

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد-۲۴

موت و حیات

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

عنوانات و تصحیح

صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث

مولانا زاہد محمود قاسمی

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240

موت وحیات

تاریخ اشاعت .... جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ

ناشر .... ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طباعت .... سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمد للہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ.... چوک فوارہ.... ملتان

مکتبہ رشیدیہ........ راجہ بازار........ راولپنڈی

ادارہ اسلامیات.......... انارکلی........ لاہور

یونیورسٹی بک ایجنسی..... خیبر بازار........ پشاور

مکتبہ سید احمد شہید....... اردو بازار...... لاہور

ادارۃ الانور........ نیوٹاؤن........ کراچی نمبر 5

مکتبہ رحمانیہ....... اُردو بازار .... لاہور

مکتبہ المنظور الاسلامیہ.... جامعہ حسینیہ... علی پور

مکتبہ المنظور الاسلامیہ.......... بلاک زیڈ...... مدینہ ٹاؤن....... بنک موڑ....... فیصل آباد

ادارہ اشاعت الخیر - حضوری باغ روڈ - ملتان

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTERE

119-121- HALLIWELL ROAD
BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۲۴ ''موت وحیات''

جدید اشاعت سے مزین آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ کے فضل وکرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔

بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو جائے۔ ادارہ نے زر کثیر خرچ کر کے یہ کام محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے یہ کام کرایا اور یہ تخریج قوسین میں اور فارسی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اُن کے نیچے لگا دیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح کا کام حضرت محترم جناب صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے سرانجام دیا۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ

جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ بمطابق جولائی 2007ء

اجمالی فہرست

دَوَاءُ الْعُیُوبُ المعروف بہ شامِ خورشید....۲۵۲

اَوَلَمْ نُعَمِّرْکُمْ مَا یَتَذَکَّرُ فِیْہِ مَنْ تَذَکَّرَ وَجَآءَ کُمُ النَّذِیْرُ

(سورۃ فاطر:۳۷)

اَلْجَمْعَیْنِ بَیْنُ النَّفَعَیْنِ.....۲۹۸

وَالصَّابِرِیْنَ فِی الْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَأْسِ اُوْلٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُوْلٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ.

(البقرہ:۱۷۶)

شَوْقُ اللِّقَآءِ ۳۵۹

فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی سُوْرَۃُ الْجُمُعَۃِ

وَلَا یَتَمَنَّوْنَہٗٓ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْھِمْ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ.

(الجمعہ:۷)

احکام و مسائل متعلق موت.....۳۸۹

اَشْرَفُ الْمَوَاعِظِ (پہلا وعظ).....۴۰۷

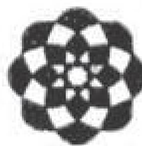
اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُھُمْ وَھُمْ فِیْ غَفْلَۃٍ مُّعْرِضُوْنَ.

(الانبیاء:۱)

اَشْرَفُ الْمَوَاعِظِ (دوسرا وعظ).....۴۱۷

وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی (المائدہ:۲)

فہرست عنوانات



ذِکرُ المَوت

(یہ وعظ کیم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ کو بمقام جھنجھانہ ہوا)

خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی اصلاح کی ضرورت ہے اور اصلاح کے واسطے مراقبہ موت کا نسخہ استعمال کرنا چاہئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ جب یہ مراقبہ صحیح ہو جائے گا تو غلطی سے بھی گناہ نہ ہوگا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِيۡكَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارِكۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ

فَقَدۡ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَلَنۡ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفۡسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ. (المنافقون:۱۱)

(یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کو جبکہ اس کی عمر کی میعاد ختم ہونے پر آ جاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتے اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب کاموں کی پوری خبر ہے)

نافرمانی کا اصل سبب غفلت ہے:

کل کے وعظ میں جو آیت کریمہ تلاوت کی گئی تھی، یہ آیت اس کا تتمہ ہے۔ کل اس کا بیان بسطۃً ہوا تھا، اس لئے آج اس کو پورا کیا جاتا ہے۔ اس آیت شریف میں ہمارے امراض کے علاج کی طرف حق تعالیٰ نے یہ اشارہ فرمایا ہے۔ کل وعظ میں امراض کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ حاصل ان امراض کا یہ ہے کہ ہم لوگوں کے اندر نافرمانی غالب ہے اور اس کی وجہ غفلت ہے اور ظاہر ہے کہ علاج بالضد ہوا کرتا ہے۔ اگر مرض سردی کی وجہ سے ہوتا ہے تو معالجہ گرمی سے کرتے ہیں اور اگر گرمی سے مرض ہو تو اس کا علاج سردی سے کیا جاتا ہے۔ غرض سبب کو زائل کیا جاتا ہے، پس معالجہ کا حاصل ازالہ سبب ہوا۔

غفلت کا علاج:

پس چونکہ ہمارے تمام امراض کا سبب غفلت ظاہر ہے کہ اس کا علاج ذکر و فکر ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے اس جزو آیت میں موت اور بعد الموت کو یاد دلایا ہے جو ذکر و فکر کا ایک اہم و انفع فرد ہے۔

سبحان اللہ! کیا مختصر اور سہل تدبیر ہے کہ اس میں کچھ مجاہدہ ومشقت نہیں، کچھ حرج نہیں۔ دنیا میں چھوٹے چھوٹے امراض کے لئے سینکڑوں روپے صرف ہوجاتے ہیں اس میں کوئی مالی مشقت نہیں۔ کوئی بدنی تعب نہیں اس لئے کہ حاصل اس علاج کا موت اور مابعد الموت کا یاد دلانا ہے کہ آدمی تھوڑی دیر بیٹھ کر سوچ لیا کرے کہ مجھے مرنا ہے اور مر کر قبر میں جانا ہے اور وہاں سانپ بچھو ہیں یا جنت کے باغ ہیں اگر اچھے عمل ہیں تو قبر باغ ہے اور اگر برے ہیں تو سانپ بچھو ہیں اور پھر قبر سے اٹھنا ہے اور حساب کتاب کے لئے پیش ہونا ہے اور پل صراط پر چلنا ہے۔ اسی طرح تمام واقعاتِ قیامت کو تفصیلاً یاد کرلیا کرے۔ فرمایئے اس میں کیا دشواری ہے؟ کسی آمدنی میں خلل نہیں پڑتا۔ بڑا عذر یہ لوگ یہ پیش کرتے ہیں کہ ہم دنیادار آدمی ہیں۔ ہم سے کیا ہوسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے ذہن میں جمالیا ہے کہ دین بڑی مشکل شئے ہے اور اس میں بڑی مشقت ہے۔ یہی علاج جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے۔

دین پر عمل کرنا مشکل نہیں:

بتلایئے اس میں کیا مشقت ہے، کون سے کام میں حرج ہوتا ہے۔ بہت سی نفلیں نہیں پڑھوائی جاتیں۔ بہت سے وظیفے نہیں بتائے گئے اور منشاء دین کو بھاری اور مشقت کی چیز سمجھنے کا یہ ہوا کہ لوگوں نے دیکھا کہ ایک جماعت ایسی ہے کہ تسبیح ان کے ہاتھ میں ہے اور رات دن سوائے درود و دعاء ذکر وفکر وتلاوت قرآن شریف اور ذکر کی ضربوں کے ان کا کوئی کام نہیں۔ نہ وہ تجارت کرتے ہیں نہ وہ زراعت کے کام کے ہیں، نہ وہ نوکری کرسکتے ہیں۔ سوائے اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے ان کو دنیا کا کوئی کام نہیں۔ اس سے یہ سمجھے کہ دیندار ایسے ہی ہوتے ہیں اور جو ایسا نہ ہو وہ دیندار نہیں۔ لہٰذا ہم کیسے دیندار ہوسکتے ہیں۔ ہم تو تجارت، نوکری، زراعت میں مبتلا ہیں۔ دنیا کے سینکڑوں دھندے ہم کو لگے ہوئے ہیں۔ ہم کس طرح خالی ہوکر ان کی طرح بیٹھ جائیں اور اس سے یہ نتیجہ ذہن میں جم گیا کہ دین بڑی مشکل شئے ہے اور ہم سے ہرگز اس پر عمل نہیں ہوسکتا۔

حقیقت دین:

صاحبو! خوب سمجھ لو کہ یہ چیزیں بھی اپنے درجے میں مرغوب ومندوب ہیں جبکہ آدمی بالکل فارغ ہو لیکن دین کی حقیقت میں داخل نہیں کہ اگر یہ اشیاء ہوں تو دین ہو اور اگر نہ ہوں تو دین کا وجود نہ ہو۔ دین نام ہے امتثال مامور بہ کا اور ضروری مامور بہ جس قدر ہے وہ بہت سہل ہے، اس میں کوئی بکھیڑا نہیں۔ شریعت نے یہ حکم نہیں دیا کہ نہ اچھا کھاؤ نہ اچھا پیو اور نہ زراعت کرو نہ تجارت نہ نوکری، نہ حرفت، ہاتھ پاؤں توڑ کر مسجد میں بیٹھے رہو بلکہ سب کچھ کرو مگر حدود سے باہر نہ نکلو۔ دین

کے بڑے بڑے ارکان یعنی نماز، روزہ، حج زکوۃ سب میں غور کیجئے کہ ان کے کرنے میں کیا مشقت ہے؟ دنیا کا کون سا بڑا کام بند ہوتا ہے۔ زکوۃ میں شاید کوئی کہے کہ اس میں مال کا خرچ ہے تو سمجھ لیجئے کہ اُمم سابقہ پر زکوۃ چوتھائی مال تھا۔ اس امت پر یہ رحمت ہے کہ صرف چالیسواں حصہ ہی فرض ہے اور پھر اس میں بھی شرط یہ ہے کہ سال بھر اس مال پر گزر جائے پھر اس مال کا قابل نمو ہونا بھی شرط ہے۔ سو اگر آدمی کو سلیقہ ہو تو بذریعہ تجارت سال بھر میں اس کو بڑھا سکتا ہے اور اگر خود سلیقہ نہ ہو تو سبحان اللہ کیا رحمت اور انعام ہے کہ اس کا بھی طریقہ بتلا دیا ہے کہ مضاربت پر کسی کو مال دے دو۔

مضاربت:

مضاربت یہ ہے کہ مال ایک کا ہو اور محنت دوسرے کی اور نفع میں دونوں شریک، لیکن اس میں یاد رکھنے کی بات ہے کہ نفع معین نہ کرے۔ جیسے آج کل معین کر لیتے ہیں کہ دس روپے ماہوار لیا کریں گے۔ یہ جائز نہیں ہے بلکہ حصہ معین کرے کہ تین چوتھائی مثلاً تیرا ایک اور چوتھا ہمارا یا نصف نصف مثلاً اگر شارع چاہتے تو اس عقد کو حرام کر دیتے اور اس کے نفع کو سود میں داخل کر دیا جاتا لیکن بندوں کی ضرورت پر نظر کر کے اس کی اجازت دے دی۔ غرض تجارت کرنے کی اجازت اور تجارت کرانے کی اجازت، اس سے زیادہ اور کیا سہولت ہو سکتی ہے۔ پس اگر کسی کے پاس سو روپے ہوں اور سال میں دس روپے نفع ہو تو کچھ بعید نہیں، تو اس میں اڑھائی روپیہ دے دینا کیا مشکل ہے۔ یہی سمجھ لیا جائے کہ ساڑھے سات ہی نفع ہوا ہے۔ پھر مزید برآں وعدہ ہے **اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ** یعنی زکوۃ دینے والے اپنے مال کو دوگنا چوگنا کرنے والے ہیں۔ یعنی زکوۃ سے یہ مت سمجھو کہ مال کم ہوتا ہے بلکہ بڑھتا ہے اور یہ بڑھنا آخرت میں تو ہوگا ہی دنیا میں بھی ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم جب سے عشر دینے لگے ہیں اس وقت سے ہمارے یہاں پیداوار زیادہ ہونے لگی ہے اور دیکھئے ایک سرکاری قانون کی قدر اس لئے کرتے ہیں کہ تنخواہ میں سے کاٹ کر اور اس کا سود لگا کر بڑھا کر اس ملازم کو دیتی ہے۔ افسوس ہے کہ اللہ تعالیٰ باوجود اس کے کہ دوگنا چوگنا دے اور اس کی قدر نہیں اور پھر بڑھنا دوگنے تک ہی نہیں بلکہ سات سو تک اور اس سے زیادہ بھی بڑھا دیتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کوئی چھوہارہ صدقہ دیتا ہے تو حق تعالیٰ اس کو بڑھاتے رہتے ہیں حتی کہ وہ اُحد پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ دیکھئے اگر احد پہاڑ کے ٹکڑے ایک چھوہارے کے برابر کریں تو کتنے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ اب بتلایئے کہ زکوۃ دینے سے کیا خسارہ ہوا؟ بعض لوگ کہیں گے کہ ہم تو گن کر روپے

رکھتے ہیں اور زکوۃ دینے کے بعد پھر گنتے ہیں تو کم ہو جاتا ہے۔ بڑھنا تو درکنار برابر بھی نہیں رہتا۔ بات یہ ہے کہ بڑھنے کی حقیقت اور غرض پر اگر نظر ہوتی تو یہ شبہ ہی نہ ہوتا۔

مال بڑھنے کی غرض:

مال کے بڑھنے کی غرض یہ ہے کہ وہ بڑھا ہوا مال اپنے کام آئے۔ چنانچہ اگر کسی کے پاس کروڑوں روپیہ ہو اور اس کے کام نہ آئے بلکہ فضولیات میں ضائع ہو جائے اور ایک شخص کے پاس دس روپے ہیں لیکن دس کے دس اس کے کام آئے تو یہ شخص اس سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ سو ہم کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے ہیں کہ دو شخص ہیں اور ان کی برابر آمدنی ہے مگر فرق اتنا ہے کہ ایک زکوۃ دیتا ہے اور تمام حقوق واجبہ ادا کر دیتا ہے۔ سو اس کی چین و آرام سے زندگی گزرتی ہے اور دوسرا شخص جو حقوق ادا نہیں کرتا وہ ہمیشہ پریشانی میں رہتا ہے۔ آج چوری ہو گئی، کل کوئی مقدمہ قائم ہو گیا۔ خود بیمار ہو گیا، بچے بیمار ہو گئے۔ عطار کے ہاں روپیہ جا رہا ہے، طبیب کی فیس میں خرچ ہو رہا ہے۔ بخلاف پہلے شخص کے کہ جس قدر آمدنی ہے وہ سب اس کے کام آ رہی ہے، جو مال کے بڑھنے سے غرض ہے وہ اس کو حاصل ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ جس قدر لیتے ہیں اس سے زیادہ دے دیتے ہیں اور پھر جو لیتے ہیں وہ اپنے لئے نہیں وہ بھی تمہارے ہی لئے ہے۔ حاصل یہ کہ زکوۃ میں کچھ مشقت نہیں ہے بلکہ ہر طرح سے سہولت اور نفع ہی ہے۔ دُنیوی بھی اور اُخروی بھی۔

احکام شرعیہ میں سہولتیں:

علیٰ ہٰذا حج میں کوئی دشواری نہیں ہے، جس کے پاس اپنی حاجت اصلیہ سے زائد اس قدر خرچ ہو کہ مکہ معظمہ تک سواری میں چلا جائے اور چلا آئے اور سفر میں رہنے تک اہل و عیال کو خرچ دے جائے اس کے ذمے حج واجب ہے۔ مدینہ طیبہ اگر ہمت اور خرچ ہو تو جانا سنت ہے۔ آج کل لوگ اس غلطی میں ہیں کہ حج کے لئے مدینہ منورہ کا خرچ بھی لگاتے ہیں اور اگر مدینہ طیبہ کا خرچ نہ ہو تو حج کو فرض نہیں سمجھتے۔ یاد رکھو جس کے پاس مکہ معظمہ تک آنے جانے کا خرچ ہو اس کے ذمے حج واجب ہو جاتا ہے۔ مدینہ طیبہ جانا فرض نہیں بتلایئے اس میں کیا خسارہ ہے بلکہ بعض لوگوں کو اور نفع ہو جاتا ہے کہ تجارتی مال لے جاتے ہیں۔ اگرچہ بلا ضرورت اولیت کے خلاف ہے اور ایک نفع یہ ہے کہ تجربہ بڑھتا ہے۔ خصوصاً ترقی یافتہ حضرات تجربہ کو اتنا بڑا نفع سمجھتے ہیں کہ اس کے واسطے ہزارہا روپیہ خرچ کر دیتے ہیں۔ غرض سمجھ میں نہیں آتا کہ احکام شرعیہ میں کوئی حکم بھی ایسا ہو جس میں مال اور جان کا ضرر ہو۔ مال کا ضرر نہ ہونا تو میں ثابت ہی کر چکا ہوں اور جان کے متعلق ارشاد ہے

رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دینے کے بعد پھر گنتے ہیں تو کم ہو جاتا ہے۔ بڑھنا تو درکنار برابر بھی نہیں رہتا۔ بات یہ ہے کہ بڑھنے کی حقیقت اور غرض پر اگر نظر ہوتی تو یہ شبہ ہی نہ ہوتا۔

مال بڑھنے کی غرض:

مال کے بڑھنے کی غرض یہ ہے کہ وہ بڑھا ہوا مال اپنے کام آئے۔ چنانچہ اگر کسی کے پاس کروڑوں روپیہ ہو اور اس کے کام نہ آئے بلکہ فضولیات میں ضائع ہو جائے اور ایک شخص کے پاس دس روپے ہیں لیکن دس کے دس اس کے کام آئے تو یہ شخص اس سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ سو ہم کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے ہیں کہ دو شخص ہیں اور ان کی برابر آمدنی ہے مگر فرق اتنا ہے کہ ایک زکوٰۃ دیتا ہے اور تمام حقوق واجبہ ادا کر دیتا ہے۔ سو اس کی چین و آرام سے زندگی گزرتی ہے اور دوسرا شخص جو حقوق ادا نہیں کرتا وہ ہمیشہ پریشانی میں رہتا ہے۔ آج چوری ہو گئی، کل کوئی مقدمہ قائم ہو گیا۔ خود بیمار ہو گیا، بچے بیمار ہو گئے۔ عطار کے ہاں روپیہ جا رہا ہے، طبیب کی فیس میں خرچ ہو رہا ہے۔ بخلاف پہلے شخص کے کہ جس قدر آمدنی ہے وہ سب اس کے کام آ رہی ہے، جو مال کے بڑھنے سے غرض ہے وہ اس کو حاصل ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ جس قدر لیتے ہیں اس سے زیادہ دے دیتے ہیں اور پھر جو لیتے ہیں وہ اپنے لئے نہیں وہ بھی تمہارے ہی لئے ہے۔ حاصل یہ کہ زکوٰۃ میں کچھ مشقت نہیں ہے بلکہ ہر طرح سے سہولت اور نفع ہی ہے۔ دُنیوی بھی اور اُخروی بھی۔

احکام شرعیہ میں سہولتیں:

علیٰ ہٰذا حج میں کوئی دشواری نہیں ہے، جس کے پاس اپنی حاجت اصلیہ سے زائد اس قدر خرچ ہو کہ مکہ معظّمہ تک سواری میں چلا جائے اور چلا آئے اور سفر میں رہنے تک اہل وعیال کو خرچ دے جائے اس کے ذمے حج واجب ہے۔ مدینہ طیبہ اگر ہمت اور خرچ ہو تو جانا سنت ہے۔ آج کل لوگ اس غلطی میں ہیں کہ حج کے لئے مدینہ منورہ کا خرچ بھی لگاتے ہیں اور اگر مدینہ طیبہ کا خرچ نہ ہو تو حج کو فرض نہیں سمجھتے۔ یاد رکھو جس کے پاس مکہ معظّمہ تک آنے جانے کا خرچ ہو اس کے ذمے حج واجب ہو جاتا ہے۔ مدینہ طیبہ جانا فرض نہیں بتلایئے اس میں کیا خسارہ ہے بلکہ بعض لوگوں کو اور نفع ہو جاتا ہے کہ تجارتی مال لے جاتے ہیں۔ اگرچہ بلا ضرورت اولیت کے خلاف ہے اور ایک نفع یہ ہے کہ تجربہ بڑھتا ہے۔ خصوصاً ترقی یافتہ حضرات تجربہ کو اتنا بڑا نفع سمجھتے ہیں کہ اس کے واسطے ہزارہا روپیہ خرچ کر دیتے ہیں۔ غرض سمجھ میں نہیں آتا کہ احکام شرعیہ میں کوئی حکم بھی ایسا ہو جس میں مال اور جان کا ضرر ہو۔ مال کا ضرر نہ ہونا تو میں ثابت ہی کر چکا ہوں اور جان کے متعلق ارشاد ہے

لَایُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یعنی اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی وسعت سے زائد تکلیف نہیں دیتے۔ دیکھئے اگر نماز کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکو تو بیٹھ کر پڑھ لو، اگر وضو نہ کر سکو پانی نقصان کرتا ہو تو تیمم سے پڑھ لو اور اگر پانی نقصان نہیں کرتا لیکن بیماری سے حرکت نشست و برخاست میں تکلیف ہوتی ہے تو دوسرے سے التجا کرنا ضروری نہیں ہے۔ شریعت اس کو بھی معذور قرار دیتی ہے۔ ہاں اگر کوئی اپنا خادم اور محکوم ہو تو اس سے وضو میں استعانت ضروری ہے۔ اگر راستے میں ڈول رسی نہ ہو اور دوسرے کے پاس ڈول رسی ہو اور مانگنے سے جی رکتا ہو تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مانگنا واجب نہیں وغیر ذالک من التسہیلات اور اس کے علاوہ بہت سی سہولتیں ہیں۔

قانون شریعت دنیا کے تمام قوانین سے زیادہ آسان ہے:

میں سچ کہتا ہوں کہ دنیا کے قوانین ایک جگہ جمع کر لو اور شریعت کو ایک طرف، سب سے زیادہ آسانی شریعت میں دیکھو گے۔ افسوس ہے کہ آج کل لوگ شریعت کو خونخوار سمجھتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ شتر بے مہار کی طرح پھریں ایسے مطلق العنان لوگ دنیا میں بھی خوار اور ذلیل ہیں اور یہ جو ظاہری عزت ان کو حاصل ہے اور لوگ ان سے ڈرتے ہیں۔ یہ ایسی ہے جیسے بھیڑیئے اور شیر سے ڈرتے ہیں۔ اگر ابھی شیر یا بھیڑیا آ جائے سب اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جائیں گے۔ چنانچہ پیٹھ پیچھے ان ہی لوگوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ بخلاف ان لوگوں کے جو خدا تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں کہ ان کی عزت سچی عزت ہے۔ ان کی تعظیم و تکریم لوگ دل سے کرتے ہیں اور پیٹھ پیچھے مدح و ثنا کرتے ہیں۔ یہ تو ان آزاد لوگوں کے لئے دنیا میں ہے اب آخرت کی نسبت سنئے۔ فرماتے ہیں: ذُقْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ یعنی چکھ مزہ عذاب کا بے شک تو بڑا عزیز و مکرم ہے۔ یہ ابوجہل کو خطاب ہے۔ یہ وہاں عزت ہوگی۔ عزیز کریم بطور طعن و تہکم (استہزاء) کے فرمایا۔ سو لوگ ایسی مطلق العنانی کو جس میں دنیا اور دین دونوں میں رسوائی ہو پسند کرتے ہیں۔

شریعت میں سراسر منفعت و راحت ہے:

شریعت کو کہ جس میں سراسر منفعت و عزت و راحت ہے چھوڑتے ہیں۔ غور کر کے دیکھئے کہ جن معاملات میں ہم نے شریعت کو چھوڑ دیا ہے اور نئی رسوم مقرر کر لی جاتی ہیں کس قدر دقتوں میں واقع ہو گئے ہیں۔

مہر کی کم از کم مقدار:

ایک شادی کے طریقہ کو دیکھئے کہ شریعت میں اس نے اس قدر آسانی فرمائی ہے کہ کوئی قید نہیں لگائی۔ اس کا پابند نہیں فرمایا کہ مہر ہزار ہی روپے کا ہو، کم از کم مقدار ہم نے تین روپے مقرر فرما

دی جس کو ادنیٰ استطاعت والا بھی ادا کر سکتا ہے۔ روپیہ کی کچھ مقدار نہیں اور وہ بھی نکاح کے وقت دینا ضروری نہیں۔ جب ہو سکیں دے دو اور اگر عورت معاف کر دے تو معاف بھی ہو جاتا ہے۔ نقد ایک پیسہ کا خرچ نہیں۔ چھوارے اگر ہوں تو مستحب ہے، واجب فرض نہیں بلکہ نکاح میں یہ برکت رکھی ہے کہ اس سے غنا حاصل ہوتا ہے۔ لوگوں کو سن کر تعجب ہوگا کہ نکاح سے غنا کیسے حاصل ہوتا ہے ہم تو اس کا برعکس دیکھتے ہیں کہ خرچ بڑھنے سے اور مصیبت ہو جاتی ہے۔

نکاح سے غنا کس طرح حاصل ہوگا:

صاحبو! آپ غور نہیں کرتے اگر ہر شئے کی روح اور حقیقت پر نظر ہو تو ان سب دعووں کا سمجھنا سہل ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ **التدبیر نصف المعیشت** (گھر کا انتظام و تدبیر آدھی معیشت ہے) یہ مسئلہ تمدن کا ہے اگر دس روپے ہوں اور ساتھ ہی تدبیر بھی تو اس میں بیس روپے سے کام چل سکتا ہے۔ بعض امور خانہ داری کے ایسے ہیں کہ مرد اکیلا پانچ روپے میں گزر نہیں کر سکتا بیوی اگر عاقلہ ہو تو پانچ روپے میں اپنا اور دوسرے کا گزر کرے گی اور بغیر تدبیر اور عقل کے ہزاروں روپیہ بھی کافی نہیں۔

عورتوں کا کفرانِ عشیر:

آج کل عورتیں حقیقت میں گھر کو کھوتی ہیں۔ بعض تو اپنے ماں باپ بھائیوں کو دیتی ہیں۔ بعض کپڑوں اور زیور میں روپیہ برباد کرتی ہیں اور جس قدر ان کو دیا جائے ان کی نظروں میں کچھ اس کی قدر نہیں۔ کفرانِ عشیر گویا ان کا جزوِ ذات ہے۔ بقول مولوی عبدالرب صاحب مرحوم کے عورتوں سے جب کبھی پوچھا جاتا ہے کہ تم کو کچھ کپڑوں کی ضرورت ہے یا کافی مقدار میں موجود ہیں تو یہی کہیں گی کہ میرے پاس کیا ہے دو چیتھڑے۔ اور جب برتنوں کا ذکر آتا ہے تو کہتی ہیں کیا ہیں دو ٹھیکرے۔ جوتا کی نسبت پوچھو تو کہتی ہیں کیا ہے دو لیترے۔ یہ نرا قافیہ بندی نہیں حقیقت یہی ہے کہ اس فرقے کے اندر شکر گزاری کا مادہ مطلق نہیں۔ الا ماشاء اللہ اور شب و روز فضولیات میں لگی رہتی ہیں اگر کوئی شے سامنے آ جاتی ہے اور پسند آ جائے تو اگرچہ ضرورت نہ بھی ہو مگر پھر بھی لے لیتی ہیں اور پوچھنے پر یہ جواب دیتی ہیں کہ گھر میں ہوئی چیز بھی نہ کبھی کام آ جاتی ہے اور شادی میں تو ایسا بے تکا روپیہ اڑاتی ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اگر پاس نہ ہو تو قرض لیتی ہیں خواہ سود ہی ملے اور مشہور یہ کر رکھا ہے کہ شادی اور تعمیر کا قرضہ ضرور ادا ہو جاتا ہے تو ایسی عورتوں کا ذکر نہیں۔ باقی اگر فضولیت سے باز آ جائیں اور انتظام سے چلیں تو وہ رونق ہو جاتی ہے کہ دس روپے میں مرد نہیں کر

سکتا تو دیکھئے شادی کرنے سے افلاس اس طرح دور ہو جاتا ہے۔ بہرحال شادی میں تھوڑا سا خرچ ہوا اور اس کے بدلے میں گھر میں رونق ہو گئی لیکن شرط یہی ہے کہ سلیقہ سے کام لیا جائے۔

شریعت کو پس پشت ڈالنے کے نتائج:

شریعت کی سہولت تو آپ نے شادی کے بارے میں ملاحظہ فرمالی اب دیکھئے کہ بجائے شریعت کے جو قواعد آپ نے شادی کے اندر مقرر کئے ہیں ان سے کس قدر کلفت واقع ہوتی ہے کہ شادی جس کو شریعت نے بہت ارزاں کیا تھا آپ نے اس کو کس قدر گراں کر دیا کہ منگنی سے لے کر فراغت تک اس قدر بکھیڑے اور خرچ اس میں بڑھا دیئے ہیں کہ جن کا شریعت میں کہیں پتہ نہیں۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لڑکے لڑکیاں بڑی عمر تک کنوارے رہتے ہیں اور سنت نکاح سے محروم رہتے ہیں اور بہت سے گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور جنہوں نے قرض دام کر کے شادی کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج گھر نیلام ہو رہا ہے، کل جائیداد بک رہی ہے۔ یہ سب نتائج شریعت کو چھوڑنے کے ہیں۔

غمی میں شریعت کا پاکیزہ قانون:

اسی طرح غمی کو دیکھئے کہ ان میں ضروری جزو صرف اس قدر ہے کہ کفن دفن کیا جائے۔ اس میں کس قدر خرچ ہے لیکن اگر اس قدر خرچ بھی کسی کے پاس نہ ہو تو سبحان اللہ دیکھئے کیا پاکیزہ قانون ہے کہ عامۃ المسلمین کے ذمے اس کا کفن دفن ہے۔ علاوہ اس کے جو فضولیات اختراع کر رکھی ہیں وہ بالکل قابل حذف ہیں۔ مثلاً تیجہ، دسواں، بیسواں، چالیسواں وغیرہ ان کا شریعت میں کہیں پتہ نہیں، اپنی طرف سے اختراع کر کے مصیبت میں پڑے ہیں۔ اب خیال فرمائیے کہ شریعت میں کیا دشواری ہے کہ آمدنی کے ابواب بند کر دیئے۔ مثلاً سود، رشوت، جوا وغیرہ۔ دوسرے یہ کہ ہماری آزادی کو بند کر دیا۔ رشوت اور جوئے کا جواب تو بہت ظاہر ہے کہ اس کے تسلیم کرنے میں ہمارے نوجوان تو ہرگز تامل ہی نہ کریں گے وہ یہ کہ رشوت و جوا سرکاری قانون میں بھی ممنوع ہے۔ فما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

سود کا وبال:

رہا سود۔ اس کے بارے میں ارشاد ہے **يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ** یعنی اللہ تعالیٰ ربوا (سود) کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں۔ مٹانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آج گن کر سو روپے رکھتے تھے دوسرے دن پچاس رہ گئے یا بالکل نہیں رہے۔ یہ بات ہے کہ مال کا

اصل مقصود یہ ہے کہ اپنی یا اپنی اولاد کے کام آئے۔ کھانے پہننے اور دیگر حوائج میں صرف ہو اور سود خوار کی آمدنی کسی کے کام نہیں آتی۔ فضول اڑ جاتی ہے۔ یا تو مکانات کی تعمیر میں روپیہ اڑ جاتا ہے یا رنڈیوں اور شراب خواری میں ضائع ہو جاتا ہے اور دوسرا وبال سود کا یہ ہے کہ سود خوار سے کسی کو محبت نہیں ہوتی اور سرمایہ راحت آپس کی محبت والفت ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ سود خوار لوگوں میں نہ باپ کو بیٹے سے محبت ہے، نہ بیٹے کو باپ سے۔ سود خوار ہر شخص کے نزدیک ساقط النظر ہوتا ہے اور نیز اس کو کسی وقت راحت نہیں ہوتی۔ ہر وقت ادھیڑ بن میں رہتا ہے اور اسی فکر میں رہتا ہے کہ کسی طرح دس کے بیس ہو جائیں۔ دنیا کی نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔ یہ مٹانے کی روح ہے۔ اب بے تکلف آپ کی سمجھ میں یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں کے معنی آ گئے ہوں گے۔ نیز کبھی قرض داروں کے پاس روپیہ مارا بھی جاتا ہے۔ بہر حال یہ دعویٰ بالکل محفوظ ہے کہ شریعت آسانی کی طرف بلا رہی ہے اور آپ کا دستور وعرف دشواری میں ڈال رہا ہے اور نیز یہ بھی محقق ہوا کہ شریعت پر عمل کرنے سے راحت ہی راحت ہے اور شریعت کو چھوڑنے میں دشواری ہی دشواری ہے۔ مگر لوگوں کی یہ حالت ہے کہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم مطلق العنان رہیں، اس لئے شریعت کی پابندی دشوار معلوم ہوتی ہے لیکن واقع میں دین میں کوئی مشقت نہیں۔

علاج غفلت کے دو اجزاء:

پس اسی طرح دین کے اس حکم میں بھی جس کا ذکر ہو رہا ہے کوئی دشواری نہیں ہے کہ موت و مابعد الموت کو سوچا کرو، پس ثابت ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے جو اس آیت شریف میں علاج ارشاد فرمایا ہے وہ بے حد سہل ہے۔ حاصل علاج کا یہ نکلا کہ موت اور مابعد الموت کو یاد کر لیا کرے سود یکھے۔ یہ علاج اس قدر سہل اور سستا ہے کہ اس میں نہ جان کا خرچ ہے نہ مال کا اور موثر ایسا کہ حقیقت میں ایسا دنیا بھر کے حکماء بقراط وسقراط بھی جمع ہو کر سوچتے تو ایسے آسان علاج تک ان کے ذہن کو ہرگز رسائی نہ ہوتی تو ایسے شدید مرض کا علاج چند لفظوں میں ارشاد فرمایا پس علاج کے صرف دو جزو ہیں: ایک موت کا یاد کرنا اور دوسرے مابعد الموت کی طرف اشارہ فرمایا اور وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ سے اشارہ مابعد الموت کی طرف ہے۔ اس لئے کہ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ جو کچھ دن رات کیا کرتے ہو اللہ تعالیٰ سب کی خبر رکھنے والے ہیں تو اس خبر دینے کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم کو سب خبر ہے تو سب اعمال کی جزا وسزا دیں گے جیسے استاد شاگردوں سے کہتا ہے یا آقا نوکر سے کہا کرتا ہے کہ مجھ کو تمہاری سب حرکتوں کی اطلاع ہے۔ مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کی سزا ملے گی اور

جزاوسزااعمال کی جو کچھ ہوگی وہ مابعد الموت ہوگی۔ پس حاصل علاج کا یہ ہوا کہ موت اور مابعد الموت کو یاد کرو اور حدیث میں بھی اس علاج کا ذکر آیا ہے۔

موت ھازم اللذ ات ہے:

چنانچہ فرمایا: اکثروا ذکرھا ذم اللذات (سنن الترمذی:۲۳۰۷)

یعنی لذات کی قطع شکستہ کرنے والی شئے (موت) کو بہت یاد کیا کرو۔ سبحان اللہ کیا خوبصورت عنوان ہے۔ حکم فرمایا ہے یہ نہیں فرمایا کہ موت کو یاد کیا کرو بلکہ موت کو ھاذم اللذ ات سے تعبیر فرمایا۔ اس میں ایک بڑی گہری بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ بات یہ ہے کہ آدمی جو گناہ کرتا ہے یا دنیا کے مال و جاہ میں منہمک ہوتا ہے تو مقصود اور غایت سب کی تحصیل لذت ہے اور جب یہ یاد کرے گا کہ یہ سب ایک دن ختم ہو جائے گا اور اس کا تصور ہوگا تو مزہ ہی نہ آئے گا اور جب مزہ ہی نہ آئے گا تو وہ گناہ بھی چھوٹ جائے گا۔ دنیا میں اس کی بہت مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً کسی بڑے عہدے پر ہے، مثلاً ڈپٹی کلکٹر ہے لیکن اس پر کوئی مقدمہ بھی قائم ہے جس سے خوف غالب ہے کہ اس عہدہ سے برطرف کر دیا جائے گا۔ اس کو اس کلکٹری میں خاک بھی لذت نہ ہو گی۔ غرض کلیہ قاعدہ ہے کہ جس شئے میں انقطاع کا خوف ہوتا ہے اس میں لذت نہیں رہتی۔

موت ہر لذت کو ختم کرنے والی ہے:

پس حاصل حدیث شریف کا یہ ہوا کہ اگر تم سے گناہ بوجہ لذت کے نہیں چھوٹتے تو ہم علاج بتاتے ہیں کہ تم یہ یاد کر لیا کرو کہ یہ لذات سب ختم ہونے والی ہیں۔ جب اس کا تصور کامل ہوگا تو گناہ چھوٹ جائیں گے اور موت سے تو تمام لذات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بہت ظاہر ہے۔

موت کے دو مقدمات:

موت کے جو مقدمات ہیں ان سے بھی لذت ختم ہو جاتی ہے۔ موت کے دو مقدمے ہیں۔ بیماری اور بڑھاپا۔ دیکھ لیجئے دونوں سے لذات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بیماری میں کسی شئے کا لطف نہیں رہتا۔ اچھے اچھے لذیذ کھانے کڑوے معلوم ہوتے ہیں۔ سب شہوانی جوش وخروش ختم ہو جاتے ہیں بلکہ بولنا تک برا معلوم ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ کسی کا پوچھنا اور عیادت کرنا برا معلوم ہوتا ہے۔

عیادت میں تھوڑی دیر بیٹھنے میں حکمت:

اسی واسطے تو حدیث شریف میں آیا ہے من عاد منکم مریضا فلیخفف الجلوس

(مسند احمد ۳: ۱۱۸) (یعنی جو شخص تم میں سے کسی مریض کی عیادت کرے تو چاہئے کہ کم بیٹھے)۔
سبحان اللہ شریعت کی کس قدر گہری نظر ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی پوری نظر ہے اور یہ بجز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی کا کام نہیں۔ کوئی کتنا ہی بڑا فلاسفر ہو مگر اس کی نظر ایسے دقائق تک کہاں پہنچ سکتی ہے۔ اکثر لوگ آج کل ایسی غلطی کرتے ہیں کہ بیمار کے پاس بیٹھ کر مجلس آرائی کرتے ہیں۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ آرام کرے یا کروٹ بدلے لیکن ان کے لحاظ سے بے چارہ ایک حالت میں لیٹا رہتا ہے۔ یہ بڑی سخت غلطی ہے۔ ہاں اگر مریض سے ایسی بے تکلفی ہو کہ اس کو اس سے کچھ لحاظ نہ ہو اور اس لئے آرام میں خلل نہ ہو بلکہ اس سے انس و راحت ہو تو وہ مستثنٰی ہے اس لئے کہ علت اس حکم کی ایذا ہے اور وہ یہاں مرتفع ہے۔ حاصل یہ کہ مرض میں کسی شئے کی حلاوت نہیں رہتی۔ ہر امر میں بے لطفی ہو جاتی ہے۔ نہ کھانے کو جی چاہتا ہے، نہ پینے کو۔ اسی واسطے تو فرمایا ہے **لا تکرھو مرضاکم علی الطعام** (سنن ابن ماجہ: ۳۴۴۴) اور مریضوں کو کھانے پینے پر مجبور نہ کرو۔ آج کل اس کے بھی خلاف کرتے ہیں اور مریض کو مجبور کرتے ہیں کہ کچھ کھا ہی لے۔ خاص کر مائیں بچوں کو بے انتہا مجبور کرتی ہیں۔ یاد رکھو بعض مرتبہ کھانے سے اور مرض بڑھ جاتا ہے بلکہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسا ہرگز نہ کرو۔ اس کے آگے فرماتے ہیں **فان اللہ یطعمھم ویسقیھم** یعنی اللہ تعالیٰ ان کو کھلا پلا دیتے ہیں۔ حقیقت میں بعض مریضوں پر بیس بیس دن گزر جاتے ہیں اور بالکل نہیں کھاتے اور پھر جس قدر کمزوری ہونا چاہئے اس قدر نہیں ہوتی۔ تندرست آدمی اگر اتنے دنوں تک نہ کھائے تو بہت ضعیف ہو جائے۔ اس کے اعتبار سے مریضوں کو اتنا ضعف نہیں ہوتا، اگر کوئی کہے کہ ہم رات دن بیمار کے پاس بیٹھے رہتے ہیں، کسی وقت جدا نہیں ہوتے اور خود بھی بیمار پڑتے ہیں مگر کبھی اللہ تعالیٰ کو کھلاتے پلاتے نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ کھلانے پلانے سے جو مقصود ہے وہ حاصل ہو جاتا ہے۔

کھانے پینے سے مقصود:

کھانے پینے سے مقصود قوت ہے۔ وہ برابر رہتی ہے اس لئے کہ رطوبات فضلیہ بدل ما یتحلل بنتی رہتی ہیں اس لئے اس کو قوت رہتی ہے اور رطوبت کا اس طرف منعرف کر دینا یہ کام بھی حق تعالیٰ ہی کا ہے۔ پھر کھلانے پلانے میں کیا شبہ رہا۔ حاصل یہ کہ ایک مقدمہ موت کا تو یہ تھا دوسرا مقدمہ بڑھاپا ہے کہ اس میں بھی سارے مزے ختم ہو جاتے ہیں۔ کھانے کا لطف نہیں رہتا اس لئے کھانے کا

لطف بھوک پر ہے۔ جوانی میں جیسی بھوک لگتی ہے وہ بڑھاپے میں نہیں رہتی۔ پس اگر کچھ بھوک ہو بھی تو جو شئے چاہیں وہ نہیں کھا سکتے۔ اس لئے کہ دانت سب رخصت ہو گئے اسی طرح سرد پانی نہیں پی سکتے کہ نزلے کی تحریک ہو جاتی ہے، تازہ پانی یا گرم پانی پیتے ہیں، سونے کا آرام جاتا رہتا ہے اس لئے کہ اول تو گھر میں نیند نہیں آتی پھر پوست دماغ میں اس قدر ہوتی ہے کہ وہ سونے نہیں دیتی۔

جوانی گئی زندگانی گئی:

حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کا یہ شعر جوانی گئی زندگانی گئی الخ سن کر ہم کو تعجب اور اشکال ہوتا تھا کہ جوانی جانے سے زندگانی کیسے جاتی رہی مگر جب اپنے اوپر گزری تو معلوم ہوا کہ واقعی بڑھاپے میں زندگانی کا لطف نہیں۔ ہماری ایک تائی تھیں اللہ تعالیٰ ان کو بخشے وہ بڑھاپے کے مصائب سے موت کی تمنا کیا کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ بوڑھا ہو کر اگر گناہ کرے تو اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے۔

تین شخصوں پر لعنت:

حدیث شریف میں تین شخصوں پر لعنت آئی ہے۔ اول ملک کذاب یعنی جھوٹے بادشاہ پر اس لئے کہ جب وہ بادشاہ ہے تو اس کو جھوٹ کی کیا ضرورت، جھوٹ تو وہ بولے جو کسی سے دبتا ہو اور جب اللہ تعالیٰ نے اس کو سلطنت عطا فرمائی ہے تو اس کو کیا حاجت ہے۔ دوسرے عائل متکبر پر لعنت آئی ہے یعنی غریب ہو کر تکبر کرے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض غریب باوجود اپنی شکستہ حالی کے بھی اینٹھ مروڑ میں رہتے ہیں۔ امیر بے چارے ریچ جاتے ہیں مگر یہ غریب اپنی شیخی میں رہتے ہیں۔ خاص کر تقریبات میں اکثر اینٹھ جاتے ہیں اور بلائے سے بھی نہیں آتے۔ تقریب والے مناتے ہیں، خوشامدیں کرتے ہیں مگر ان کی ناک ہی سیدھی نہیں ہوتی۔ ہمارے یہاں ایک مال دار شخص تھے، ان کے یہاں تقریب تھی۔ ایک مفلس شخص کو جو کہ ان کے یہاں مدعو تھے اور انتظار طعام میں بیٹھے تھے ان کے یہاں کا سامان دیکھ کر بہت حسد ہوا۔ سوچنے لگے کہ کوئی ء ب نکلے۔ چنانچہ ایک بات نکلی سقاء کارخانہ میں جا رہا تھا۔ اس کی مشک میں ایک سوراخ تھا۔ اس میں سے پانی نکل کر ان کے کپڑوں پر گرا۔ بس شیخ صاحب کہاں تھے چھنک کر کھڑے ہو گئے اور خدا جانے گھر والے کو کیا کیا کہا۔ اب مناتے ہیں منتے نہیں، ایسوں کا علاج تو یہ ہے کہ ان کو منہ نہ لگانا چاہئے۔ اگر خفا ہو جائیں بلا سے۔ تیسرے شیخ زانی پر لعنت آئی ہے اور بدنگاہی اور دل کے اندر خیال پکانا بھی زنا ہی میں داخل

ہےاور وجہ یہ ہے کہ تقاضا کرنے والی تو کوئی چیز اندر ہے نہیں جو مجبور کرے۔ اس پر بھی کمبخت مبتلا ہوتا ہے تو یہ زیادہ موجب وعید ہے۔ یہ وقت تو وہ تھا کہ ذکر و فکر میں گزارتا۔

بڑھاپا پیغام موت ہے:

اسی واسطے تو فرماتے ہیں اَوَلَمْ نُعَمِّرْکُمْ مَّا یَتَذَکَّرُ فِیْهِ مَنْ تَذَکَّرَ وَ جَآءَ کُمُ النَّذِیْرُ یعنی کیا ہم نے تم کو ایسی عمر نہیں دی کہ اس میں نصیحت وعبرت حاصل کرے۔ وہ شخص جو نصیحت حاصل کرنا چاہے اور تمہارے پاس ڈرانے والا آیا۔ مراد نذیر سے بڑھاپا ہے۔ اسلئے کہ بڑھاپا پیغام موت ہے اس لئے اس کو نذیر فرمایا۔ غرض بوڑھاپا پیغام موت ہے کیونکہ بچوں کو تو یہ بھی امید ہے کہ جوان ہو کر کچھ کرلیں گے اور جوانوں کو یہ خیال ہے کہ بوڑھے ہو کر کچھ کریں گے۔ اگر چہ یہ خیال اور امید بھی سراسر باطل ہے اس لئے کہ یہ کیا معلوم ہے کہ جوانی اور بڑھاپا ضرور آئے گا بلکہ اس زمانہ میں تو اکثر پہلے ہی پہلے ختم ہو جاتے ہیں، لیکن خیر عامی خیال میں تو اس کی گنجائش ہے لیکن ان بوڑھوں کو کیا امید ہے، یہ کس بات پر بھولے ہوئے ہیں۔ حاصل یہ کہ مرض اور بوڑھاپا کہ دونوں مقدمات موت سے ہیں۔ الٰہی ان سے دیکھیے لذت کیسے قطع ہو جاتی ہے۔ سو خود موت تو کیسی کچھ قاطع لذت ہو گی پس عنوان سے ذکر موت کو معالجہ میں اور زیادہ دخل ہوا۔ بالجملہ معالجے کا حاصل موت کو یاد کرنا ہے اور اس وقت ایک لطیفہ اور یاد آیا۔ وہ یہ کہ علاج بھی وہ فرمایا جس میں سراسر اسی کا نفع ہے اور اس حیثیت سے مکلّف کو اپنے نفع کے لئے اس کا اختیار کرنا ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے امر پر کوئی شخص کسی خاص اجرت یا انعام کا مستحق نہیں ہو سکتا، بلکہ مرض کا علاج بتلانے والا اگر کوئی اجرت یا فیس مانگنے لگے تو گنجائش ہے مگر اللہ اکبر کیا رحمت ہے کہ علاج بھی بتلایا اور اس علاج کے کرنے پر خود ایک انعام کا بھی وعدہ فرمایا۔

دن میں چالیس مرتبہ موت کو یاد کرنے کا اجر:

چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ اگر کوئی شخص دن بھر میں چالیس مرتبہ موت کو یاد کرے تو اس کو شہادت کا مرتبہ ملتا ہے اور شہادت کا مرتبہ معلوم ہے کتنا بڑا ہے کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور بے حساب و کتاب جنت میں جاتا ہے۔ سو علاج کے ساتھ انعام بھی کیسی عنایت ہے۔ اس پر ایک مثال یاد آ گئی، مجھ کو ایک مرتبہ بچپن میں والد صاحب نے مسہل دیا، میں وہ مسہل پیتا نہ تھا تو والد صاحب نے فرمایا کہ ہم تم کو ایک روپیہ دیں گے اگر تم یہ پی لو۔ دیکھئے وہ ہمارے ہی نفع کے لئے ہی تھی اگر ہم پئیں گے ہمارا ہی نفع ہو گا نہ پئیں گے تو اس کا ضرر ہم کو ہو گا لیکن دوا پینے پر بھی

انعام دیا جاتا ہے۔ یہ غایت شفقت ہے۔ شفاخانہ میں تو ذرا تجربے کر کے دیکھو اس سے حق تعالیٰ کی رحمت اپنے بندوں پر رافت وشفقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے نفع کے لئے ایک علاج تجویز فرمایا اور پھر اس پر انعام کا وعدہ بھی یعنی شہادت جو کہ اعلیٰ مراتب میں سے ہے، اس کے عطاء کا وعدہ یہ تو ذکر موت کی فضیلت ہوئی جس کو میں نے انعام سے تعبیر کیا۔ باقی رہے اس کے آثار جن کے ترتب کے اعتبار سے اس کا یاد کرنا علاج قرار دیا گیا ہے۔ سو وہ یہ ہیں کہ موت کو جب کثرت سے یاد کرے تو دنیا سے دل اس کا سرد ہو جائے گا اور دنیا کے بکھیڑوں میں پڑنا پسند نہ کرے گا اور اس کی مؤید ایک نظیر ہے وہ یہ کہ جس زمانہ میں طاعون پھیلا تھا اس وقت یہ حالت تھی کہ کام تو دنیا کے سب کرتے تھے بازار والے، تجارت والے، زراعت والے سب اپنا اپنا کام کرتے تھے مگر سب میں ایک سونا پن تھا کہ کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا اذا اصبحت فلا تحدث نفسک بالمساء واذا امسیت فلا تحدث فی نفسک بالصبح (اتحاف السادۃ المتقین ۱۰:۲۳۶) (یعنی جب صبح کا وقت آوے تو شام کا انتظار مت کرو اور جب شام کا وقت آوے تو صبح کا انتظار مت کرو)، کا مرتبہ ہر شخص کو بلا مجاہدہ حاصل تھا۔

طاعون اللہ کی رحمت ہے:

یہ اثر کس چیز کا تھا صرف موت کے یاد رہنے کا اور اس حیثیت سے طاعون کا ایک رحمت ہونا ثابت ہوتا ہے مگر بعض لوگ جہل سے طاعون کو ملعون اور بعض غایت جہل سے ملاعون بالالف کہتے ہیں لیکن اوپر کی تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ طاعون خدا کی ایک رحمت ہے۔ دعا تو یہی کرو کہ طاعون نہ ہو کیونکہ ایک مصیبت ہے لیکن اگر ہو جائے تو اسکو برا بھی نہ کہو کہ ایک رحمت ہے اور اس میں کچھ منافات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر شئے کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت۔ ظاہر صورت تو طاعون کی مصیبت ہے اس اعتبار سے تو دعا کا حکم ہے اور حقیقت اس کی رحمت ہے۔ اس کے اعتبار سے اس سے نہ بھاگنے کا حکم ہے۔ اب لوگ اس سے بھاگتے ہیں اور پریشان ہوتے ہیں اور برا کہتے ہیں۔ پریشانی کی کیا بات ہے مقدر میں جو کچھ ہوگا واقع ہوگا۔ ہم لوگوں کا تقدیر پر پورا اطمینان نہیں ورنہ پریشانی بالکل بھی نہ رہے۔ حضرت علیؓ جنگ صفین میں گھوڑے پر سوار تھے اور اسی حالت میں آپ سو رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ ایسی حالت میں آپ اطمینان سے سو رہے ہیں۔ فرمایا کہ دو قسم کے دن ہیں ایک وہ جن میں موت لکھی ہوئی ہے ان میں ٹل نہیں سکتی پھر پریشانی کی کیا بات ہے۔ اللہ اکبر کس قدر توکل ہے۔ دوسرا قصہ ان کے محقق ہونے کا بھی بیان کر

دوں تاکہ کسی کو اس مسئلہ میں غلو اور غلط فہمی نہ ہو جائے۔

وہ یہ ہے کہ ایک شخص نے حضرت علی سے دریافت کیا کہ آپ تقدیر پر ایمان لاتے ہیں۔ فرمایا کہ ہاں اس نے کہا کہ اگر تقدیر پر ایمان ہے تو اس دیوار سے کود پڑو اگر مقدر ہو گا تو زندہ رہو گے ورنہ نہیں۔ فرمایا کہ مجھ کو اپنے مولا کے امتحان لینے کا کب حق حاصل ہے، جو کچھ مقدر میں ہے، ہو گا تو وہی، لیکن حق تعالیٰ سے عافیت طلب کرنا چاہئے اور احتیاط رکھنا چاہئے چنانچہ حدیث میں ہے سلوا اللہ العافیة (الصحیح البخاری ۴:۶۲) اللہ تعالیٰ سے عافیت کی درخواست کرو۔ پس نہ طاعون سے اس قدر گھبرانا چاہئے جیسے کہ لوگ بھاگتے پھرتے ہیں کہ ایمان بالقدر کے منافی ہے اور نہ مقام طاعون میں بے ضرورت گھسنا چاہئے بلکہ مشروع احتیاط و دعائے عافیت کرنا چاہئے۔ الحاصل جس طرح طاعون کے زمانے میں تمام لذات سے دل برداشت ہو جاتا ہے اسی طرح ہر زمانہ میں موت کے ذکر سے تمام لذات سے دل سرد ہو جائے گا اور گناہ چھوٹ جائیں گے اور شہادت کا مرتبہ ملے گا وہ مزید براں اور راز شہادت کے ملنے میں یہ ہے کہ شہید پر تو ایک ہی مرتبہ تلوار چلی ہے اور اس ذاکر موت کو چونکہ ہر وقت نفس سے مقابلہ رہتا ہے اس لئے اس پر ہر دم تلواریں چلتی ہیں، ایک جزو تو علاج کا یہ ہوا۔

دوسرا جزو یہ ہے کہ مابعد الموت یعنی جزا و سزا کو یاد کرنا جس کا اصل مقام دار آخرت ہے اور اصل مقام اس لئے کہا کہ دنیا میں بھی کسی قدر جزاء و سزا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رسالہ جزاء الاعمال میں اس کو عقلاً و نقلاً ثابت کر دیا ہے ان العبد لیحرم الرزق بخطیئة یعملها. (مسند احمد ۵:۲۸۰) یعنی بے شک بندہ رزق سے محروم ہو جاتا ہے بہ سبب گناہ کے جس کو وہ کرتا ہے۔

گناہ کا اثر:

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ بعض دن گھوڑا شرارت کرتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ آج مجھ سے ضرور کوئی گناہ ہوا ہے۔ چنانچہ سوچنے سے گناہ یاد آ جاتا ہے اور بعض دن گناہ کی وجہ سے بیوی بچے مجھ سے لڑتے ہیں، یہ تو نافرمانی کی سزائیں ہیں، اسی طرح فرمانبرداری پر جزائیں ملتی ہیں۔ چنانچہ اس کے بعض آثار کی نسبت فرماتے ہیں۔

تو ہم گردان از حکم داور پیچ   کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

تم اللہ تعالیٰ کے حکم سے روگردانی مت کرو تمہارے حکم سے بھی کوئی روگردانی نہ کرے گا۔

حق تعالیٰ شانہ کی اطاعت کا اثر:

چنانچہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کی ایک حکایت حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ سے سنی کہ

سہارنپور میں ایک مکان تھا۔ اس میں جن کا سخت اثر تھا جس سے وہ مکان متروک کر دیا گیا تھا۔ اتفاق سے حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ پران کلیر سے واپس ہوتے ہوئے سہارن پور تشریف لائے تو مالک مکان نے حضرت کو اسی مکان میں ٹھہرایا کہ حضرت کی برکت سے جن دفع ہو جائیں گے۔ رات کو تہجد کے واسطے جب حضرت اٹھے اور معمولات سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ ایک شخص سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ حضرت کو حیرت ہوئی کہ باہر کا آدمی اندر کوئی نہ تھا اور کنڈی لگی ہوئی ہے، پھر یہ کیسے آیا۔ حضرت نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا حضرت میں وہ شخص ہوں جس کی وجہ سے یہ مکان متروک ہو گیا یعنی جن ہوں، مدت دراز سے حضرت کی زیارت کا مشتاق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آج میری تمنا پوری کی۔ حضرت نے فرمایا کہ ہمارے ساتھ محبت کا دعویٰ کرتے ہو اور پھر مخلوق کو ستاتے ہو، توبہ کرو۔ حضرت نے اس کو توبہ کرائی، پھر فرمایا کہ دیکھو سامنے حافظ صاحب تشریف رکھتے ہیں ان سے بھی ملے ہو۔ اس نے کہا نہ۔ حضرت! ان سے ملنے کی ہمت نہیں ہوتی وہ بڑے صاحب جلال ہیں ان سے ڈر لگتا ہے۔ صاحبو! اللہ کی فرمانبرداری وہ شئے ہے کہ جن وانس سب مطیع ہو جاتے ہیں۔

حکایت حافظ غلام مرتضیٰ صاحب مجذوب:

حافظ غلام مرتضیٰ صاحب رحمہ اللہ ہمارے یہاں ایک مجذوب تھے مگر ایسے پاک باز مجذوب تھے کہ کبھی ننگے نہ ہوتے تھے اور سلیقہ دار اس قدر تھے کہ ایک مرتبہ جلال آباد تشریف لے گئے۔ لوگوں نے کہا حضرت آپ نے بڑی تکلیف فرمائی۔ فرمایا یوں نہ کہو مجھ کو تکلیف کرنے کی کیا غرض تھی بلکہ یہ کہو کہ حضرت آپ نے کرم فرمایا۔ ان کی حکایت سنی ہے کہ حافظ صاحب ایک مرتبہ جنگل میں کھڑے تھے اور بھیڑیئے دونوں طرف سے ان سے کھلاڑیاں کر رہے تھے۔ میرے نانا صاحب بھی وہاں تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ حضرت یہ بھیڑیئے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کون بزرگ ہیں کون نہیں۔ فرمایا یہ آدمیوں کو نہیں کھایا کرتے ان کی غذا جانور ہیں، ہم کو کچھ نہ کہیں گے۔

بعض اہل کشف بزرگوں کے واقعات:

اس پر مجھ کو شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کی حکایت یاد آ گئی کہ شاہ صاحب جامع مسجد میں آتے تھے تو عمامہ آنکھوں پر جما لیا کرتے تھے اور ادھر ادھر نظر نہ فرماتے تھے۔ ایک شخص نے اس کا سبب دریافت کیا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنا عمامہ اس کے سر پر رکھ دیا۔ دیکھا کہ جامع مسجد میں بجز دو چار آدمیوں کے سب گدھے، کتے، بندر، بھیڑیئے پھر رہے ہیں۔ فرمایا کہ اسی وجہ سے میں اس

صورت سے آتا ہوں۔ مجھ کو سب کتے بندر وغیرہ نظر آتے ہیں اور طبیعت پریشان ہوتی ہے اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ جس شخص کے اندر جو خصلت غالب ہوتی ہے اہل کشف واہل بصیرت کو وہ شخص اس جانور کی شکل میں نظر آتا ہے جس کے اندر وہ خصلت ہو، مثلاً اگر کسی میں ستانے کی صفت ہے وہ کتے کی شکل میں نظر آئے گا، اگر تملق مذموم کی خصلت ہے تو بلی کی شکل میں، حیلہ گری ہو تو لومڑی کی شکل میں متمثل ہوگا اور قیامت میں بھی انہی شکلوں میں اٹھیں گے۔

دیوبندیوں میں ایک بزرگ تھے مولانا فریدالدین صاحب رحمہ اللہ اور ان کے زمانہ میں ایک مجذوبہ تھی، وہ ننگی پھرا کرتی تھی۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ تو پردہ کیوں نہیں کرتی؟ اس نے کہا کہ بیلوں، گدھوں سے پردہ کا حکم نہیں ہے۔ ایک روز وہ حسب عادت ننگی پھر رہی تھی۔ اسی حالت میں اس نے کہا کپڑا لاؤ مرد آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں مولانا فریدالدین تشریف لائے۔ پس حقیقت میں آدمی تو فرمانبردار ہی ہے باقی تو سب جانور ہیں۔

کشف کوئی بڑا کمال نہیں:

ان حکایات سے کوئی کشف کو بڑا کمال نہ سمجھا جائے کیونکہ جانور بھی صاحب کشف ہوتے ہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ عذاب قبر کے بارے میں حدیث میں آیا ہے **یسمعه کل دابة غیر الثقلین** (مسند احمد ۶:۶۲:۳ بلفظ آخر) (یعنی اس کو سوائے جن وانسان کے ہر حیوان زمین پر چلنے والا سنتا ہے۔) پس جو لوگ طالب کشف ہیں وہ نادان ہیں یہ کوئی کمال مقصود نہیں کمال تو رضا اور قرب ہے۔ یہ حکایتیں صرف اس کی تائید میں لایا ہوں کہ اطاعت کرنے والوں کو دنیا میں بھی یہ نعمتیں مل جاتی ہیں کہ مخلوق ان کی عظمت اور اطاعت کرنے لگتی ہے۔ الحاصل بندہ مطیع کی سب شے مطیع ہو جاتی ہے حتی کہ کفار کے دل میں بھی اس شخص کی محبت ہوتی ہے۔

دنیا میں اطاعت کے ثمرات:

یہ جزائیں ہیں فرمانبرداری کی جو دنیا میں ملتی ہیں لیکن اصل مقام اس کا مابعد الموت ہے اسی واسطے وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب کاموں کی پوری خبر ہے، سے ما بعد الموت کو یاد دلاتے ہیں اور مابعد الموت قبر سے شروع ہو جاتا ہے اس لئے قبر سے جنت دوزخ میں جانے تک جو حالات پیش آنے والے ہیں سب کو فرداً فرداً سوچے کہ مجھ کو مرنا ہے اور قبر میں جانا ہے وہاں منکر نکیر آئیں گے وہ سوال جواب کریں گے۔ اس کے بعد حشر ہوگا وہاں جو شدت ہو

گی اس کو یاد کرے کہ زمین گرم ہوگی اس پر پاؤں نہ رکھے جائیں گے، کہیں سایہ نہ ہوگا۔

سات آدمی سایہ عرش الٰہی میں:

سوائے عرش کے اور وہ سایہ سات آدمیوں کو ملے گا۔ ایک ملک عادل، دوسرے شاب عابد، تیسرے جس کا دل مسجد میں زیادہ لگتا ہو، چوتھے جو خلوت میں خدا کو یاد کر کے رونے لگے، پانچویں جن دو شخصوں میں اللہ کے واسطے محبت ہو چھٹے جو خفیہ خیرات کر دے، ساتویں جس کو کوئی عورت حسین بلائے اور وہ خدا کے خوف سے رک جائے۔ پھر سوچے کہ حساب کا وقت آئے گا ہر شخص کو الگ الگ بلایا جائے گا وہاں کوئی وکیل، بیرسٹر نہ ہوگا۔ جب یہاں کی عدالت کی جرح کا تحمل نہیں تو وہاں کیسے ہوگا۔ پھر صراط کو یاد کر کے اس پر چلنا ہوگا وہ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہوگی اس کے بعد جہنم اور اس کے قسم قسم کے عذاب کو یاد کرے۔ غرض ایک وقت مقرر کر کے اس طرح ہمیشہ بلاناغہ کم از کم ایک گھنٹہ یہ مراقبہ کر لیا کرے۔ اول اول تکلف سے یہ یاد ہوگی اور خاص وقت میں یاد ہوگی پھر رفتہ رفتہ اکثر وقت میں اور ہر وقت یہ حالت پیش نظر رہنے لگے گی اور معصیت چھوٹ جائے گی۔ چنانچہ جن لوگوں پر یہ حالت غالب ہو جاتی ہے ان سے کبھی نافرمانی نہیں ہوتی۔

ایک بادشاہ اور فقیر کی حکایت:

یہاں مجھ کو ایک حکایت یاد آ گئی۔ ایک بادشاہ ایک فقیر کے معتقد تھے اور ان کی خدمت میں جایا کرتے تھے اور ہمیشہ دیکھتے تھے کہ وہ فقیر ایک گولی روز کھاتے ہیں۔ بادشاہ نے ایک دن پوچھا کہ حضرت یہ گولی کیسی ہے؟ فقیر نے ایک گولی بادشاہ کو بھی دے دی۔ بادشاہ نے وہ گولی کھالی۔ اس کے سبب شہوت اس قدر ہوئی محل میں جس قدر بیبیاں، لونڈیاں تھیں سب سے قربت کی، لیکن ان سے بھی تسلی نہ ہوئی۔ بادشاہ کے دل میں وسوسہ گزرا کہ میں نے یہ گولی آج ہی کھائی ہے میری یہ حالت ہوئی اور یہ فقیر روزانہ کھاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس عورتیں آتی ہیں اور اس وسوسہ نے اس کو زیادہ پریشان کیا۔ ان بزرگ کو بذریعہ کشف اس خطرہ کی اطلاع ہوئی۔ جب دوسرے روز بادشاہ آئے تو چاہا ایک تدبیر لطیف سے اس کا وسوسہ زائل کریں۔ ان حضرات کی عادت ہوتی ہے کہ زبان سے کچھ نہیں کہتے بلکہ ترکیب سے مرض زائل کرتے ہیں۔

حضرت فریدالدین عطار کا اپنے مرید کے عشق مجازی کا علاج:

اس پر ایک حکایت یاد آ گئی۔ حضرت فرید عطار کے ایک مرید تھے۔ حضرت کے گھر ایک

باندی تھی۔ یہ مرید صاحب اس پر فریفتہ ہوگئے۔ حضرت کو اطلاع ہوئی۔ زبان سے کچھ نہیں فرمایا اس باندی کو دستوں کی دوا کھلا دی اور اس کو دست آنے شروع ہوئے اور حکم دیا کہ ان دستوں کو ایک جگہ جمع رکھو اور اس باندی کی حالت یہ ہوئی کہ اس کے چہرے کا رنگ ارغوانی بالکل پیلا ہوگیا اور چہرے پر بے رونقی ہوگئی۔ اس کے بعد اس باندی کے ہاتھ اس مرید کے پاس کھانا بھیجا اور چھپ کر دیکھا کہ اس کو دیکھتا ہے یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ اس طرف رخ بھی نہیں کرتا۔ حضرت نے فرمایا کہ ہم کو تمہارے تعلق کی اطلاع ہے۔ اب اس کو کیوں نہیں دیکھتے۔ یہ تو وہی ہے، اب ہم بتلاتے ہیں کہ اس میں کون سی شے کم ہوئی ہے اور حکم دیا کہ وہ کونڈا لاؤ جس میں دست جمع ہیں۔ وہ کونڈا آیا۔ حضرت نے فرمایا کہ تمہارا محبوب یہ ہے۔

حضرت معروف کرخی رحمہ اللہ کا غیبت کرنے والے پر عتاب:

حضرت معروف کرخی رحمہ اللہ کی حکایت ہے کہ ایک شخص نے ان سے عرض کیا کہ آپ کا فلاں مرید شراب خانہ میں مست پڑا ہے۔ حضرت کو غیبت کرنا اس کا برا معلوم ہوا اور اس کو سزا دینا چاہا، زبان سے تو کچھ نہ فرمایا، فرمایا کہ جاؤ اس کو کندھے پر اٹھالاؤ۔ یہ بہت چکرائے اور پچھتائے لیکن کرتے کیا پیر کا حکم تھا۔ شراب خانے میں گئے اور اس کو کندھے پر لا رہے تھے اور لوگ کہتے تھے کہ بھائی ان صوفیوں کا بھی کچھ اعتبار نہیں، دیکھو دونوں نے شراب پی ہے۔ ایک تو نشہ ہوگیا اور دوسرے کو اب ہوگا۔ دونوں اپنا عیب چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

موت کو پیش نظر رکھنے کے آثار:

چنانچہ اس فقیر نے بھی اس بادشاہ سے زبان سے تو کچھ کہا نہیں ایک لطیف تدبیر سے اس کا علاج کیا۔ وہ یہ کہ اس فقیر نے یہ بات کہی کہ ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ تمہاری موت قریب ہے۔ چالیس دن کے اندر اندر تم مر جاؤ گے۔ یہ بات سن کر بادشاہ کا رنگ فق ہوگیا اور چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ پیدا ہوگئی اور جھرنا شروع ہوگیا۔ فرمایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، مرنا تو ایک دن ہے ہی، اب تم کو چاہئے کہ اپنا انتظام کرلو۔ اہل حقوق کے حقوق ادا کردو اور خود گوشہ نشین ہو کر اللہ کی یاد کرو اور یہ گولیاں کھالیا کرو۔ ان سے عبادت کی طاقت رہے گی۔ بادشاہ وہاں سے اٹھ کر قلعہ میں آئے، وزراء امراء کو بلا کر جملہ امور سلطنت کا انتظام کیا۔ ولی عہد کو سلطنت سپرد کر کے خود ایک حجرے میں بیٹھ گئے۔ جب چالیس روز گزر گئے اور مرے نہیں تو

خوش ہوئے لیکن حیرت اور تعجب ہوا کہ شاہ صاحب نے تو پیشین گوئی کی تھی یہ بات کیا ہے، خوش خوش شاہ صاحب کے پاس گئے اور عرض کیا کہ حضرت موت تو نہیں آئی ۔فرمایا کہ گولیاں کھائیں، کہا کہ کھائیں ۔ پوچھا کچھ اثر انہوں نے کیا؟ کہا اثر کیا کرتیں، موت تو سامنے کھڑی رہتی تھی ۔ فرمایا کہ تم کو تو موت میں چالیس روز کی مہلت بھی تھی باوجود اس مہلت کے تم کو کچھ اثر نہیں کیا اور فقیر کو تو ایک گھڑی کی بھی توقع نہیں، پھر مجھ پر ان کا کیا اثر ہوتا ۔ تو تمہارا وہ گمان کیسے ہوسکتا ہے بادشاہ اپنے وسوسہ پر شرمندہ اور نادم ہوا اور معذرت کی ۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم استنجے کے بعد تیمّم فرمالیتے تھے ۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پانی تو موجود ہے، فرمایا کہ کیا معلوم کہ پانی آنے تک زندہ بھی رہوں ۔

صاحبو! موت کو پیش نظر رکھنے کے یہ آثار ہیں ۔اب بھی کوئی اگر اس معالجے کو اختیار کرے گا ۔ اب بھی وہی نفع ہوگا ۔ یہ حاصل ہے اس آیت کا ۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی اصلاح کی ضرورت ہے اور اصلاح کے واسطے مراقبہ موت کا نسخہ استعمال کرنا چاہیے ۔ انشاء اللہ تعالیٰ جب یہ مراقبہ صحیح ہو جائے گا تو غلطی سے بھی گناہ نہ ہوگا ۔ اس وقت جو مجھ کو بیان کرنا تھا بیان ہو چکا ۔ امید ہے کہ اس پر عمل کیا جائے گا ۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں

آمین برحمتک یا ارحم الراحمین

رِجَآءُ اللِّقَآء

یہ وعظ ۱۱ شوال ۱۳۳۷ھ میں بمقام کیرانہ برمکان مولوی حبیب احمد صاحب حضرت نے ارشاد فرمایا، جسے شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثانی رحمہ اللہ نے قلمبند فرمایا۔ سامعین میں مردوں کی تعداد تقریباً ۵۰ تھی۔

آخرت کے تصور کے لئے اس دومنزلہ مکان اور تہہ خانہ والے جیل خانہ کا تصور کرلیا کرو، انشاء اللہ اس سے اعمال صالحہ کی فکر ہوگی اور گناہوں سے بچنے کی ہمت ہوگی۔ پھر جب فکر پیدا ہو جائے گی تو طلب بھی پیدا ہو جائے گی اور طلب کے بعد محرومی نہیں ہوا کرتی، یہی طریقہ اعمال صالحہ کے آسان کرنے کا اور گناہوں سے بہ سہولت بچنے کا ان آیات میں تعلیم کیا گیا ہے۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ۔

اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

مَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ وَّھُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (العنکبوت:۵)

(جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو سو اللہ تعالیٰ کا وہ معین وقت ضرور ہی آنے والا ہے وہ سب کچھ سنتا، سب کچھ جانتا ہے)

رحمت خداوندی:

امابعد یہ ایک آیت ہے سورۃ عنکبوت کی جس میں حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عمل کے اسان ہونے کا ایک طریقہ بتلایا ہے اور ایک خاص طریق کے اختیار کرنے کا امر کیا ہے جس سے عمل آسان ہو جاتا ہے اور یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ احکام بیان فرما کر ان کے سہل اور آسان ہونے کی تدبیر بھی بتلا دیتے ہیں، ورنہ ان کو ان کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ہر طرح مالک و مختار ہیں ہم کو جو چاہیں حکم فرمائیں، پھر وہ خواہ آسان ہو یا دشوار ہو اس کا بجالانا ہمارا فرض منصبی ہے، مگر جس طرح حق تعالیٰ کو ہم سے مالک و خالق ہونے کا تعلق ہے اسی طرح رحمت و کرم کا تعلق بھی ہے، ان کو اپنے بندوں سے محض ضابطہ ہی کا تعلق نہیں جیسا کہ حکام کو ہوا کرتا ہے۔ ان کو اپنے بندوں پر ماں باپ سے بھی زیادہ شفقت ہے۔ اس وجہ سے وہ اول تو احکام ہی آسان بیان فرماتے ہیں، پھر ان آسان احکام کے ساتھ تدبیریں بھی ایسی بتلا دیں ہیں جن کو اختیار کرنے سے وہ بہت ہی زیادہ سہل ہو جاتے ہیں۔

دین کے آسان ہونے کا مفہوم:

یہی معنی ہیں الدین یسر (الدر المنثور ۱:۱۹۲) (دین آسان ہے) کے لوگ دین کے آسان ہونے کے یہ معنی سمجھتے ہیں، کہ سب کام خود بخود ہونے لگیں، ہمیں کچھ کرنا نہ پڑے نہ ارادہ، نہ ہمت اور نہ کوئی تدبیر۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آسان ہونے کا یہی مطلب ہے تو پھر دنیا میں آسان کام ایک بھی نہ رہے گا، سب سے زیادہ آسان کام بالاتفاق روٹی کھانا ہے، لیکن وہ بھی پہلے ہی دن آسان نہیں ہوگیا اس کے آسان بنانے کی بھی تدبیر کی جاتی ہیں، پہلے بچہ دودھ پیتا ہے، پھر جب ایک سال کا ہوتا ہے تو اس کو چاول کھچڑی وغیرہ نرم کر کے کھلاتے ہیں، پھر روٹی شوربے میں بھگو کر دیتے ہیں، پھر چھوٹا سا ٹکرا اس کے منہ میں دیتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ وہ خود کھانے لگتا ہے جس سے پہلے پہل اس کو تکلیف پہنچنے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے، اس کے ہضم کے لئے کچھ ادویہ وغیرہ کھلاتے ہیں، اس طرح مہینوں میں جا کر بچہ اس قابل ہوتا ہے کہ بے تکلف روٹی کھا سکے اور ہضم کر سکے جب سب سے زیادہ آسان کام کی یہ حالت ہے کہ وہ تدبیروں اور طریقوں سے آسان معلوم ہونے لگیں اور تدبیر و ہمت سے کچھ بھی کام لینا نہ پڑے ان کے آسان ہونے کا بھی یہی طریقہ ہے کہ پہلے ان کاموں کو ہمت سے شروع کر دیجئے۔ دیکھئے اگر والدین بچہ کو سات برس تک روٹی کھانا نہ کھلائیں تو اس کو روٹی کھانا سات برس تک بھی آسان نہ ہوگا۔

اعمال حسنہ کے آسان ہونے کا طریق:

اسی طرح دین کے کام بھی بدوں کئے آسان نہیں ہو سکتے، اول ان کو شروع کیجئے پھر ان تدبیروں کو اختیار کیجئے جو حق تعالیٰ نے احکام کے آسان کرنے کی بتلائی ہیں، پھر وہ ایسے آسان ہو جائیں گے کہ روٹی کھانا بھی اتنا آسان نہ ہوگا، روٹی کے بغیر آپ گزر کر سکیں گے اور ان اعمال و احکام کے بغیر صبر نہ ہو سکے گا۔

اب سنئے اس آیت میں حق تعالیٰ نے عمل کے آسان ہونے کا طریقہ بتلایا ہے اور وہ طریقہ دو باتوں میں ہے۔ ایک بات ہے اور وہ دونوں ایسے ہیں کہ دوسری آیات سے دونوں کا نافع ہونا اور عمل کے لئے معین ہونا معلوم ہوتا ہے، لہٰذا اس وقت دونوں کا ذکر کیا جائے گا لیکن اس آیت میں دونوں مراد نہیں، بلکہ ایک ہی مراد ہے کیونکہ لفظ یرجوا کے دو معنی ہیں، امید کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے اور خوف کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ دونوں تفسیر پر جدا جدا ترجمہ ہوگا، ایک تفسیر پر یہ ترجمہ ہوگا کہ جس کو خدا سے ملنے کی امید ہو الخ ایک تفسیر پر یہ ترجمہ ہوگا کہ جس کو خدا سے ملنے کا خوف ہو کہ

خدا تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی، منہ دکھانا ہوگا، الخ دونوں صورتوں میں فرماتے ہیں کہ وہ میعاد ضرور آنے والی ہے۔ظاہر میں فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ (سو اللہ تعالیٰ کا وہ وقت معین ضروری آنے والا ہے)

جزا مقدار:

جزا من کی معلوم ہوتی ہے مگر واقع میں جزا نہیں، حقیقت میں جزا مقدر ہے اور یہ جملہ اس کے قائم مقام ہے۔جزا مقدر یہ ہے **فلیتھیئا له ویستعدله** (پس چاہئے کہ اس کے لئے تیاری کرے اور مستعد ہو جائے) حاصل یہ ہوا کہ جو شخص خدا سے ملنے کی امید رکھتا ہو تو اس کے لئے تیاری لازم ہے اور وہ تیاری یہ ہے کہ اس کے لئے عمل کرے جیسا کہ دوسری نصوص سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا **وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰی لَهَا سَعْيَهَا** (اور جو شخص آخرت کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی سعی کرنا چاہئے ویسی ہی سعی بھی کرے گا) اب حاصل یہ ہوا کہ جس کو خدا سے ملنے کی امید یا خوف ہو وہ عمل کے لئے مستعد ہو جائے، یہ تو ترجمہ ہوا اب سمجھئے کہ وہ طریقہ عمل کے آسان کرنے کا کیا بتلایا گیا ہے وہ طریقہ صرف لفظ یرجوا میں بیان کیا گیا ہے۔

عمل کے لئے مستعد ہونے کا طریقہ:

یعنی عمل کے لئے مستعد اور تیار ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دل میں امید و اشتیاق اور خوف پیدا کرے، پس وہ طریقہ امید اور خوف ہے یا یوں کہئے کہ ترغیب و ترہیب ہے یا وعدہ اور وعید ہے، جب دل میں رغبت اور شوق ہوگا تو اس کے لئے مستعد ہونا چاہئے گا بلکہ دین ہی کی کیا تخصیص ہے یوں کہیے کہ ہر کام اور ہر عمل میں یہی دو طریق کار آمد ہو سکتے ہیں۔خوف یا رغبت ان دونوں کے بغیر کوئی بھی کام نہیں ہو سکتا۔ نہ دنیا کا نہ دین کا، اسی لئے مشہور ہے دنیا با امید قائم میرے نزدیک یوں کہنا چاہئے تھا دنیا با میدو بیم قائم مگر شاید جس طرح عربی میں لفظ رجا خوف اور امید دونوں کے واسطے مستعمل ہو فارسی میں بھی امید کا لفظ دونوں کے واسطے مستعمل ہو اس لئے اس مشہور مثل میں صرف امید کے لفظ پر اکتفا کیا یا یہ وجہ ہو کہ زیادہ کام امید سے ہوتے ہیں اس لئے اسی کا ذکر کیا، غرض نیک کام کرنے میں بھی یہ دونوں نافع ہیں اور عمل بد کے چھوڑنے میں بھی۔

رغبت کو اعمال صالحہ میں بڑا دخل ہے:

اس لئے کہ جب رغبت اور خوف دونوں کسی کے دل میں ہوں گے تو رغبت کی وجہ سے اعمال صالحہ کو بجا لائے گا کیونکہ رغبت کی وجہ سے ان کے ثواب پر نظر ہوگی، خدا تعالیٰ کی رضا قرب کی

طلب ہوگی اور چونکہ اس کے دل میں خوف بھی ہے اس لئے اعمال صالحہ کو چھوڑنے پر وعید ہے اس پر نظر کر کے ان کے چھوڑنے سے رکے گا۔ غرض کہ رغبت کو اعمال صالحہ کے فعل میں دخل ہے۔

خوف کو ترک معاصی میں بڑا دخل ہے:

خوف کو ان کے ترک سے بچنے میں دخل ہے۔ اسی طرح معصیت میں مطلوب یہ ہے کہ اس کو ترک کیا جائے اور معاصی کے ترک پر ثواب ورضاء قرب کا وعدہ تو رغبت کی وجہ سے معاصی کو ترک کرے گا اور خوف کی وجہ سے ان کے فعل سے رکے گا، کیونکہ گناہوں کے ارتکاب پر عذاب کی وعید ہے، اس طرح سے یہ رغبت اور خوف دونوں مل کر انسان کو طاعات میں مشغول اور معاصی سے متنفر بنادیں گے اور یہ دونوں مستقل طریقے ہیں، ان میں سے اگر ایک بھی حاصل ہو جائے وہ بھی اتباع احکام کے لےء کافی ہو جائے گا کیونکہ اگر صرف خوف ہی ہو اور رغبت نہ ہو تو جب بھی گناہوں سے بچے گا اور طاعات کو ترک نہ کرے گا کیونکہ ان دونوں صورتوں میں گناہ کا اندیشہ ہے اور اگر صرف رغبت ہی ہو جب بھی طاعات کو بجالائے گا اور گناہوں کو چھوڑ دے گا کیونکہ ان دونوں میں ثواب کا وعدہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ طاعات کے بجالانے اور معاصی کے چھوڑنے میں ان دونوں میں سے ہر واحد کو دخل ہے۔ اب ہم لوگوں میں جو اعمال کی کمی ہے اس کا منشا یہ ہے کہ ہم کو رغبت اور خوف جیسا ہونا چاہئے ویسا نہیں اگر یہ رغبت اور خوف کامل ہو تو ہر حکم کے بجا لانے اور ہر گناہ کے چھوڑنے کا اہتمام پیدا ہو جائے، مگر ہماری حالت یہ ہے کہ بعض طاعات کو ضروری سمجھتے ہیں اور ان کا اہتمام بھی کرتے ہیں اور بعض طاعات کا بالکل اہتمام نہیں ہوتا، اسی طرح گناہوں میں سے بعض موٹے موٹے گناہوں سے بچنے کا تو اہتمام کرتے ہیں ان کے سوا اور گناہوں کی پرواہ نہیں کی جاتی حالانکہ اعتقاد میں تمام گناہوں کو گناہ اور تمام فرائض وواجبات کو فرض وواجب مانتے ہیں مگر عملاً سب کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔

جملہ معاصی کو نہ چھوڑنے کا سبب خواہشات نفسانی ہے:

اس سے صاف یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جن طاعات کو ہم بجالاتے ہیں اور جن گناہوں سے بچتے ہیں ان میں اپنی خواہش کا اتباع کرتے ہیں، جن طاعات میں دنیا کا کچھ نقصان نہ ہو، جسم کو کلفت نہ ہو، ان کو کرلیا باقی کو حذف کر دیا اور جن گناہوں میں بدنامی اور رسوائی کا اندیشہ ہو ان کو چھوڑ دیا۔ باقی گناہوں کی ذرا پرواہ نہیں کی جاتی، اگر ہم کو رضا وقرب الٰہی کی رغبت یا عذاب آخرت کا خوف ہوتا تو تمام طاعات اور تمام معاصی کا پورا اہتمام ہوتا یہ تو ہر اک کو معلوم ہے کہ نماز،

روزہ، زکوٰۃ و حج وغیرہ کا کرنا واجب ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ دوسروں کا حق ادا کرنا بہنوں کا حصہ دینا بھی واجب ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ جس طرح زنا اور چوری گناہ ہے غیبت اور جھوٹ اور بہتان بھی گناہ ہے اسی طرح کسی کا مال دبانا خواہ زمین جائیداد ہو یا اناج اور نقد یہ بھی سخت گناہ ہے مگر دیکھ لیجئے کہ ان میں سے ہم کتنی باتوں کا اہتمام کرتے ہیں، بڑی بہادری کریں گے تو نماز پڑھ لیں گے کیونکہ ان میں کچھ خرچ نہیں ہوتا مگر حقوق کبھی ادا نہ کریں گے، بہنوں کا حصہ کبھی نہ دیں گے، کیونکہ اس سے گھر سے روپیہ نکلتا ہے، گناہوں میں چوری اور زنا سے بچیں گے کیونکہ اس میں رسوائی اور بدنامی بھی ہے اور سزا کا بھی اندیشہ ہے مگر غیبت جھوٹ بہتان سے نہیں بچتے پرایا مال دبانے اور حرام کھانے سے نہیں رکتے، نامحرم عورتوں کو بری نگاہ سے دیکھتے ہیں، امانت میں خیانت کرتے ہیں، کیا یہ زنا اور چوری نہیں، مگر ان کو لوگ گویا گناہ ہی نہیں سمجھتے اور اگر دل میں گناہ سمجھتے بھی ہیں تو پرواہ ذرا نہیں کرتے، یہ سب مسلمان جانتے ہیں کہ تمام طاعات اور عبادات کا بجالانا ضروری ہے اور تمام معاصی کا ترک واجب ہے۔

روزہ نہ رکھنے کا اصل سبب کم ہمتی ہے:

مگر ان کا اہتمام بالکل نہیں کرتے جب نماز ہی کی ہمت نہیں تو روزہ کی تو کہاں ہمت ہے۔ بعض لوگ گرمی کے روزہ میں پیاس کی شدت کا عذر کیا کرتے ہیں مگر اس رمضان میں لوگوں نے دکھلا دیا کہ یہ عذر محض ایک حیلہ اور بہانہ ہے ورنہ اصلی سبب کم ہمتی ہے کیونکہ میں نے خود دیکھا ہے کہ بعض لوگ صبح صبح اٹھ کر کھیت پر بیٹھے ہوئے تربوز کھاتے تھے، بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ صبح کے وقت کون سی گرمی تھی، یہ وقت کون سی پیاس کی شدت کا تھا، گرمی اور پیاس تو عصر ہی کے وقت زیادہ معلوم ہوتی ہے، تم نے روزہ رکھ کر تو دیکھا ہوتا جب عصر کے وقت پیاس کی شدت معلوم ہوتی اور صبط نہ ہوسکتا جب ہی روزہ توڑا ہوتا، مگر اس حرامزدگی کا کیا علاج کہ صبح ہی سے روزہ نہ رکھنے کا ارادہ کرلیا اور افسوس اسی بات کا ہے کہ پہلے زمانہ میں بھی لوگ گناہ کیا کرتے تھے مگر ان میں شرم اور غیرت کا مادہ بھی تھا، سب کے سامنے رمضان میں کچھ نہیں کھاتے تھے، چوری چھپے کھالیا کرتے تھے مگر آج کل شرم اور غیرت بھی جاتی رہی، سب کے سامنے کھاتے پیتے ہیں اور ذرا لحاظ ان کو نہیں ہوتا کہ آخر رمضان کا مہینہ ہے اس کا بھی کچھ احترام کرنا چاہئے۔ میں صبح کو نماز پڑھ کر جنگل کی سیر کو جایا کرتا تھا، اس وقت کھیتوں پر بہت سے لوگ تربوز کھاتے ہوئے ملتے تھے، میں خود ہی غیرت مذہبی یا یوں کہئے کہ طبعی

حیاء کی وجہ سے ان کی طرف کو نہ نکلتا تھا، چکر کاٹ کر دوسری طرف کو نکل جاتا تھا کہ ان لوگوں کو تو غیرت نہ آئے گی مگر مجھے تو غیرت کرنی چاہئے کہ رمضان میں کسی کو کھاتا ہوا نہ دیکھوں۔

مسلمانوں کو عزت کس صورت میں حاصل ہوگی:

یہ آج کل کے مسلمان ہیں، پھر لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمان ذلیل ہو گئے، ترقی نہیں کرتے۔ ذلیل کیوں کر نہ ہوں کام ہی ذلت کے کرتے ہیں۔ عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے جب تک خدا کو راضی نہ کرو گے اس وقت تک تم کو کبھی عزت نہیں مل سکتی۔ مسلمانوں کو جب کبھی عزت ملے گی احکام الٰہی کی پابندی ہی سے ملے گی، اس کے بغیر مسلمان مسلمان رہ کر ترقی نہیں کر سکتے، ہاں کافر ہو جائیں تو اس کے بغیر بھی عزت ملنا ممکن ہے مگر اس کا انجام جو کچھ ہوگا سب کو معلوم ہے۔ ابدالاباد کے لئے آخرت میں جہنم تیار ہے، جب روزہ کے ساتھ مسلمانوں کا یہ برتاؤ ہے جو سال بھر میں ایک مہینہ میں فرض ہوتا ہے تو نماز کا اہتمام تو وہ کیا خاک کریں گے۔

کھانے پینے کی حلاوت روزہ دار کو نصیب ہوتی ہے:

اس سال بہت ہی کم لوگوں نے روزے رکھے ہوں گے اور اگر ذرا ان کے دل سے پوچھئے تو معلوم ہوگا کہ روزہ میں ان کو کھانے پینے کی حلاوت بھی نصیب نہیں ہوئی ہوگی، روزہ توڑنے والا جب کھانا کھاتا ہے تو اس کو خود یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پائخانہ کھا رہا ہو، ذرا بھی حلاوت نصیب نہیں ہوتی، روزہ میں ثواب تو ہے ہی مگر سچ یہ ہے کہ کھانے پینے کی حلاوت بھی روزہ دار ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

روزہ دار کے دل کو افطار کے وقت جو مسرت اور حلاوت نصیب ہوتی ہے روزہ خور کو قیامت تک وہ بات نہیں مل سکتی، پھر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ روزہ میں باوجودیکہ دنیا اور آخرت دونوں کی حلاوت ہے پھر بھی لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے، یوں کہیئے کہ ثواب کی رغبت اور عذاب کا خوف تو دلوں سے نکل ہی گیا تھا ساتھ میں حس بھی خراب ہوگئی، گناہ بے لذت کے کرنے سے زیادہ اور کیا بے حسی ہوگی۔

شریعت میں نماز کا اہتمام روزہ سے زیادہ ہے:

روزہ سے زیادہ شریعت میں نماز کا اہتمام ہے۔ یہ روزانہ پانچ مرتبہ فرض ہے اور روزہ تو مرض اور سفر وغیرہ کی وجہ سے قضا کرنا بھی جائز ہے لیکن نماز جب تک ہوش میں رہیں اس وقت تک معاف نہیں، اگر کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکو تو بیٹھ کر پڑھنا فرض ہے، بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر اشارہ سے پڑھنا ضروری ہے مگر مسلمانوں کو اس کا بہت ہی کم اہتمام ہے۔ رمضان میں بعض لوگ

روزہ تو رکھ بھی لیتے ہیں مگر نماز کا پھر بھی اہتمام نہیں کرتے۔ چنانچہ بعض لوگ صرف عید ہی کے نمازی ہوتے ہیں، عید کے دن لوگوں کو کپڑے دکھانے کے واسطے چلے جاتے ہیں حالانکہ اگر غور کیا جائے تو نماز میں ثواب کے علاوہ دنیوی فائدہ بھی ہے۔ نمازی کی طبیعت صاف رہتی ہے اور بے نمازی کی طبیعت میلی میلی رہتی ہے۔ نمازی کی صورت پر نشاط اور رونق ہوتی ہے، بے نمازی کے چہرہ پر وحشت برستی ہے اس لئے اگر ثواب کی رغبت زیادہ نہ ہو تو نشاط اور فرحت ہی کے لئے نماز پڑھ لینا چاہئے۔ اس پر شاید کوئی بے نمازی یہ شبہ کرے کہ ہمکو تو اپنے اندر وحشت اور ظلمت نہیں معلوم ہوتی سو اول تو یہ بات غلط ہے جس شخص میں ذرا بھی ایمان ہوگا وہ ضرور نماز چھوڑنے کی ظلمت اور وحشت اپنے اندر پائے گا اور اگر کسی کا دل بے حس ہو گیا ہو اس سے یہ کہا جائے گا کہ تم نماز شروع کر کے پھر اپنے دل کی حالت کا اندازہ کرو یقیناً اس حالت میں اور پہلی حالت میں زمین آسمان کا فرق معلوم ہو گا۔ جو شخص بچپن سے اندھیرے تہ خانہ میں پرورش پاتا رہا ہو اس کو تاریکی اور روشنی میں کیا فرق معلوم ہو سکتا ہے، ہاں ایک مرتبہ اس کو تہہ خانے سے باہر نکالو اس وقت اس کو روشنی اور اندھیرے کا فرق محسوس ہوگا، اس کے بعد وہ تہہ خانہ میں زندگی بسر کرنا کبھی قبول نہ کرے گا۔

عورتوں کو نماز کا بہت کم اہتمام ہے:

غرض آج کل نماز کا اہتمام بہت ہی کم کیا جاتا ہے، خصوصاً عورتوں کو روزہ رکھنا تو آسان ہے، چنانچہ عورتیں مردوں سے زیادہ روزے رکھتی ہیں، مگر نماز کے نام سے ان کو جاڑا چڑھتا ہے، دن بھر کھانا پکانے، سینے پرونے میں گزر جاتا ہے مگر اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ ذرا سی دیر کو اٹھ کر چار رکعت پڑھ لیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک کھانا پکانا تو فرض ہے اور نماز فرض نہیں حالانکہ شرعاً عورتوں کے ذمہ کھانا پکانا کوئی ضروری نہیں، اگر وہ چاہیں شوہر کو مجبور کر سکتی ہیں کہ کھانے کا انتظام کسی اور سے کرائے اور نماز پڑھنا ہر عورت اور مرد کے ذمہ فرض ہے مگر کھانا پکانے کا بھی ایک بہانہ ہے، میں پوچھتا ہوں کہ مگر کھانا پکاتے ہوئے انکو پیشاب یا پاخانہ کا تقاضا ہونے لگے تو یہ کیا کریں گی؟ کیا اس وقت بھی چولہے ہانڈی کو نہ چھوڑیں گی، پھر اس کی کیا وجہ کہ نماز کا بھی دل پر تقاضا ہوتا تو بدوں نماز پڑھے دل کو چین نہ آتی۔ پھر چولہے ہانڈی کا عذر وہ عورتیں کر سکتی ہیں جو خود کھانا پکاتی ہیں جو کہ نادار اور غریب ہیں مگر وہ تو اکثر نمازی بھی ہیں اور جن کے گھر میں مامائیں کام کرتی ہیں اور زیادہ تر بے نمازی وہ ہی ہیں پھر ان کا یہ عذر کیونکر قبول ہو سکتا ہے اور جو خود پکاتی ہیں میں نے ان کو بھی جواب دے دیا کہ اگر ان کے دل پر تقاضا ہوتا تو وہ ہرگز یہ بہانہ نہ کر سکتیں،

رات دن کا مشاہدہ ہے کہ عورتیں ہانڈی چولہے کا کام تمام دن نہیں کرتیں بہت تھوڑا سا وقت اس کام میں صرف ہوتا ہے اور اس میں بھی اگر کوئی محلّہ والی ان سے ملنے آ جائے تو سارے کام چھوڑ کر اس سے باتیں بنانے بیٹھ جاتی ہیں۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ تم کو ہانڈی چولہے کے کام میں نماز کے لئے تو فرصت ملتی نہیں باتیں بنانے کے لئے کہاں سے فرصت آ گئی۔

چھوٹے بچوں کے عذر کے سبب مستورات کو نماز قضا نہ کرنا چاہئے

بعض عورتوں کو بچوں کا عذر ہے کہ بچوں کے گوہ موت میں ہر وقت کپڑے ناپاک رہتے ہیں، پانچوں وقت کپڑے کس طرح پاک کریں، میں کہتا ہوں کہ جو عورتیں نماز کی پابند ہیں، آخر وہ کس طرح کرتی ہیں، کیا ان کے بچے نہیں ایسا کرتے، کیا تم ہی کو سارے بچے مل گئے ہیں، کیا ان کے بچے پیشاب پاخانہ نہیں کرتے، ان کے بدن پر ناپاکی نہیں لگتی مگر پھر بھی بعض اللہ کی بندیاں پانچوں وقت پابندی کے ساتھ نماز پڑھتی ہیں، کپڑوں کا ایک جوڑا نماز کے واسطے الگ رکھ دیتی ہیں، نماز کے وقت بدن پاک کر کے وہ جوڑا پہن لیا اور نماز پڑھتے ہی اس کو جدا کر دیا اور ناپاک جوڑا پہن لیا۔

ایک صاحب عزم خاتون کا قابل رشک اہتمام عبادت:

میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ میرے گھر میں اتنا کام کرتی ہیں کہ مجھے ان پر رشک آتا ہے، صبح اٹھتے ہی نماز اور قرآن اور مناجات مقبول کی تلاوت کر کے گھر کا کام کرتی ہیں، بچے چھوٹے چھوٹے کئی ہیں، ان کی خدمت بھی کرتی ہیں، اشراق اور چاشت بھی ادا کرتی ہیں، گھر کا سارا کام خود کرتی ہیں، بچے بھی بہت تنگ کرتے ہیں، انہیں بھی بہلاتی ہیں، اور پھر بارہ ہزار یا اس سے بھی زیادہ ذکر اسم ذات کرتی ہیں، تہجد کی پابند ہیں اور نفلیں بھی بہت پڑھتی ہیں، میں حیرت میں ہوں کہ اس قدر کاروبار کے ساتھ وہ اپنا کام کر لیتی ہیں، بات یہ ہے کہ جب آدمی ارادہ کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کی اعانت کرتے ہیں اور سب کام آسان کر دیتے ہیں جو عورتیں اس قسم کے بہانے بیان کرتی ہیں انہوں نے ارادہ ہی نہیں کیا ورنہ ارادہ کرنے کے بعد وہ خود آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتیں کہ حق تعالیٰ کس طرح ان کی امداد کرتے ہیں، ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ بعض اللہ کی بندیوں نے گھر کے کاروبار کے ساتھ بھی سب کام کر کے دکھلا دیا ہے اب کوئی ارادہ ہی نہ کرے تو اس کا کیا علاج، نماز کی عادت کر کے دیکھو پھر خود بخود وہ تمہارے سر ہو جائے گی، بدوں نماز پڑھے چین ہی نہیں آئے گا، ہم لوگوں کی نماز اگرچہ کچھ نہیں ہوتی مگر بحمد للہ جب ذرا دیر ہو جاتی

ہے دل دکھتا ہے، جی اندر سے شرمندہ ہوتا ہے اور جب تک نماز نہیں پڑھ لیتے دل ہلکا نہیں ہوتا۔

رغبت اور خوف سے دل میں تقاضا پیدا ہوتا ہے:

صاحبو! افسوس ہے کہ تم دنیا کے تو سارے کام کرتے ہو، مشکل سے مشکل کام کے لئے تم کو فرصت اور مہلت مل جاتی ہے، ان میں کسی قسم کا بہانہ نہیں سوجھتا یہ سارے حیلے دین ہی کے کاموں کے لئے کیوں رہ گئے، تم دریا کا سفر کرتے ہو، ریل کا سفر کرتے ہو، گرمی اور سردی میں سفر کرتے ہو، مقدموں کے لئے نہ صبح دیکھو نہ دوپہر، نہ گرمی دیکھو نہ سردی، ان کاموں میں نہ تم کو زکام کا اندیشہ ہے نہ لُو کا، مگر نماز کے واسطے سردی میں وضو کرنے سے آپ کو زکام بھی اور سب کچھ ہونے لگتا ہے حالانکہ دنیا کے کاموں میں اعانت کا وعدہ بھی حق تعالیٰ نے نہیں فرمایا مگر دنیا کے سارے کام تمہارے چلتے رہتے ہیں اور آخرت کے کاموں میں تو اعانت کا بھی وعدہ ہے، جب کام شروع کردو گے اس وقت معلوم ہوگا کہ پھولوں ہلکا ہے۔ غرض نماز میں یہ کوتاہی اسی لئے ہو رہی ہے کہ اس کا تقاضا دل پر نہیں اور تقاضا اس واسطے نہیں کہ رغبت اور خوف پوری طرح نہیں ہے، رغبت اور خوف سے دل میں تقاضا پیدا ہوتا ہے، اور تقاضے سے ہر کام آسان ہو جاتا ہے۔

ادائیگی زکوٰۃ کے لئے دل پر بوجھ ہونے کا سبب:

زکوٰۃ میں ہماری یہ حالت ہے کہ روپیہ نکالتے ہوئے جان نکلتی ہے کہ ہائے ہم تو اڑھائی روپے اس میں اور ڈالتے یہ تو اور اسی میں سے نکلنے لگے، میں کہتا ہوں کہ اگر روپیہ یوں ہی رکھا رہے اور اس میں سے خرچ نہ کیا جائے، فائدہ ہی کیا؟ روپیہ تو خرچ ہی کے واسطے ہے، ضرورت میں صرف کرنے ہی سے روپیہ کی راحت معلوم ہوتی ہے تو لامحالہ دینوی ضرورت میں صرف کرنے ہی سے روپیہ کی راحت معلوم ہوتی ہے، لامحالہ دینوی ضرورت میں تم یقیناً صرف کرو گے، پھر اس وقت یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ ہائے ہم تم اس میں اور ڈالتے یہ تو اور اس میں نکلنے لگے، معلوم ہوا کہ تم دینوی ضرورت کو ضرورت سمجھتے ہو اور ان میں خرچ کرنا تم پر گراں نہیں ہے اور زکوٰۃ کو تم ضروری نہیں سمجھتے، اس لئے دل پر بوجھ ہوتا ہے تو پھر صاحبو! اس کا علاج کرنا چاہئے، آخر اس کی کیا وجہ کہ زکوٰۃ حالانکہ خدا تعالیٰ نے فرض کی اس کو تم ضروری نہیں سمجھتے اور اپنی دینوی ضرورتوں کو جن کو تم نے اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے ضروری سمجھتے ہو اور اگر آپ زکوٰۃ کو بھی ضروری سمجھتے ہیں تو پھر اس کی گرانی کی کیا وجہ دینوی کاموں میں تم صدہا روپے خرچ کر دیتے ہو بلکہ فضولیات میں بہت سا روپیہ اڑا دیتے ہو اور اس وقت تمہارے دل پر ذرا بھی گرانی نہیں ہوتی۔

ادائیگی زکوٰۃ کے لئے دل سے گرانی دور کرنے کا طریقہ:

غرض جو شخص روپیہ کو بالکل ہی خرچ نہیں کرتا اس سے تو یہ کہا جائے گا کہ روپیہ صرف جمع کرنے کے واسطے نہیں ہے، ایسے روپیہ میں اور ٹھیکروں میں کیا فرق ہے اور جو لوگ خرچ کرتے ہیں اور بڑے بڑے خرچ کرتے ہیں ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ سو روپیہ میں اڑھائی روپے کا خرچ ہی کیا ہے جو اس سے تمہارے دل پر گرانی ہے، بس اس کی بھی وہی علت ہے کہ دل میں خوف اور رغبت نہیں ہے ورنہ جس طرح دینوی راحت کے لئے خوشی سے خرچ کرتے ہیں اسی طرح آخرت کی راحت اور عذاب سے بچنے کے لئے زکوۃ بھی نکالتے ہیں، دنیا کے کاموں میں امید اور اندیشہ ہے اس لئے دل پر خرچ کا تقاضا بھی ہوتا ہے اور آخرت کی رغبت اور خوف نہیں اس لئے زکوٰۃ کا دل پر تقاضا نہیں ہوتا، تقاضا ہوتا تو خوشی سے زکوۃ نکالا کرتے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی برکت:

یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہے کہ زکوۃ میں چالیسواں حصہ فرض کیا گیا، اس میں بھی لوگوں کی جان نکلتی ہے۔ پہلی امتوں پر علماء نے لکھا کہ چوتھائی حصہ نکالنا فرض تھا اگر تمہارے واسطے بھی ایسا ہی ہوتا تو کیا کرتے؟ حق تعالیٰ کا دیا ہوا مال ہے۔ اس میں وہ جو چاہیں حکم فرما دیں ان کو اختیار ہے جب تم ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے اس وقت تمہارے ہاتھ میں کیا تھا، کچھ بھی نہ تھا، خالی ہاتھ آئے تھے، بعد میں یہ سب مال و دولت حق تعالیٰ نے تم کو دیا ہے تو اس میں اگر کچھ غریبوں کا حق رکھا گیا تو جان کیوں نکلتی ہے۔ بلکہ اس امت پر بہت ہی رحمت ہے کہ چالیسواں حصہ فرض ہے، حق تعالیٰ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرماتے ہیں **ویضع عنهم اصرهم** کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے اوپر سے وہ بوجھ ہلکا کرتے ہیں جو پہلے ان کے اوپر تھا، جس کو میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ پہلے لوگوں پر زکوۃ میں چوتھائی مال کا نکالنا فرض تھا، اس کے علاوہ اور بہت سی آسانیاں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ہوگئی ہیں، اس نعمت کی ہم کو قدر کرنی چاہیئے، بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا صدمہ نہ ہوگا کہ میری وجہ سے حق تعالیٰ نے امت پر اس قدر آسانی فرمائی اور پھر بھی میری امت نے احکام میں سستی کی، ہم کو چاہیئے کہ پہلی امتوں سے زیادہ کام کریں کیونکہ ان پر احکام سخت تھے اور ہمارے لئے بہت سہولتیں کر دی گئی ہیں۔

زکوٰۃ میں درحقیقت ہمارا ہی نفع ہے:

اور اگر غور کیا جائے تو زکوۃ میں درحقیقت ہمارا ہی نفع ہے، ثواب آخرت کے علاوہ دنیا کے

بھی بہت سے منافع ہیں، ایک منفعت تو بہت بڑی یہ ہے کہ زکوۃ کی وجہ سے مال محفوظ رہتا ہے کیونکہ غریب لوگ جو چوریاں کرتے ہیں ان کی زیادہ تر یہی وجہ ہے کہ وہ افلاس سے پریشان ہوتے ہیں اگر مالدار لوگ زکوۃ نکالتے رہیں اور ہر شہر میں اس کی پابندی ہو جائے تو غرباء کو چوری کا خیال بھی پیدا نہ ہو وہ چوریاں اسی لئے کرتے ہیں کہ تم گھر میں مال جمع کر کے رکھتے ہو اور ان کو نہیں پوچھتے ، اگر تم ان کی خبر گیری بھی کرتے رہو تو تمہارے احسان کا خیال کر کے یا اپنی ضروریات پوری ہوتے دیکھ کر وہ اس قسم کے ارادے کبھی نہ کریں۔

شریعت کی نظر بہت دقیق ہے:

لوگ مال کی حفاظت کے لئے بڑے بڑے قفل لگاتے اور چوکی پہرہ مقرر کرتے ہیں مگر شریعت کی نظر بہت دقیق ہے اس نے اس راز کی کیسی رعایت کی ہے کہ مال کی حفاظت اس طرح نہیں ہوسکتی، بلکہ اسکی حفاظت کا طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں سے اندیشہ ہے ان کا پیٹ بھر دو، پھر چاہے قفل بھی نہ لگاؤ، مال محفوظ رہے گا کیونکہ اس طرح سارا شہر بے فکری سے گزرنے لگے گا اور تم اگر زکوۃ میں سو روپے میں سے اڑھائی روپے بھی نہ نکالو گے تو کسی وقت تمہاری ساری جمع پونجی نکل جائے گی اس وقت ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے تو درحقیقت زکوۃ نکالنا اپنے مال کو محفوظ کرنا ہے، اگر زکوۃ نہ دو گے تو کسی اور بہانہ سے نقصان ہو جائے گا اور یہ حکمت زکوۃ کی میں نے طریق تبرع بیان کر دی ہے ورنہ ہم کو حق تعالیٰ کا منقاد ہونا چاہئے، اگر کوئی بھی مصلحت اس میں نہ ہوتی تب بھی ہم کو خدا کا حکم سمجھ کر خوشی سے زکوۃ دینی چاہئے چہ جائیکہ اس میں دنیوی اور اخروی فوائد بھی ہیں۔ بتلاؤ کہ آخر ہم کس کے ہیں، خدا ہی کے تو ہیں، تو ہمارا مال بھی اسی کا ہے جس کے ہم ہیں بعض لوگ زیور کی زکوۃ میں یہ عذر کرتے ہیں کہ صاحب اس طرح تو ہر سال زکوۃ نکالتے ہی نکالتے زیور ختم ہو جائے گا۔ سارا سرمایہ برابر ہو جائے گا۔

تجارت نہ کرنا اپنی کوتاہی ہے:

میں کہتا ہوں کہ اس کا الزام خود تم پر ہے شریعت مقدسہ پر کوئی اشکال نہیں کیونکہ یہ خود تمہارا فعل ہے کہ تم نے اس روپیہ کو مقید کیا اگر اس میں تجارت کرتے تو سال بھر میں نفع سے ایک زکوۃ کیا کئی زکوۃ نکل آئیں۔ اب تم نے خود ہی اس کو بے کار کر کے عورتوں کے گلے میں ڈال رکھا ہے اس صورت میں اگر زکوۃ دیتے دیتے وہ برابر بھی ہو جائے تو شریعت پر کیا الزام ہے، اسی قسم کے احتمالات ہیں جن کی وجہ سے حج بھی نہیں کرتے۔

شرعاً فقط حج ہی فرض ہے:

کوئی کہتا ہے کہ صاحب حج تو بہت ہی مہنگا ہوگیا، پانچ سو چھ سو روپے میں تو حج کیا جائے، میں کہتا ہوں کہ آج حج مہنگا ہوگیا، پہلے تو سستا تھا، بیس پچیس روپے جہاز کا کرایہ تھا، اس وقت کتنوں نے حج کیا، یہ بھی ایک بہانہ ہے اگر حج مہنگا ہوگیا ہے تو جس کے پاس اتنی رقم نہ ہو اس پر حج فرض بھی نہیں، مگر جن کے پاس ہزاروں روپے ہیں اور جو شادیوں میں نام و نمود کے لئے سینکڑوں روپے خرچ کرتے ہیں ان کے پاس کیا عذر ہے، کچھ بھی نہیں، بس خدا کی مار ہے کہ حج نہیں کرتے اور اس میں یہ ساری حیلے بہانے ان کو سوجھتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ حج تو اب بھی بہت مہنگا نہیں، پہلے تین سو روپیہ میں حج اور مدینہ دونوں ہو جاتے تھے، اب اڑھائی تین سو میں صرف حج ہو جاتا ہے اور شرعاً فقط حج ہی فرض ہے، مدینہ جانا مستحب ہے اور سنت ہے تو اگر کسی کو ایسا ہی پانچ سو روپے خرچ کرنا گراں ہوتا ہے، وہ حج ہی کر کے واپس چلا آوے، البتہ جس کے پاس رقم کافی ہو اور محض بخل کی وجہ سے مدینہ نہ جائے اس سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شکایت ضرور ہوگی، تاہم پھر بھی مدینہ کا جانا فرض نہیں ہے۔ کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکایت کا خیال ہو وہ مدینہ بھی ہو آئے اور اگر اس کی پرواہ ہو تو حج نہ کرنے کے لئے مہنگے سستے ہونے کا بہانہ کیوں کرتا ہے، حج میں تو اب بھی کچھ زیادہ رقم صرف نہیں ہوتی، پھر بعضے تو حج کو چنداں ضروری ہی نہیں سمجھتے، اور بعض ضروری تو سمجھتے ہیں مگر کھیتی اور تجارت وغیرہ کے عذر پیش کرتے ہیں۔ سو جو لوگ ضروری ہی نہیں سمجھتے ان سے اس وقت میرا خطاب نہیں کیونکہ وہ اپنے ایمان کی خیر منائیں، میں اس وقت مسلمانوں کو خطاب کر رہا ہوں، مسلمان کوئی ایسا نہیں ہوسکتا جو خدا کے فرض کئے ہوئے کام کو ضروری نہ سمجھے۔ رہا کھیتی وغیرہ کا عذر، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آج ان کی آنکھ بند ہو جائے اور یہ میاں ٹیں ہو جائیں تو اس وقت ان کی کھیتی وغیرہ کا کیا انتظام ہوگا۔ میں بدفالی نہیں کرتا مگر معاملہ کی بات ہے، میں پوچھتا ہوں کہ تمہارے پاس وحی آ گئی ہے یا کسی اور ذریعہ سے یقین ہوگیا ہے تم ہمیشہ زندہ ہی رہو گے۔ ظاہر ہے کہ زندگی کا بھروسہ ایک دن بھی نہیں۔ بہت لوگ کھاتے پیتے چل دیئے ہیں تو بس دل کو یہی سمجھا لو کہ اگر آج ہماری زندگی ختم ہو جائے تو اس وقت بھی تجارت اور کھیتی کا انتظام ہم سے آخر چھوٹے ہی گا تو چند مہینے کے واسطے آج ہی اس کو کیوں نہ چھوڑ دیں جو انتظام مرتے وقت کرتے ہو وہ آج ہی کیوں نہ کرلو اور میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ارادہ کیا جائے تو ہر چیز کا انتظام خاطر خواہ ہوسکتا ہے۔ کیا کھیتی والوں اور تجارت والوں کو سفر پیش نہیں آتے اور اس وقت وہ اپنے کاروبار کا انتظام نہیں کرتے یا کبھی

چار پانچ مہینوں کے لئے وہ بیمار نہیں ہوتے، کیا اس وقت ان کا کام بند ہو جاتا ہے؟ مگر کچھ عادت یہ ہے کہ مجبوری کے وقت انسان سب کچھ انتظام کر لیتا ہے اور چلتے ہاتھ پیروں یہی چاہتا ہے کہ میں ایک دن کے واسطے بھی اپنے کام سے علیحدہ نہ ہوں، پھر سوا اس کے کہ یوں کہا جائے کہ دنیا کی محبت نے دل میں گھر کر لیا ہے اور اس کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔

جان و مال دونوں اللہ کی امانت ہیں:

ہر شخص جانتا ہے کہ جان خدا کی امانت ہے، وہ جب چاہیں اس کو لے سکتے ہیں اور عزیز و اقارب کے مرنے کے بعد سب لوگوں کی زبان پر یہ بات آتی ہے کہ بھائی خدا کی امانت تھی اس نے لے لی تو جب جان خدا کی امانت ہے تو مال کو اس سے زیادہ خدا کی امانت سمجھنا چاہئے، جہاں خدا کا حکم ہو امانت سمجھ کر خرچ کرنا چاہئے، پھر حج میں جو کچھ صرف ہوتا ہے وہ تو اپنے ہی کام میں صرف ہوتا ہے، ثواب الگ ملتا ہے، سیر و تفریح الگ ہوتی ہے، بعض لوگ شملہ اور منصوری کی سیر میں سینکڑوں روپے صرف کر دیتے ہیں جس میں نہ ثواب ہے نہ کچھ بلکہ بعض دفعہ اسراف کا گناہ سر پر پڑ جاتا ہے تو ایک دفعہ یہی سمجھ لو کہ حج میں بھی تفریح کے لئے روپیہ خرچ ہو گیا، دریا کی سیر سے زیادہ اور کیا تفریح ہو گی مکہ اور مدینہ کی زیارت مفت میں ہو جائے گی، غرض خدا توفیق دے تو دل کے سمجھانے کے واسطے سو طریقے ہیں اور اگر خود ہی ارادہ نہ ہو تو ہزار بہانے نکال سکتے ہیں اور سب کی علت وہی ہے کہ رغبت اور خوف دل میں نہیں ہے اسی وجہ سے عملی حالت تباہ ہو رہی ہے، یہ تو طاعات میں ہماری کوتاہیاں ہیں۔

گناہوں کی فہرست:

اب گناہوں کی فہرست لے لیجئے تو ان میں بھی ہماری حالت بدتر سے بدتر ہو رہی ہے۔ چنانچہ غیبت میں قریب قریب سب ہی مبتلا ہیں، حتیٰ کہ علماء اور مشائخ تک اس بلا میں گرفتار ہیں بلکہ علماء کی غیبت عوام کی غیبت سے بھی اشد ہے کیونکہ عوام تو معمولی آدمیوں کی غیبت کرتے ہیں اور علماء علماء اور مشائخ کی غیبت کرتے ہیں کیونکہ ان کا واسطہ انہی سے پڑتا ہے، وہ عوام کی غیبت کیوں کرنے لگے اور ظاہر ہے کہ علماء اور مشائخ کی غیبت کا گناہ بھی بہت زیادہ ہے کیونکہ غیبت میں آبروریزی کی وجہ سے گناہ ہوتا ہے کہ اس سے ایک مسلمان کی آبرو کم ہوتی ہے تو جس کی آبرو جس قدر عظیم الشان ہو گی اسی قدر اس کی غیبت میں گناہ بھی زیادہ ہو گا۔

علماء و مشائخ کی آبروریزی کا گناہ:

علماء و مشائخ کی عزت و آبرو عام لوگوں سے علاوہ عرف کے شرعاً بھی بڑھی ہوتی ہے۔

حدیث میں ہے من لم یرحم صغیر ناولم یوقر کبیر ناولم یجبل عالیمینا فلیس منا (سنن ابی داؤدالادب:۶۵) جوکوئی ہمارے چھوٹوں پررحم اور بڑوں کالحاظ اور ہمارے علماء کی تعظیم نہ کرے وہ ہمارے میں سے نہیں، یہ تو علماء کی شان میں ہے، بزرگوں اور مشائخ کی بابت ایک حدیث قدسی میں ہے، من آذیٰ لی ولیا فقد آذنته بالحرب (اتحاف السادۃ المتقین ۵:۲۹۵) جوکوئی میرے ولی کوتکلیف پہنچائے میں ان کواعلان جنگ دیتا ہوں۔اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علماءاور مشائخ کی غیبت میں اوران کی آبروریزی کرنے میں کیا کچھ گناہ ہوگا اس لئے میں کہتا ہوں کہ علماء ومشائخ کی غیبت عوام کی غیبت سے زیادہ سخت ہے مگران کی کسی کوبھی کچھ پرواہ نہیں، اکثر گناہ کرکے جی بھی براہوا کرتا ہے، مگر غیبت ایسی عام ہوگئی ہے کہ اس کے بعد جی بھی برانہیں ہوتا، یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کچھ ہم نے گناہ کا کام بھی کیا ہے یانہیں۔اس حالت پرنظر کر کے یوں معلوم ہوتا ہے کہ غیبت بہت ہی بڑا گناہ ہے کیونکہ گناہ کو ہلکا سمجھنا قریب بکفر ہے اور غیبت کوعام طور پراعتقاداً نہ ہوتو عملاً توضرور ہلکا سمجھا جاتا ہے اس سے بچنے کا بہت ہی اہتمام چاہئے۔

غیبت کا منشاء کبر ہے:

اوراس غیبت کا منشا کبر ہے کیونکہ جب کوئی شخص اپنے آپ کودوسرے سے بڑا سمجھے گا جبھی اس کی برائی کرے گا۔ چنانچہ جن کواپنے سے افضل سمجھا جاتا ہے ان کے واقعی عیوب میں بھی تاویل کرلی جاتی ہے۔اسی طرح اگر ہرشخص کواپنے سے اچھا سمجھا جائے تواس کی غیبت اور برائی پر جرأت نہ ہواس کے ہرعیب میں کوئی نہ کوئی تاویل ضرور کرلی جاتی مگرآج کل کبر کا مرض عام ہے، ہرشخص اپنے کودوسروں سے افضل سمجھتا ہے اس لئے غیبت کی بھی کثرت ہے اور چونکہ کبر میں نفس کو حظ ہوتا ہے اس لئے غیبت کرکے جی برابھی نہیں ہوتا جب فخر کے ساتھ گناہ ہوگا توجی کہاں براہوگا اورظاہر ہے کہ گناہ پرفخر کرنا سخت گناہ ہے اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ حدیث میں غیبت کوزنا سے بدتر کہا گیا ہے کیونکہ زنا کا خاصہ ہے کہ اس سے انسان کے دل میں ندامت اور شرمندگی پیدا ہوتی ہے،اسی لئے کھلم کھلا اس کاارتکاب نہیں کیا جاتا، چھپ چھپا کر پردہ میں کیا جاتا ہے کہ کہیں کسی کو خبرنہ ہوجائے بلکہ زنا کرکے انسان خوداس عورت کی نظروں میں بھی اپنے آپ کوذلیل سمجھتا ہے، جس سے یہ حرکت کرتا ہے تواس پرفخر نہیں کرسکتا۔

غیبت حق العبد بھی ہے:

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ زنا میں صرف خدا کا گناہ ہے جس کواگروہ چاہیں معاف کرسکتے

ہیں، اور غیبت میں خدا کا بھی گناہ ہے اور بندے کا حق بھی ہے، اس کو حق تعالیٰ اس وقت تک معاف نہیں فرمائیں گے جب تک کہ وہ شخص معاف نہ کر دے جس کی غیبت کی گئی ہے اور بندہ محتاج ہے، نہ معلوم قیامت میں وہ اس شخص کی نیکیاں ملتی ہوئی دیکھ کر معاف کرے یا نہیں، اگر اس کی ساری ہی نیکیاں مل گئی تو یہ میاں بالکل خالی ہاتھ ہی رہ جائیں گے اس لئے اس گناہ سے بچنے کی بہت ہی فکر چاہئے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے اندر سے کبر کا مادہ نکالے اس کے بغیر غیبت نہیں چھوٹ سکتی، تکبر کے ہوتے ہوئے اگر غیبت چھوٹے گی بھی تو دو چار دن سے زیادہ نہیں چھوٹے گی، پھر چونکہ مادہ کبر کا اندر موجود ہے وہ پھر اس کو اسی میں مبتلا کر دے گا۔ افسوس یہ ہے کہ آج کل ہم لوگوں نے دین فقط تسبیحوں اور نفلوں کو سمجھ لیا ہے، دل کی اصلاح کو ضروری ہی نہیں سمجھتے اور میں سچ کہتا ہوں کہ دل کی اصلاح کے بغیر ظاہری اعمال بھی درست نہیں ہو سکتے اور دل کی اصلاح کا یہی طریقہ ہے کہ اپنے اندر خدا کی محبت اور خوف اور فکر آخرت پیدا کیا جائے، جب دل پر محبت اور خوف اور فکر سوار ہو جائے گا تو بہت جلد اس کی اصلاح کی امید ہے۔ امراض قلب کی زیادہ تر وجہ بے فکری ہے، جب دل فکر سے خالی ہوتا ہے تو اس میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، مگر فکر سے مراد فکر آخرت ہے ورنہ دنیا کی فکر تو اس کے لئے سم قاتل ہے۔

نظر بد داعی الی الزنا ہے:

اسی طرح آج کل بری نظر کا بہت مرض ہے، یہ گناہ کمبخت ایسا ہے کہ اس سے جی ہی نہیں بھرتا، ہر گناہ کر کے انسان کا دل اس سے فارغ ہو جاتا ہے بلکہ اکثر گناہ کے بعد آدمی اپنے اوپر نفرتیں کرتا رہتا ہے لیکن بری نظر کا ایسا مرض ہے کہ اس کا بار بار تقاضا ہوتا ہے، سیری ہوتی ہی نہیں، ایک کانٹا سا کھٹکتا رہتا ہے۔ لوگ اس کو ہلکا سمجھتے ہیں مگر در حقیقت یہ بہت سنگین جرم ہے اس کی ایک خرابی تو آپ نے یہی سن لی کہ اس سے سیری نہیں ہوتی۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ یہ زنا کا مقدمہ ہے اگر کوئی شخص ساری عمر کسی نامحرم کو نہ دیکھے تو پھر بھی ہم دیکھیں کہ وہ کس طرح زنا کرلے گا، زنا کی خواہش بھی نظر ہی سے پیدا ہوتی ہے، اسی لئے حدیث میں ہے کہ **العینان تزنیان وزنا هما النظر** (مسند احمد ۲:۳۷۲) آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا نظر بد ہے تو نظر بد کو زنا اسی لئے کہا گیا کہ وہ داعی الی الزنا ہے، اہل فراست کو بری نظر کرنے والے کی آنکھوں میں ایک کھلی ہوئی ظلمت محسوس ہوتی ہے بلکہ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس کو ہر شخص امتیاز کرسکتا ہے۔ آپ دو شخصوں کو لیجئے جن میں ایک متقی پرہیزگار ہو جو بری نظر سے احتیاط رکھتا ہو اور دوسرا وہ شخص ہو جو

نامحرموں کو گھورا کرتا ہو، دونوں کی آنکھوں میں آپ کو کھلا ہوا فرق محسوس ہوگا۔ متقی کی آنکھوں میں ایک خاص رونق ہوتی ہے جو فاسق کی آنکھ میں نہیں ہوسکتی۔ حق تعالیٰ نے نظر بد سے بچنے کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ ارشاد ہے **قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ** (آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں) کیا عجیب تعلیم ہے کہ زنا سے بچنے کی تعلیم فرمانا مقصود تھا تو اس کی جڑ کاٹنے کا پہلے حکم دے دیا، یعنی پہلے نگاہ نیچے رکھنے کا حکم فرمایا جس میں بتلا دیا کہ زنا اس کی وجہ سے ہوتا ہے، پہلے اس کا اہتمام کرو کہ آنکھیں نیچی رہیں جب آنکھیں نیچی رکھو گے تو کسی نامحرم پر نظر ہی نہ پڑے گی۔ نہ اس کے اختلاط کا خیال آئے گا، پھر بلاغت یہ ہے کہ بجائے لاینظروا الی المحرمات (محرم عورتوں کی طرف نہ دیکھیں) کے **يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ** فرمایا اگرچہ مقصود یہی ہے کہ نامحرموں کو مت دیکھو مگر آنکھیں اٹھا کر چلنے میں اس کی احتیاط دشوار تھی، خواہ مخواہ جب آنکھیں اٹھی ہوں گی کسی نہ کسی پر نظر پڑ ہی جائے گی۔

نظر بد سے بچنے کا طریقہ:

اس لئے ساتھ ساتھ نظر بد سے بچنے کا طریقہ بھی بتلا دیا کہ آنکھیں نیچی رکھا کرو، پھر کسی پر نظر پڑے ہی گی نہیں۔ اس میں آج کل بہت بے احتیاطی کی جاتی ہے۔ بعض گھروں میں دیور اور جیٹھ سے اور ان کے جوان لڑکوں سے پردہ نہیں کیا جاتا۔ بعض عورتیں خالہ زاد اور ماموں زاد اور چچازاد اور پھوپھی زاد بھائیوں سے پردہ نہیں کرتیں، اس میں سخت فتنہ کا اندیشہ ہے اور اگر کوئی اندیشہ نہ بھی ہو تو یہ کیا کم فتنہ ہے کہ ہر روز نامحرموں کے سامنے آنے کا گناہ ان کے نامہ اعمال میں لکھا جاتا ہے۔

حکماء امت:

فقہاء نے یہاں تک احتیاط کی ہے کہ جوان بھتیجی کا حقیقی چچا سے بھی پردہ کرانے کو لکھا ہے کہ وہ اگر خود بری نظر سے نہ دیکھے گا تو ممکن ہے کہ اسی نظر سے دیکھے کہ یہ میرے لڑکے کے قابل ہے یا نہیں اور اس نظر سے دیکھنے میں شہوت کی آمیزش کا ضرور اندیشہ ہے۔ اللہ اکبر! یہ ہیں حکماء امت واقعی فقہاء نے زمانہ کی حالت کو خوب سمجھا ہے اور شیطان کے دھوکوں پر ان کی بہت نظر تھی۔ فقہاء نے جب ایسے ایسے انتظامات کئے ہیں تب ہی تو اس وقت آپ کو کچھ دین کی صورت نظر آ رہی ہے، بعض گھروں میں اگر نامحرم عزیزوں سے پردہ کا اہتمام ہے تو ایک اور بے احتیاطی ہے۔

باہر پھرنے والی عورتوں سے پردہ:

باہر پھرنے والی عورتوں سے پردہ کا اہتمام نہیں ہے حالانکہ فقہاء نے صاف لکھا ہے کہ کافر عورت سے مسلمان عورت کو ویسا ہی پردہ کرنا چاہئے جیسا کہ اجنبی مرد سے کیا جاتا ہے اور شاہ عبدالقادر صاحب نے فاجر عورتوں سے پردہ کرنا او نسائهن کی تفسیر میں لکھا ہے۔ اسی سے باہر پھرنے والی لاابالی عورتوں سے بھی پردہ کی تاکید مستنبط ہوتی ہے کیونکہ یہ باہر پھرنے والیاں اکثر کٹنیاں ہوتی ہیں جو بدمعاش مردوں سے گھر والی عورتوں کے حالات جا کر بیان کرتی ہیں، پھر اس سے بڑے بڑے فتنے پیش آتے ہیں اور لاابالی اس لئے کہا کہ باہر پھرنے والیوں سے میری مراد سب نہیں ہیں کیونکہ بعض عورتیں بے چاری غریب ہیں، ان کو کام کاج کے لئے نکلنا ضروری ہے، وہ اگر سر سے پاؤں تک بدن ڈھانپ کر گھونگھٹ نکال کر باہر نکلیں تو اس میں وہ معذور ہیں، ان پر کوئی الزام نہیں، البتہ اتنی قید ضروری ہے کہ وہ اچھا لباس پہن کر باہر نہ نکلیں، میلے کچیلے کپڑے پہن کر نکلیں اور ضرورت سے زیادہ باہر نہ رہیں تو ایسی عورتوں سے گھر والیوں کو پردہ کرنے کی ضرورت نہیں، باہر پھرنے والیوں سے میری مراد وہ عورتیں ہیں جو کھلے مہار پھرتی ہیں جو حیاء اور شرم کی چادر اتار کر باہر نکلتی ہیں ان سے احتیاط کرنی چاہئے۔ باقی جو عورتیں ضرورت اور مجبوری سے باہر نکلتی ہیں ان کو پردہ میں بٹھلانا مشکل ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر ان کو پردہ میں بٹھلانا مشکل ہے تو مردوں کو تو اپنی آنکھوں کو پردہ میں بٹھلا دینا آسان ہے وہ اگر ضرورت سے باہر پھرتی ہیں تو تم کو دیکھنے کی کیا ضرورت ہے کہ تم مت دیکھو۔

بدنظری کا مرض عام:

مگر یہ مرض آج کل ایسا پھیلا ہوا ہے کہ شاید ہی اس سے کوئی بچا ہو کیونکہ اس گناہ میں ایک سہولت یہ ہے کہ دوسروں کو اس کی خبر نہیں ہوتی، کسی ضرورت سے آنکھ اٹھائی اسی میں کسی کو گھور لیا دوسرے تو سمجھتے ہیں کہ اپنی چیز دیکھنے کو نگاہ اٹھائی تھی مگر اس نے نہ معلوم اندر ہی اندر کس کس کی چیزیں دیکھ لیں، اسی لئے قرآن میں اس کو خائنة الاعین (آنکھوں کی چوری (جانتا ہے) سے تعبیر کیا ہے۔ ان سب غوائل سے حفاظت کا اچھا طریقہ وہ ہے جو قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ نگاہ نیچی رکھو۔

شیطان کا قابو صرف دو طرفوں میں نہیں:

ایک بزرگ کا قول ہے کہ شیطان نے حق تعالیٰ کے سامنے انسانوں کو بہکانے کے لئے اپنی

آمدورفت کرنے کی چار جہتیں بیان کی ہیں۔ **لا تینھم من بین ایدیھم ومن خلفھم وعن ایمانھم وعن شمائلھم** کہ میں آدمیوں کے پاس بہکانے کے واسطے چار طرف سے جاؤں گا، سامنے سے اور پیچھے سے اور دائیں اور بائیں سے۔ دو جہتیں اس نے بیان نہیں کیں ایک اوپر کی جانب ایک نیچے کی جانب۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان دو طرفوں سے شیطان کو قابو انسان پر نہیں چل سکتا تو نگاہ یا تو بالکل آسمان کی طرف رکھے یا زمین کی طرف۔ اس صورت میں شیطان سے بچ سکتا ہے مگر آسمان کی طرف آنکھیں لگائے رکھنا عادتاً موجب کلفت ہے اس لئے یہی صورت متعین ہے کہ نگاہ ہر وقت نیچی رکھے۔ اگرچہ یہ بات ایک نکتہ کے طور پر ہے مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ نگاہ نیچی رکھنے سے نظر بد کا گناہ صادر نہیں ہوسکتا کیونکہ خود بخود کوئی کسی کی آنکھوں میں تھوڑا ہی گھستا ہے اور باقی تمام جہات میں نظر بد کا اندیشہ لگا ہوا ہے۔

بدگمانی بڑا جھوٹ ہے:

ایک عام گناہ جس میں بکثرت ابتلاء ہے یہ ہے کہ بے تحقیق کوئی بات سن کر کسی کی طرف منسوب کر دی یا بدگمانی پکا لی۔ تحقیق کا مادہ ہی آج کل نہ رہا۔ بس کسی سے کچھ سن لیا اور انکل پچو گھوڑے دوڑا لئے۔ قرآن وحدیث میں اس کی سخت ممانعت ہے اور بہت ہی تاکید کے ساتھ تحقیق کا حکم ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **ولا تقف ما لیس لک بہ علم** یعنی جس بات کی پوری تحقیق نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو۔ ایک آیت میں ارشاد ہے **یایھا الذین امنوا ان جاء کم فاسق بنباء فتبینوا** یعنی اگر کوئی فاسق فاجر کوئی خبر لاوے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ حدیث میں ہے **ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث** (الصحیح للبخاری ۴:۵) بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی بھی بڑا جھوٹ ہے مگر آج کل بدگمانی کو گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔ پھر بدگمانی بھی کسی بڑی وجہ سے نہیں کی جاتی ذرا سا اشارہ سن لیا اور طومار باندھ دیا، یاد رکھو یہ بہت سخت گناہ ہے ان باتوں سے احتیاط کرو ورنہ سارا تقویٰ وطہارت دھرا رہ جائے گا۔

بات کی تحقیق کی ضرورت:

افسوس یہ ہے کہ اس مرض میں علماء اور مشائخ تک بھی مبتلا ہیں جہاں ان کے مقربین میں سے کسی نے کسی کی نسبت کوئی بات کہہ دی اس پر ایمان لے آئے، ذرا تحقیق نہیں کرتے کہ اس کی اصل بھی کچھ ہے یا نہیں۔ آج کل مشائخ کو اپنے خاص معتقدین اور مقربین پر بہت ہی اعتماد ہوتا

ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جس کو چاہتے ہیں مشائخ کی نظر سے گرا دیتے ہیں، گویا کسی کو مقبول ومردود کر دینا بالکل ان کے اختیار میں ہوتا ہے۔

روایات مقربین میں ضرورت تفتیش:

حالانکہ اگر محدثین اور فقہاء کے اصول پر جانچا جائے تو میں سچ کہتا ہوں کہ خود مشائخ میں بھی ایسے کم نکلیں گے جن کو محدثین ثقہ کہہ سکیں ان کے مقربین اور معتقدین تو کس شمار میں ہیں۔ جن محدثین نے بڑے بڑے زاہد اور عابد لوگوں کو یہ کہہ دیا کہ حدیث بیان کرنے میں ضعیف ہیں اگر چہ زاہد اور عابد بہت بڑے ہیں وہ آج کل کے زاہدوں کو کب ثقہ مان سکتے ہیں۔ علماء اور مشائخ کو چاہئے کہ روایات میں بالکل محدثین کے قواعد برتا کریں جو شخص پوری بات بیان نہ کرتا ہو یا ہر بات کو سند سے بیان نہ کر سکتا ہو اس کی بات کا بھی کبھی اعتبار نہ کریں جب کوئی شخص کسی کی نسبت کوئی بات کہے اس سے فوراً پوچھیں کہ تم نے خود اس کا مشاہدہ کیا یا کسی سے سنا اگر وہ اپنا مشاہدہ بیان کرے تو اس پر اس سے گواہوں کا مطالبہ کیا جائے اگر گواہ نہ لا سکے تو اس کو دھمکا دیں یا اور کوئی سزا دیں اور یہ کہہ دیں کہ آئندہ کوئی بات بدون ثبوت شرعی کے ہمارے سامنے بیان نہ کرو اور اگر وہ یہ کہے کہ میں نے کسی سے سنا ہے تو اس کا نام دریافت کیا جائے کہ کس سے سنا ہے، کب سنا ہے کس طرح سنا ہے اس کے کیا الفاظ تھے۔ پوری بات بیان کرو، اپنی طرف سے کم زیادہ نہ کرو۔ اس کے بعد اس دوسرے شخص کے حال کی تفتیش کرو کہ وہ نیک ہے یا فاسق اور اس نے بھی خود مشاہدہ کیا ہے یا کسی سے سنا ہے اس طرح اگر مقربین کی روایات میں تفتیش کی جایا کرے تو اس وقت معلوم ہو کہ یہ مقربین ہیں یا مکربین ہیں یعنی مکر کی تاک میں لگے رہنے والے۔ غرض بے تحقیق بات پر کبھی کان لگانا نہ چاہئے نہ بلاوجہ کسی سے بدگمان ہونا چاہئے، اسی طرح آج کل جھوٹ کی بھی بہت کثرت ہے اور طلبہ اور ذاکرین میں عمداً جھوٹ بولنے کا تو مرض نہیں مگر قیاس دوڑانے کا بہت مرض ہے کہ میں نے تو یہ سمجھا تھا۔ اس لئے کسی کی بات پر بلا تفتیش کے اعتماد نہ کرنا چاہئے، ایک مرض آج کل مال کی محبت کا ہے کہ ہر وقت اسی کی فکر ہوتی ہے کہ کچھ اور روپیہ جمع ہو جائے، زمینداروں کو زمین بڑھانے کی فکر رہتی ہے پھر اس میں حلال وحرام کی ذرا تمیز نہیں کی جاتی، بس ہر وقت دھن رہتی ہے کہ کسی طرح ہو روپیہ اور زمین بڑھنی چاہئے جو زبردست ہیں وہ غریبوں کی جائیدادیں اپنے قبضہ میں کر لیتے ہیں بھلا اس ظلم کی بھی کوئی انتہا ہے۔

بہنوں کا حق میراث نہ دینا ظلم ہے:

بہنوں کا حق لیا جاتا ہے اور بہانے یہ کرتے ہیں کہ ان کی شادی وغیرہ میں باپ نے اتنا خرچ کیا ہے کہ ہمارے واسطے اتنا خرچ نہیں کیا اس لئے ان کا اب کیا حق رہا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ باپ کی زندگی میں سارا مال اس کا تھا وہ جہاں چاہے اس کو خرچ کرے اس سے میراث میں کسی کا حق کیوں کر کم ہو جائے گا۔ پھر شادیوں میں جو کچھ کیا جاتا ہے وہ بیٹی کے واسطے نہیں کیا جاتا محض اپنے نام کے واسطے کیا جاتا ہے بھلا دس پانچ ہزار آدمیوں کو کھانا کھلا دینے سے لڑکی کا کیا نفع ہو گیا اس لئے باپ نے اپنی بیٹی کے واسطے کچھ نہیں کیا وہ سب اپنے واسطے خرچ کیا ہے پھر اس کی وجہ سے بہن کا حق کیوں کم کیا جاتا ہے۔ بعضے یہ کہتے ہیں کہ بہن نے ہم کو خوشی سے اپنا حق معاف کر دیا ہے یہ بھی بالکل غلط ہے خوشی سے کوئی معاف نہیں کرتی وہ سمجھتی ہے کہ مجھے کچھ ملے گا تھوڑا ہی لاؤ ان کی خاطر یہی کہہ دوں کہ میں نے معاف کیا۔ خوشی سے دینے کی صرف ایک صورت ہے اس کا امتحان کر لیا جائے وہ یہ کہ بہن کا شرعی حصہ فرائض کے موافق علیحدہ کر کے اس پر اس کا نام چڑھا دو اور داخل خارج سب کچھ کر دو جو آمدنی اس کی آوے ساری اس کے حوالہ کرو اور صاف کہہ دو کہ یہ تمہاری ملک ہے اس میں تم کو ہر طرح تصرف کا اختیار ہے۔ سال دو سال اس کو اس طرح آمدنی دیتے رہو اور اگر وہ پہلے پہل رسم و رواج کی وجہ سے انکار کرے تو مجبور کر کے دو اور صاف کہہ دو کہ اس وقت ہم تم سے نہیں لیں گے۔ دو تین سال کے بعد دو گی تو لے لیں گے پھر دو تین سال جب وہ اپنی آمدنی کو لیتی رہے اور صرف کرتی رہے اور اس مزہ کو دیکھ لے پھر بھی اگر کوئی بخش دے اس وقت البتہ یہ دینا خوشی کا دینا ہے۔

باپ کے مرتے ہی لڑکیوں کا ترکہ لینے سے انکار کرنا شرعاً معتبر نہیں

باقی باپ کے مرتے ہی جو لڑکیاں آمدنی اور زمین لینے سے انکار کر دیتی ہیں وہ انکار معتبر نہیں اول تو اس وقت صدمہ تازہ ہوتا ہے، صدمہ میں اس کو اپنے نفع و نقصان کا خیال نہیں ہوتا۔ دوسرے جب رواج یہی پڑا ہوا ہے کہ بہنوں کو میراث سے محروم سمجھا جائے تو وہ اپنا حق لیتے ہوئے بدنامی سے بھی ڈرتی ہیں۔ تیسرے ان کو اپنے حق کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ کتنا ہے اور کس قدر ہے جب صدمہ کا وقت گزر جائے اور تم ان سے کہہ دو کہ تمہارا حق شرعی ہے تم کو لینا پڑے گا، پھر وہ اپنی آمدنی کی مقدار بھی دیکھ لیں، اس کا لطف بھی اٹھا لیں، اس کے بعد اگر کوئی دے تو مضائقہ

نہیں مگر ہم دکھاویں گے کہ اس کے بعد سو میں سے ایک یا دو ہی ایسی نکلیں گی کہ پھر بھی اپنا حق معاف کر دیں پس جس طرح سے آج کل بہنیں اپنا حق بھائیوں کو معاف کرتی ہیں وہ شرعاً معتبر نہیں اس میں رضا اور طیب خاطر نہیں ہوتی اور حدیث میں صاف موجود ہے کہ **الا لا یحل مال امرا مسلم الا بطیب نفس منه** (کنزالعمال:۳۹۷) کہ خبردار کسی مومن کا مال بدون طیب خاطر کے لینا حلال نہیں ہے تو یہ ساری خرابی کس چیز کی ہے، محض محبت مال کی۔ یہ محبت آج کل دلوں میں پیوست ہوگئی ہے اور بالخصوص عورتوں میں یہ مرض بہت ہے۔

مستورات کی زیورات سے محبت کا حال

عورتوں کو زیور کی ایسی محبت ہے کہ گویا اس کی بھوک اور پیاس سے بلکہ بھوک اور پیاس سے بھی زیادہ کیونکہ اکثر عورتوں کو کھانے پینے کا اتنا شوق نہیں ہوتا، اگر کسی دن خاوند گھر پر نہ ہو تو چولہا سرد پڑا رہتا ہے۔ چٹنی اچار ہی سے باسی کوسی کھا کر بیٹھ رہتی ہیں مگر زیور کا اتنا چاؤ ہے کہ اس میں شوہر کی حیثیت بھی نہیں دیکھتیں۔ عورتوں کے زیوروں میں اکثر لوگ سودی قرض لے لیتے ہیں۔ بعض رشوت کا روپیہ کماتے ہیں۔ غرض مردوں کو حرام اور حلال کی بھی پرواہ نہیں رہتی، پھر اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ سودی قرض اگر بڑھ گیا تو سارا زیور بھی اسی میں جاتا ہے اور گھر بار تک نیلام ہو جاتا ہے اور آخرت کا وبال جدا رہا، مگر عورتوں کو اس کی بھی کچھ پرواہ نہیں کہ اس زیور کمبخت کی خاطر شوہر جہنم کی آگ میں جلے گا، اسی طرح کپڑوں کی عورتوں کو ایسی دھت ہوتی ہے کہ جوڑے پر جوڑے بناتی چلی جاتی ہیں۔ بعضوں کے پاس اتنے کپڑے ہوتے ہیں کہ سب کے پہننے کی بھی ان کو نوبت نہیں آتی۔ بس اپنے نامزد کر کے ڈال دیتی ہیں، پھر جب مرتی ہیں تو وہ کورے کے کورے اور نئے کے نئے اللہ واسطے دیئے جاتے ہیں۔ بھلا اتنے کپڑے بنانے سے کیا نفع جن کے پہننے کی بھی نوبت نہ آئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس واسطے بہت جوڑے بناتی ہیں تاکہ ہمارے بعد اللہ واسطے دے دیئے جائیں تو یہ بالکل غلط ہے، بناتے وقت اس خیال کو بھی منحوس سمجھا جاتا ہے جب یہ نیت بناتے وقت نہیں ہوتی تو تم کو ثواب کیا خاک ملے گا اور دوسروں کے دینے کا ثواب اگرچہ مردوں کو پہنچتا ہے مگر وہ بھی جبھی پہنچتا ہے جبکہ دینے والے خلوص سے دے دیں مگر آج کل اکثر اس واسطے دیا جاتا ہے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ سارے مال کو دبا کر بیٹھ گئے، خدا واسطے بھی نہ دیا تو اس میں خلوص کہاں؟

عورتوں میں حفاظت زیور سے بے احتیاطی:

پھر طرہ یہ ہے کہ عورتوں کو زیور وغیرہ کا جتنا شوق ہے اسی قدر اس کے ساتھ بے احتیاطی بھی

کی جاتی ہے۔ زیور اتار کر کبھی تکیہ کے نیچے رکھ دیتی ہیں، کبھی طاق میں ڈال دیتی ہیں، کبھی ردی کے نیچے چھپا دیتی ہیں۔ گویا اپنے نزدیک بڑی احتیاط کی، پھر جب وہ چوری ہو جاتا ہے تو دنیا بھر کے نام لگاتی پھرتی ہیں، جس سے تین گناہ ان کے ذمہ ہوتے ہیں۔ ایک مال کی محبت کا، دوسرے خدا کی نعمت کی بے قدری کا، تیسرے بلاوجہ بدگمانی کا۔ خدا کی نعمتوں کی بے قدری بہت بڑا وبال ہے جس سے نعمت بہت جلدی زائل ہو جاتی ہے۔ شریعت نے جہاں مال کی محبت سے منع کیا ہے وہاں نعمتوں کی قدر کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔

زمین کے روپیہ میں برکت نہ ہونے کا مفہوم:

حدیث میں اگرچہ زمینداری سے ممانعت بھی آئی ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہے کہ اگر زمین کسی کے پاس ہو اور کسی ضرورت سے اس کو بیچے تو فوراً اس کے روپیہ سے کوئی دوسری زمین خرید لے ورنہ برکت نہ ہوگی۔ میں ان دونوں حدیثوں سے یہ سمجھا ہوں کہ جس کے پاس زمین نہ ہو وہ تو زمین نہ خریدے اور جس کے پاس پہلے سے ہو یا میراث میں مل جائے وہ اس کو فروخت نہ کرے اور اگر فروخت کرے تو فوراً زمین ہی میں وہ روپیہ لگا دے، واقعی اس کا تجربہ ہوا ہے۔ زمین فروخت کر کے روپیہ ادھر ادھر اٹھ جاتا ہے اور یہی معنی اس کے کہ اس میں برکت نہیں ہوتی تو دیکھئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نعمت کی احتیاط اور قدر کی کہاں تک تعلیم دی ہے مگر عورتوں میں جہاں کپڑے اور زیور کی دھت زیادہ ہے وہاں بے احتیاطی اور بے قدری بھی بہت ہے۔ کپڑے کا وہ شوق جس کی کوئی حد نہیں جہاں پھیری والا آیا فوراً کپڑا خرید لیتی ہیں۔ ضرورت ہو یا نہ ہو۔ کیا مجال ہے کہ پھیری والا خالی پھر جائے۔ ایک عورت نے خود کہا کہ ہم تو دوزخ ہیں دوزخ جس طرح اس کا پیٹ نہیں بھرتا آخیر تک ھل من مزید (وہ کہے گی) کچھ اور بھی ہے پکارتی رہے گی، یہی حال ہمارا ہے بس ہمارا پیٹ تو خدا ہی بھرے گا مگر یہ بھی غنیمت ہے کہ اس اللہ کی بندی نے اپنے عیب کو عیب تو سمجھ لیا اور اس کے عیب ہونے کا اقرار بھی کر لیا، ورنہ اکثر عورتوں میں تو یہ مرض ہے کہ اپنے عیب کو عیب بھی نہیں سمجھتیں اور سمجھانے والے کو نام دھرتی ہیں۔ غرض ان میں یہ بھی بہت بڑا مرض ہے کہ خدا کی نعمت کی قدر نہیں کرتیں، گھر میں چاہے کتنا ہی سامان ہو مگر جب کوئی پوچھے گا یہی کہیں گی کہ میرے پاس کیا دھرا ہے؟ مولانا عبدالرب صاحب دہلوی بڑے ظریف تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ عورتوں کی عادت ہے کہ ان کے پاس کتنے جوڑے ہوں یہی کہیں گی کہ ہائے میرے پاس کیا ہیں یہی دو لیتھڑے اور کپڑوں کو چاہے صندوق بھرا ہوا ہو مگر

جب پوچھا جائے یہی کہیں گی کہ میرے پاس کیا ہے بس دو چیتھڑے اور برتن خواہ کتنے ہی موجود ہوں مگر یہی کہیں گی کہ میرے پاس کیا ہے دو ٹھیکرے تو بس ان کے پاس ہمیشہ لیتھڑے اور چیتھڑے اور ٹھیکرے ہی رہتے ہیں کبھی خدا کی بندیاں یہ نہ کہیں گی کہ اللہ کا فضل ہے اس کا دیا ہوا ہمارے پاس سب کچھ ہے بس ان کا تو وہ حال ہے۔

گفت چشم تنگ دنیا دار را — یا قناعت پر کند یا خاک گور

اس نے کہا چشم تنگ دنیا دار کو یا تو قناعت بھرتی ہے یا خاک گور پر کرتی ہے۔

عورتوں کا حرص:

ہم نے ایک عورت کو خود دیکھا کہ اس کے پاس رضائی موجود تھی مگر نئی چھینٹ مل گئی تو ایک اور رضائی بنالی جب پوچھا گیا کہ تم کو رضائی کی ضرورت کیا تھی؟ تو یہ جواب دیا کہ خوبصورت چھینٹ تھی میں نے کہا کہ ایک اور بنالوں پڑی رہے گی، پھر کام آجائے گی۔ عورتوں کو ساری عمر کا انتظام آج ہی سوجھتا ہے حالانکہ مسلمان کی تو یہ شان ہونی چاہئے کہ صبح کو اٹھے تو شام کی فکر نہ ہو اور شام آوے تو صبح کی فکر نہ ہو کیا خبر ہے کہ صبح سے شام بھی ہوگی یا نہیں ممکن ہے کہ ہماری زندگی ختم ہی ہوگئی ہو۔ عورتوں کو زیور یا کپڑے بناتے ہوئے موت کا دھیان بھی نہیں آتا کہ آخر ہم کو کسی دن دنیا سے جانا ہے اس وقت ان چیزوں کی محبت وبال جان ہوگی، ان بلاؤں اور جھگڑوں کی محبت دل سے نکال دینی چاہئے، پھر عورتوں کو زیور اگرچہ بہت ہی محبوب ہے مگر جب ہی تک کہ یہ اس کو پہن کر دورہ نہ کریں اور جہاں انہوں نے ایک دورہ کیا اور اپنے زیور سے کسی دوسری عورت کا زیور وضع یا بناوٹ میں اچھا دیکھا تو پھر ان کا اپنا زیور بالکل جی سے اتر جاتا ہے اور اس کو توڑ پھوڑ کر دوسروں کے ہر زیور کی نقل اتروا تی ہیں۔ حیرت ہے کہ عورتوں کو زیور توڑتے ہوئے کچھ بھی دکھ نہیں ہوتا۔ وہ پہلی گھڑوائی برباد ہو جاتی ہے، پھر ہر سنار سونے چاندی میں کچھ نہ کچھ کھوٹ ضرور ملاتا ہے اس بار بار کے توڑنے پھوڑنے میں گھڑوائی بھی بہت جاتی ہے جو بالکل بے قیمت ہے۔ زیور کو اگر بیچنے کھڑے ہو تو گھڑوائی کے دام کبھی نہ ملیں گے، پھر سنار کے ہر مرتبہ کھوٹ ملانے سے خود سونے چاندی کی بہت کم قیمت رہ جاتی ہے مگر عورتوں کو اس کی کیا پرواہ ان کو تو اپنے چاؤ سے کام ہے۔

گھر کا بگاڑنا اور سنوارنا عورتوں کے ہاتھ میں ہے:

مثل مشہور ہے کہ عورت اگر چاہے تو سوئی کی نوک سے گھر کو ڈھادے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ

گھر کا بگڑنا اور سنورنا عورتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ مگر یاد رکھو کہ روپیہ کو اس طرح ضائع اور برباد کرنا خدا کو پسند نہیں۔ اسراف اور فضول خرچی کرنے والوں کو قرآن میں شیطان کا بھائی کہا گیا ہے کیونکہ شیطان نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی ہے اور فضول خرچی کرنے والے بھی نعمتوں کی بے قدری کرتے ہیں، پھر اگر کسی کو ایسی ہی ہمت ہو اور اس کو زیور کا اور روپیہ کا درد نہ آتا ہو تو کم از کم اتنا خیال تو کرنا چاہیئے کہ قرض کر کے ادھار کر کے تو اپنے چاؤ نہ پورے کرو کیونکہ قرض سے جو تکلیف ہوتی ہے وہ تمام راحت کو مٹی کر دیتی ہے۔ راحت اور چین ہمیشہ بے فکری سے نصیب ہوتی ہے اور قرض والے کو بے فکری کہاں اس کے دل پر تو قرض کا غم پہاڑ کی طرح کھڑا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ قرض کی فکر میں نیند نہیں آتی پھر ایک ذرا چاؤ کے لئے اتنا بڑا غم اپنے سر پر سوار کرنا کون سی عقل مندی ہے۔

سالکین کو قرض سے بچنے کی ضرورت:

میں سچ کہتا ہوں کہ جس شخص کے ذمہ کسی کا قرض نہ ہو وہ چاہے کیسا ہی تنگی سے گزر کرتا ہو اس کے دل سے پوچھو کہ کتنی راحت میں ہے اور جو لوگ قرض کر کے گدی اور تکیوں پر سوتے ہیں ان کے دل سے پوچھو کہ ان پر کس قدر بوجھ ہے۔ ہمارے حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ نے تحدیث بنعمۃ اللہ اپنی وصیت میں لکھا ہے کہ بندے کے ذمہ کسی کا قرض نہیں ہوا کرتا، بالخصوص سالکین کو تو قرض سے بہت بچنا چاہیئے کیونکہ اس طریق میں جمعیت اور سکون قلب کی بہت ضرورت ہے اور قرض کرنے سے جمعیت بالکل برباد ہو جاتی ہے اور اس قرض سے بچنے کی تدبیر سادہ زندگی اور رسوم کا پابند نہ ہونا ہے جو بزرگوں کا شیوہ رہا ہے۔

میزبانی مولانا حکیم معین الدین صاحب:

چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ ایک مرتبہ مولانا حکیم معین الدین صاحب کے یہاں مہمان ہوئے۔ اتفاق سے اس دن حکیم صاحب کے یہاں فاقہ تھا۔ حکیم صاحب تھے بہت بے تکلف اگر کوئی دوسرا ہوتا تو ایسے وقت میں لاکھ جتن کرتا کہیں سے ادھار قرض کر کے لاتا اور مہمان کی دعوت ضرور کرتا مگر حکیم صاحب نے بے تکلف مولانا سے آ کر کہہ دیا کہ آپ آج میرے مہمان ہیں اور میرے گھر میں آج فاقہ ہے اگر کہیئے تو خدام بعضے درخواست دعوت کی کر رہے ہیں قبول کر لوں۔ مولانا نے فرمایا کہ نہ بھائی میں تو تمہارا مہمان ہوں اگر تمہارے گھر فاقہ ہے تو میں بھی فاقہ ہی کروں گا۔ سبحان اللہ! کیسے بے تکلف اور سادہ لوگ تھے۔ حضرت مولانا کی تو

بڑی شان ہے فاقہ سے وہ تو کیا گھبراتے اللہ کے بندے بعض ایسے بھی ہیں کہ ظاہر میں دنیا دار معلوم ہوتے ہیں اور فاقہ سے نہیں گھبراتے اور گھبرانا تو کیا الٹا اس سے خوش ہوتے ہیں۔ الہ آباد میں ایک وکیل تھے مولوی محمد صاحب مولوی ان کے نام کا جزو تھا اگر ان کو کوئی مولوی کے لقب سے ذکر کرتا تو لفظ مولوی اس کو مکرر کہنا پڑتا تھا وہ خود وکیل بھی تھے اور گھر ہی کی ذمہ داری بھی تھی مگر خرچ زیادہ ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی ان کے یہاں فاقہ کی نوبت بھی آتی تھی اور وہ اللہ کے بندے بڑی خوشی سے فاقہ کرتے تھے۔ ادھار کرنے کی عادت نہ تھی اور حیرت یہ ہے کہ اس کے بچے بھی فاقہ کے دن خوشیاں کرتے پھرتے تھے۔ انہوں نے فاقہ کا نام شیخ جی رکھا تھا جب کبھی ان کے یہاں فاقہ ہوتا تھا بچوں سے کہہ دیتے تھے کہ آج شیخ جی آئے ہیں، آج روٹی نہ ملے گی۔ بچوں کو بہلانا ہی کیا وہ اسی میں بہل جاتے تھے۔ ایک صاحب میرے دوست بیان کرتے تھے کہ وہ ان وکیل صاحب کے یہاں مہمان ہوئے، وہ کہتے تھے کہ ایک دن ان کے بچے اچھلتے کودتے پھر رہے تھے اور یہ کہتے تھے کہ آہا جی آج ہمارے ہاں شیخ جی آئے۔ کہنے لگے کہ میں یہ سمجھا کہ کوئی ان کے عزیز ہوں گے، وہ آئے ہوں گے مگر شام تک نہ تو وہ شیخ جی نظر آئے نہ میرے لئے کھانا ہی گھر سے آیا۔ میں بڑا متحیر ہوا کہ وہ کیسے شیخ جی ہیں جو گھر ہی میں گھسے بیٹھے ہیں اور ایسا ان کے واسطے کیا سامان ہوا ہوگا کہ شام تک بھی کھانا تیار نہیں ہوا۔ آخر ایک نوکر سے انہوں نے پوچھا کہ بھائی وہ کون سے شیخ جی ہیں جن کے آنے سے کھانے میں اس قدر دیر ہوئی، اس نوکر سے معلوم ہوا کہ شیخ سے مراد فاقہ ہے۔ جب وکیل صاحب کے یہاں فاقہ ہوتا تو وہ بچوں سے یہی کہہ دیتے ہیں کہ آج شیخ جی آئے ہیں روٹی نہ ملے گی۔ بچے اس میں بہل جاتے اور روٹی نہیں مانگتے۔

حق تعالیٰ شانہ کی نعمت سے کوئی مستغنی نہیں:

تو صاحبو! جب دنیاداروں نے یہ کر کے دکھلا دیا ہے تو دینداروں کو کیا مشکل ہے، مگر آج کل یہ مرض ہے کہ جہاں کوئی مہمان آتا ہے اس کے لئے خواہ مخواہ تکلیف کرتے ہیں اور مہمان کے سامنے اپنے یہاں کے کھانے کی تحقیر کرتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟ یہ آپ کو کیا پسند آیا ہوگا؟ اسی طرح بعض لوگوں کی عادت ہے کہ جب مشائخ کو کچھ ہدیہ دیتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ آپ کو تو اس کی کیا پرواہ تھی حقیر چیز ہے مگر میرا جی بھلا ہو جائے گا، اس کو قبول کر لیجئے۔ میرے تو اس لفظ سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں بھلا خدا کی نعمت سے بے پروا کون ہو سکتا ہے، مگر افسوس ہے کہ لوگوں کو اس کا مطلق خیال نہیں ہوتا۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھانا نوش فرما کر جو الفاظ فرماتے تھے ان میں یہ بھی

ہے غیر مودع ولا مستغنی عنه ربنا کہ اے پروردگار میں اس کھانے کو رخصت نہیں کرتا! اور نہ اس سے مستغنی ہوں۔ دوسرے وقت پر اس کا محتاج ہوں گا اور اس وقت بھوک ختم ہوگئی ہے اس لئے اس کو اٹھواتا ہوں، کچھ ٹھکانا ہے اس عبدیت کا کہ کھانا اٹھوانے میں چونکہ بظاہر استغنا کی صورت ہوتی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم استغنا کی صورت سے بھی اتنا بچتے تھے۔

محسن الیہ کا ادب:

اسی طرح آج کل یہ بھی مرض ہے کہ مہمان کے سامنے ایک سالن ہو تو اس کو حقیر سمجھتے ہیں اور خفیہ خفیہ محلّہ میں سے دوسرا سالن منگاتے ہیں، پھر ستم یہ کہ جس کے یہاں سے کھانا منگاتے ہیں اس کا نام بھی ظاہر نہیں کرتے حالانکہ احسان کا بدلہ ہے کہ محسن کے احسان کو ظاہر کیا جائے۔ محسن کا تو ادب یہ ہے کہ وہ اپنے احسان کو چھپائے اور محسن الیہ کا ادب یہ ہے کہ محسن کے نام کو ظاہر کر دے، مگر لوگ یہ کرتے ہیں کہ محلّہ میں سے کھانا منگاتے ہیں اور نام اپنا کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہمارے گھر میں ایک ہی سالن تھا اور اکثر ایک ہی سالن ہوتا بھی ہے۔ وقت پر مہمان آ گئے اس وقت بھائی کے یہاں سے دوسرا سالن منگا لیا گیا حالانکہ میں نے منع کر دیا تھا دو سالن ہونا کیا ضروری ہے جب گھر میں ایک سالن ہے ایک ہی بھیج دو مگر نہ مانا جس وقت مہمانوں نے کھانا شروع کیا میں نے خود ہی بھانڈا پھوڑ دیا کہ آج گھر میں ایک سالن تھا یہ دال بھائی کے گھر سے منگائی ہے۔

فضول خرچی بخل سے زیادہ بری ہے:

صاحبو! ان تکلفات کو حذف کر دینا چاہئے، اگر ہم نے یہ فضول خرچ کم نہ کئے تو ایک دن گھر کا سامان بازاروں میں بکتا نظر آئے گا۔ میرے نزدیک آج کل مسلمانوں کے لئے بخیل اور ممسک ہونا مسرف اور فضول خرچ ہونے سے ضرر میں کم ہے اگرچہ شرعاً دونوں صفتیں بری ہیں، بخل بھی اور اسراف بھی مگر پھر ان دونوں میں آج کل کی حالت و واقعات پر نظر کر کے اسراف کی صفت بخل سے زیادہ مضر ہے۔ اگرچہ عرفاً بخیل کو زیادہ برا سمجھا جاتا ہے مگر دلائل اور مشاہدہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انجام کے اعتبار سے اسراف بخل سے زیادہ برا ہے، ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ انہوں نے اسراف اور فضول خرچی میں اپنا سارا گھر بار کھو کر تنگدستی اور افلاس سے پریشان ہو کر دین تک بدل دیا اور عیسائی ہو گئے مگر کسی بخیل کی نسبت یہ نہیں سنا کہ اس نے بخل کے ساتھ روپیہ جمع کر کے پھر اپنے دین کو بدل دیا ہو۔ بخیل کے پاس چونکہ دولت جمع رہتی ہے اس کا دل غنی ہوتا ہے، پھر وہ افلاس سے کیوں پریشان ہوگا

اوراس کودین بدلنے کی نوبت کیوں آوے گی۔لوگ اگرچہ بخیل آدمی کوزیادہ برا بھلا کہتے ہیں مگر کوئی اس کے دل سے پوچھے کہ وہ کس قدر مسرور رہتا ہے۔مشہور ہے کہ سوروپیہ کا نشہ ایک بوتل کے برابر ہوتا ہے اس لئے بخیل کے اپنے پاس روپیہ جمع ہونے کی وہ خوشی ہوتی ہے کہ اس کے سامنے کسی کی برائی کی اس کومطلق پرواہ نہیں ہوتی اس لئے اس کوارتداد کی نوبت بھی نہیں آتی۔

بخل بھی مذموم ہے:

باقی چونکہ اس میں اور مفاسد ہیں اس لئے مذموم اور معصیت یہ بھی بہرحال گناہ دونوں صورتوں میں ہوگا لیکن ایک گناہ (یعنی اسراف) کفرتک پہنچادینے والا ہے اور دوسرا گناہ (یعنی بخل) کفرسے بچانے والا ہے توان دونوں گناہوں میں سے وہ گناہ ہلکا ہے جس سے ایمان محفوظ رہے اور کفرتک نوبت نہ پہنچے۔

تنگ دستی میں نیت ڈانواڈول رہتی ہے:

نیز اسراف کے ساتھ فقروفاقہ لگا ہوا ہے اور کاد الفقر ان یکون کفرا (مشکوٰۃ المصابیح:۵۰۵۱) معلوم ہے یعنی فقر کا انجام قریب ہے کہ کفرتک پہنچ جائے۔حدیث میں ہے کہ ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں درہم ودینار مسلمانوں کے لئے سب چیزوں سے بہتر ہوگا۔میرے خیال میں یہ وہی زمانہ ہے اس وقت مسلمانوں کوروپیہ بہت احتیاط سے خرچ کرنا چاہئے۔تنگدستی اور فقر میں انسان کی نیت اکثر ڈانواڈول ہوجاتی ہے اور دوسروں کے حقوق مارنے کی ہروقت فکر رہتی ہے۔

ایک شخص پر کسی بنئے کا قرض تھا اور قرض بھی سودی تھا۔اس نے یہ تدبیر کی کہ کسی طرح بنئے سے فارغ خطی لکھوانی چاہئے تو آپ نے یہ سامان کیا کہ اپنے گھر پر ڈھول باجہ منگوایا اور دوست احباب کو بلایا اس کے بعد بنئے کوبھی بلایا اور اس سے کہا کہ لالہ جی ہمارے یہاں بارات آئی ہوئی ہے۔اس میں نوتہ آوے گا بہی لیتے آؤ تا کہ سب روپیہ بیباق کر کے فارغ خطی لکھوالوں۔لالہ جی بھی کھاتہ لے کر حاضر ہوگئے۔اس نے ڈھول باجہ والوں کوتوحکم دیا کہ باجہ زور زور سے بجاؤ اور اس لالہ کومکان میں بند کر کے ڈرایا کہ فارغ خطی لکھوورنہ خیرنہیں۔مجبور ہوکراس نے لکھ دی اور اپنا سا منہ لے کر گھر آ گیا۔اس کے بعد یہ قصہ ہوا کہ لالہ جی کی دکان کے سامنے ڈھول باجہ بجتا ہوا گزرا۔اس کے لڑکے نے کہا کہ ا الہ جی بارات آرہی ہے،تو وہ کہتا ہے مکا مکا (میں نے کہا) بارات نہیں پھار کھتی لکھواتے ہوں گے (یعنی فارغ خطی لکھواتے ہوں گے سانپ کا کاٹا رسی سے بھی ڈرتا ہے وہ

غریب اب ہر بارات کو یہی سمجھنے لگا کہ فارغ خطی لکھواتے ہوں گے) تو غربت میں ایسی ایسی حرکتیں بھی انسان کر بیٹھتا ہے۔ کسی کا حق دبالیتا ہے کسی کو دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ آج کل مسلمانوں کے ہاتھ خرچ کے لئے بہت ہی کھلے ہوئے ہیں۔ احتیاط سے خرچ کرنے کا ان میں مادہ ہی نہیں۔

مسلمان بچوں کا اسراف:

ایک مرتبہ میں گنگوہ سے سہارن پور جارہا تھا، راستہ میں امبیٹھ پڑتا ہے وہاں جب سکول کے سامنے سے گاڑی گزری تو میں نے دیکھا کہ دولڑکے سکول میں سے کچھ کھانے پینے کے لئے باہر آئے۔ ایک مسلمان کا تھا دوسرے بنئے کا اور دونوں کو گھر سے پیسے ملے تھے کہ ان کا کچھ لے کر کھا لینا۔ اب ان دونوں لڑکوں میں گفتگو ہوئی کہ ان پیسوں کا کیا لینا چاہئے۔ مسلمان لڑکے نے کہا ہم تو پیڑا خریدیں گے۔ بنئے کے لڑکے نے کہا میں تو سنگھاڑے خریدوں گا کچھ پیٹ میں بوجھ بھی ہو۔

اولاد کو چٹور پن سکھانا مذموم ہے:

دیکھ لیجئے مسلمانوں اور بنئیوں کے اولاد میں بچپن ہی سے یہ تفاوت ہوتا ہے کہ بنئیوں کے بچوں کو بھی کفایت پر نظر ہوتی ہے سو اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے جس طرح اپنے بڑوں کو دیکھتے ہیں اسی طرح سبق سیکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی چونکہ کفایت پر نظر نہیں ہوتی ان کے بچے بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ تم بالکل بنئیوں کی طرح ہو جاؤ مگر خدا کے واسطے اپنی اولاد کو چٹور پن تو نہ سکھلاؤ جس کی وجہ سے وہ ساری عمر پریشان ہوتے ہیں۔ غرض میں گناہوں کی فہرست کہاں تک گناؤں عموماً ہم لوگوں میں گناہوں سے بچنے کا بالکل اہتمام نہیں بہت کم ایسے لوگ ہیں جن کو یہ فکر ہوتی ہے کہ گناہ سے ہم کو بچنا چاہئے اور جن کو فکر بھی ہے وہ ہمت سے کام نہیں لیتے بس ان کی بڑی دوڑ یہ ہوتی ہے کہ کسی بزرگ کے پاس جائیں گے اور ان سے یہ درخواست کریں گے کہ حضرت کوئی توجہ ایسی کیجئے کہ گناہ چھوٹ جائیں۔

گناہوں سے بچنے کے اہتمام کی ضرورت:

سبحان اللہ! بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ جو حضرات گناہوں سے بچے ہیں کیا ان پر کوئی توجہ ہوئی تھی۔ انہوں نے تو مجاہدے کئے تھے، ہمت سے کام لیا تھا، جب گناہوں سے بچے ہیں۔

اصل مجاہدہ ہمت کا نام ہے:

مجاہدے سے میری یہ مراد نہیں کہ کھانا پینا کم کر دیا تھا آج کل لوگوں نے صرف اسی کا نام مجاہدہ

رکھ لیا ہے کہ کھانا پینا کم کر دیا جائے۔ چنانچہ مشائخ کی فضیلت میں سب سے پہلے اسی کا ذکر کیا جاتا ہے کہ حضرت نے سات برس تک گیہوں کی روٹی نہیں کھائی۔ فلاں بزرگ نے اتنے سال تک پانی نہیں پیا۔ سو خوب سمجھ لو کہ مجاہدہ صرف اسی کا نام نہیں اور نہ اس کی چنداں ضرورت ہے بلکہ آج کل تو چونکہ قوتیں خود کم ہیں یہ مجاہدہ مضر بھی ہوتا ہے۔ آج کل خوب کھانا پینا چاہئے ورنہ چار دن میں دماغ کو لے کر بیٹھ رہو گے پھر کسی کام کے بھی نہ رہو گے اس کے علاوہ ایک اور راز بھی ہے جو لوگ کھانا پینا کم کر دیتے ہیں اور بڑے بڑے مجاہدے کرتے ہیں ان میں عجب پیدا ہو جاتا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بہت محنت کرتے ہیں اس لئے ہم ثمرات کے ضرور مستحق ہیں پھر اگر ان کو کچھ ثمرات عطا ہوتے ہیں تو ان کی اپنی محنت اور مجاہدے کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ خالص عطاء حق نہیں سمجھتے اور اس طریق میں عجب بہت ہی سدراہ ہوتا ہے خدا کے راستے میں جو کچھ عطا ہوا اس کو اپنے اعمال کا ثمرہ نہ سمجھنا چاہئے بلکہ محض خدا تعالیٰ کا عطیہ سمجھ کر شکر کرنا چاہئے اور جو لوگ خوب کھاتے پیتے ہیں اور کام بھی کرتے ہیں جب ان کو ثمرات عطا ہوتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے کام ہی کیا کیا تھا یہ محض خدا تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ یہ دولت عطا فرما دی۔ ان کو عجب نہیں ہوتا اس لئے بھی آج کل زیادہ مجاہدے، جن کو عام طور پر مجاہدہ سمجھا جاتا ہے مناسب نہیں اور پہلے لوگوں کے قویٰ بھی اچھے تھے، فہم بھی اچھے تھے، ان کو ان مجاہدوں سے یہ مضار نہ ہوتے تھے۔ اصل مجاہدہ تو یہ ہے کہ نفس کی مخالفت کی جائے، نفس کے تقاضوں پر عمل نہ کیا جائے۔ مثلاً نفس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ادھر ادھر کی باتیں بنائی جائیں، کسی کی غیبت، شکایت کی جائے تو مجاہدہ یہ ہے کہ اس تقاضے کی مخالفت کرو اور صبح سے شام تک زبان کو قفل لگا دو، کوئی بات خلاف شرع نہ کہو۔ اسی طرح نفس تقاضا کرتا ہے کہ حسین صورتوں کو دیکھو اس وقت مجاہدہ یہ ہے کہ اس تقاضے کے مقتضاد پر عمل نہ کرو اور آنکھیں بند کر لو۔ غرض کہ اصل مجاہدہ ہمت کا نام ہے کہ ہمت کے ساتھ نفس کی ناجائز خواہشوں کا مقابلہ کیا جائے۔ اس میں پہلے پہل دشواری پیش آتی ہے مگر وہ ایسا کون سا کام ہے جو پہلے ہی دن آسان ہو جائے۔ دنیا کا بھی ہر کام پہلے پہل مشکل ہی معلوم ہوتا ہے مگر اپنے فائدہ کے لئے اس کو کرتے ہی ہیں، کرتے کرتے ہر کام آسان ہو جاتا ہے۔

حقیقی مجاہدہ:

اسی طرح یہاں بھی ہمت کر کے بار بار نفس کے تقاضوں کی مخالفت کرو۔ چند روز کے بعد پھر مخالفت کی عادت ہو جائے گی اور عادت سے ہر کام سہل ہو جاتا ہے بس اسی کا نام حقیقی مجاہدہ ہے اس سے اتباع کامل اور استقامت نصیب ہو جاتی ہے اور یہی بڑی کرامت ہے اس کے سامنے ہزار کرامتیں ہیچ ہیں۔

حضرت جنید رحمہ اللہ کی معنوی کرامات:

ایک شخص حضرت جنیدؒ کے پاس دس سال رہا مگر اس عرصہ میں کوئی حسی کرامت اس کو نظر نہ آئی۔ دس سال کے بعد اس نے عرض کیا کہ حضرت میں دس سال سے آپ کے پاس ہوں، مجھے کوئی کرامت آپ کی معلوم نہیں ہوئی جس طرح اور لوگ ہیں ایسے ہی آپ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی خاص بات آپ کے اندر مجھے معلوم نہیں ہوئی۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ تم نے اس دس سال کے عرصہ میں جنیدؒ سے کوئی کام خلاف شرع صادر ہوتے دیکھا۔ اس نے کہا حضرت کوئی بات خلاف شرع تو نہیں دیکھی۔ فرمایا اس سے زیادہ جنیدؒ کی کرامت اور کیا چاہتے ہو کہ دس برس میں اس سے ایک کام بھی خلاف شرع نہیں ہوا۔ اپنے کمالات بیان کرنے کی بزرگوں کی عادت نہیں ہوتی بلکہ اس سے ان کو نفرت ہوتی ہے مگر طالبین کے سامنے کبھی کوئی بات کہہ دیتے ہیں تا کہ وہ ان کے فیوض و برکات سے نفع حاصل کریں۔ پس مقصود اپنی مدح نہیں ہوتی بلکہ طالب کا نفع مقصود ہوتا ہے وہ سائل بھی طالب ہوگا اس لئے حضرت جنید نے اس کے سامنے معنوی کرامت کو بیان فرما دیا اور ساتھ ہی اس کو یہ بھی بتلا دیا کہ حسی کرامتوں سے معنوی کرامتیں بڑھی ہوئی ہیں۔

کرامت کی حقیقت:

اس پر نظر کرنی چاہئے تھی، تم دس سال تک ظاہری کرامتوں کے پیچھے پڑے رہے اور یہ تمہاری غلطی تھی۔ اگر تم کرامت کی حقیقت سے واقف ہوتے تو قدم قدم پر تم کو کرامتیں معلوم ہوتیں۔ یہ غور کرتے کہ میں ہر کام کو کس طرح شریعت کے موافق کرتا ہوں اور قدم قدم پر کس طرح رضاء حق کا خیال رکھتا ہوں۔ یہ تھی بڑی کرامت، اسی لئے صوفیہ فرماتے ہیں الاستقامۃ فوق الکرامۃ کہ احوال کا مستقیم ہو جانا کرامت حسی سے بڑھ کر ہے اور استقامت حاصل ہوتی ہے نفس کی مخالفت سے جب بار بار نفس کو اتباع شریعت پر مجبور کیا جائے گا تو استقامت عطا ہو جائے گی۔

زاہدان خشک کا مجاہدہ:

مگر آج کل اس مجاہدہ کو بہت کم لوگ اختیار کرتے ہیں۔ صرف کھانا پینا کم کر دیتے ہیں اور اس کا ایک راز ہے وہ یہ کہ کھانا پینا کم کر دینا سب کو معلوم ہو جاتا ہے تو اس مجاہدہ سے شہرت جلدی ہو جاتی ہے اور نفس کو شہرت مطلوب ہے اور مخالفت نفس کا کسی کو علم نہیں ہوتا۔ کسی کو کیا خبر ہے کہ اس وقت ان حضرت کے نفس میں کیا تقاضا پیدا ہو رہا ہے اور یہ کس طرح اس کو دبا رہے ہیں۔ غرض کہ

ترک معاصی کی کوئی صورت محسوسہ نہیں ہے جس سے دوسروں کو اس مجاہدہ کی خبر ہو جایا کرے اس لئے اس مجاہدہ یعنی مخالفت نفس کی کسی کو خبر نہیں ہوتی تو اس میں شہرت بھی حاصل نہیں ہوتی اس لئے اس طریقہ کو بہت کم اختیار کیا جاتا ہے مگر جو طالب صادق ہوگا وہ شہرت سے ضرور نفرت کرے گا۔ طالب شہرت ہرگز طالب خدا نہیں ہوسکتا اس لئے جو واقعی طالب صادق ہیں وہ اسی مجاہدہ کو اختیار کرتے ہیں اور کھانا پینا اہتمام سے کم کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کچھ نہیں کرتے۔ بڑے آرام سے رہتے ہیں مگر ان کے دل پر جو آرے چلتے ہیں ان کی کسی کو کیا خبر ہے پس کھانا پینا کم کرنا یہ زاہدان خشک کا مجاہدہ ہے عارف اس پر نظر نہیں کرتا۔

عارفین کا مجاہدہ:

عارف کا مجاہدہ مخالفت نفس ہے، تو صاحبو! بزرگان دین تو اس مصیبت سے نفس کو سیدھا کرتے ہیں اس کے بعد کہیں جا کر وہ گناہوں سے محفوظ ہوتے ہیں۔ توجہ سے بھی کہیں گناہ چھوٹا کرتے ہیں اگر آج بزرگوں کی توجہ سے گناہ چھوٹنے کی درخواست ہے تو بس کل کو چکی لے آنا کہ حضرت ایک توجہ سے چکی بھی چلا دیجئے کہ خود بخود آٹا پس جائے۔ بھلا اس حماقت کی بھی کوئی انتہا ہے جو کام تمہارے کرنے کا ہے اس کو خود کرو، پھر برکت کے لئے بزرگوں سے دعا کراؤ۔ یوں کہنا چاہئے کہ حضرت میں نے معاصی کو چھوڑنے کی ہمت کی ہے، پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو جاوے خدا کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کروں گا۔ آپ بھی دعا فرمایئے کہ حق تعالیٰ میری ہمت میں برکت عطا فرما دیں۔ اس کا مضائقہ نہیں مقبولان الٰہی کی دعا سے ہمت میں برکت ضرور پیدا ہو جاتی ہے اور اگر تم خود ارادہ نہ کرو، نہ ہمت سے کام لو تو بزرگوں کی دعا سے یہ نہیں ہوسکتا کہ ہر وقت ڈنڈا لئے کوئی مؤکل تمہارے اوپر مسلط ہو جائے کہ تم جب گناہ کا قصد کرو وہ ڈنڈوں سے تمہاری خبر لیا کرے۔ اب میں توجہ کی حقیقت آپ کو بتلاتا ہوں۔

توجہ کی دو قسمیں:

توجہ کی دو قسمیں ہیں ایک توجہ اختیاری، وہ تو ہمت اور تصرف کا نام ہے کہ شیخ مرید کے قلب کی طرف متوجہ ہو کر اس میں کوئی تصرف کر دے۔ اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا، فوری اثر ہوتا ہے اس وقت تو قلب میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کچھ دیر کے بعد زائل ہو جاتی ہے۔ دوسری توجہ غیر اختیاری ہے وہ یہ کہ تم شیخ کی اطاعت کرو اس کو راضی رکھو اس سے خود بخود شیخ کے دل میں تمہاری

محبت پیدا ہو جائے گی۔ بڑا فائدہ اس سے ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں تمہارا خیال شیخ کے دل میں رہے گا اور حق کی نظر شیخ کی طرف رہتی ہے تو جب تم اس کے دل میں بیٹھے رہو گے تو تم کو بھی اس نظر حق سے حصہ عطا ہو جائے گا۔ پھر وہ نظر تمہارا کام بنا دے گی۔ پس یہ توجہ اس قابل ہے کہ اس کے لئے کوشش کی جائے۔

طالبین تصرف:

مگر آج کل اس کی کوشش نہیں کی جاتی، صرف تصرف کے طالب ہوتے ہیں تاکہ خود آرام سے رہیں کچھ کرنا نہ پڑے اور اس آرام طلبی میں یہاں تک غلو ہوا ہے کہ بعض مریدوں کی یہ حالت ہے کہ پیر ایسا تلاش کرنا چاہتے ہیں جو خود ان کی خاطر کرے۔ خود شیخ کی اطاعت کرنا نہیں چاہتے۔ مجھ سے ایک اودھ کے رئیس کہنے لگے کہ مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب کے یہاں تو مریدوں کی بڑی بے قدری ہوتی ہے ہر وقت نکالنے کا حکم زبان پر رہتا ہے کوئی ایسا شیخ بتاؤ جہاں مریدوں کی قدر ہوتی ہو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون لیجئے یہ طلب رہ گئی ہے کہ مرید یہ چاہتے ہیں کہ پیر ایسا ہو جو ہماری قدر کرے۔ جس مرید کو اپنی قدر کرانے کی خواہش ہوگی وہ کیا خاک شیخ کی اطاعت کرے گا۔

طلب کی حقیقت:

طلب تو اس کا نام ہے کہ مرید اپنی طرف سے اس کے لئے بھی آمادہ رہے کہ اگر شیخ بر سر بازار بھی جوتیاں مارے تو ذرا سا میل بھی دل میں نہ آئے اگرچہ شیخ عمر بھر بھی کبھی ایسا نہ کرے مگر مرید کو ہر وقت اسکے لئے تیار رہنا چاہئے اور بعضے مشائخ ایسا کرتے بھی ہیں۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے مکہ میں ایک شیخ کو دیکھا کہ مرید سے اٹھک بیٹھک کرا رہے ہیں۔ حاجی صاحب کے ایک مرید بیان کرتے تھے کہ حضرت نے یہ منظر دیکھ کر ان سے فرمایا کہ کبھی ہم کو بھی اٹھک بیٹھک کراتے تم نے دیکھا ہے؟ واقعی ہمارے مشائخ تو رحمت مجسم ہیں، وہ مریدوں کو ایسی سخت سزائیں کبھی نہیں دیتے اور خصوصاً حضرت حاجی صاحب کے یہاں تو رحمت ہی رحمت تھی۔ غصہ کبھی آتا ہی نہ تھا مگر ایسے پیروں کی لوگ قدر نہیں کرتے۔ ہاں ان کی قدر کرتے ہیں جو بات بات میں سینکڑوں سناتے ہیں۔ دوسرے یہ تو بتاؤ کہ اگر تم پیر کی توجہ سے گناہوں سے بچ بھی گئے تو اس میں تم کو کیا ثواب ملے گا، کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ ثواب تو امورِ اختیاریہ پر ہوتا ہے اور جب پیر کی توجہ اور نظر سے تم گناہ ہی نہ کر سکے یا گناہوں کا خیال ہی تمہارے دل میں نہ آیا تو اختیار کہاں رہا اور جب

اختیار نہ رہا تو ثواب بھی نہ ہوگا۔ عنین اگر زنا سے بچا رہا تو کیا کمال کیا اور اس کو زنا سے بچنے کا ثواب ہی کیا ملا جب کہ وہ زنا پر قادر ہی نہیں۔ ثواب اسی شخص کو ملے گا جو زنا پر قادر ہے اور اس کے دل میں وسواس بھی آتے ہیں، پھر خدا کے خوف سے نہیں کرتا۔

بزرگوں کو استقامت مجاہدہ کی بدولت ملی:

یادرکھو بزرگوں میں یہ استقامت اور گناہوں سے احتیاط کسی کی توجہ سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ ان کو یہ دولت مجاہدہ سے ملتی ہے اور مجاہدہ سے مراد وہی ہے مخالفت نفس۔ بس اسی طریقہ سے تم بھی گناہوں سے بچ سکتے ہو۔ نفس معاصی کا تقاضا کرتا ہے اس کو روکو اور اطاعت میں کسل کرتا ہے اس کا مقابلہ کرو۔ بس یہی خلاصہ ہے تمام تصوف کا۔ اذکار، اشغال اور مراقبات بھی اسی لئے کئے جاتے ہیں تا کہ نفس کے تقاضوں کا مقابلہ آسان ہو جائے اور ہمت میں قوت اور برکت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ایک مراقبہ اس آیت میں بھی تعلیم کیا گیا ہے جس کو میں نے تلاوت کیا تھا مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ جس شخص کو خدا سے ملنے کا اشتیاق یا خوف ہو وہ اس کو سوچا کرے کہ خدا سے ملنے کا وقت ضرور آنے والا ہے جنت اور دوزخ کے احوال واہوال کے سوچنے سے دل میں رغبت اور خوف پیدا ہوگا اور نفس کا مقابلہ سزا کے استحضار سے آسان ہوتا ہے اور طاعات میں مشقت ومحنت ثواب کے استحضار سے سہل ہوتی ہے تو اس مراقبہ سے دونوں کام بن جائیں گے گناہوں سے بچنے کی بھی ہمت ہو جائے گی اور طاعات میں کسل بھی نہ رہے گا۔ جس وقت نفس میں معصیت کا تقاضا پیدا ہو اس وقت پانچ منٹ کے لئے دوزخ کا تصور کر لینا چاہئے کہ اس تھوڑی سی لذت کا انجام یہ ہوگا کہ سخت عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا اور جس وقت طاعات میں سستی اور کاہلی پیدا ہو اس وقت جنت کی نعمتوں کا تصور کرنا چاہئے کہ ذرا سی مشقت برداشت کر لینے سے ابدالآباد کی راحت نصیب ہوگی۔ تو صاحبو! جس کسی کو گناہوں سے بچنے کا شوق ہو وہ قرآن کی اس تعلیم پر عمل کرے ہمارے اندر رغبت اور خوف دونوں کی بہت کمی ہے اسی وجہ سے ہم گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اگر یہ دو باتیں پیدا ہو جائیں تو پھر کبھی معاصی کا ارتکاب ہی نہ ہو اور نہ طاعت میں سستی ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو شانیں:

اسی واسطے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو شانیں حق تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں۔ مبشراً ونذیراً کہ آپ بشارت دینے والے اور ڈرانے والے ہیں یعنی بندوں میں رغبت اور خوف پیدا

کرنے والے ہیں جس پر تمام دین کا مدار ہے اس کے بدون دین کامل نہیں ہوسکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ طبائع مختلف ہیں کہیں زیادہ خوف انفع ہوتا ہے کہیں زیادہ رغبت زیادہ نافع ہوتی ہے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں ان دوشانوں کے ہونے کا راز وہی ہے جو میں نے ابھی بیان کیا ہے۔

ہر مسلمان کو دو حالتیں پیش آتی ہیں:

تمام مسلمانوں کو دو حالتیں پیش آتی ہیں۔ ایک تقاضا معصیت کا دوسرے سستی، اور کسل طاعات میں حق تعالیٰ نے ان دونوں کا علاج اس طرح کیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ دو شانیں رکھ دیں مبشر ونذیر۔ آپ بشارت دے کر سستی اور کسل کو دور فرماتے ہیں اور عذاب سے ڈرا کر معاصی سے بچاتے ہیں اور نفس کے تقاضے کو کمزور بناتے ہیں۔ پس جس وقت طاعات میں نفس سستی کرے فوراً یاد کرو کہ اس کے چھوڑنے میں عذاب ہوگا اور بجالانے میں ثواب ملے گا اور جب گناہوں کا تقاضا ہو تو فوراً سوچو کہ اس کے کرنے سے عذاب ہوگا اور چھوڑنے سے ثواب ملے گا۔

آخرت کے ثواب وعذاب کی ضرورت استحضار:

اعتقاداً تو ہر مسلمان کو عذاب وثواب اور جنت و دوزخ کا یقین ہے ہی مگر اعتقادی علم کافی نہیں ہے بلکہ اس کے استحضار کی بھی ضرورت ہے۔ اس کا مراقبہ اتنا کرنا چاہئے کہ ہر وقت عذاب و ثواب کا خیال دل میں حاضر رہے، اسی لئے حق تعالیٰ نہایت تاکید کے ساتھ فرماتے ہیں **فان اجل الله لآت** (سو مدت معین ضرور آنے والی ہے) اس میں ان حروف سے تاکید ہے، اس کے بعد خبر پر لام تاکید ہے پھر جملہ اسمیہ خود تاکید کو موجب ہے مطلب یہ ہے کہ آخرت کا آنا بالکل یقینی ہے اس میں ذرا بھی شک نہیں اب آپ خود سوچ لیں کہ جس طرح ہم کو دوسری یقینی باتوں کا استحضار رہتا ہے کیا ایسا ہی استحضار آخرت کا بھی ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کو پھانسی کا حکم سنا دیا جائے تو اندازہ کرلیا جائے کہ اس کی کیا حالت ہوجاتی ہے۔ اگرچہ حکم سنا دینے کے بعد پھانسی دے دینا حاکم کے اختیار میں من کل الوجہ نہیں ممکن ہے کہ آگے چل کر اپیل منظور ہوجائے مگر ان سب احتمالات کے باوجود پھر بھی جو حالت اس شخص کی ہوتی ہے جس کو پھانسی کا حکم سنایا گیا ہے اس سے کوئی ناواقف نہیں۔ وہ ان احتمالات پر مطلق نظر نہیں کرتا اس کے سر پر ہر وقت موت کھیلتی ہے اور وہ مرنے سے پہلے مردہ ہوجاتا ہے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ایک ادنیٰ حکم کا انسان پر کیا اثر ہوتا ہے جس کا واقع ہونا آخرت کے برابر یقینی ہرگز نہیں ہوتا۔ اسی طرح جس دن نوشہ کی شادی ہوتی ہے اس دن اس کی خوشی کا اندازہ کیا جائے کہ اس کو اپنی مسرت میں کھانے پینے کی بھی خبر نہیں رہتی حالانکہ ابھی بارات ہی

آئی ہے نکاح بھی نہیں پڑھا گیا۔ ممکن ہے کہ نکاح کے وقت کسی بات پر تکرار ہو جائے اور ساری شادی رل رلا جائے۔ چنانچہ بعض دفعہ ایسے واقعات پیش بھی آئے ہیں مگر ان کو ایسی مسرت ہوتی ہے کہ اس کے سامنے ان احتمالات کا وہم بھی اس کو نہیں آتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن باتوں کا ہم کو یقین یا غلبہ ظن ہو جاتا ہے اس کی مسرت یا دہشت اس درجہ غالب ہوتی ہے کہ ہر وقت اسی کا دھیان بندھا رہتا ہے۔ کیوں صاحبو! سچ بتلائیے گا کیا آخرت کے ثواب وعذاب کا بھی ہم کو ایسا ہی دھیان اور ایسا ہی استحضار ہے؟ ہرگز نہیں۔ پھر اس کی کیا وجہ، کیا آخرت کے ثواب وعذاب کا یقین نہیں، اگر یہ بات ہے تو ایمان کی خیر منانی چاہئے اور اگر یقین ہے تو پھر اس کا استحضار کم کیوں ہے۔ بات یہ ہے کہ پھانسی کا حکم سننے والا اپنی آئندہ حالت کو بار بار سوچتا رہتا ہے کہ مجھے اس طرح لٹکایا جائے گا۔ یوں گلے میں رسی پڑے گی، پھر میں اس طرح تڑپوں گا۔ ان باتوں کے سوچنے سے اس کے اوپر غم سوار ہو جاتا ہے اور موت ہر دم سامنے کھڑی رہتی ہے۔ اسی طرح شادی کرنے والا آئندہ کے عیش و عشرت کو سوچ سوچ کر اس سے بار بار مزے لیتا ہے۔ اس لئے وہ خیال اس کے دل پر غالب ہو جاتا ہے اور آخرت کے بارے میں ہم لوگ اجمالی علم پر اکتفا کرتے ہیں اس کی تفصیل کو بار بار نہیں سوچتے ورنہ یہاں بھی وہی حالت ہو جاتی۔ دیکھئے جب آدمی کہیں سفر کرتا ہے اور اپنے کاموں سے فارغ ہو کر سامان ساتھ لے کر وطن کا قصد کرتا ہے تو گھر پہنچنے سے پہلے راستہ میں وہ اپنے دل سے اس طرح کی باتیں کیا کرتا ہے کہ اب جلدی گھر پہنچ کر بیوی بچوں سے ملیں گے۔ بیوی کو فلاں زیور پہنائیں گے، بچوں کو یہ کھلونے دیں گے، ان سے وہ خوش ہوں گے اور فلاں کمرہ کو اس سامان سے سجائیں گے اس کے واسطے خس کی ٹٹیاں خریدی ہیں وہاں یہ خس کی ٹٹیاں لگائیں گے۔ غرض سارے راستہ وہ اسی حدیث النفس میں مشغول رہتا ہے اور اس انہماک میں محض تصور سے بعض دفعہ اس سے وہ حرکات صادر ہوتی ہیں جو وقوع کے وقت ہوتیں۔

آخرت کے لئے حدیث النفس پیدا کرنے کی ضرورت:

اسی طرح کوئی تجارت شروع کرتا ہے تو اس میں بھی حدیث النفس قائم ہو جاتا ہے۔ اپنے دل ہی میں خرید وفروخت آمدنی اور خرچ نفع اور نقصان کا حساب لگاتا رہتا ہے۔ غرض دنیا کے ہر کام میں حدیث النفس ضرور پیدا ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے ہر دم اپنے نفس ونقصان کی فکر رہتی ہے۔ افسوس ہے کہ آخرت کے لئے یہ حدیث النفس کبھی پیدا نہیں ہوتا، اس وقت بھی جتنے حاضرین ہیں سب اپنے اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ چوبیس گھنٹوں میں کسی وقت بھی

آخرت کا سوچ بچار اور حدیث النفس پیدا ہوتا ہے؟ کبھی تمہارا دل یہ سوچتا ہے کہ ہم ایک دن مریں گے، عذاب اور ثواب ہوگا، خدا کے سامنے جانا ہوگا۔ اس کام سے خدا تعالیٰ ناراض ہوں گے فلاں کام سے راضی ہوں گے اس کو نہ کرنا چاہیئے اس کو کرنا چاہیئے، اس طرح آپ کا دل باتیں کرتا ہے؟ کبھی نہیں۔ پس اجمالاً اعتقاد ہے کہ جنت حق ہے جہنم حق ہے مگر میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ اجمالی اعتقاد اصلاح کے لئے کافی نہیں۔ یہ سوچ بچار اور حدیث النفس اپنے اندر پیدا کرو اگر یہ پیدا ہو جائے تو سب کام درست ہو جائیں اور پھر بھی اگر کچھ کمی ہوگی تو اسی سوچ بچار کی کمی سے ہوگی۔ تو صاحبو! یہ تدبیر گناہوں سے بچنے کی ہے، نہ کہ پیر کی خالی توجہ سے اس کو پیدا کرو۔

اپنے اصلی گھر کا تصور:

اگر پہلے پہلے اس میں کچھ تکلیف بھی ہوگی تو وہ اس تکلیف سے کم ہوگی جو معصیت کے بعد ہوگی اور گناہوں سے خود دنیا میں بھی بہت تکلیف ہوتی۔ آخرت کا عذاب تو جدا رہا گناہ سے طبیعت پر توحش دل میں تاریکی اور گھٹن اور بے چینی پیدا ہوتی ہے، تو اس مراقبہ یعنی دھیان اور سوچ بچار میں اس سے تو کم ہی تکلیف ہوگی اور دو چار دن کے بعد جو لطف آئے گا اس کو تم خود دیکھ لو گے اس کے لئے روزانہ کم از کم ایک گھنٹہ یا آدھ گھنٹہ مقرر کر لو اس میں یہ سوچا کرو کہ پہلے ہم کیا تھے کہاں تھے اور دنیا میں کس لئے آئے ہیں؟ پہلے ہم جنت میں تھے وہی ہمارا اصلی گھر ہے وہاں پہنچنے کے لئے ہم کو دنیا میں کچھ کام کرنا چاہئے اور گناہوں سے بچنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ اپنے اصلی گھر سے بچھڑ جائیں اور دوزخ کی قید میں پھنس جائیں۔ دنیا کے زوال وفنا کو بھی سوچو کہ یہاں آخر ہم کب تک رہیں گے۔ ایک دن تو یہاں سے جانا ہی ہے۔

دلا تا کے دریں کاخ مجازی — کنی مانند طفلان خاک بازی
توئی آن دست پرور مرغ گستاخ — کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرا زاں آشیاں بیگانہ گشتی — چو دو ناں چغد ایں ویرانہ گشتی

''اے دل کب تک اس مجازی محل میں بچوں کی طرح خاک بازی کرتا رہے گا، تو وہی ہاتھ کا پلا ہوا مرغ گستاخ ہے کہ تیرا آشیانہ اس محل سے باہر تھا کیوں اپنے اصلی آشیانہ سے بیگانہ ہو گیا ہے مانند اُلوؤں کے اس ویرانہ میں ہے۔''

روزانہ اس طرح تصور کرنے سے انشاء اللہ آخرت کا حدیث النفس آپ کے دل میں پیدا ہو جائے گا۔ پھر انشاء اللہ سب کام بن جائیں گے۔ گناہوں کا بھی خیال نہ آئے گا اور اگر خیال آیا

بھی تو اس کا مقابلہ آسان ہوگا اور اعمال و طاعت میں بھی سستی اور کسل نہ ہونے پائے گا۔ ایک مقصود تو میرا یہ تھا جس کو بحمد اللہ میں نے بہت تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا اب ایک بات رہ گئی۔ بیان کر کے مضمون ختم کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ بعض طبائع میں مستقبل کی چیز کے حالات میں غور کرنے سے اثر کم ہوتا ہے اور حاضر کے تصور کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ ایسے لوگوں پر آخرت کے تصور کا اثر نہ ہو کیونکہ وہ اس کو من کل الوجوہ مستقبل سمجھتے ہیں میں اس وقت بتلانا چاہتا ہوں کہ عالم آخرت کو من کل الوجوہ مستقبل نہیں سمجھتے۔ ایک طرح سے وہ حاضر بھی ہے اس طرح سے کہ آخرت کا زمانہ تو غائب ہے کہ ہم کو یہ معلوم نہیں کہ حساب کتاب کب ہوگا اور جنت میں جانا کب نصیب ہوگا لیکن مکان آخرت اس وقت بھی حاضر ہے۔

تصور جنت:

کیونکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ساتویں آسمان کے اوپر ہے اور وہ اس وقت حاضر ہے اور اس کی سمت محسوس بھی ہے تو ہم کو چاہئے کہ جنت کا تصور اس طرح کریں کہ گویا یہ مکان جہاں ہم رہتے ہیں دو منزلہ مکان ہے ایک منزل جو اوپر ہے وہ ہمارا اصلی مکان ہے اور یہ منزل جہاں ہم اس وقت موجود ہیں ہمارا اصلی مکان نہیں بلکہ یہاں عارضی طور پر آئے ہیں اور ہر منزل میں جدا کرایہ دار رہتا ہے اسی طرح تم اپنے آپ کو سمجھو کہ سودا لینے کے واسطے اوپر کی منزل سے نیچے آئے ہیں الدنيا مزرعة الأخرة (اتحاف السادۃ المتقین ۵۳۹:۸) (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) تو کیا کبھی ایسا سنا ہے کہ بمبئی کے مکانوں میں اوپر کی منزل والا اگر سودے وغیرہ کے لئے نیچے اترا ہو تو اپنی منزل کو بھول گیا ہو، پھر کیا وجہ ہے کہ تم بھی اسی طرح ایک منزل سے دوسری منزل میں سودا خریدنے کے واسطے آئے تھے حیرت ہے کہ تم اپنی اصلی جگہ کو بھول گئے۔ پس جن لوگوں کی طبائع مستقل چیز کے تصور سے متاثر نہیں ہوتیں وہ خوب سمجھ لیں کہ زمان آخرت گو اس وقت معدوم ہے مگر مکان آخرت تو معدوم نہیں۔ وہ آپ کے سر کے اوپر موجود ہے اس کا تصور کیا کرو کہ ہم پہلے اوپر کی منزل میں تھے وہاں ایسی راحت اور چین ہے کہ یہاں اس کے برابر خاک بھی راحت نہیں اور اس منزل میں ہم صرف اس واسطے آئے ہیں کہ حق تعالیٰ کی عبادت اچھی طرح کریں تو پھر ہم اس منزل میں پہنچ جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم سے طاعات میں کوتاہی ہو جائے اور اپنے اصلی گھر سے ہم محروم کر دیئے جائیں اور کسی دوسرے کو وہ جگہ دے دی جائے۔ اس تصور کا

بہت زیادہ اثر ہوگا اسی طرح ان زمینوں کے نیچے دوزخ ہے جو بالکل آپ کے پیروں تلے ہے تو بجائے اس کے کہ تم آگرہ کے جیل خانہ کا تصور کرو یہ تصور زیادہ باعث خوف ہے کہ دوزخ کا جیل خانہ ہر وقت ہمارے پیروں کے نیچے ہے جب تم دوزخ کو اس طرح تصور کرو گے تو بعض دفعہ زمین پر چلتے ہوئے بھی ڈر لگنے لگا کہ اس کے نیچے جیل خانہ آگ سے بھرا ہوا دہک رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ ہم اس میں ڈال دیئے جائیں۔ غرض کہ جنت آپ کے سر پر ہے اور دوزخ پیروں کے نیچے ہے اور تم دونوں کے بیچ میں ہو۔ پھر آخرت کو من کل الوجوہ غائب کیوں سمجھتے ہو اب تو بہت زیادہ ڈرنا چاہیئے کہ دیکھئے ہمارے اعمال صالحہ ہم کو اوپر چڑھاتے ہیں یا اعمال سیئہ ہم کو نیچے دھکا دیتے ہیں۔ اگر ہم نے اب بھی اصلاح نہ کی تو دوزخ کہیں دور نہیں۔ ہمارے نیچے ہی موجود ہے اور ہم اسی کے اوپر چلتے پھرتے ہیں، اسی کے اوپر غافل ہو کر سوتے ہیں اور اسی سے بے خبر ہو کر گناہ کرتے ہیں یہاں سے حکمت معلوم ہوگئی ہوگی جنت اور دوزخ کے اتنے پہلے پیدا کئے جانے کی، اگر جنت و دوزخ اس وقت بالکل معدوم ہوتی تو اس کے تصور کا بعض طبائع پر بالکل اثر نہ ہوتا۔ موجود شئے کے تصور کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے اور بھی خدا جانے کیا کیا حکمتیں ہوں گی جن میں سے ایک اس وقت سمجھ میں آ گئی۔

تصور آخرت:

تو بس آخرت کے تصور کے لئے اس دو منزلہ مکان اور تہہ خانہ والے جیل خانہ کا تصور کر لیا کرو انشاء اللہ اس سے اعمال صالحہ کی فکر ہوگی اور گناہوں سے بچنے کی ہمت ہوگی۔ پھر جب فکر پیدا ہو جائے گی تو طلب بھی پیدا ہو جائے گی اور طلب کے بعد محرومی نہیں ہوا کرتی یہی طریقہ اعمال صالحہ کے آسان کرنے کا اور گناہوں سے بسہولت بچنے کا اس آیت میں تعلیم کیا گیا ہے۔ آگے فرماتے ہیں **وَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ**

دوسرا مراقبہ:

یہ ایک دوسرا مراقبہ ہے یعنی حق تعالیٰ ہر بات کو سنتے اور ہر حالت ہماری جانتے ہیں۔ پس ہر کام کے وقت یہ بات بھی حاضر رکھا کرو کہ اس سے اور زیادہ رغبت اور خوف میں ترقی ہوگی کہ حق تعالیٰ ہر وقت ہمارے اقوال و احوال کو سنتے اور جانتے ہیں تو یہ کیسی بے حیائی ہے کہ ان کو سنا سنا کر دکھا دکھا کر گناہ کئے جائیں اور یہ کیسی بے غیرتی ہے کہ حاکم حقیقی کے سامنے سے بھی اس کی

اطاعت اور تابعداری نہ کی جائے۔ صاحبو! حکام کے پیچھے تو انسان کو مخالفت کی ہمت ہو جاتی ہے مگر سامنے تو ہر شخص کا یہی دل چاہتا ہے کہ اس کو خوش کیا جائے اور ناراض نہ کیا جائے، سو خوب جان لو کہ حق تعالیٰ جو کہ حاکم حقیقی ہیں ہر وقت تمہارے سامنے ہیں، تم چاہے ان کو نہ دیکھو مگر وہ ہر دم تم کو دیکھ رہے ہیں۔ اس حالت میں تو اطاعت بجالاؤ اور معصیت سے باز آؤ۔ عشاق کی تو اس تصور میں عجیب حالت ہو جاتی ہے کہ محبوب حقیقی ہمارے ذکر کو سن رہے ہیں۔ ہماری نماز کو دیکھ رہے ہیں، ان پر جو کیفیت اس تصور میں گزرتی ہے اس کو ان کا دل ہی جانتا ہے وہ تو یوں کہتے ہیں:

ہمینم بس کہ داند ماہ رویم   کہ من نیز خویدران اویم

"یہی کافی ہے کہ ہمارا محبوب جان لے کہ میں اس کے خریداروں میں ہوں۔" اور یوں کہتے ہیں:

دلا رامی کہ داری دل درو بند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

"جس سے تم نے دل لگالیا ہے پھر تمام جہان سے آنکھیں بند کرلو۔"

اہل اللہ کو مصائب اور تکلیف آسان معلوم ہونے کا سبب:

یہی تو وجہ ہے کہ اہل اللہ پر تمام تکالیف اور مصائب سہل ہو جاتے ہیں کیونکہ و مصیبت کے وقت یہ سمجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ جن کی محبت میں یہ تکلیف ہم کو پہنچی ہے وہ خود دیکھ رہے ہیں تو عاشق کے لئے اس سے زیادہ کیا بات ہوگی کہ محبوب دیکھ رہا ہے کہ میری محبت کی وجہ سے اس پر یہ کلفت اور مصیبت آئی ہے اور یہ اف نہیں کرتا، اس حالت میں بھی میری محبت میں ثابت قدم ہے۔ ایک عاشق کے لوگ تازیانے مار رہے تھے۔ سو تازیانے پڑنے تک اس نے اف بھی نہیں کی ،اس کے بعد آہ کی، کسی نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ کہ تم نے سو تازیانے خاموش ہو کر کھا لئے اف بھی نہ کی اور اس ایک تازیانے میں آہ کرنے لگے۔ اس نے کہا کہ سو تازیانوں تک تو وہ شخص میرے سامنے موجود تھا جس کی وجہ سے میرے اوپر تازیانے پڑ رہے تھے اور سو کے بعد وہ چلا گیا۔ جب تک وہ میرے سامنے رہا اس وقت تک مجھے تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوا۔ مجھے ایک حظ آ رہا تھا کہ جس کی وجہ سے مجھ پر یہ مصیبت آئی ہے وہ میرا حال خود دیکھ رہا ہے اس کے پیٹھ موڑنے کے بعد یہ لطف تو ختم ہو گیا، تکلیف کا احساس ہونے لگا، گویا اس وقت یہ حال تھا۔

بجرم عشق تو ام می کشند وغوغائیست   تو نیز برسر بام آ کہ خش تماشائیست

"تیری محبت کے جرم میں مجھ کو قتل کرتے ہیں اور اسی کا شوروغل ہے تو بھی بام آ جا تو سب

سے اچھا تماشائی ہے۔''

سو عاشقان جمال حقیقی کو ہر دم اپنا محبوب سامنے ہی معلوم ہوتا ہے وہ کبھی ان کی نظر سے غائب نہیں ہوتا کیونکہ وہ ہر جگہ موجود ہے اور اپنے عشاق کے ساتھ ہے وَاللہُ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ اس تصور اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ان پر تمام مشقتیں آسان ہو جاتی ہیں۔

محبت حق بہت بڑی دولت ہے:

واللہ! محبت حق بہت بڑی دولت ہے اس کے برابر کوئی دولت نہیں اور نہ کوئی چیز راحت میں اس کے برابر ہے اس کے لئے پوری کوشش کرنا چاہئے جس کا طریقہ یہی ہے کہ معاصی سے اجتناب کرو اور طاعات کا اہتمام کرو۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو توفیق عمل اور فہم سلیم عطا فرمائے۔ آمین۔

اختتام

اس کے بعد حضرت والا نے حسب معمول دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر پوشیدہ طور پر نہایت خشوع کے ساتھ دعا فرمائی، حاضرین بھی جو اس بیان سے بہت زیادہ متاثر ہو چکے تھے عاجزی کے ساتھ دعا کرتے رہے۔ الٰہی اپنے اس ناچیز غلام کو بھی اپنی محبت کاملہ سے نواز دیجئے اور معاصی کے اجتناب اور طاعات کے امثال کی توفیق اور ہمت پوری عطا فرمایئے اور حضرت حکیم الامت دام مجدہم اور میرے سب مشائخ کی قوت اور عمر میں برکت عطا فرمایئے۔ ومتعنا اللهم بفيوضهم وبركاتهم وارزقنا في الجنة مرافقتهم ودخول درجاتهم. امين وصلى الله تعالى على خير خلقه سيدنا ومولانا محمد وعلى اله واصحابه وسلم. واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين.

اَلسَّوُقُ لِاَھُلِ الشَّوُق

(یہ وعظ ۲ شعبان المعظم ۱۳۳۶ھ بمقام مدرسہ قاسم العلوم مسجد شاہی بازار چوک مراد آباد حضرت والا نے ارشاد فرمایا جس کو حضرت مولانا حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوریؒ نے قلم بند فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۱۵۰۰ یا ۲۰۰۰ تھی)

اصل بیان یہ تھا کہ قیامت کے دن یہ تو ہوگا کہ بعض نیکیاں بدوں کئے ہوئے نامۂ اعمال میں لکھی ہوئی ملیں گی اور یہ نہ ہوگا کہ کوئی نیکی کی ہو اور نامۂ اعمال میں لکھی ہوئی نہ ملے۔ یہ شانِ رحمت ہے کہ عدل کا معاملہ نہیں۔ فرمایا بلکہ فضل کا معاملہ کیا جائے گا، ورنہ یہ ہوتا کہ جیسے کی ہوئی نیکی بلا کئے ہوئے درج بھی نہ کی جاتی جس سے نہ نیکی بڑھتی نہ گھٹتی۔

دعا خطبہ

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ
بِيَمِيْنِهٖ ۚ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۖ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۝
وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ
بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا
يَفْعَلُوْنَ ۝ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ۗ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ
لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ
يَوْمِكُمْ هٰذَا ۗ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ
جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۗ
حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا
خٰلِدِيْنَ ۝ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ
حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ
يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الزمر: ٦٧ تا ٧٥)

(افسوس ہے کہ) ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی کچھ عظمت نہ کی جیسی عظمت کرنی چاہیے تھی حالانکہ اس کی وہ شان ہے کہ ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان لپٹے ہوں گے اسکے دائیں ہاتھ میں وہ پاک اور برتر ہے ان کے شرک سے اور قیامت کے روز صور میں پھونک ماری جائے گی پس تمام آسمان اور زمین والوں کے ہوش اڑ جائیں گے مگر جس کو خدا چاہے پھر اس صور میں دوبارہ پھونک ماری جائے گی تو دفعۃً سب کے سب کھڑے ہو جائیں گے اور چاروں طرف دیکھنے لگیں گے اور زمین اپنے رب کے نور بے کیف سے روشن ہو جائے گی اور سب کا نامہ اعمال ہر ایک سامنے رکھ دیا جائے گا اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جائیں گے اور سب میں ٹھیک فیصلہ کیا جائے گا ان پر ذرا ظلم نہ ہوگا اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور وہ سب کے کاموں کو خوب جانتا ہے اور جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف گروہ گروہ بنا کر ہانکے جائیں گے یہاں تک کہ جب دوزخ کے پاس پہنچیں تو اس

وقت اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور ان سے دوزخ کے محافظ فرشتے بطور ملامت کہیں گے کیا تمہارے پاس تم ہی لوگوں میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو تمہارے رب کی آیتیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور تم کو تمہارے اس دن کے پیش آنے سے ڈرایا کرتے تھے کافر کہیں گے کہ ہاں لیکن عذاب کا وعدہ کافروں پر پورا ہو کر رہا پھر ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کے دروازوں میں سے داخل ہو اور ہمیشہ اس میں رہا کرو غرض خدا کے احکام سے تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے وہ گروہ گروہ ہو کر جنت کی طرف روانہ کئے جائیں گے یہاں تک کہ اس جنت کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے سے کھلے ہوں گے تاکہ ذرا بھی دیر نہ لگے اور وہاں کے محافظ فرشتے ان سے کہیں گے السلام علیکم تم مزہ میں رہو اس جنت میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہو جاؤ اور داخل ہو کر کہیں گے کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس سرزمین کا مالک بنادیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں غرض نیک عمل کرنے کا اچھا بدلہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرشتوں کو دیکھیں گے (حساب کے اجلاس کے وقت) عرش کے گرداگرد حلقہ باندھیں ہوں گے اور اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے ہوں گے اور تمام بندوں میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ ساری خوبیاں خدا کو زیبا ہیں جو تمام عالم پروردگار ہے۔

اثباتِ توحید:

یہ چند آیتیں ہیں جن میں حق جل شانہ وعم نوالہٗ نے اکثر حصہ میں معاد کا ایک مضمون بیان فرمایا ہے اور اس سے مقصود اس مقام پر توحید کی ترغیب اور تاکید ہے اور ترک توحید پر ترہیب ہے۔ تو یہ دو مضمون ہوئے اور ان دونوں میں زیادہ طول ہے اور اس میرے دعوے پر کہ مقصود اثبات توحید ہے آیت میں صریح قرینہ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ہے جس کا میں ترجمہ کروں گا تو بہت وضاحت کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آ جاوے گی۔ غرض اس آیت میں کھلے کھلے الفاظ ایسے موجود ہیں جن سے میرا مدعا ثابت ہوتا ہے۔ ترجمہ کے عنوان میں غور کرنے سے معلوم ہو جاوے گا کہ مقصود زیادہ تر اثبات توحید ہے اور اس مضمون کی تاکید کے لئے معاد کا بیان کیا گیا ہے۔ اور اس آیت میں اوپر تو بہت ہی صریح الفاظ اس مضمون کے موجود ہیں۔ دیکھئے فرماتے ہیں قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ یعنی اے جاہلو! کیا تم مجھے خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت کے لئے کہتے ہیں۔ اس میں غیر اللہ کی عبادت پر انکار کیا گیا یعنی شرک کی نفی کی گئی ہے اور یہ عین اثبات توحید ہے اور اس سے بھی صریح عنوان اس کے آگے یہ موجود ہے کہ وَلَقَدْ

اُوْحِیَ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرف بھی اور جو پیغمبر آپ سے پہلے گزرے ان کی طرف بھی یہ بات وحی میں بھیجی جا چکی ہے کہ اے عام مخاطب اگر تو شرک کرے گا تو تیرا کیا کرایا سب غارت ہو جائے گا اور تو خسارہ میں پڑے گا) اس میں لفظ لئن اشرکت موجود ہے نفی شرک کے لئے اس سے زیادہ کون سا لفظ صریح ہو سکتا ہے اور ہر چند کہ لئن اشرکت واحد حاضر کا صیغہ ہے جس میں بظاہر خطاب صرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر مقصود یہ نہیں ہے کہ یہ حکم یعنی شرک کی ممانعت اور توحید کی تاکید صرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے ساتھ خاص ہے کیونکہ اس پر سینکڑوں نصوص اور دلائل موجود ہیں کہ توحید کا قائل ہونا ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور شرک سب کے لئے ممنوع ہے۔

شرک حابط اعمال ہے:

بلکہ اس آیت میں اصل مقصود ملازمت سے ثابت کرنا ہے۔ درمیان شرک اور حبط عمل کے یعنی جہاں شرک کا وجود ہوگا اس کے ساتھ حبط کا عمل بھی ضرور ہوگا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا مخاطب اس لئے کیا گیا کہ وحی کے مخاطب اول حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ غرض خطاب خاص کی صورت میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ کہ شرک حبط عمل لازم ہے یہ تو مشہور جواب ہے اس بات کا کہ اس موقع پر یا اسی جیسے دوسرے موقعوں پر قرآن شریف میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیوں بنایا گیا ہے اور اس کا ایک نہایت لطیف جواب اور ہے وہ یہ کہ لَئِنْ اَشْرَکْتَ (اگر تو شرک کرے گا) میں خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے ہی نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان غایت نزاہت رکھتی ہے شرکت جیسی گندی چیز کا وہاں کیا ذکر اور کیا احتمال شرک تو وہ اکبر الکبائر اور اقبح القبائح ہے جس کو کسی صاحب عقل نے بھی جائز نہیں رکھا۔ شان نبوت تو بہت اعلیٰ وارفع ہے بلکہ اس کا خطاب دوسرے مخاطبین کو ہے۔

لئن اشرکت کی تفسیر بے نظیر:

اور اس پر کوئی لفظ اُوْحِیَ اِلَیْکَ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی بھیجی گئی) سے اشکال نہ کرے جو اسی جملہ میں موجود ہے کہ اُوْحِیَ اِلَیْکَ میں تو یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اس کا مخاطب تو ہر شخص نہیں ہو سکتا جب ایک جملہ میں آپ کو خطاب ہے تو جملہ ثانیہ لَئِنْ اَشْرَکْتَ الخ (اگر تو شرک کرے) کے مخاطب کو بھی آپ ہی ہوں گے کیونکہ یہ کوئی ضروری

بات نہیں کہ آیت میں کئی مضمون ہوں تو سب کے مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک کے مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور باقی مضامین تبلیغ کے لئے ہوں اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کی طرف اور تمام انبیاء کی طرف وحی بھیجی گئی ہے اس مضمون کی کہ لئن اشرکت ایھا المخاطب لیحبطن عملک تا کہ یہ حکم خدا کے بندوں کو پہنچا دو کہ جو کوئی شرک کرے گا اس کے اعمال حبط ہو جائیں گے۔ تو لَئِنْ اَشْرَکْتَ میں تو خطاب افراد امت کو ہوا اور لَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ الخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو خطاب ہوا۔ بہر حال خطاب خواہ عام ہو یا خاص احاد امت کو ہو۔ مقصود آیت میں نفی اور ابطال شرک ہے اور پوری آیت سیاق وسباق میں نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کو باطل کرنا اور توحید کو ثابت کرنا منظور ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ یعنی ان لوگوں نے خدا کی اتنی عظمت نہیں جانی جتنی کہ واقع میں ہے۔

شرک کا مفہوم:

اس میں شکایت ہے شرک کی کیونکہ شرک کے معنی یہی ہیں کہ خدا میں کسی بات کی کمی ہے اس واسطے دوسرے کو ماننے کی ضرورت ہے۔ کوئی دوسرے کو کسی کام میں جب ہی شریک کرتا ہے کہ وہ کام خود اس سے پورا نہ ہو سکے۔ مثلاً تجارت میں کوئی دوسرے کو اسی وجہ سے شریک کرتا ہے کہ اس کے پاس روپیہ کم ہے یا یہ اس میں کما حقہ محنت نہیں کر سکتا۔ غرض اس میں مالی یا جانی کمی ہے اس کے پورا کرنے کے لئے دوسرے کو شریک کرتا ہے تو خدا کے ساتھ جب کسی کو شریک کیا جاوے گا تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ نعوذ باللہ خدا میں کسی بات کی کمی ہے اس کے پورا کرنے کے لئے دوسرے کی ضرورت ہے۔ اس صورت میں خدا تعالیٰ کو کمال وآثار کمال میں تغیر نہ ہوگا تو مشرک نے خدا کو کامل نہیں مانا بلکہ ناقص مانا تو اس نے خدا کی پوری تعظیم نہیں کی کیونکہ پوری تعظیم بدون اس کے نہیں سکتی کہ کمال یا اس کے آثار میں کمی نہ مانی جاوے میں نے یہ دو لفظ یعنی کمال وآثار کمال اس واسطے کہے کہ بعض دفعہ اعتقاد درجہ کمال میں شرک نہیں ہوتا مثلاً خالقیت وغیرہ میں خدائے تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ مانا جاوے مگر آثار میں شرک مانا جاوے جیسے مشرکین عرب کرتے تھے کہ مقصودیت و خالقیت میں کسی کو حق تعالیٰ کے برابر نہیں مانتے تھے۔ ہاں ان کے آثار میں غلطی کرتے تھے اس کی شہادت قرآن میں موجود ہے۔ حق تعالیٰ نے ان کا قول نقل فرمایا ہے مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی "یعنی مشرکین کہتے تھے کہ ہم ان بتوں کی پرستش صرف

اس واسطے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا کے یہاں پہنچا دیں اور مقرب بنا دیں۔'' اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ خدا کے برابر تو کسی کو نہیں جانتے تھے ہاں خدا کے تصرفات میں بعضوں کو دخیل مانتے تھے بلفظ دیگر یہ کہ کمال میں تو شریک نہیں کرتے تھے لیکن آثار کمال میں شریک کرتے تھے اور حدیث میں روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشرک سے پوچھا تیرے کتنے معبود ہیں؟ کہا سات ہیں۔ ان میں سب سے بڑا تو آسمان میں ہے۔ بڑے بڑے کاموں کے لئے اس کو پکارا جاتا ہے اور معمولی کاموں کے لئے دوسرے معبود ہیں۔ دیکھئے یہ لوگ کمال مطلق تو حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت کرتے تھے کیونکہ اس سے بڑا کسی کو نہیں جانتے تھے۔ ہاں کمال کے آثار میں دوسروں کو بھی شریک کرتے وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پہنچانے اور قریب کرنے کے لئے ان کو معبود مانتے تھے مگر اس پر بھی حق تعالیٰ نے انکار فرمایا۔

عظمت حق سبحانہ و تعالیٰ:

چنانچہ آیت مذکورہ میں ان کا وہی قول نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ م مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ فِیْ مَا ھُمْ فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ (یعنی مشرکین کہتے تھے کہ ہم ان بتوں کی پرستش صرف اس واسطے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا کے یہاں پہنچا دیں اور مقرب بنا دیں بلا شبہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائیں گے جس میں یہ اختلاف رکھتے ہیں بے شک اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت نصیب نہیں فرماتے جو جھوٹا نافرمان ہو) ایسے لوگوں کو کفار فرمایا ہے۔ غرض یہ دونوں مشرک ہیں۔ اسی واسطے میں نے دو لفظ عطف کے ساتھ کہے کہ کمال میں اور اس کے آثار و مقتضیات میں جب تک کمی کی بالکلیہ نفی نہ کی جاوے اس وقت تک پوری تعظیم نہیں ہو سکتی اگر ایک میں بھی کمی مانی جاوے گی تو پوری تعظیم نہ ہوگی خواہ کمال میں کمی ہو یا اس کے آثار و مقتضیات میں یہ دونوں منافی ہیں حق تعالیٰ کی عظمت کے اور ان سے کسی ایک کا بھی قائل ہونا شرک ہے۔ پوری بڑائی یہی ہے کہ نہ کمال میں کسی کو شرک مانا جاوے اور نہ مقتضیات کمال میں۔ غرض شکایات کرتے ہیں کہ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ان لوگوں نے خدائے تعالیٰ کی پوری عظمت نہیں کی حالانکہ پوری پوری عظمت کرنی چاہئے کیونکہ خدائے تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ زمین اس کی ایک مٹھی ہے اور آسمان ایک ہاتھ میں لپیٹ لئے جاویں گے اور صور پھونکا جاوے گا اور قیامت قائم ہوگی اور کفار جہنم میں جاویں گے اور مؤمنین کو جنت ملے گی۔ غرض حق و باطل پر اس

اہتمام کے ساتھ جزا و سزا ہونے والی ہے پھر یہ لوگ کس خیال میں ہیں اور کیوں خدائے تعالیٰ کی عظمت کماحقہ نہیں کرتے اور شرک کئے جاتے ہیں۔ اول تو کمال ذاتی ہی قرآن شریف میں اس عنوان کو اختیار کیا گیا ہے کہ توحید کے بیان کے ساتھ معاد کا بیان کیا گیا کہ اب ایسا ہونے والا ہے۔ یوم الفصل آنے والا ہے اور وہاں یہ ہوگا۔ باوجود اس کے تعجب ہے کہ مشرکین پوری تعظیم نہیں کرتے اور شرک سے باز نہیں آتے جیسے بچے سے کہیں کہ کل کو امتحان ہونے والا ہے اور ایسی ایسی قمچیاں منگائی گئی ہیں اور ایسے ایسے جلاد بلائے گئے ہیں جو بالکل بے رحم ہیں اگر اس پر بھی وہ یاد نہ کرے تو تعجب کیا جاوے گا کہ کس قدر دلیر اور بدطینت ہے کہ علم اول تو ویسے ہی قدر کی چیز ہے۔ بے علم آدمی جانوروں سے بھی بدتر ہے قطع نظر اس سے اس بے حیا کو ایسی مار کا بھی خوف نہ ہوا ظاہر ہے کہ بچہ کے سامنے یہ ہولناک چیزیں سنانے سے غرض اس کو علم سکھانا ہے۔ اسی طرح آیت میں مقصود توحید کا اثبات اور شرک کی نفی کرنا ہے اس کے لئے معاد کا ذکر فرمایا ہے۔

متن قرآن کے تین اصول مسائل:

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ متن قرآن یعنی اس کے اصول مسائل تین چیزیں ہیں۔ توحید اور رسالت اور معاد یہ تینوں اصول اور متن ہیں باقی سب ان کی شرح ہیں۔ ان میں سے دو مسئلے اس آیت میں مذکور ہیں یعنی توحید اور معاد اور غور کیا جاوے تو تیسرا مسئلہ یعنی مسئلہ رسالت بھی اس آیت میں مذکور ہے کیونکہ ان ہی آیات میں صاف موجود ہے اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یعنی فرشتے کفار سے بطور سرزنش کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس پیغمبر نہیں آئے تھے اور وہ حسرت سے جواب دیں گے کہ بَلٰی وَلٰکِنْ حَقَّتْ کَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یعنی پیغمبر آئے تو بے شک تھے مگر قسمت ہماری کہ یہ عذاب چکھنا تھا، ان کی بات کو نہ مانا معلوم ہوا کہ مسئلہ رسالت بھی ضروری اور ماننے کی چیز ہے، تو تینوں اصولِ دین اس آیت میں مذکور ہیں اور مسئلہ رسالت کے ضروری ہونے کا راز یہ ہے کہ مسئلہ توحید موقوف ہے رسالت پر اور مسئلہ توحید ضروری ہی ہے تو مسئلہ رسالت بھی ضروری ہوا۔ اور مسئلہ توحید کے مسئلہ رسالت پر موقوف ہونے کا بیان یہ ہے کہ توحید خدا تعالیٰ کی معرفت پر موقوف ہے اور معرفت ایک تعلق ہوتا ہے درمیان دو شخصوں کے اور تعلق کے لئے مناسبت شرط ہے اور بندوں میں اور خدا میں کچھ مناسبت نہیں اس واسطے ضرورت ہوئی واسطہ کی اس واسطہ ہی کو رسول کہتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ کی شان یہ ہے انت کما اثنیت علی نفسک (مسند احمد ۶:۵۸) یہ سید العارفین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقولہ ہے

فرماتے ہیں کہ اے اللہ آپ خود ہی اپنی ذات وصفات کو خوب جانتے ہیں ہم نہیں جان سکتے اور یہ بطور مبالغہ نہیں ہے بالکل سچی بات ہے ذات وصفات واجب تعالیٰ کا علم ممکن کو ہو ہی نہیں سکتا اپنا علم انہیں کو ہے اگر کوئی عقل سے کچھ دریافت کرنا چاہے گا تو قیاس الغائب علی الشاہد ہوگا کیونکہ ان کی کوئی نظیر نہیں تو بہت سے بہت یہ ہوگا کہ سامان دنیا پر قیاس کریں گے کہ ان کی بھی قدرت اور علم اور دیگر صفات ایسی ہی ہوں گی اور یہ بات کہ ان کی قدرت عام اور علم محیط سے کوئی چیز خارج نہیں یہ بلاوحی کے ثابت نہیں ہوسکتی تو خدا کی معرفت عقل سے جو کچھ ہوتی بھی وہ بالکل ناقص ہوتی۔ چنانچہ جن لوگوں نے وحی سے استفادہ نہیں کیا اور اپنی عقل کے زعم میں رہے انہوں نے الٰہیات میں ایسی غلطیاں کی ہیں جن پر آج اہل حق کے بچے بھی ہنستے ہیں۔ جب تک وحی نہیں تھی وہ لوگ بڑے عقلمند اور حکیم مانے جاتے تھے لیکن وحی کے آنے پر ان کی قلعی کھل گئی کہ کیسی فاش غلطیوں میں مبتلا تھے۔ غرض خدائے تعالیٰ کی معرفت بلا اسی طرف کی خبر کے اور بلا توسط واسطہ کے جس کو رسول کہتے ہیں نہیں ہوسکتی اگرچہ خبر کے بعد کنہ اس کی مدرک نہیں مگر خبر سے اتنا تو ہوا کہ وجہ تو اس کی مدرک ہوئی (یعنی علم بالوجہ تو ہوگیا) اجمالاً اتنا تو معلوم ہوگیا کہ خدائے تعالیٰ وہ ہے جس کی قدرت اور علم سے کوئی چیز خارج نہیں، بلاوحی اور بلا رسول کے اتنا بھی معلوم نہیں ہوسکتا۔ یہ راز مسئلہ رسالت کی ضرورت کا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ توحید بلا مسئلہ رسالت کے پورا نہیں ہوسکتا۔

تمہید مقصود سے طویل ہوتی ہے:

غرض تینوں اصول مسائل اس آیت میں مذکور ہیں، توحید بھی اور رسالت بھی اور معاد بھی، ہاں بیان مبسوط معاد کا ہے گو مقصود توحید ہے اور اس سے تعجب نہ کیا جاوے اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اگر مقصود مسئلہ توحید ہوتا تو اس کے بیان میں بسط ہوتا نہ کہ اس مسئلہ کے بیان میں جو مقصود نہیں اور تبعاً اور ضرورتاً لایا گیا ہے۔ گویا طریق کو مقصود سے بڑھا دیا گیا۔ صاحبو! کبھی توطیہ وتمہید میں زیادہ کام ہوتا ہے بہ نسبت اصل مقصود کے جیسے کھانا ایک مقصود ہے کہ یہ ذرا دیر کا کام ہے مگر اس کے تمہید اور مقدمات کو دیکھئے کہ اللہ توبہ! کس قدر طول، طویل اور دشوار ہیں۔ اس کا شروع مثلاً کھیتی ہوتا ہے اس کے لئے برسات کے موسم کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بہت انتظار کے بعد موسم آیا تو بیلوں کی ضرورت ہے اور آدمیوں کی ضرورت ہے سب مل کر کام کرتے ہیں حتیٰ کہ مالک کو بھی ان کے ساتھ لگنا پڑتا ہے۔ برسات کی دھوپ ہے اور سر سے پیر تک پسینہ بہہ رہا ہے۔ ہزار کوششوں اور دردسریوں کے بعد کھیت پیدا ہوا اور عرصہ تک نگاہ داشت اور غور پرداخت کے بعد اس میں دانہ پیدا ہوا پھر وہ کاٹا گیا اور پیروں

میں لا کر گاہا گیا دانہ الگ کیا گیا اور بھوسہ الگ پھر اس دانہ کو پیسا گیا پھر پکایا گیا اور پکانے کے لئے ماما کی تلاش کرنی پڑی۔ غرض بہزار وقت یہ نوبت آئی کہ کھانا تیار ہوا اس میں کتنا عرصہ لگا اور کتنے بکھیڑے ہوئے کہ خدا کی پناہ اور یہ سب ذریعہ اور تمہید کا مرتبہ تھا اور جو اصل مقصود ہے یعنی کھانا وہ پانچ منٹ میں ختم۔ دیکھئے اس مثال میں مقصود سے ذریعہ اور تمہید کو اتنا طول ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بہ نسبت مقصود کے ذریعہ میں طول ہے بلکہ طریق کا بہ نسبت مقصود کے طول ہونا تو موافق عادت کے ہے اور امر اکثری ہے دیکھئے آپ کہیں سیر کرنے یا اور کسی کام کے لئے جاتے ہیں تو اصل مقصود طول عرض میں کتنا ہوتا ہے اس کا طریق کتنا ہوتا ہے مثلاً کلکتہ سیر کے لئے جاتے ہیں تو سیر گاہ یعنی شہر کلکتہ تو دو چار میل ہی کا طول عرض رکھتا ہے مگر طریق اس کا ایک ہزار میل کا ہے تو یہ کچھ تعجب کی بات نہ رہی کہ طریق مقصود سے بڑا ہے بلکہ امر معتاد یہی ہے کہ طریق مقصود سے طول ہو ہاں جلالت قدر میں مقصود کا ذریعہ سے بڑا ہونا ضروری ہے اگر اس کا خیال رکھا جاوے تو غلطی ہوگی۔ مثلاً کلکتہ جانا سیر کے لئے اور عجائبات دیکھنے کے لئے تو مضائقہ نہیں کیونکہ یہ چیزیں کسی درجہ میں مہتم بالشان ہیں اور اگر مثلاً کوئی اس واسطے جاوے کہ ایک مٹھی گھاس کی ضرورت ہے اور اس کے لئے اتنا سفر کرے تو ہر شخص بے وقوف بنادے گا کہ اتنی ذراسی بات کے واسطے اتنا بڑا رستہ کیوں طے کیا؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ مقصود جلالت قدر میں طریق کے برابر نہیں۔ آیت میں مقصود مسئلہ توحید ہے اور یہ جس قدر جلیل القدر مسئلہ ہے سب جانتے ہیں۔ اس کے لئے طریق کو جتنا بھی طول ہو تعجب کی بات نہیں بلکہ عین عادت اور عقل کے موافق ہے۔ غرض اتنی تقریر سے بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ آیت میں بالقصد مسئلہ توحید کا اثبات اور شرک کی نفی کرنا ہے اور اس کی تاکید کے لئے مسئلہ معاد نہایت شدومد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور مسئلہ رسالت بھی آیت میں مذکور ہے۔ غرض تینوں اصول دین آیت میں مذکور ہیں لیکن مجھ کو اس وقت صرف مسئلہ معاد کو بیان کرنا مقصود ہے اور نتیجہ یہ نکالوں گا کہ جب معاد میں ایسے واقعات ہونے والے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کی درستی کی سخت ضرورت ہوئی تو اس کا جاننا بھی سخت ضروری ٹھہرا کہ معاد کی درستی کیسے ہوتی ہے اور چونکہ یہ احتمال تھا کہ پھر یاد رہے نہ رہے اس لئے اس کو میں ذرا تفصیل کے ساتھ یہیں بتائے دیتا ہوں کہ معاد کی درستی کے طریقے میں اخیر میں کیا بتاؤں گا۔

درستی معاد کا طریق حصول:

سو اس طریق کا حاصل یہ ہے کہ عقائد و اعمال کی اصلاح کی جاوے اور یہ موقوف ہے علم پر تو علم کی ضرورت ثابت ہو جاوے گی اور یہ مضمون اس علمی جلسے کے مناسب ہو جاوے گا۔ صاحبو! یوں

تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ہی سے ضرورت علم کی معلوم ہے۔ بہت سی حدیثیں علم کی فضیلت اور اس کے طلب وجوب کے متعلق موجود ہیں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہم کو مل گیا تو ضرورت معلوم ہوگئی کہ اس کام کو کرنا چاہئے اب اور کسی ضرورت کے تلاش کی حاجت نہیں رہی لیکن اگر عقل سے بھی ثابت ہوجاوے اس طرح سے کہ تحرز عن المضرت اور جلب منفعت ضروری چیز ہے اور منجملہ مضرتوں کے مضار آخرت بھی ہیں بلکہ مضرت کے افراد میں اکمل وہی ہیں تو آخرت کے مضار سے بچنا بھی ضرور ہوا اور وہ موقوف ہے مضار آخرت کے علم پر جس کا ذریعہ محض علم دین ہے تو اس سے یہ مضمون اور زیادہ اقرب الی الفہم اور موجب طمانیت قلب ہوگا اس واسطے بیان معاد کے بعد اصلاح عقائد و اعمال کی ضرورت بیان کروں گا اس کے لئے علم کی ضرورت ثابت کروں گا تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہوجاوے اس وقت اس اصلاح مذکور کے طریق کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔ آج کل اس کو سب مانتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے تمام حالات میں اصلاح کی حاجت ہے اور اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ سب مسلمان مل کر کوشش کریں یہ کام ایک دو افراد کا نہیں ہے اور اصلاح کے لئے علم کی ضرورت ہے تو اس بات کی ضرورت ہوئی کہ علم کے لئے سب مسلمان مل کر کوشش کریں۔ گھر گھر علم کا چرچا ہو، جگہ جگہ مجمعے اہل علم کے موجود ہوں۔ چنانچہ بحمد اللہ بہ نسبت پہلے زمانہ کے اس میں ترقی بھی ہے۔ ہر جگہ مدرسہ موجود ہے کچھ نہ کچھ مجمع اہل علم کا موجود رہتا ہے اور مدرسہ جگہ جگہ ہونے سے بہت فائدہ پہنچا ہے کیونکہ جب علم کی مسلمانوں کو ضرورت ہے اور علم کی ترقی علمی مجالس سے ہوتی ہے تو علمی مجالس جس قدر زیادہ ہوں اسی قدر علم کو ترقی ہونے کی اور اسی قدر مسلمانوں کو نفع پہنچنے اور قوت علمی بڑھنے کی امید ہوگی۔

علم کی مثال:

علم کی مثال ریل کے انجن کی سی ہے کہ اسی کی طاقت سے ریل چلتی ہے۔ انجن جتنا زوردار ہوا تنی ہی رفتار ریل کی زیادہ ہوتی ہے اور اگر ایک انجن کی جگہ دو انجن جوڑ دیئے جاویں تو ظاہر ہے کہ قوت اور بڑھ جاوے گی۔ بنابریں جتنی مجالس علمی یعنی مدارس تعداد میں زیادہ ہوں گے علمی قوت بڑھے گی اور مسلمانوں کو نفع ہی پہنچے گا یہاں سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوتی ہے جو کہا کرتے ہیں کہ مدرسہ کھولنے کی کیا ضرورت ہے۔ شہر میں ایک ہی مدرسہ کافی ہے۔ بازار میں اگر دس دکانوں کی جگہ گیارہ ہوجاویں تو اس کو بازار کی ترقی کہا جاتا ہے اور جتنی بڑھتی جاویں اس کو اچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

دینی مدارس کی تعداد میں اضافہ پر اعتراض کا منشاء:

پھر نہ معلوم مدرسوں کی تعداد بڑھنے پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے۔ غور سے دیکھئے تو اس پر اعتراض کا منشاء صرف یہ ہے کہ دین کی کچھ وقعت ان کے ذہن میں نہیں ہے اس واسطے اس کے ذرائع کی بھی حاجت نہیں سمجھتے۔ دراصل ایک مدرسہ بھی ان کے دل میں کھٹکتا ہے مگر چونکہ نام اسلامی مدرسہ کا لگا ہوا ہے اس واسطے اس سے کچھ تعرض نہیں کر سکتے کیونکہ لوگ مطعون کریں گے۔ پس یہ خوف ان کو اس مدرسہ کی مخالفت سے روکے ہوئے ہے ورنہ ان کے دل کی پوچھو تو ایک مدرسہ کو بھی نہ رہنے دیتے۔ تعداد تو کہاں گوارا ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ذرا سی کوتاہی مدرسہ میں ہو جاتی ہے تو یہ لوگ مخالفوں کی طرح طعن کرنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں کیونکہ خاموشی کی جو اصل وجہ تھی یعنی اعتراض کرنے سے لوگوں کا مطعون کرنا وہ اب نہیں رہی کیونکہ اس کوتاہی کی وجہ سے سب لوگ مدرسہ کے موافق نہیں رہے۔ کچھ ان کے بھی ہم خیال پیدا ہو گئے ہیں اب ان کا اصلی خیال ظاہر ہونے کا موقع ملا۔ چنانچہ وہ ظاہر ہوتے ہی مدرسوں والوں کے گلے پر چھری پھیرنے کو تیار ہوتے ہیں اور اگر مدرسہ بیخ و بنیاد سے بھی جاتا رہے تو ان کے کام پر جوں نہ رینگے۔ اگر یہ صرف تعدد کے مخالف ہوتے تو اس ایک مدرسہ سے تو ہمدردی رکھتے اور ایسے وقت میں اس کی اصلاح کی کوشش کرتے نہ کہ اس کے بھی اٹھا دینے کی غرض تعداد کی مخالفت جس طرح آج کل ہو رہی ہے وہ تو بے جا ہے اور اس کا منشاء دین سے لاپروائی ہے جو مسلمان کے لئے کسی طرح زیبا نہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ہر مذہب والے کو یہ خیال ہے کہ مذہبی ترقی ہو اور اس کے ذرائع سوچتے ہیں اور اس کو منجملہ ضروریات کے سمجھتے ہیں لیکن مسلمانوں کا خیال یہ ہوتا جاتا ہے کہ مذہب کی کوئی ضرورت نہیں اور اسی وجہ سے اس کے ذرائع کو بیکار سمجھتے ہیں اور وہ ذرائع جتنے زیادہ ہوں ان کی طبیعت کے زیادہ خلاف ہوتے ہیں۔ یہ تو غلطی ہے اور اس بنا پر تعدد مدارس کی مخالفت درحقیقت دین کی مخالفت ہے لیکن اس تعدد مدارس کے متعلق ایک شکایت واقعی بھی ہے وہ یہ کہ تکثیر مدارس فی نفسہ تو واقعی مفید اور باعث ترقی دین ہے لیکن آج کل یہ تکثیر ظاہراً تو تکسیر ہے اور درحقیقت تکثیر بالثاء بمعنی تعدد نہیں بلکہ تکسیر بالسین بمعنی شکستن ہے۔

دوسرا مدرسہ بنانے کی غرض:

ایک کی جگہ دو مدرسہ اس واسطے نہیں ہوتے کہ مسلمانوں کی علمی قوت دوچند ہو جاوے اس

مدرسہ کو اس سے قوت پہنچے اور اس کو اس سے بلکہ اس واسطے ہوتے ہیں کہ ایک قوت دو جگہ بٹ جاوے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو قوت رہتی ہے نہ اس کو۔ اس کی مثال یہ ہوئی کہ ایک روٹی ایک آدمی کے پاس ہے، بجائے اس کے وہ اس کو اکیلا کھاوے دوسرا اور شریک ہو گیا تو ظاہر ہے کہ نہ اس کا پیٹ بھرے گا نہ اس کا، تو یہ تعداد اشخاص روٹی کے لئے تکسیر ہوئی یعنی دو حصے کر دینا تکثیر بمعنی کثیر کردن جب ہوئی کہ دوسرا آدمی اس روٹی میں حصہ دار نہ بنتا بلکہ اور روٹی لا کر شامل کرتا تو ایک سے دو زیادہ روٹیاں ہو جاتیں۔ یہی حالت آج کل کے تعدد مدارس کی ہے کہ اس واسطے تعدد نہیں ہوتا کہ دوسرے کو علمی اور دینی قوت پہنچاویں بلکہ اس واسطے ہوتا ہے کہ اس کی علمی اور دینی قوت آدھی بانٹ لیں بلکہ یہ بھی نہیں ہر ایک کی یہ نیت ہوتی ہے کہ اس کی سب قوت چھین لے۔ تو اب مثال یہ ہوئی کہ ایک روٹی والے کے پاس دوسرا آدمی آیا اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ وہ کل روٹی اس سے چھین لے اور خود کھالے اور اس کو نہ دے بلکہ اس سے بھی ترقی کر کے کہا جاتا ہے کہ یہ مثال بھی صحیح نہیں۔ ٹھیک مثال یہ ہے کہ وہ دوسرا صرف یہ چاہتا ہے کہ اس سے وہ روٹی چھن جاوے چاہے اس کو بھی نہ ملے جس کو حسد کہتے ہیں اسی طرح ہر مدرسہ والا یہ چاہتا ہے کہ دوسرا مدرسہ نہ رہے چاہے یہ مدرسہ بھی رہے یا نہ رہے۔

مقتدا صاحبان کی قابل اصلاح حالت:

افسوس اس میں کون مبتلا ہیں وہ لوگ جو مقتدا اور علماء کہلاتے ہیں اور جن کو لوگ دین کا حامل سمجھتے ہیں اور ان کے وجود سے دین کا وجود سمجھا جاتا ہے جُبہ قُبہ سے تو ان کو جیسا چاہئے سمجھ لیجئے ورنہ درحقیقت ان کی حالت دنیاداروں سے بھی بدتر ہے اور یہ ان لوگوں سے بھی زیادہ خطرناک امراض میں مبتلا ہیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے کہ وہ ظاہراً صرف تعدد مدارس کے خلاف ہیں اور درحقیقت ایک مدرسہ کی بھی ان کے نزدیک ضرورت نہیں کیونکہ ان کے نزدیک دین ہی کی ضرورت نہیں۔ ان علماء کی حالت ان سے بدتر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں اس بات میں تو برابر ہیں کہ نہ وہ مدرسہ کے وجود کو ضروری سمجھتے ہیں نہ تعدد کو اور اس کی وجہ سوائے قلت مبالات کے کچھ نہیں۔ گو دونوں زبان سے مدرسہ کی حمایت ہی کا دم بھرتے ہیں لیکن حقیقت وہی ہے جو میں نے عرض کی ایک فرقہ لوگوں کے مطعون کرنے سے ڈر رہا ہے اس واسطے حمایت کا دم بھرتا ہے اور ایک اپنے پیٹ کی وجہ سے مدرسہ نہ رہے گا تو ہمارا گزارہ کیسے ہوگا؟ غرض اس میں تو دونوں برابر ہیں کہ ضرورت مدرسہ کی جس حیثیت سے ہونی چاہئے ایک کے ذہن میں بھی نہیں اور ان علماء

صاحبان میں اتنی بات زیادہ ہے کہ قلب مبالات بالدین کے ساتھ یہاں حسد بھی شریک ہے جو بدترین امراض ہے اور اس میں ایک شدت اور یہ بڑھ گئی کہ اہل دنیا کا تو جو فعل بھی ہوتا ہے دنیا کے رنگ میں ہوتا ہے گویا معصیت طاعت کی شکل میں ہوتی ہے، اس سے بہت دھوکا ہوتا ہے۔

تعدد مدارس بغرض مقابلے کی عجیب مثال:

اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ یہ مقتدا صاحبان اہل دنیا سے بھی خراب حالت میں ہیں اور ان کی کوشش تعدد مدارس کے لئے علم کو بڑھانے اور قوت پہنچانے کے لئے نہیں ہے بلکہ اس موجودہ قوت کو مٹانے کے لئے ہے تو یہ مدارس کی تکثیر بالنشاء نہ ہوئی بلکہ تکسیر بالسین ہوئی اور ان پر جو تعدد کی مثال یہ دی گئی تھی کہ ریل میں دو انجن لگا دیئے گئے تو قوت اور رفتار بڑھ جاوے گی۔ یہاں مثال یہ ہوگی کہ انجن جوڑے گئے لیکن رفتار دونوں کی ایک طرف کو نہیں رکھی گئی۔ ایک کو مغرب کی طرف چلایا گیا اور ایک کو مشرق کی طرف تو ظاہر ہے کہ ریل کو اس سے کوئی فائدہ بھی نہ پہنچے گا کیونکہ ان دونوں انجنوں میں سے ایک بھی نہ چل سکے گا جب تک ایک کو اس سے الگ نہ کر لیا جاوے ورنہ یا تو ٹرین ایک ہی جگہ کھڑی رہے گی یا دونوں کے زور سے بیچ سے ٹوٹ جاوے گی کچھ اس کے ساتھ ہو جاوے گی اور کچھ اس کے ساتھ۔ یہی حالت مدرسوں کے اس تعدد کے وقت ہوتی ہے کہ دونوں میں تزاحم ہوتا ہے جس دین کی قوت کے لئے مدارس کی ضرورت تھی اس کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں بلکہ اس کا تزاحم ایسا ہوتا ہے جیسے دو انجنوں کا آمنے سامنے مقابلہ ہو جس کو ریل لڑنا کہتے ہیں جس کے تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ خدا نہ دکھاوے۔ وہی حالت ان حضرات کے تزاحم سے دین کی ہو رہی ہے کہ اس کے واسطے یہی کہنا پڑتا ہے کہ خدا نہ دکھاوے مگر افسوس ہر جگہ یہ تزاحم واقع ہو رہا ہے اور دیکھتے دیکھتے عادت ہو گئی ہے اس واسطے اس سے کچھ زیادہ انقباض بھی نہیں ہوتا۔ غرض آج کل تعدد مدارس کی حقیقت اور اس کا کچا چٹھا یہ ہے۔ تو یہ بات موجب شکایت ہے یا نہیں اور اس حالت میں تو تعدد مدارس سے جو طبیعتوں کو انقباض ہوتا ہے وہ مطلقاً بے اصل نہیں ہے بلکہ اس کے لئے کچھ واقعیت ضرور ہے گو نئے تعلیم یافتوں کو جو انقباض ہوتا ہے وہ تو بے اصل ہی ہے کیونکہ اس کا منشا دین سے علیحدگی ہے اور کاش تزاحم کے وقت دونوں میں سے ایک فریق تواضع اختیار کر لیتا ہے اور کہتا کہ لے بھائی تو مجھے ہی پیچھے ہٹا لے اور ہم ہی دب گئے تو بات ختم ہو جاتی اور تزاحم جاتا رہتا۔ دب جانے پر ایک حکایت یاد آئی۔

تکبر اور تواضع کا انجام:

ایک شیخ صاحب داڑھی چڑھائے چلے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک خان صاحب ملے ان کو

شیخ صاحب کا داڑھی چڑھانا سخت ناگوار ہوا اور کہا کیوں بے! تو ہماری برابری کرنے لگا۔ شیخ جی بڑے چالاک تھے کہا برابری کیوں نہ کریں ہم تجھ سے کس بات میں کم ہیں۔ خان صاحب کو اور غصہ آ گیا اور کہا اچھا آ لڑیں۔ شیخ جی نے کہا یوں نہیں لڑتے۔ لڑائی لڑنی ہے تو اچھی طرح لڑیں گے پھر اپنے پیچھے جورو اور بچوں کو بیوہ اور یتیم چھوڑ گئے تو کس کام کی بات ہوگی۔ لڑنا ہے تو پہلے اپنے اپنے کنبہ کو ختم کر لو پھر دل کھول کر لڑو۔ خان صاحب کو غصہ بے حد چڑھا ہوا تھا زور میں آ کر اس کے لئے بھی تیار ہو گئے اور گھر جا کر تمام کنبہ کو صاف کر دیا اور لوٹ کر آئے کہ اب لڑ لے۔ شیخ جی نے کیا کیا کہ اپنی داڑھی اتار لی اور کہا کہ لو بھائی تم ہی جیتے میں ہارا۔ میں تمہاری برابری نہیں کرتا تم بڑے اور میں چھوٹا۔ تواضع ایسی چیز ہے جس کی بدولت شیخ جی اور شیخ جی کا کنبہ صحیح و سالم رہا اور تکبر ایسی چیز ہے جس کی بدولت خان صاحب کا سارا کنبہ غارت ہو گیا اور اگر شیخ جی بھی اکڑ تے ہی جاتے اس کا مصداق ہوتا:

وگر از ہر دو جانب جاہلانند　　اگر زنجیر باشد بگسلانند

''اگر ہر دو جانب جاہل لوگ ہوتے ہیں تو اگر لوہے کی زنجیر بھی ہو تو توڑ دیں گے یعنی محبت اور تعلق مضبوط سے مضبوط ختم کر دیتے ہیں۔''

اور نتیجہ وہی ہوتا کہ شیخ جی کا سارا کنبہ بھی صاف ہو جاتا بلکہ شیخ جی بھی نہ رہتے اور خان صاحب بھی نہ رہتے اگر مرتے بھی نہیں تو زخمی تو ہو ہی جاتے۔ ایک تواضع نے ایک کا کنبہ بچایا اور دونوں کی جان بچائی۔ دو ریلیں جب لڑتی ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ دونوں انجنوں میں سے کوئی پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا اگر ایک انجن خود یا بالواسطے ڈرائیور کے یہ کہتا کہ میں مزاحمت نہیں کرتا اور آگے کو نہیں چلتا بلکہ واپس ہوتا ہوں میری چال پیچھے ہی کو سہی تو وہ تمام آفتیں نہ آتیں جو تزاحم سے آتی ہیں اور مالی اور جانی نقصان سب سے حفاظت رہتی۔

اتفاق اور تابعیت کی برکت:

ہاں ایک بات یہ ہوتی کہ ذرا دیر کو ہیٹی ہوتی اور تابعیت کا اطلاق آتا سو یہ کوئی بات نہیں تابعیت تو کوئی عیب نہیں کیونکہ متبوعیت کو کوئی کہاں تک نباھے گا کسی نہ کسی بات میں تو ہر شخص کو کسی نہ کسی کا تابع بننا ہی پڑتا ہے پھر اس موقع پر بھی تابعیت اختیار کر لی جاوے تو کیا عیب لگ جاوے گا۔ تابعیت اور چھوٹا پن تو بڑی اچھی چیز ہے اس سے اپنا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ تم متبوع بن کر بھی دیکھو اور تابع بن کر بھی دیکھو اندازہ ہو جاوے گا کہ کس میں راحت ہے۔ دیکھو ایک عالم سے کوئی مسئلہ پوچھا جاوے اور وہ اس میں غور وخوض کرے مگر اطمینان نہ ہو تو اگر وہ یہ کہہ دے کہ مجھے شرح صدر نہیں ہوا دوسرے

سے پوچھ لوتو کتنا بوجھ ہلکا ہو جاوے گا مگر آج کل ان کو کسر شان سمجھا جاتا ہے اور علم کی شان یہی سمجھی جاتی ہے کہ مسئلہ کا جواب ضرور دیا جاوے خواہ وہ غلط ہی ہو۔ بس اس شان نے تباہ کیا، اسی سے علماء میں اتفاق نہیں ہوتا۔ کوئی عالم دوسرے کا تابع بننا نہیں چاہتا حالانکہ اتفاق اور تابعیت سے مؤنت کم ہو جاتی اور بوجھ بٹ جاتا مگر ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ بے علمی کا اقرار کرنے سے کرکری ہوگی اور اس کو گوارا نہیں کرتا مگر اس سے کرکری میں پڑ جاتے ہیں۔ بعض دفعہ تو وہ کرکری یہیں دنیا میں ہی ظاہر ہوتی ہے مثلاً دوسرے سے رائے نہ لینے کی وجہ سے جواب میں غلطی رہ گئی اور وہ غلطی پکڑ لی گئی۔ بعض دفعہ وہ غلطی ایسی فاش ہوتی ہے کہ آدمی کو بہت خفیف ہونا پڑتا ہے اور اگر یہاں ظاہر نہ بھی ہوئی تو ایک وقت وہ آنے والا ہے جس میں وہ بہت رنگ لاوے گی۔ وہ وقت آنکھ بند ہونے کے بعد کا ہے۔ وہ کرکری ایسی سخت ہوگی کہ اس کا کچھ علاج نہ ہو سکے گا مگر ہم لوگ ایسے بے حس ہو گئے ہیں کہ کرکری سے بھاگتے ہیں اور کرکری میں مزا آتا ہے اور بے دھڑک مسئلہ کا جواب دے دیتے ہیں۔ اور اس سے جو کسی قدر شان بڑھتی ہے اس میں لطف آتا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے تمبا کو کھانے والے کہتے ہیں کہ تمبا کو میں مزا آتا ہے۔ ذرا ان سے پوچھو تو کہ سسرا تمبا کو بھی کوئی مزے کی چیز ہے مگر چونکہ تم عادی ہو گئے ہو اس واسطے حس خراب ہو گیا ہے۔ ذرا ایک نئے آدمی کو کھلا کر دیکھو کیسا چکراتا ہے اور کیسی ہچکیاں آنے لگتی ہیں۔ ہلکے سے ہلکا تمبا کو بھی کھلا دو تو وہ برداشت نہیں کر سکتا اور کھانے والوں کی یہ حالت ہے کہ جتنا کڑوا اور تیز ہو اتنا ہی ان کو مزا آتا ہے اور اس کو اچھا سمجھتے ہیں۔

حقیقت پر نظر رکھنے کی ضرورت:

اس پر ایک قصہ یاد آیا کہ ایک شخص نے دکان سے تمبا کو خریدا اور اس کو پیا تو ہلکا ثابت ہوا۔ پھر آیا کہ اس سے کڑوا دو۔ دکان دار نے اور تیز قسم کا تمبا کو دیا مگر خریدار کو وہ بھی ہلکا معلوم ہوا۔ کہا اس سے بھی کڑوا دو تو دکان دار کہتا ہے بس اس سے کڑوا اللہ کا نام۔ لفظ تو بے ہودہ ہے مگر معنی صحیح ہیں۔ وہ یہ کہ کڑوا ہونا تمبا کو کے لئے کمال سمجھا جاتا ہے تو اس لفظ کے معنی یہ ہوئے کہ تمبا کو کو تو اتنا ہی کمال حاصل ہے اس سے زیادہ کمال اللہ کے نام کو ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے یہ شخص کافر نہیں ہوا کبھی فتویٰ لگا دیا جاوے، یہ ایسا تلخ ہوا جیسے عارف شیرازی کہتے ہیں

آں تلخ وش کہ صوفی ام الخبائث خواند   اشھیٰ لنا و احلیٰ من قبلۃ العذارے

غرض اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ کا نام کڑوا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس سے زیادہ لذیذ اللہ کا نام ہے اور کڑوے سے اس واسطے تعبیر کیا کہ تمبا کو میں کڑوا ہونا ہی لذت ہے۔ یہ سیدھی سی

توجیہ ہے آدمی کو چاہئے کہ حقیقت پر نظر کرے نہ کہ عوان وصورت پر اس مثال سے غرض یہ ہے کہ عادت ہو جانے سے حس ایسا بدل جاتا ہے کہ کڑوا پن بھی کمال سمجھا جاتا ہے حالانکہ کڑوا ہونا بھی کوئی کمال ہے۔ بس عادت نے حس میں تبدیلی کردی ہے کہ کڑوے ہی میں لذت آتی ہے۔

عادت حقیقت تبدیل کردیتی ہے:

جیسے ہماری طرف ایک شخص مقدمہ باز تھے وہ مقدمہ بازی کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ بلا کچہری جائے ان کو چین ہی نہ آتا تھا اور گھر کی روٹی اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ خواہ مخواہ سرائے میں جاکر پڑتے اور ان کی روکھی پھیکی روٹی کھاتے اور اس میں خوش رہتے۔ گھر میں دودھ گھی سے منہ سیدھا نہ ہوتا۔ تو ان کو اگر مقدمہ بازی میں لطف آتا تھا تو کیا اس سے کوئی عقلمند یہ ثابت کر سکتا ہے کہ مقدمہ بازی لذت اور مزے کی چیز ہے؟ نہیں، بلکہ یہی کہا جاوے گا کہ ان کا حس خراب ہو گیا ہے اور عادت نے حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے جیسے تمبا کو حقیقت میں تکلیف کی چیز تھی مگر عادت سے اس میں مزہ آنے لگا۔ اسی عادت سے مقدمہ بازی جیسی چیز بری چیز میں لطف آنے لگا حالانکہ کس قدر بکھیڑے کی چیز ہے۔ توڑ پھوڑ پارٹیاں بنانے جھوٹے گواہ بہم پہنچانا وکلاء کی خوشامد کرنا اور دن میں مارے مارے پھرنا، ایک مجمع کو جمع کرنا اور ان کو ساتھ لئے پھرنا، عملہ والوں کو رشوتیں دینا اور ہاتھ جوڑنا، اللہ توبہ!۔ لوگوں کا اس سے جی نہیں گھبراتا مگر کیا کیجئے عادت سے حقیقت پر پردہ پڑ گیا ہے اور ایسی بدمزہ چیز لذیذ بن گئی ہے۔ ان بکھیڑوں کے تو تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے بس اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ عادت سے سہار ہو گئی ہے سمجھ میں آ گیا ہوگا۔

دینی مدارس کے تزاحم کے خطرناک نتائج:

بعض تکلیف کی چیزیں بھی عادت ہو جانے سے لذیذ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اس قبیل سے وہ تکلیفیں بھی ہیں جو مدارس کے تزاحم سے پیش آتی ہیں۔ بعض دفعہ اس کی نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ دونوں مدرسوں کے مہتمموں کے خاندانوں میں عداوت ہو جاتی ہے اور اس پر بھی بس نہیں ہوتا کیونکہ مدرسہ دینی کام ہے اس سے تمام مسلمانوں کو تعلق ہوتا ہے اس لئے ان کے تزاحم کا اثر صرف دو خاندانوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ عام مسلمانوں پر پڑتا ہے اور مدرسوں کے تزاحم کے وقت عام مسلمانوں میں فرقہ بندی ہو جاتی ہے اور بہت سے فریق بن جاتے ہیں جن میں عداوتیں پیدا ہو جاتی ہیں، پھر یہ عداوتیں بچے دیتی ہیں اور جس بات پر ان کی بنا ہوئی اس پر بھی محدود نہیں رہتیں بلکہ

ذاتی عداوتیں طرح طرح کی پیدا ہو جاتی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ عداوت اتفاق کی ضد ہے اور سب جانتے ہیں کہ اتفاق تمام راحتوں کی جڑ ہے تو اس کی ضد تمام تکالیف کی جڑ ہوگی تو یہ تزاحم ایسی بری چیز ہوئی کہ تمام تکالیف کی جڑ ہے مگر آج کل ایسی بے حسی چھائی ہوئی ہے کہ ہر جگہ مدارس میں یہ تزاحم موجود ہے اور لوگوں کو اس سے ذرا بھی گرانی نہیں ہوتی۔ یہ بے حسی داخل عادت ہوگئی ہے۔ گویا مدرسہ کے لئے یہ بات مان لی گئی کہ تزاحم بھی لازمی چیز ہے جب مدرسہ کا کام شروع کیا تو اس کو بھی شروع کر دیا اور سمجھتے ہیں کہ جہاں مدرسہ کے اور کاموں میں محنت مشقت ہے اسی جنس سے یہ بھی ہے۔

حسد بدترین اعمال میں سے ہے:

اور نیز یہ بھی سمجھتے ہیں کہ جیسے مدرسہ کے اور کاموں میں اجر ہے ایسے ہی اس توڑ پھوڑ میں بھی اجر ہے بلکہ اور کاموں سے زیادہ اجر ہے کیونکہ اس میں مجاہدہ زیادہ ہے۔ اس غلطی میں اچھے اچھے پڑھے لکھے مبتلا ہیں اور مقدمہ بازیوں اور پالیسیوں کو مدرسہ کا کام سمجھتے ہیں حالانکہ یہ سب بناء فاسد علی الفاسد ہے یہ مستحسن جب ہوتا جب شریعت نے اس کا حکم کیا ہوتا یا شریعت کے کسی حکم پر اس کی بناء ہوتی اس کی بناء تو بہت گندی اور شریعت کے خلاف امر پر ہے اور امر وہی ہے جس کو میں نے اوپر عرض کیا کہ تعدد مدارس دوسرے مدرسہ کو توڑنے اور دین کی موجودہ قوت مٹانے کے لئے ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس کی بنا اکثر حسد پر ہوتی ہے پھر جس چیز کی بنا حسد پر ہو اس سے شریعت کو کیا واسطہ۔ شریعت میں تو حسد منجملہ بدترین اعمال کے ہے تو جس کام کی بناء اس پر ہو اس پر اجر کی توقع رکھنا نہ معلوم کہاں تک صحیح ہے۔

مدرسہ دار العلم ہے:

تعدد فی نفسہٖ تو برا نہ تھا کیونکہ مدرسہ دار العلم ہے اور دین کے لئے علم کی ضرورت ہے، تو جتنے دار العلم زیادہ ہوں گے اتنے ہی دین کی قوت ہوگی اور اس کی نظیر بھی موجود ہے۔ دیکھئے ایک شہر میں بلکہ ایک قصبہ میں مسجدیں متعدد ہوتی ہیں اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا بلکہ کسی کا دل نہیں کھٹکتا پھر مدارس نے کیا قصور کیا ہے مسجد دار العمل ہے اور مدارس دار العلم تو جیسے دار العمل کا تعدد دین کے لئے مضر نہیں بلکہ مسلمانوں کے لئے آرام دہ ہے اور ترقی دین کی علامت ہے ایسے ہی دار العلم کا تعدد بھی دین کے لئے مفید اور علامت ترقی ہونا چاہئے لیکن عجیب بات ہے کہ مساجد کے تعدد سے کوئی نہیں کھٹکتا اور مدارس کے تعدد سے کھٹکتے ہیں۔ یہ بات دراصل بے بنیاد بھی نہیں ہے اس میں ایک راز

ہے وہ یہ کہ عادۃً تعدد مساجد کی بنا ان باتوں پر نہیں ہوتی جن پر تعدد مدارس کی بنا ہوتی ہے یعنی باہمی مخالفت اور جاہ اور بڑائی، اس واسطے مساجد سے کوئی نہیں کھٹکتا اور مدارس سے کھٹکتے ہیں اور جہاں کہیں مساجد میں بھی یہ خرافات شامل ہوجاتی ہیں اور تعدد کی بنا جاہ اور بڑائی پر ہوجاتی ہے تو وہاں مساجد کی بھی یہی گت ہوجاتی ہے کہ ہر شخص ان کو بری نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔

تعدد بنائے فاسد کا اثر:

چنانچہ کانپور میں دو مسجدیں برابر ایسی ہی موجود ہیں پہلے ایک مسجد تھی پھر ایک شخص نے صرف اپنی بڑائی دکھانے کے لئے دوسری مسجد بنائی۔ اب دونوں میں مخالفت کی یہ نبوت آئی کہ ہر ایک میں کوشش کی جاتی ہے کہ یہاں نمازی زیادہ ہوں اس کے لئے تعارف سے بھی کام لیا جاتا ہے اور اپنے جان پہچان لوگوں کو ہر مسجد والا اپنی مسجد میں کھینچ کر لے جاتا ہے جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تو مٹھائی بانٹی جاتی ہے اور عمدہ عمدہ مٹھائیاں بنوائی جاتی ہیں۔ یہ مسجد گو احکام مسجد میں ہو مگر باعتبار ثواب کے مسجد نہیں ہے کیونکہ ثواب مسجد خدا کے لئے بنانے سے ہوتا ہے اور جب اس میں دوسری حیثیت لگ گئی وہ یہ کہ خدا کے حکم کے خلاف بنائی گئی تو اب اس میں ثواب کیا۔ دیکھو مسجد ضرار کی نسبت قرآن شریف میں موجود ہے کہ وہ مسجد مع اہل مسجد کے دوزخ میں گرے گی۔ دیکھئے جہاں تعدد کی بنا فاسد ہو وہاں مسجد جیسی متبرک چیز میں بھی برکت جاتی رہتی ہے اور اس کا تعدد بھی برا ہوجاتا ہے اور وہ بناء فاسد کیا ہے؟

مسجد ضرار:

مسجد ضرار میں تو کفر کی تائید اور اسلام کا اضرار تھا اور یہ بنا متیقن تھی اس لئے وہ احکام میں بھی مسجد نہ ہوئی اور یہاں یہ تو نہیں بلکہ اس سے ہلکی چیز ہے یعنی اپنا نام مقصود ہونا اس کا منشا حب جاہ اور کبر ہے اس لئے وہ احکام میں مسجد ضرار نہیں لیکن ثواب نہ ہونے میں اسی کے مشابہ ہے لیکن چونکہ عام طور سے مساجد میں یہ بناء نہیں ہوتی اس لئے اس سے کوئی نہیں کھٹکتا اور تعدد مدارس کی بناء اس پر ہوتی ہے اس وجہ سے اس سے سب کھٹکتے ہیں۔

تعدد سے مقصود:

پس راز اس کا یہ ہوا کہ کہیں تعدد سے مقصود ثواب ہوتا ہے تو وہاں تزاحم نہیں ہوتا اور نتیجہ اس کا اچھا نکلتا ہے اور کہیں مقصود ثواب نہیں ہوتا بلکہ سباب ہوتا ہے، پھر وہاں ثواب کہاں سباب کے

معنی گالیاں بکنا ہے، گالیاں بکنے میں ثواب کا کیا کام اس صورت میں نتیجہ کبھی اچھا نکل نہیں سکتا اور تزاحم ضرور ہوتا ہے اور یہ اثر ہر جگہ لازم ہے خواہ دارالعمل یعنی مسجد میں ہو تو یا دارالعلم یعنی مدرسہ میں ہو تو جہاں تعدد ہو مسجد کا ہو یا مدرسہ کا اگر ثواب کے لئے ہو یعنی اس میں خلوص ہو اور محض دین مقصود ہو تو وہاں تزاحم نہ ہوگا اور وہی تعدد مسجد کا ہو یا مدرسہ کا اگر ثواب کے لئے نہیں ہے یعنی اس میں خلوص نہیں تو تزاحم ضرور ہوگا اور اس وقت تعدد سے زیادہ تر مقصود بجائے ثواب اور دین کی تائید کے اپنا بڑا بننا ہوتا ہے۔ اسی کی شکایت ہے کہ تعدد مدارس فی نفسہ تو برا نہ تھا مگر آج کل اکثر جگہ اس کی بناء حب مال یا جاہ پر ہوتی ہے اس واسطے قابل اعتراض ہے دیکھ لیجئے اس سے بہت کم مدرسے خالی ہوں گے جہاں دو مدرسہ ہوئے بس وہاں ثواب اور خلوص سے تو بحث نہیں رہتی بس یہ نیت ہوتی ہے کہ کام کی نسبت ہماری طرف ہو کیوں صاحب اگر دین مقصود ہے تو اس خصوصیت کو کیا دخل ہے۔ یہ تو کھلا ہوا حب جاہ ہے کیونکہ دین مقصود ہوتا تو نظر اس پر رہتی کہ دین کا کام ہو جاوے خواہ ہمارے ہاتھ سے ہو یا دوسرے کے ہاتھ سے اور جب اپنی خصوصیت مدنظر ہوئی تو مقصود یہ ہوا کہ ہمارا نام ہو، اسی کا نام حب جاہ ہے۔

کان پور میں ایک طالب علم کی دستار بندی کا قصہ:

کانپور کا قصہ ہے کہ ایک طالب علم ایک مدرسہ میں پڑھتا تھا جب وہ قریب فراغ پہنچا تو دوسرے مدرسہ میں جا نام لکھایا۔ دستار بندی کا جلسہ ہونے والا تھا اب صبح کو جلسہ ہے شام کو پہلے مدرسہ والوں نے اس کو بلایا اور کہا کہ محنت تو کی ہم نے اس کے کیا معنی کہ دستار بندی دوسرے مدرسہ میں ہو لہٰذا تم یہیں آ جاؤ۔ اس پر ایک قصہ اور یاد آ گیا۔ دو بھائی تھے ان کے یہاں کچھ مہمان آئے تو ایک بھائی بولا کہ آج دوپہر کی دعوت میرے یہاں اور دوسرے سے کہا شام کی دعوت تم کر دینا۔ چنانچہ اس پر طرفین کی ناراضی ہوگئی جس کے یہاں صبح کی دعوت تھی اس نے کیا کیا کہ ان سے کہا کہ چلو جنگل ہو آویں ذرا ہوا خوری اور تفریح ہو گی۔ جنگل میں ایک گولر کھاویں چنانچہ کسی کو درخت پر چڑھا کر خوب گولر جھڑوائے اور خود بھی کھائے ان کو بھی کھلائے۔ مقصود ان کو ہی کھلانا تھا تاکہ روٹی کم کھاویں جب دوسرے بھائی کو خبر ہوئی تو اس نے کہا اس وقت کی دعوت تو میرے ہاں ہے تم شام کو کھلا دینا۔ اس نے کہا واہ یہ خوب رہی گولر ایا تو ہم نے اور کھانا تو کھلائے گا ایسا نہیں ہو سکتا۔ سو حضرت یہی قصہ یہاں ہوا کہ ایک مدرسہ والوں نے اس طالب علم سے کہا کہ تجھے گولرایا تو ہم نے یعنی محنت کی اور تیار کیا اور وقت پر دوسرے کو دے اس مدرسہ والوں نے اس

طالب علم کو کچھ روپے دینے کو بھی کہے اور اس پر پکا کر لیا کہ دستار بندی دوسرے مدرسہ میں نہ ہو بلکہ یہیں ہو۔ اس کی خبر دوسرے مدرسہ والوں کو بھی لگ گئی انہوں نے کمیٹی کی کہ کیا کرنا چاہئے؟ بعض چالاکوں نے ایک ترکیب نکالی اور اس طالب علم کو کسی حیلہ سے بلا کر ایک کوٹھی میں بند کر دیا نہ کہنا نہ سننا کسی کو کانوں کان خبر نہیں۔ بس کوٹھری میں بند کر کے تالا ڈال دیا۔ اس سے مقصود ان کو دق کرنا نہیں تھا بلکہ صرف محبوس کرنا اور اپنے قبضہ میں رکھنا منظور تھا۔ اسی واسطے کوٹھری میں اس کے کھانے پینے وغیرہ کا کل سامان فراغت کے ساتھ جمع کر دیا۔ چند قسم کے پھل رکھ دیئے۔ پانی پینے کے لئے گھڑا، لوٹا، گلاس سب کچھ سامان کر دیا معلوم نہیں نماز کیسے پڑھی ہوگی اور پاخانہ کیسے پھرا ہو گا اسی طرح ان کو قید رکھا پہلے مدرسہ والے ان کو تلاش کر کے مایوس ہو کر بیٹھ رہے یہ سمجھے ہوں گے کہ طالب علم لاأبالی ہوتے ہی ہیں کہیں کو چل دیئے ہوں گے جب عین جلسے کا وقت ہوا تو دوسرے مدرسہ والوں نے ان کو کوٹھی میں سے نکال کر بہت حفاظت کے ساتھ جلسہ میں پہنچایا اور دستار بندی کر دی جب کام نکل گیا تو چھوڑ دیا کہ اب جہاں چاہے تشریف لے جایئے۔ وہاں تو روپے بھی ملتے تھے یہاں کچھ بھی نہ ملا۔ مفت ہی میں کام نکالا یہ نوبت ہے تزاحم کی کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کی بناء ثواب پر ہے اس کی بنا صرف جاہ پر ہے کہ یوں نام ہوگا کہ ہمارے مدرسہ میں اتنے طلبہ کی دستار بندی ہوئی اگر دین کی ترقی منظور ہوتی تو اس بکھیڑے کی کیا ضرورت تھی بس ایک عالم تیار ہوا تھا جس سے دین کی امداد ہونے کی توقع ہے اس مدرسہ سے ہوا تو کیا مگر یہ تو منظور نہیں۔ منظور تو یہ ہے کہ ہمارا نام ہو اور اس کی وجہ وہی بڑائی ہے جس کو جاہ کہتے ہیں کہ یہ کہا جاوے کہ ہمارے مدرسہ سے اتنے آدمی پڑھ کر نکلے جس طرح ہو تعداد بڑھائی جاوے۔

مخلص اور مفلس:

اس موقع پر مولانا محمد یعقوب صاحب کی ایک بات یاد آئی وہ فرمایا کرتے تھے یہ حضرات مخلص تھے اور ہم مفلس ہیں یعنی خلوص سے خالی ہاتھ ہیں مفلس کے لفظ پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک شخص سے میں نے کہا آپ بڑے مخلص ہیں۔ انہوں نے شاید کبھی مخلص کا لفظ نہ سنا تھا وہ مفلس سمجھے تو کہنے لگے جی اللہ کا فضل ہے کھانے کو سب کچھ ہے۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی راہ نجات بھی پڑھاتا ہے وہ بھی ہمارا معین ہے ہمارا کام بٹاتا ہے ہم کو بھی اس کی اعانت کرنی چاہئے اور ملا جلا رہنا چاہئے۔ یہ ہے خلوص اور یہ ہے ثواب کے واسطے دین کی تعلیم دینا۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا سا باہمی علاقہ ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ انبیاء سب بھائی بھائی

ہیں یہ ہے طریقہ سنت اور طریقہ حق اور یہی مشائخ اور علماء اور فقراء کو چاہئے کہ باہم ایسا علاقہ رکھیں مگر آج کل اگر کسی دوسرے کو بھائی کہتے بھی ہیں تو اس کے معنی وہ ہوتے ہیں جو ہندو بھائی اور عیسائی بھائی یوں کہتے ہیں یہ لفظ تہذیب کا ہے ورنہ مراد دشمن ہے تو مشائخ یا علماء اگر کسی اپنے ہم عصر کی نسبت بھائی یا برادر کا لفظ بولتے ہیں تو برادران وطن مراد ہوتے ہیں جس کا اطلاق ہندوؤں پر آتا ہے نہ برادران طریق پر، علماء کو بھی چاہئے کہ اتحاد سے رہیں اور دین کا کام دین کی طرح کریں۔ نہ آج کل کے مدرسوں کی طرح کہ دوسرے مدرسہ میں چاہے کیسے ہی قابل لوگ وہاں موجود ہوں مگر جب اسے یاد کریں گے تو برائی ہی سے یاد کریں گے کیا اس حالت پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ خلوص سے کام کیا جاتا ہے؟ خلوص تو کوسوں دور ہے۔

مقصود چندہ ہے یا جاہ:

بس مقصود دوسرا ہے کہیں مقصود جاہ ہے یعنی انتساب کہ ہم اتنا کام کرتے ہیں اور کہیں مال یعنی چندہ رسی کی ضرورت سے مجمع بڑھایا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ طالب علم زیادہ ہوں کیونکہ جب طالب علم زیادہ ہوں گے تو لوگ سمجھیں گے کہ کام خوب ہو رہا ہے لہٰذا چندہ بھی زیادہ دیں گے۔ یہ چندہ ایسا مطمع نظر ہوا ہے کہ اس پر بھی نظر نہیں رہی کہ چندہ مقصود بالذات ہے یا کسی چیز کا ذریعہ ہے اور اس کی وہ حالت ہوگئی جیسے بعض لوگ کھانے کے حریص ہوتے ہیں اور کھائے چلے جاتے ہیں خواہ اس پر وہ غرض جس کے لئے کھانا موضوع ہے مرتب نہ بھی ہو یعنی تغذیہ بدن ہو یا نہ ہو چاہے دست ہی آتے رہیں مگر کھائے ضرور جاتے ہیں اور جب کوئی ٹوکے تو کہتے ہیں سب کام تو قوت پر موقوف ہیں اور قوت موقوف ہے کھانے پر تو سب کام موقوف ہیں کھانے پر تو کھانا ایسی ضروری چیز ہے اور تم اس سے منع کرتے ہو اس بے وقوف نے یہ نہیں سمجھا کہ اس دلیل میں ایک مقدمہ میں تفصیل کی کسر ہے وہ یہ کہ یہ تو صحیح ہے کہ سب کام موقوف ہیں قوت پر اور یہ بھی صحیح ہے کہ قوت موقوف ہے کھانے پر مگر یہ کہ کون سا کھانا مورث قوت ہے اس میں کلام ہے اگر یہ کہا جاوے کہ مطلق کھانا مورث قوت ہے تو اس پر ہم کہیں گے کیونکہ کھانا وہ مورث قوت ہوتا ہے جو ہضم ہو اور ہضم جب ہی ہوگا جب پیٹ کے موافق کھایا جاوے اور جب پیٹ سے زیادہ کھایا جاوے گا تو وہ ہضم نہیں ہو سکتا اور جب ہضم نہ ہوگا تو اس سے طبیعت غذا نہیں حاصل کر سکی بلکہ مجبور ہوگی اس کی دفع پر اور اس میں کوئی فعل نہ کرے گی بجز اس کے کہ دستوں کے راہ نکال دے تو اس

کھانے کا نتیجہ تو محض یہ ہوا کہ ایک راہ سے پیٹ میں داخل کیا گیا اور دوسری راہ سے نکال دیا گیا تو اس دلیل میں غلطی یہ تھی کہ ایک مقدمہ کا خیال نہیں رہا جس پر نتیجہ کی صحت موقوف تھی۔

حصول چندہ میں غلو:

خلاصہ غلطی کا یہ ہوا کہ ذریعہ کو اختیار کیا گیا مگر نہ بہ حیثیت منتج مقصود ہونے کے بلکہ ذریعہ کو مقصود بنالیا گیا۔ یہی حالت آج کل کے چندہ کی ہے کہ لوگ ایسے اس کے پیچھے پڑے ہیں کہ فنافی الچندہ ہوگئے۔ نہ جائز کو دیکھتے ہیں نہ ناجائز کو بس چندہ ہونا چاہئے اور جب کوئی ان سے کہے کہ چندہ میں یہ خرابیاں ہیں تو وہی جواب یہاں بھی ملتا ہے جو اس کھانے والے نے دیا تھا کہ سارے کام تو آج کل مالی قوت پر موقوف ہیں اور مالی قوت کا مدار چندہ پر ہے تو سارے کام موقوف ہوئے چندہ پر اور تم اس سے منع کرتے ہو۔

چندہ مقصود بالذات نہیں:

صاحبو! یہ دونوں مقدمے ٹھیک ہیں مگر ایک مقدمہ یہاں بھی قابل تفصیل ہے کہ یہ چندہ جس میں حدود کا خیال نہ رکھا جاوے یہ بھی مفضی الی القوت ہے یا نہیں۔ سو دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہرگز نہیں ہے کیونکہ قوت سے مراد دینی قوت ہے (اس کو خوب ذہن نشین کر لیجئے) اور جب چندہ اس طریق سے لیا گیا جو شرعاً ممنوع ہے تو دین تو پہلے ہی غارت ہوگیا پھر اس سے دینی قوت کی توقع رکھنا کیا معنی ہے یہ تو ایسا ہوا جیسے کھانے کے شوق میں آ کر ڈھیلے پتھر کھالئے اور خوش ہیں کہ اس سے قوت آوے گی بلکہ ڈھیلے پتھر بھی نہیں سنکھیا کھالیا اور دل خوش کر لیا کہ اس سے قوت آوے گی اس سے جیسی قوت آوے گی ابھی ذرا دیر میں معلوم ہو جائے گی۔

ذریعہ کو مقصود سمجھنا غلطی ہے:

غلطی یہی ہے کہ چندہ کو مقصود بالذات سمجھا ذریعہ نہیں سمجھا اگر ذریعہ سمجھتے تو ظاہر ہے کہ چندہ ذریعہ ہے دین کا تو دین اس کے واسطے غارت نہ کرتے اور دین کو غارت کر کے چندہ لیا تو یہ تو ایسا ہوا جیسے چھت کی مرمت کے لئے سیڑھی کی ضرورت تھی اور کوئی یوں کرے کہ چھت ہی میں سے دو کڑیاں نکال کر ان کی سیڑھی بنالے تو کیا آپ کو عقلمند کہیں گے ہرگز نہیں اس میں بھی تو غلطی یہ ہے کہ اس نے مقصود اور ذریعہ میں فرق نہیں کیا اور ذریعہ کے لئے یعنی سیڑھی کے لئے مقصود کو یعنی چھت ہی کو بگاڑا اسی طرح یہ چندہ والے کرتے ہیں کہ چندہ جو کہ ذریعہ ہے دین کی

درستی کا اس کے لئے دین ہی کو خراب کر لیتے ہیں اور سنئے آپ کو معلوم ہوگا کہ اصلاح ذات البین اور اتفاق بھی ایک فرد ہے دین کا اور اس کا مقابل تخریب دین ہے تو چندہ اگر موجب ہوا فساد اور نفاق اور عداوت کا تو وہ قوت دین کا ذریعہ کہاں بنا بلکہ تخریب دین کا ذریعہ بن گیا بس اس وقت تو یہی کہا جاوے گا کہ مقصود سے کچھ غرض نہیں ذریعہ ہی کو مقصود بنالیا ہے جہاں دو مدرسے ہوجاتے ہیں وہاں کیا کیا برے اور شرمناک واقعات ہوتے ہیں اور سب کی اصل نکالی جاوے گی تو وہی چندہ اصل نکلے گا کہ ہر مدرسہ والا اس کی کمی سے ڈر رہا ہے اس واسطے دوسرے مدرسہ کی مخالفت کرتا ہے اور دونوں آپس میں لڑتے ہیں حتیٰ کہ ہاتھا پائی اور فوجداری کی نوبت آ جاتی ہے پھر کیسا فضیحت ہونا پڑتا ہے۔ عدالت تک نوبت آتی ہے اور موافق اور مخالف سب کے سامنے ہنسائی ہوتی ہے حالانکہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر دو مدرسے ہوگئے تو حرج کیا ہوگیا کام ہلکا ہوگیا پہلے سب کام ایک کو کرنا پڑتا تھا اب دو ہوگئے تو کام بٹ گیا۔

نرم برتاؤ فی نفسہٖ مامور بہ ہے:

اس کو تو غنیمت سمجھنا چاہئے ہمارے یہاں تھانہ بھون میں مدرسہ ہے جس کو لوگ جانتے ہیں ایک دفعہ ایک نیا مدرسہ ہونے کو تھا میں نے کہلا بھیجا کہ ''چشم ماروشن دل ماشاد'' اچھا ہے ہمارا کام آپ اپنے سر لے لیں اگر آپ مدرسہ کرتے ہیں تو ہم مخالفت نہیں کریں گے جس سے آپ کے چندہ میں کچھ کمی ہو بلکہ ہم اپنا مدرسہ اٹھا دیں گے۔ یہ چندہ بھی جو کچھ ہو آپ ہی لے لیجئے اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ نیا مدرسہ موقوف رہا (اگر دوسرے مدرسہ کو روکنا بھی ہو تو یہ ترکیب ہے نہ یہ کہ اس سے لڑا جاوے اور فوجداری کی جاوے) میں نے دراصل یہ ترکیب نہیں چلی تھی اور صرف کہلا بھیجنا نہ تھا بلکہ دل سے یہی ارادہ تھا حتیٰ کہ یہ کیا کہ اپنے یہاں کے مدرسین کو تین چار مہینہ کی تنخواہیں پیشگی دے کر میں باہر چلا گیا اور ان سے کہہ گیا کہ اگر وہ مدرسہ واقعی شروع ہو جاوے تو مزاحمت نہ کرنا بلکہ اس میں چلے جانا اور تنخواہیں اس واسطے دے دیں کہ شاید اس میں بالفعل چندہ کی کمی ہو اور اس لئے وہاں مدرسین کو تنخواہیں نہ مل سکیں اور وہ اس وجہ سے وہاں جانے والوں کو کچھ رکاوٹ ہو میں تو اس کے لئے بالکل تیار تھا مگر اثر یہ ہوا کہ وہ مدرسہ شروع ہی ہو کر رہ گیا ایک نرم ہو جاوے تو اس کا دوسرے پر بھی اثر ہوتا ہے اور وہ بھی نرم ہو جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہ سمجھئے کہ اس ترکیب سے اس غرض کے لئے کام لینا چاہئے۔ دوسرے پر یہ اثر ہو کہ وہ نرم پڑ جاوے اور اس سے دب جاوے اور دوسرا مدرسہ جاتا رہے۔ یہ تو خود طلبی اور دھوکا دینا ہے اور اس کو پالیسی کہتے ہیں اور اس سے اثر بھی نہیں ہوتا بلکہ جب یہ بات کھل جاتی ہے کہ اس

میں پالیسی بھی تو اثر برعکس ہوتا ہے اور ہر شخص پہلے مدرسہ والوں کا مخالف بن جاتا ہے اور لوگ کہنے لگتے ہیں کہ مولویوں کو بھی مکاری آتی ہے بلکہ نرم برتاؤ فی نفسہ ماموریہ اور محمود ہے اور دونوں اس کے مخاطب ہیں یہ سمجھ کر دونوں کو چاہئے کہ نرمی کا برتاؤ کریں اور خلوص سے کام کریں جس سے بھی جو کام دین کا ہو جاوے اس کو غنیمت سمجھیں تزاحم کیوں کیا جاتا ہے۔ یہ صورت اتفاق کی۔

اتفاق کی اصل:

حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ لوگ اتفاق اتفاق پکارتے پھرتے ہیں مگر جو اصل ہے اتفاق کی اس سے بہت دور ہیں تو اتفاق کی اصل تواضع ہے جن دو شخصوں میں تواضع ہوگی ان میں نا اتفاقی نہیں ہوسکتی اور تواضع کی ضد تکبر ہے جہاں تکبر ہوگا وہاں اتفاق نہیں ہوسکتا اب لوگ ہر بات میں تکبر کو اختیار کرتے ہیں اور اور زبان سے اتفاق اتفاق پکارتے ہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے اگر دونوں تواضع سے کام لیں تو اتفاق قائم رہے اور تواضع جب ہوتی ہے جبکہ حب مال و جاہ نہ ہو اور جہاں مال و جاہ کا دخل ہوگا وہاں تزاحم ضرور ہوگا۔ یہ حب مال و جاہ فساد کی جڑ ہیں اگر یہ نہ ہوں تو خدا کی قسم کہ تزاحم کبھی نہ ہو جیسے اسی کی ایک نظیر موجود ہے کہ مساجد میں تزاحم نہیں ہوتا کیونکہ عادتاً اکثر مساجد کے بنانے میں مال و جاہ مقصود نہیں ہوتا اور جہاں مساجد میں بھی یہ بلا شامل ہے وہاں تزاحم بھی موجود ہے مساجد کو بھی چھوڑیئے مدرسوں ہی میں جہاں یہ بلا نہیں ہے وہاں تزاحم بھی نہیں۔

سرکاری سکولوں میں تزاحم نہ ہونے کا سبب:

دیکھ لیجئے گورنمنٹ کے ہزاروں مدرسے ہیں اور آپس میں تزاحم نہیں کیونکہ ان میں مال و جاہ کی غرض شامل نہیں کیونکہ ہر شخص کو اپنی تنخواہ سے مطلب ہے۔ یہ خیال کسی کو نہیں کہ ایک مدرسہ میں طالب علم زیادہ ہوں گے تو دوسرے سے بڑھ جاوے اور چندہ زیادہ آوے گا اور نام ہوگا کہ فلانے کا مدرسہ خوب چلتا ہے وہ مدرسہ تو سب ایک ہی کے ہیں چندہ کا وہاں کام نہیں اور طالب علم زیادہ ہونے سے کسی ایک شخص کا نام نہیں ہوتا۔ غرض مال و جاہ کی شرکت نہیں اس واسطے تزاحم بھی نہیں اگر ہمارے مدرسوں میں بھی یہ بلا نہ رہے تو تزاحم نہ رہے اور اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ دونوں میں سے ایک ماتحت بن جاوے دوسرے کا تو حقیقت میں دونوں ایک ہوں گے ایک اصل اور یک فرع تو تزاحم نہ ہوگا کیونکہ ایک کی ترقی دوسرے کی ترقی کو مانع نہ سمجھی جاوے گی بلکہ ہر ایک کی ترقی دوسرے کی بھی ترقی سمجھی جاوے گی اور دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے تابع نہ سہی

مگر آپس میں محبت رکھیں اور غور کرنے سے یہ صورت ثانی زیادہ مشکل معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہم لوگ ایسے فاسد المذاق ہو گئے ہیں کہ بلا حکومت اور دباؤ کے مل کر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ بہر حال جتنی کوشش ہو سکے اچھا ہے آپس میں میل اور اتحاد پیدا ہونے کی کچھ تدبیریں ہیں مثلاً ایک یہ کہ علماء ایک دوسرے سے ملتے رہیں۔ دوسرے یہ کہ دوسرے مدرسہ کے طالب علم کو اپنے مدرسہ میں داخل نہ کریں تاوقتیکہ وہاں کی اجازت نہ ہو اور مہتمم کے دستخط نہ لے آویں۔ ایک طرف سے یہ ہو اور دوسری طرف سے یہ ہو کہ اس طالب علم کو اس مدرسہ میں داخل ہونے سے منع نہ کریں اور دستخط اور اجازت دے دیا کریں کیونکہ مقصود تعلیم دین ہے ممکن ہے کہ ایک کتاب ایک مدرسہ میں ہوتی ہو جس میں شرکت کی طالب علم کو ضرورت ہو دوسرے مدرسے میں وہ نہیں ہوتی تو اس صورت میں اس طالب کو ضرورت ہے اور دوسرے مدرسے میں وہ نہیں ہوتی تو اس صورت میں اس طالب علم کو ایک مدرسہ کا مقید کرنا اس کا وقت ضائع کرنا ہے اور مقید کرنے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔

ظاہری برتاؤ کو باطنی برتاؤ میں دخل ہے:

غرض آپس میں اتحاد رکھنا ہو تو اس کی یہ تدابیر ہیں ان تدابیر کو اگر بتکلف بھی اختیار کیا جاوے تو اثر ہوتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اخلاق باطنی کو دخل ہے ظاہری برتاؤ میں کہ جیسے اخلاق ہوتے ہیں ویسے ہی برتاؤ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے ہی اس کا عکس بھی ہے کہ ظاہری برتاؤ کو بھی دخل ہے باطنی اخلاق کے پیدا ہو جانے میں کہ جیسا برتاؤ بتکلف اختیار کیا جاوے ویسے ہی اخلاق پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ یعنی اگر کسی سے تکلیف پہنچے تو اس کی مکافات اچھے برتاؤ کے ساتھ کیجئے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس کو آپ سے عداوت تھی وہ پکا دوست بن جاوے گا۔ صدیق صداقت سے ہے جس کے معنی ہیں محبت اور خلت، یعنی وہ دوستی جو قلب میں گھس گئی ہو۔ معلوم ہوا کہ نیک برتاؤ کا گو وہ تکلف ہی سے ہو یہ اثر ہے کہ دوسرے شخص کے قلب میں سچی اور واقعی محبت پیدا ہو جاتی ہے آیت سے یہ مسئلہ بدلالۃ النص ثابت ہو گیا کہ اگر یہ تدابیر اتحاد دل سے بھی نہیں اختیار کر سکتے تو بتکلف ہی اختیار کر لیں۔ غرض اتحاد اچھی چیز ہے اس کے حاصل کرنے کی تدابیر کرنی چاہئیں۔ پھر اتحاد کی صورت میں تعدد مدارس بھی کچھ برا نہیں مگر یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ مقصود علم دین کی خدمت ہو نہ کہ جاہ اور مال اگر مقصود تعدد سے علم دین کی خدمت ہو تو جتنا تعدد ہوگا علم دین کی خدمت زیادہ ہوگی یہ ایسا ہوگا جیسے ایک آدمی کے ساتھ دس آدمی ہو جاویں

تو دس گنا کام ہوگا اور اس کو ہر شخص چاہتا ہے کہ علم دین کی جس قدر زیادہ خدمت ہو سکے ضروری ہے خصوصاً اس زمانہ میں کہ ضلالت سے نجات بلا اس کے ناممکن ہے یعنی خصوصاً اس واسطے کہا کہ پہلے زمانہ میں اہل تزاحم کم تھے اس لئے تھوڑی جماعت کی دین سے واقفیت کافی تھی اور ناواقفوں کے لئے صرف اتنا کافی تھا کہ جو ضرورت پیش آئے اس کا حکم کسی سے پوچھ لیا اب اہل باطل کی مزاحمت بھی موجود ہے۔ زمانہ آزادی اور خودداری کا ہے ہر شخص جدا جدا اسلام پر حملہ کرنے کو تیار ہے غیر اسلام والے بھی اسلام پر حملہ کرتے ہیں اور خود اہل اسلام میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اسلام پر حملہ کرتے ہیں اور یہ حملہ زیادہ مضر ہے کیونکہ غیر اہل اسلام تو مخالف ہیں، صورۃً وحقیقۃً دونوں طرح ان کو دشمن سمجھا جاتا ہے اور دشمن کی بات کا زیادہ اثر نہیں ہوتا اور یہ لوگ دشمن بصورت دوست ہیں ان کے جال سے بچنا مشکل ہے۔

درستی معاد علم سے ہوتی ہے:

اب تو دین کی حفاظت کی اس کے سوا کوئی صورت ہی نہیں کہ علم والوں کی بہت بڑی جماعت ہو اور اتنا بڑا مجمع اہل علم کا بلا کافی قوت اور کوشش کے نہیں ہو سکتا اس واسطے ضرورت ہے کہ سب مسلمان متفق ہو کر کوشش کریں۔ اب وقت اختلاف کا نہیں رہا اس تقریر سے علم اور کافی علم کی ضرورت ثابت ہوگئی اور یہی علم ذریعہ ہے دین کی حفاظت کا اسی سے عقائد درست ہو سکتے ہیں اور اسی سے اعمال درست ہو سکتے ہیں اور اس مجموعہ اصلاح کا خلاصہ درستی معاد ہے، تو حاصل یہ ہوا کہ درستی معاد ہوتی ہے علم سے، اس واسطے علم کی سخت ضرورت ہے اور اس وقت جو آیت تلاوت کی گئی اس کے ضمن میں مسئلہ معاد ہی کا بیان مجھے مقصود ہے اب میں آیت کا ترجمہ ہی کئے دیتا ہوں متعلقات کو طول نہیں دوں گا۔ اب تک میرا یہ طریقہ تھا کہ ایک آیت پڑھی اور اس کے متعلق تمام مالۂ وماعلیہ سے بحث کی اور اس ضمن میں اصل مضمون اور اس کے متعلقات سب ہی آ جاتے تھے اور بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی تھی۔ گو اس سلسلہ کے بڑھ جانے سے بھی کلام میں تشتت نہ ہوتا تھا اور اصل مضمون محفوظ رہتا تھا کیونکہ نظر اصل مضمون ہی کی طرف رہتی تھی تاہم اصل مضامین کے ساتھ متعلقات بہت زیادہ ہوتے تھے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت تھوڑی ہوتی تھی اور بیان زیادہ ہوتا تھا اور آج اس طرز کو چھوڑ کر دوسرے طرز سے بیان کروں گا وہ یہ ہے کہ متعلقات کو طول نہیں دوں گا صرف آیتوں کا ترجمہ کروں گا اور مختصر طور پر توضیح مطلب کروں گا۔ اس طرز کا نتیجہ یہ ہے کہ آیتیں

زیادہ ہوں گی اور متعلقات کا بیان کم ہوگا اور میرا قدیم طریقہ یہی تھا گو اس دوسرے طریقہ کی ایک مدت سے عادت ہو جانے کے سبب یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ قدیم طریقہ تھا اور جدید طریقہ اختیار کیا جاتا ہے لیکن واقعی بات یہ ہے کہ قدیم طریقہ عرصہ سے بدلا ہوا تھا اور بجائے اس کے دوسرا طریقہ اختیار کیا ہوا تھا آج پھر اسی قدیم طریقہ کا اعادہ کیا جاتا ہے اور بات بھی یہی کہ بیان ذریعہ ہے۔

اصل مقصود وعظ ہے:

اصل مقصود مضمون آیت ہے تو نظر مقصود پر رہنی چاہئے ذریعہ وہی اختیار کرنا چاہئے جو موصول الی المقصود ہو اور بس اگر ایک کام کے چند ذرائع ہوں تو ظاہر ہے کہ جو ذریعہ احقر ہو یعنی چھوٹے سے چھوٹا ہو اسی کو اختیار کرنا چاہئے قدیم طریقہ مختصر اور بہت سہل تھا اس واسطے اس کو درمیانی طریقہ پر ترجیح ہو سکتی ہے جیسا کہ ظاہر ہے کہ ترجمہ اور مضامین اصلیہ کے بیان کرنے میں کچھ بھی دقت نہیں اور اس دوسرے طریقہ میں چند چیزوں کی ضرورت ہے (جیسا کہ آگے معلوم ہو گا) تو چند چیزوں کے جمع کرنے میں اتنی سہولت نہیں ہو سکتی جتنی ایک چیز میں ہوگی۔ یہاں میں پھر وہی بات یاد دلاتا ہوں کہ طریقہ مقصود نہیں بلکہ مقصود ہی مقصود ہے۔ مقصود کیا ہے وہ یہ ہے کہ جس کا بیان خود قرآن میں موجود ہے وذکر فان الذکرٰی تنفع المؤمنین (پس آپ نصیحت فرمایئے بے شک نصیحت مومنین کو نفع پہنچاتی ہے) جس کا خلاصہ نصیحت ہے۔ مسلمانوں کو جب مقصود نصیحت ہے اور بیان اس کا ذریعہ اور طریق ہوا تو کیا ضرور ہے کہ ایک ہی طریقہ کا التزام کر لیا جاوے بلکہ جب کوئی دوسرا طریقہ نفع معلوم ہو تو چاہئے کہ پہلے کو بدل دیا جاوے اور یہ مؤید بالسنّت بھی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہے ما خیر بین امرین الا اختار ایسرھما (مجمع الزوائد ۹:۱۵) یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کسی دو بات میں اختیار دیا جاتا تو ان سے اسی کو اختیار فرماتے تھے جو آسان ہو یہ ایسا ہے جیسے حج کو جانے کے دو راستے ہوں ایک قریب اور ایک بعید تو عقل کی بات یہی ہے کہ قریب کا راستہ اختیار کیا جاوے، اس میں بعض غلطی کرتے ہیں اور طریق طویل کے اختیار کرنے کو باعث مزید ثواب اور مجاہدہ سمجھتے ہیں۔

دین میں سہولت پسندی:

وطن میں ایک صاحب سے میری گفتگو ہوئی وہ اسی خیال کے تھے اور کہتے تھے کہ دین میں سہولت پسندی اچھی نہیں کیونکہ جتنی مشقت زیادہ ہوگی اتنا ہی ثواب زیادہ ہوگا۔ حدیث میں موجود

ہے اجرک علی قدر نصبک (تلخیص الحبیر لابن حجر ۴: ۱۷۷) یعنی اجر بقدر محنت کے ہے اور میں کہتا تھا کہ اس حدیث سے طریق طویل کو اختیار کرنے کی فضیلت بتلانا مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ بڑے مقصود کو حاصل کرو اور اس کی تحصیل میں جو مشقتیں پیش آئیں ان کی وجہ سے ہمت نہ ہارو کیونکہ اجر علی قدر نصبک ان مشقتوں پر اجر بھی زیادہ ملے گا یہ مقصود نہیں کہ مقصود کے دو طریقوں میں سے اعسر اور اطوال کو اختیار کرو اس امید پر کہ اس سے ثواب بڑھ جاوے گا یہ تو درحقیقت مقصود سے محرومی ہے اور ذریعہ کو مقصود بنانا ہے وہ کسی طرح مانتے نہ تھے میں نے کہا اچھا اگر یہی بات ہے کہ جتنا ذریعہ کو طول دیا جاوے اتنا ہی باعث فضیلت ہے تو آپ یوں کیا کریں کہ اگرچہ پانی تھانہ بھون میں بھی موجود ہے مگر فضیلت بڑھانے کے لئے وضو کے واسطے پانی جلال آباد سے لایا کیجئے اور اس سے وضو کر کے نماز پڑھا کیجئے اس طرح ہر نماز کا ثواب بہت بڑھ جاوے گا۔ کیا آپ کے دل کو یہ بات لگتی ہے تب ان کی سمجھ میں آیا۔ تو اصل بات یہی ہے کہ ذریعہ اور طریق کو طول دینا کچھ فضیلت کی بات نہیں ہاں اگر مقصود کے لئے کوئی طریق ہی نہ ہو سوائے طریق طویل کے تو ہمت نہ ہارے۔

وعظ ایک طریق ہے:

غرض وعظ ایک طریق ہے جس سے مقصود مسلمانوں کا نفع ہے تو جس طریق میں بلا مشقت و مضرت ہو وہی طریق اچھا ہوگا اور جو طرز آج کل اختیار کیا گیا ہے اس کی یہی شان ہے۔ اس دوسری طریق میں ایک مضرت یہ ثابت ہوئی کہ بعض سامعین کو غلط فہمی ہوتی تھی کیونکہ بعض مضامین نئے ہوتے تھے جو کتابوں میں نظر سے نہیں گزرتے اکثر طبائع نئی بات سے چونکتی ہیں اس واسطے لوگ ان سے متوحش ہوتے تھے اور غور کرنے کا مادہ طبیعتوں میں رہا ہی نہیں ہے بس نئی بات سن کر خواہ مخواہ اعتراض کر دیتے تھے اور نئے مضامین ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس طریق میں صرف منقولات پر اکتفا نہ ہوتا تھا کہ فلاں کتاب میں یوں لکھا اور فلاں کتاب میں یوں لکھا بلکہ معقولات بھی شامل ہوتے تھے یعنی سیاق و سباق اور قواعد سے استنباط کر کے ایسے مضامین بھی بیان ہوتے تھے جو کسی نے نہیں لکھے کیونکہ ہر مضمون کا کتاب میں لکھا ہوا ہونا ضروری نہیں اور کتابوں میں قواعد کے درج کرنے کا یہی تو حاصل ہے کہ جزئیات کے لکھنے کی ضرورت نہ رہے پس چند اصول کلی لکھ دیئے ہیں جن سے سینکڑوں جزئیات نکالے جا سکتے ہیں۔ تو وعظ کے وقت ان جزئیات کو مستنبط کر کے بیان کر دینے میں کیا حرج ہے۔ اول تو ہمیں اس کی لیاقت کہاں اور قواعد ہم کو ایسے مستحضر کہاں ہیں جن سے ہم زیادہ استنباط کر سکیں مگر خیر ہم بہت تواضع بھی کیوں کریں آخر کچھ تو علم خدا تعالیٰ نے دیا ہی ہے کہیں کہیں استنباط سے

بھی کام لیا جاتا تھا اور کچھ نہ کچھ ایسے مضامین بھی جو کسی سے بالتصریح منقول نہ ہوں بیان میں آ جاتے تھے۔ ان سے بعض لوگ چونکتے تھے اور خواہ مخواہ اعتراض کرتے تھے یا بعض مضامین ایسے ہوتے تھے کہ ان کے سمجھنے کی لیاقت سامعین میں نہیں ہوتی تھی نہ اس کے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے بس جو مدلول سرسری طور پر اپنی سمجھ میں آ گیا اسی کو واقعی مطلب سمجھ کر اعتراض کر دیتے تھے۔ ان مضرتوں کو دیکھ کر خیال ہوا کہ اس بکھیڑے کو کیوں مول لیا جائے۔ اس طریقہ کو چھوڑ ہی کیوں نہ دیا جاوے جس سے یہ سب خرابیاں پیدا ہوئیں۔ گو اس سے یہ فائدہ بھی ہوتا تھا کہ وہ نئے مضامین اگر کسی کو پسند آ گئے تو وہ بہت محظوظ ہوتے تھے لیکن پھر یہ مفسدہ ہوتا تھا کہ کبھی مضامین منقولہ وغیر منقولہ میں تعارض کئے تو ہم سے فرقہ بندی شروع ہوگئی اور ایک اس کے طرف دار ہو گئے اور ایک اس کے۔ گو اس فرقہ بندی سے بیان کنندہ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ اس نے کوئی غلطی نہیں کی ایسی فرقہ بندی سلف کے وقت میں ہوئی ہے مگر مجھے اس سے بھی غیرت آتی ہے کہ کوئی قاسمی بنے اور کوئی رشیدی، کوئی اشرفی اور کوئی روپیہ۔ صاحبو! انسان بنئے اشرفی روپیہ بننے سے کیا فائدہ۔ پھر غور سے سمجھ میں آیا کہ یہ ساری خرابی استنباط کی ہے۔ نہ یہ ہو نہ اختلافات ہوں جب نقل محض ہوگی اور صرف ترجمہ ہوگا تو بات بڑھے گی ہی نہیں، پھر استنباط کی نوبت ہی نہیں آوے گی۔ تو اس طریق میں خطرہ نہیں جب کوئی اشکال کرے، کہہ دیا دیکھ لو یہ ترجمہ اور یہ مضمون فلاں صاحب نے لکھا ہے اپنے اوپر کچھ بھی بار نہ رہا اس طریق میں دماغ پر بھی تعب بہت ہوتا تھا کیونکہ آیت میں سے ایک مضمون نکالا اور اس مضمون میں سے اور مضمون نکالا اس میں سے اور نکالا ان سب کا سلسلہ یاد رکھنا اور ہر مضمون کے لئے اصل کو تلاش کرنا اور ہر پہلو پر نظر رکھنا ظاہر ہے کہ کس قدر دماغ کا کام ہے اور اس صورت میں آیت کے الفاظ کا اتباع ہے جو مضامین سیدھے سیدھے ان الفاظ میں سمجھ میں آویں بیان کر دے تو بہت سا کام ہو گیا۔ غرض اس طریق میں بہت بکھیڑے تھے نیز ضرر بھی دیکھا تو اس سنت پر عمل کرنے کو جی چاہا ما خیر بین امرین الا اختار اھونھما (مجمع الزوائد ۹:۱۵ بلفظ آخر) اور اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ طریقہ بدل دیا جاوے اس واسطے اب میں سیدھے سیدھے ترجمہ پر اکتفا کروں گا بعضوں کا خیال یہ ہے کہ اس طریق کے بیان میں مزا نہیں ہے اس کا جواب یہ ہے کہ مزہ مقصود نہیں شفا مقصود ہے۔

مقصود مزہ نہیں:

دیکھئے حکیم محمود خان مریض کے لئے نسخہ لکھتے تھے۔ اس میں مزہ کہاں ہوتا تھا۔ بلکہ بعضے نسخے تو نہایت بدمزہ ہوتے ہوں گے، پھر یہ تھوڑا ہی ممکن تھا کہ کوئی بدمزہ ہونے کی وجہ سے اس نسخہ کو چھوڑ کر

مومن خان کے مزہ دار اشعار پڑھ لیا کرے۔ مزہ شعر میں ہے مگر شفا نسخہ میں ہے حتیٰ کہ بمقتضائے انا عند ظن عبدی بی (مسند احمد ۲: ۳۱۵) بعض دفعہ صرف کاغذ گھول کر پلا دینے سے شفاء ہوگئی اور مومن خان اور ذوق شوق کے تمام دیوان بھی پی جاوے تو شفا نہیں ہوسکتی۔ تو مقصود نفع ہے نہ کہ مزہ۔

وعظ کا طرز جدید:

جس کی نظر مقصود پر ہے اس کے نزدیک دونوں طریقے یکساں ہیں۔ اصلاح کے مضامین اس میں بھی ہوں گے کیونکہ نرا ترجمہ سہی مگر ہے تو ترجمہ اسی کلام کا جس میں سرتاپا اصلاح بھری ہوئی ہے رنگینی نہ سہی اور اس بے مزہ طریق کو اختیار کرنے میں بھی ایک نفع ہے کہ لوگ مجھے وعظ کے لئے کم بلاویں گے اور گرمی میں دق نہ کریں گے مجھے آرام ملے گا نیز بلانے والوں کی محبت بھی معلوم ہو جاوے گی کہ صرف اپنے کام کے لئے بلاتے ہیں یا محبت ہی اس کی محرک ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں کے بلانے والوں سے میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر وعظ مقصود ہے تو میں وعظ تو اب پھیکا اور بے مزہ کہوں گا اگر اس پر بھی آپ حضرات راضی ہوں تو میں حاضر ہوں۔ چنانچہ اس وعدہ کا اس وقت ایفاء کروں گا حضرات داعین کی محبت ہے کہ انہوں نے اس کو منظور کیا گویا اصل محبت تو یہی ہے کہ روٹیاں کھلا دیں اور بوٹیاں نہ نوچیں اور کام لے کر اور پوری محنت کرا کے روٹی دی تو کیا احسان کیا۔ یہ تو مزدوری ہے خیر یہ تو لطیفہ تھا۔ اصل وجہ اس تبدیل طریقہ کی محض مضرات ہیں جن کا اب احساس ہوا بیان تو کیا جاتا ہے نفع کے لئے اور پیدا ہوا نقصان تو کیوں ایسا طریقہ اختیار کیا جاوے میں نے اترے پترے سب کھول دیئے مجھے بناوٹ پسند نہیں جو بات صاف ہے وہ کہہ دی اب جس کا جی چاہے وعظ سنے اور جس کا جی چاہے نہ سنے۔ اب میں ترجمہ کرتا ہوں۔

ترجمہ آیات متلوہ:

فرماتے ہیں وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ لوگوں نے حق تعالیٰ کی ایسی عظمت نہ کی جیسا عظمت کرنا چاہیے تھا حالانکہ ان کی عظمت وہ ہے کہ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تمام زمین ان کی ایک مٹھی میں ہوگی قیامت میں۔ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ اور کل آسمان ان کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ یمین کا لفظ اور ایسی ہی قبضہ کا لفظ متشابہات میں سے ہے جن کا بیان کوئی کر نہیں سکتا صرف اتنا معلوم ہے کہ ان الفاظ کے معنی متعارف مراد نہیں۔ حدیث میں ہے فرماتے ہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کلتا یدی ربی یمین (مجمع الزوائد ۱۰: ۳۴۴) یعنی

خدائے تعالیٰ کے دونوں ہاتھ یمین ہیں مراد یہ ہے کہ قوت میں یمین ہی کی طرح ہیں وہاں فرق نہیں ہے کہ ایک ہاتھ قوی اور ایک ضعیف ہو جیسے مخلوقات میں متعارف ہے کہ داہنا ہاتھ قوی اور بایاں ضعیف ہوتا ہے متشابہات کے متعلق تحقیق یہی ہے کہ ان میں گفتگو نہ کرے اور ان پر ایمان رکھے۔ مثلاً خدائے تعالیٰ کے لئے شریعت میں ید کا اطلاق آیا ہے لہٰذا اس کا تو قائل ہو کہ ید ثابت ہے مگر اس کی کیفیت وغیرہ سے بحث نہ کرے۔ بس سیدھی بات ہے جیسا اللہ ویسا ہی اس کا ید۔ ہم کو اللہ کی حقیقت کہاں معلوم ہے اور اس کا علم بالکنہ کہاں حاصل ہے بس ایسے ہی اس کے ید کا بھی علم نہیں ہے۔ یہ تو قبضہ اور یمینہ کی بحث ہوئی۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین پر قدرت بیان کرنے کے لئے تو قبضہ فرمایا اور آسمانوں کے لئے مطویات بیمینہ فرمایا۔

مطویات بیمینہٖ فرمانے کا سبب:

دونوں کے واسطے عنوانوں میں فرق کیوں کیا کہ زمین کی بابت تو فرمایا کہ مٹھی میں ہوگی اور آسمانوں کی نسبت فرمایا کہ لپٹے ہوئے ہاتھ میں ہوں گے۔ گویا ہتھیلی پر رکھے ہیں۔ سیدھی بات یہ تھی کہ یوں فرمادیتے وَالْاَرْضُ وَالسَّمٰوٰتُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یعنی زمین و آسمان سب اس کی مٹھی میں ہوں گے۔ اس کا نکتہ ایک ان پڑھ آدمی کی سمجھ میں آیا بلکہ آدمی کے نہیں آدمن کے سمجھ میں آیا جو مجھ سے ترجمہ پڑھا کرتی تھی اور مجھے وہ نکتہ بہت پسند آیا حتیٰ کہ میں نے اس کو اپنی کتاب میں درج بھی کر دیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ فرق عنوانوں میں کیوں کیا گیا ہے؟ کہا کہ زمین بہ نسبت آسمان کے چھوٹی ہے اور چھوٹی چیز کے لئے یہی عادت ہے کہ مٹھی میں بند کی جاتی ہے اور بڑی چیز کے لئے عادت یہ ہے کہ لپیٹ کر کھلے ہاتھ پر رکھ لی جاتی ہے۔ مٹھی کو بند نہیں کیا جاتا اس واسطے زمین کے لئے وہ عنوان اختیار کیا گیا اور آسمان کے لئے یہ۔ دیکھئے یہ علوم قرآنیہ ہیں ان میں خصوصیت پڑھے لکھوں اور علماء فضلاء کی نہیں ہے جس کو حق تعالیٰ چاہیں القاء کر دیں۔ خدا کی دین ہے جس کو چاہے دے دیں۔

نور ایمان کی برکت:

بعض اوقات ایک عامی آدمی کی سمجھ میں وہ بات آجاتی ہے جو ایک بڑے عالم میں نہیں آتی اور ایسا بہت ہوتا ہے کہ عامی آدمیوں کی سمجھ میں دین کی بات آجاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دین فطرت کے بہت قریب ہے جس کی فطرت میں سلامت ہو اس کا ذہن اس تک پہنچ جاتا ہے۔ گو عامی آدمی اس مضمون کو اصطلاحی الفاظ میں ادا نہ کر سکے مگر اعتبار تو معانی کا ہے۔ الفاظ اتنا ہوں تو

کیا حرج ہے یہ نور ایمان کی برکت ہے اور نور ایمان کم و بیش ہر مسلمان کو حاصل ہے۔ خواص کی کچھ خصوصیت نہیں مگر اس کو سن کر ان پڑھ لوگ فخر نہ کرنے لگیں کہ ہم بھی نکات جانتے ہیں کیونکہ ان کے نکات صحیح و غلط ہونے کا معیار یہی ہے کہ اہل علم ان کے جس نکتہ کو صحیح کہیں وہ صحیح ہے ورنہ غلط ہے ان کے واردات اہل علم کی رجسٹری کے محتاج ہیں۔ علم اور بے علمی برابر نہیں ہے۔ بلکہ عوام تو کیا غیر متبحرین کی واردات بھی جبھی معتبر ہے جبکہ متبحرین کے نزدیک صحیح ہوں۔

القاء کے صحیح ہونے کا معیار:

اصل میں تو ان کے صحیح ہونے کا معیار یہ ہے کہ شریعت کے موافق ہوں اور شریعت کے موافق ہونے کو پہچاننا یہ متبحرین کا کام ہے اس واسطے یہ کہہ دیا گیا کہ وہ متبحرین کے نزدیک صحیح ہوں آج اس غلطی میں اچھے اچھے پڑھے لکھے مبتلا ہیں ذراسی کسی کو کوئی کیفیت حاصل ہوئی یا کوئی وارد قلب پر آیا اور اس کو وحی سمجھنے لگے اور کہتے ہیں ہم کو یہ القاء ہوا ہے کہ گویا یہ مقدمہ ان کے نزدیک مسلم ہے کہ القا شدہ بات کبھی غلط نہیں ہوتی۔ صاحبو یہ بڑی غلطی ہے۔ القاء کا منجانب اللہ ہونا ضروری نہیں۔ القاء منجانب شیطان بھی ہوتا ہے اور بہت ہوتا ہے خود نص موجود ہے وان الشیاطین لیوحون الی اولیائھم یعنی شیاطین اپنے ہم جنسوں پر القاء کرتے ہیں آج کل اس غلطی میں بڑے بڑے لوگ مبتلا ہیں، اسی غلطی میں پڑ کر کوئی مدعی ولایت بن گیا اور کوئی مدعی نبوت۔

القاء شیطانی:

صاحبو! جب نص موجود ہے کہ القاء شیطانی بھی ہوتا ہے تو پھر ہر القاء کو صحیح اور قطعی سمجھ لینا کیسے ٹھیک ہے۔ اس کے لئے ایک یہی معیار ہے کہ اگر وہ شریعت کے موافق کہے تو صحیح ہے ورنہ غلط ہے۔ اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کبھی اپنے حالات اور واردات پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے تاوقتیکہ کوئی متبحر اور تجربہ کار اس کو شریعت کے موافق نہ کہے۔ اہل فن نے بالتصریح لکھ دیا ہے کہ کل حقیقۃ ردتھا الشریعۃ فھی زندیقۃ۔

سید الطائفہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کی احتیاط:

ہمارے حاجی صاحب کو اس بارہ میں اس قدر احتیاط تھی کہ علماء کے سامنے کوئی نکتہ بیان فرماتے تو یہ بھی فرما دیتے کہ بھائی میرے نکات اور اقوال میں تم غور کر لینا اگر کچھ غلطی ہو تو بتلا دینا اور اس بارے میں ادب سے کام نہ لینا۔ میں کہہ چکا اب تم ذمہ دار ہو۔

چند جاہلانہ نکات:

جب ایسے کاملین اور عارفین کو اس قدر احتیاط تھی تو ماشاچہ رسد۔ اس باب میں ہرگز جرأت نہیں کرنا چاہئے کسی حال اور کسی وارد کو صحیح مت سمجھو جب تک کہ وہ شریعت کے موافق نہ ہو اور شریعت کے موافق نہ سمجھو جب تک کوئی متبحر عالم اس کو شریعت کے موافق نہ کہہ دے۔ غرض عام لوگ اپنی یہ ایک تعریف سن کر کہ عوام کی سمجھ میں بھی نکات صحیح طور پر آ جاتے ہیں کیونکہ دین فطرت کے بہت قریب ہے اور ان لوگوں کی فطرت میں تصنع وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت سلامتی ہوتی ہے، شریعت میں نکات نکالنے کی جرات نہ کریں ورنہ وہ قصہ ہوگا کہ ایک ہمارے ابتدائی کتابوں کے استاد تھے ان کے پاس ایک درزی بیٹھا تھا اس نے آمنت باللہ (میں اللہ پر ایمان لایا) اور والبعث بعد الموت (اور موت کے بعد اُٹھائے جانے پر) پر ایک آہ کی اور کہا کہ بادل کی بھی موت ہے ع بعد کا ظاہر نہ ہوا تھا، الف پڑھا تھا اس لئے یہ نکتہ مستنبط کیا یا کسی نے من ذالذی یشفع کا ترجمہ کیا تھا۔ من ذل جو شخص ذلیل کرے ذی یعنی نفس کو (شاید ذی کو جی پڑھا یا اسم اشارہ سمجھا) یشف شفا پاوے گا ع یاد رکھ ایسے ہی ایک صاحب تھے کہ وہ بی بی کو تو خوب کھلاتے پلاتے تھے اور ان کی ماں بھی موجود تھی اس کی خبر گیری نہ کرتے تھے۔ ان سے ایک مولوی صاحب نے کہا کہ تو ماں کو کچھ کھانے کو کیوں نہیں دیتا۔ کہا کہ ان میں تو کھلانے کا حکم بی بی ہی کے لئے آیا ہے وَاَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ یعنی جوئے کو کھانا دو (جوئے بمعنی زوجہ) مولوی صاحب بھی بڑے حاضر جواب تھے۔ کہا بھلے مانس بی بی کے لئے تو کھانا ہی دینے کا حکم آیا ہے اور ماں کے لئے تو یہ حکم ہے کہ مالہ وما کسب یعنی ماں کا سب مال ہے جو کچھ تیرے پاس ہے سب ماں کا ہے اس حکم کی رو سے تو جوئے کا کھانا تو الگ رہا تو بھی اپنے مال میں سے بلا اجازت ماں کے کچھ نہیں کھا سکتا۔ اب وہ لاجواب ہوئے۔ یہاں طالب علمانہ ذرا سا اشکال ہے اس کو اور اس کے حل کو بھی سن لیجئے، وہ یہ کہ اس شخص نے جو استدلال قرآن شریف سے کیا یعنی اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ کے معنی یہ لئے کہ بی بی کو کھانا دے اس کو تو غلط کہا گیا اور جاہلانہ نکات میں شامل کیا گیا لیکن اس کے جواب میں مولوی صاحب نے بھی ایسی گنوارہ بات کہی کہ وہ بھی بجنسہٖ ویسی ہی ہے کیونکہ ما کسب کے معنی عربی زبان میں یہ کہاں ہیں کہ بیٹے کا مال سب ماں ہی کی ملک ہے، پھر ایک گنوار ہی پر کیا الزام ہے معلوم ہوا کہ علماء بھی ایسے نکتے نکالتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہم یہ نہیں کہتے

کہ مولوی صاحب نے ٹھیک جواب دیا ہے اور قرآن کا یہی مدلول ہے اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کا یہ نکتہ مقبول ہے اور اس کی گنوار کا وہ نکتہ مقبول نہیں بلکہ ہم دونوں کو یہی کہتے ہیں کہ یہ جاہلانہ نکات ہیں۔ دونوں یکساں ہیں اور اس قسم کے نکات قرآن میں نکالنا درست نہیں۔ یہ مولوی صاحب والا نکتہ بھی غلط ہے اور بجنسہ ویسا ہی ہے جیسا وہ گنوار والا نکتہ ہے لیکن چونکہ یہ واقعہ ایک بڑے عالم کا ہے اس واسطے یہ نہیں کہا جاتا کہ قرآن میں تحریف کی گئی ہے یا وہ ماکسب کے معنی یہی سمجھتے تھے بلکہ اس میں تاویل کی جائے گی کہ مولوی صاحب نے جواب الزامی دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر ایسے نکات سے حکم ثابت ہوسکتا ہے جیسا اس نے **لایلاف** سے جوئے کا حق ثابت کیا تو تبت سے ماں کا سب حق ثابت ہوجاوے گا۔ یہ جواب اس کے ساتھ استدلال کے رد کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ یہ تقریر ہے اس طالب علمانہ شبہ کی اور اس کے جواب کی۔

غرض یہ ہے کہ عوام کے نکات اکثر ایسے لغو ہوتے ہیں جیسے مثالوں میں بیان ہوئے، لھذا عوام کو قرآن میں نکات نکالنے کی اجازت نہیں اور اس سے عوام خوش نہ ہوں کہ ایک شخص کے ایک نکتہ کی میں نے تعریف کردی آیت **وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ** اور **وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِهٖ** کے متعلق اس کی سمجھ میں آگیا تھا اور میں نے تعریف میں یہ لفظ کہہ دیا کہ عوام کا مذاق چونکہ فطرت کے بہت قریب ہوتا ہے اور دین بھی فطرت کے موافق ہے اس واسطے دین کی بات ان کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عوام کے ذہن میں کوئی صحیح نکتہ آجاتا ہے اور علماء کو بھی یہ نہ چاہئے کہ ہر بات کو صرف یہ دیکھ کر کہ عوام کے منہ سے نکلی ہوئی ہے غلط سمجھنے لگیں بلکہ اس بات میں غور کریں اور دیکھیں کہ قواعد شرعی کے مخالف ہے یا نہیں اگر مخالف نہ ہو تو اس کو مان لیں اور اس کو اپنے لئے کسر شان نہ سمجھیں۔ دین کچھ ان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ دین تو سب کی مشترک جائیداد ہے۔ نور ایمان سب میں موجود ہے اس کی برکت سے اگر کسی وقت ایک عامی آدمی کی سمجھ میں ایسی بات آجاوے جو کسی عالم کی سمجھ میں نہ آئی ہو تو کیا استعجاب ہے۔ خدا کا دین ہے جس کو چاہیں دے دیں۔ اسی قبیل سے یہ نکتہ ہے جو **وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِهٖ** میں ایک عامی آدمی کے منہ سے نکلا۔ مجھے یہ پسند ہوا لھذا میں نے اس کو اپنی کتاب تفسیر بیان القرآن میں بھی درج کردیا ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ **سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ** ترجمہ یہ ہے کہ پاک ہے حق تعالیٰ اور برتر ہے اس سے جو شرک کرتے ہیں۔ دیکھئے جملہ سابقہ پر اس جملہ کو مرتب کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام آیت سے

مقصود نفی شرک ہے جس کا میں نے شروع ہی میں دعویٰ کیا تھا کہ گو بظاہر یہاں معاد کا بیان ہے۔

اثبات توحید:

مگر مقصود اس سے توحید الٰہی کا اثبات ہے جس کو شکایت کے عنوان میں اس طرح ارشاد فرمایا گیا کہ لوگوں نے خدائے تعالیٰ کی عظمت نہیں پہچانی اور اب اس کی شرح کی ہے کہ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ اس میں تصریحاً شرک سے تنزیہ ہے غرض آیت کے الفاظ سے بہت وضوح کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مضمونوں میں سے یعنی توحید اور معاد میں سے گو مضمون معاد کو طول کے ساتھ بیان کیا گیا ہے مگر مقصود اثبات توحید ہے۔ آگے فرماتے ہیں وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ یعنی یہ ہیں کہ نفخ صور سے گر پڑیں گے تمام وہ لوگ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ صعق کے معنی بے ہوش ہو کر گر پڑنا ہیں تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ مرجاویں گے کیونکہ مرنے میں بے ہوشی اور گر پڑنا ہو ہی جاتا ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ غشی طاری ہو جاوے گی۔

نفخ صور کی کیفیت:

کیونکہ صور کی آواز ایسی ہولناک ہوگی کہ سب کے حواس جاتے رہیں گے۔ الا من شاء الله کو من فی السموات ومن فی الارض سے مستثنیٰ کیا۔ من شاء الله کے معنی یہ ہوئے کہ تمام آسمان اور زمین کے لوگ بے ہوش ہو جاویں گے سوائے اس کے جس کا بے ہوش ہونا حق تعالیٰ کو منظور نہ ہو اس سے بظاہر معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو بے ہوش نہ ہوں گے۔ باقی یہ اللہ کو معلوم ہے کہ وہ کون کون ہیں اور ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی کہ الا من شاء الله گو بظاہر استثناء ہے مگر بمعنی شرط کے ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کسی کا بے ہوش نہ ہونا مشیت ایزدی پر ہے اگر چاہیں تو کسی کو صعق کے حکم کلی سے مستثنیٰ بھی کر سکتے ہیں تو اس کا تحقق جب بھی صحیح ہے کہ کسی کو بھی صعق سے نہ بچایا جائے کیونکہ ماحصل اس کا یہ ہوا کہ مستثنیٰ کرنا مشیت پر موقوف ہے۔ مشیت اس کے وقوع کے متعلق ہوئی تو وقوع ہوگا اور عدم وقوع سے متعلق ہوئی تو عدم وقوع ہوگا تو یہ مضمون ہر حال میں صادق رہا کہ بعض افراد بشرط مشیت مستثنیٰ ہو سکتے ہیں اس کے لئے استثناء کا وقوع ضرور نہیں۔ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ترجمہ: پھر نفخ صور دوبارہ ہوگا تو ایک دم سب کھڑے ہو جاویں گے اور محشر کا تماشا پیش نظر ہوگا۔ اگر صعق کے معنی مرجانے کے ہیں تو یہ

معنی ہوئے کہ مردے زندہ ہو جاویں گے اور اگر صعق کے معنی بے ہوش جانے کے ہوں تو یہ معنی ہوئے کہ بے ہوشی سے ہوش میں آ جاویں گے۔ اس میں اختلاف ہے کہ نفخ صور کتنی دفعہ ہوگا۔ اس آیت میں بتفسیر مشہور اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نفخہ سے تمام عالم مر جاوے گا مگر میں نے کہا تھا کہ صعق کے معنی بے ہوش ہو جانے کے بھی ہیں اس لحاظ سے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ جو لوگ اس وقت زندہ ہوں گے وہ مر جاویں گے اور جو لوگ اس سے پہلے مر چکے ہیں ان کی روحیں بے ہوش ہو جاویں گی اور نفخہ ثانیہ سے مردہ زندہ ہو جاویں گے اور بے ہوش روحیں ہوش میں آ جاویں گی۔ اسی کا نام حشر ہے۔ سب سے اگلے پچھلے مردے انسان اور حیوان اور حشرات ایک ایک زندہ ہو جاویں گے۔ یہاں یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ زمین ان سب کے لئے کافی کیسے ہوگی کیونکہ اگر مردم شماری سے دیکھا جاوے تو اولین و آخرین تمام انسانوں ہی کی تعداد اس قدر ہو سکتی ہے کہ زمین ان کے جمع ہونے کے لئے کافی نہ ہو چہ جائیکہ تمام وحوش وطیور وغیرہ سب کے سب جمع ہوں۔ جواب یہ ہے کہ واقعی زمین موجودہ حالت میں تو اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی لیکن اس وقت زمین کو وسعت دے دی جاوے گی جیسے ربڑ کو پھیلا دیں تو وہ بڑھ جاتا ہے کہ ربڑ پہلے چھوٹا ہوتا ہے مگر کھینچنے سے بڑھ جاتا ہے۔ یہی خاصیت زمین میں ہے کہ اس وقت چھوٹی ہے اور اس وقت اس کو کھینچ کر بڑھا دیا جاوے گا اور یہ بات عام طبائع میں بھی محال نہیں بلکہ ممکن ہے چنانچہ محاورات میں بولتے ہیں کہ زمین کی طنابیں کھینچ گئیں۔ معلوم ہوا کہ عوام بھی زمین کو بڑھنے اور کھینچنے کے قابل سمجھتے ہیں بلفظ دیگر یوں کہئے کہ زمین میں تخلخل ہو جاوے گا۔ تخلخل کو حکماء نے بھی ممکن مانا ہے۔ تخلخل کے لفظ سے یہ مضمون سہولت سے ذہن نشین ہو جاتا ہے اور استبعاد رفع ہو جاتا ہے کیونکہ تخلخل کا امکان ذہنوں میں موجود ہے۔

ننانوے قتل کرنے والے کا قصہ توبہ:

یہاں سے ایک بات طالب علموں کے کام کی بھی نکلتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حدیث میں ایک قصہ آتا ہے کہ ایک شخص نے ننانوے قتل کئے تھے۔ اس کے بعد اس کو کچھ تنبہ ہوا اور خیال ہوا کہ میری مغفرت کیسے ہوگی؟ اس کے دریافت کرنے کے لئے ایک عالم کے پاس پہنچے اور سب واقعہ بیان کیا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں۔ میری مغفرت کی بھی کوئی صورت ہے۔ وہ خفا ہوئے اور کہا کہ ایک ہی قتل دوزخ میں جانے کے لئے کافی ہے چہ جائیکہ ننانوے قتل۔ جاؤ اب کوئی صورت

بخشش کی نہیں ہوسکتی۔ اسے بہت رنج ہوا اور غصہ بھی آیا اور کہا جب یہی بات ہے کہ دوزخ میں جانا ضروری ہے تو آپ کو بھی کیوں چھوڑوں جس نے میرے دل پر نشتر لگایا ہے، جہاں ننانوے قتل ہوئے ہیں ایک اور بھی سہی، پورے سو بھی کیوں نہ ہو جائیں۔ چنانچہ ان کو بھی قتل کر دیا، مگر پھر دل نے نہ مانا اور دوسرے عالم کے پاس پہنچا اور سارا واقعہ بیان کیا کہ ننانوے قتل کئے تھے اور ایک قتل ابھی کر کے آیا ہوں، میری مغفرت کی بھی کوئی صورت ہے۔ میں توبہ کرلوں تو میری بخشش ہوسکتی ہے یا نہیں؟ وہ حکیم بھی تھے اور شاید کچھ اس شخص سے خوف بھی ہوا ہو، اس لئے خیال ہوا کہ اس وقت ترہیب کا موقع نہیں ہے ترغیب کی ضرورت ہے۔ ترغیب ہی سے اثر ہوگا کہا توبہ سب کی قبول ہے سو قتل کیا اگر ایک ہزار بھی کئے ہوں تب بھی توبہ قبول ہوسکتی ہے۔ تم توبہ کرو مگر تکمیل توبہ کی شرط یہ ہے کہ اس سرزمین سے چلے جاؤ اور کسی نیک بستی میں جا کر رہو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ ان کے ہاتھ پر توبہ کی اور ایک دوسری بستی کو چلا۔ راستہ میں موت کا وقت آ گیا اور ملک الموت علیہ السلام نے اس کی جان قبض کرلی اس وقت اس کو نہایت یاس ہوئی اور کچھ تو نہ ہوسکا اتنا کیا کہ اپنا سینہ اسی بستی کی طرف بڑھا دیا جہاں جانا تھا۔ اب اس کے پاس ملائکہ دونوں قسم کے آئے، عذاب کے بھی اور رحمت کے بھی۔ وہ کہتے تھے کہ اس کی روح کو ہم لے جائیں گے اور وہ کہتے تھے ہم لے جائیں گے۔ آخر اس جھگڑے کے فیصلے کے لئے حق تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا اور اس نے کہا اس رستہ کی پیمائش کرو جس بستی کے یہ شخص قریب ہو اسی کا حکم ہوگا۔ واقع میں وہ شخص اپنی بستی کے قریب تھا، تو فیصلہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ عذاب ہی کے فرشتے غالب آتے مگر حق تعالیٰ نے خود ہی یہ فیصلہ کیا اور خود ہی اس کی تکمیل بھی فرما دی۔ یہ اس کی نیت کی برکت تھی کہ اس سے جو کچھ ہوسکتا تھا کر چکا اور وہ ارادہ ہے یہ اس کے اختیار سے باہر تھا کہ دوسری بستی میں پہنچ جاوے۔ آدمی کا اختیاری فعل نیت کرنا اور بقدر وسعت کوشش کرتا رہے اس کی تکمیل اور نتیجہ کا متفرع ہو جانا یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں وہ شخص نیت کر چکا اور جہاں تک اس کے امکان میں تھا چل چکا۔ حق تعالیٰ نے اس پر نتیجہ اپنی رحمت سے متفرع فرمایا اس طرح باوجود یکہ وہ اپنی بستی سے قریب تھا لیکن زمین کے اس حصے کو حکم دیا کہ دور ہو جا اور دوسرے حصے کو حکم دیا کہ قریب ہو جا۔ بس فرشتوں نے پیمائش کی تو وہ اس دوسری بستی سے قریب ثابت ہوا جہاں کو جا رہا تھا اور قریب بھی صرف اس قدر کہ اس کا سینہ اس طرف بڑھا ہوا تھا۔ لھذا رحمت کے فرشتے غالب آئے۔ اس قصہ میں بیان کرنا اس بات کا مقصود ہے کہ کوئی طالب علم پوچھ سکتا ہے کہ وہ دونوں بستیاں کس طرح

قریب اور بعید ہوگئیں۔ جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے اور اس میں اشکال کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ جس بات کے استحالہ پر کوئی دلیل عقلی قائم نہیں ہے وہ ممکن ہے پھر ممکن کے وقوع میں کیا استعجاب ہے مگر طبیعت چاہتی ہے کہ اس قریب اور بعید ہونے کی کوئی صورت بھی بیان کی جائے جس سے قریب الی الفہم ہو جاوے اور استعجاب بالکل باقی نہ رہے۔ وہ یہ ہے کہ اس وقت تخلخل اور تکاثف کا حکم ہوا۔ ایک حصہ میں تخلخل ہوا اور اس کی مسافت بڑھ گئی اور دوسرے حصہ میں تکاثف ہوا، اس کے اجزاء سمٹ گئے اور مسافت گھٹ گئی، پھر بعد میں خواہ ہر حصہ اپنی حالت سابقہ پر ہو گیا ہو استعجاب رفع ہو جاتا ہے مگر دعویٰ نہیں کیا جاتا کہ یہی صورت ہوئی تھی۔ صرف احتمال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ اس قرب اور بعد کے ہونے کی یہ بھی صورت ہوئی تھی۔ صرف احتمال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ اس قرب اور بعد کے ہونے کی یہ بھی صورت ممکن ہے۔ سو دفعہ اشکال کے واسطے یہ احتمال بھی کافی ہے، اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ حدیث میں جو آیا ہے کہ قیامت میں تمام عالم کے حشر کے لئے زمین کافی ہوگی اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس زمین کے اجزاء میں تخلخل ہو جائے گا جس سے اتنی وسعت ہو جائے گی کہ حشر کے لئے کافی ہو۔ اب آگے محشر کے واقعات گنوائے ہیں۔ ایک واقعہ یہ ہے کہ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا یعنی زمین چمک اٹھے گی خدا تعالیٰ کے نور سے۔ خود آیت میں ہے کہ یہ نور حق تعالیٰ کی تجلی کا ہوگا۔

آیات متشابہات:

دوسری آیت میں حق تعالیٰ کی آمد صاف الفاظ میں ہے وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار اور فرشتے جوق در جوق (میدان حشر میں) آئیں گے) یہ آیتیں متشابہات میں سے ہیں ان کی حقیقت سے کاوش کرنا ٹھیک نہیں، پس سیدھے سیدھے یہ معنی کہے جاویں کہ حق تعالیٰ زمین کی طرف متوجہ ہوں گے اور تشریف لاویں گے یہ تو ترجمہ ہو گیا، آیت کا باقی اس کے حقیقی معنی کی نسبت یہی کہیں گے کہ اللہ اعلم بمراده بذالک حق تعالیٰ ہی کا کلام ہے اور انہیں کو اس کے معنی خوب معلوم ہیں۔ یہ آیت ایسی ہے جیسے آیت الرحمٰن علی العرش استوی (رحمٰن عرش پر جلوہ افروز ہوا) ہے کہ اس کے معنی میں بھی یہی کہا جاتا ہے استواء یلیق بہ اس وقت استواء عرش پر ہے اور اس وقت یعنی قیامت میں زمین کی طرف مجیی ہو یہ معنی ہیں جاء ربک (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردگار آئیں گے) کے اور اگر مجیی سے کیف سمجھ میں

نہ آوے تو تقریب الی الفہم کے لئے یوں سمجھ لیجئے کہ جب بادشاہ کے خدم وحشم آتے ہیں تو کہتے ہیں بادشاہ آرہا ہے حالانکہ ابھی بادشاہ نہیں آیا تو ایسے ہی جاء ربک سے معنی مجازی مراد لے لیجئے کہ حق تعالیٰ کے خدم وحشم آویں گے یعنی فرشتے اور جن اور نار وغیرہ آئیں گے اور عدالت قائم ہوگی اور حساب وکتاب ہوگا مگر اس سے جزماً یہ نہ سمجھا جاوے کہ یہی معنی مراد ہیں کیونکہ متشابہات کے بارہ میں سلف کا مسلک یہی ہے کہ معنی نہ بیان کئے جاویں اور ان کے علم کو حق تعالیٰ کے سپرد کیا جاوے نہ حقیقی معنوں سے بحث کی جاوے نہ مجازی سے بس یہ کہہ کر چھوڑ دیا جاوے کہ **اللہ اعلم بمرادہ بذلک** (اللہ تعالیٰ ہی اُس کی مراد جانتے ہیں) مگر متاخرین نے عوام کی وحشت رفع کرنے کے لئے معنی مجازی بیان کرنے کی اجازت دی ہے مگر ان کا مطلب یہ نہیں کہ جو معنی مجازی بیان کئے جائیں ان پر یقین کر لیا جاوے کہ یہی معنی مراد ہیں اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جو واقعات محشر کی آیت میں مذکور ہیں وہ فرضی نہیں ہیں بلکہ واقعی ہیں آج کل اس مذاق کے لوگ بھی بہت ہیں جن کو ان واقعات سے اس قدر استعجاب ہوتا ہے کہ ان کو ناممکن کہہ دیا ہے اور نصوص میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ ترغیب و ترہیب کے لئے یہ فرضی باتیں فرمادی ہیں تاکہ جنت کے شوق میں اعمال صالحہ کریں اور دوزخ سے ڈر کر معاصی سے باز رہیں اور جو واقعہ قیامت کا بیان کیا جاتا ہے اس کی نظیر مانگتے ہیں۔

دنیا عالم طبائع ہے:

صاحبو! بہت سے واقعات وہاں کے ایسے ہیں جن کی نظیر یہاں موجود نہیں کیونکہ دنیا عالم طبائع ہے اور وہاں طبائع کو دخل نہ ہوگا لیکن چونکہ ان کے اتحاد پر کوئی دلیل عقلی نہیں ہے اس واسطے ان کو ممکن کہا جاوے اور ممکن کے وقوع کا اگر صحیح دلیل سے دعویٰ کیا جاوے تو کسی کو اس کی تکذیب کا یا اس میں کوئی اشکال نکالنے کا حق نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ان لوگوں کا خیال بالکل غلط ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ حق تعالیٰ محض ترغیب وترہیب کے لئے فرضی واقعات بیان فرمائیں جب کلام میں فرضیت پر کوئی لفظ دال نہیں تو ان کو فرضی مثال لکھنے کے لئے کوئی دلیل ہونی چاہئے اور اگر بلا دلیل کسی بات کو فرضی کہا جاسکتا ہے تو اس طرح تو اوامر ونواہی اور احکام سے بھی اطمینان اٹھ جائے گا کیونکہ ممکن ہے کہ یہ بھی سب فرضی باتیں ہوں حالانکہ کوئی مسلمان اس کا قائل نہیں ہوسکتا۔ **ووضع الکتاب**

ترجمہ: اور نامۂ اعمال لائے جاویں گے یعنی سب کے ہاتھوں میں دیئے جاویں گے۔ کیفیت ان کے دیئے جانے کی دوسری آیتوں میں مذکور ہے۔ وہ یہ ہے کہ نیکیوں کے نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں

دیئے جاویں گے اور بدوں کے بائیں ہاتھ میں۔ یہ نامہ اعمال کا لایا جانا ایسا ہے جیسے عدالت میں مثل پیش کی جاتی ہے کہ اب اس کے موافق مقدمہ ہوگا اور جرح قدح ہوگی وَجِیْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ ترجمہ: انبیاء علیہم السلام کو بھی بلایا جاوے گا۔ یہ ایسا ہے جیسے عدالت میں گواہ بلائے جاتے ہیں۔ وَقُضِیَ بَیْنَھُمْ بِالْحَقِّ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ترجمہ: اور تمام فیصلے ٹھیک ٹھیک کئے جاویں گے اور کسی کا حق نہیں مارا جاوے گا۔ یعنی یہ نہیں ہوگا کہ کسی نے کوئی نیکی ذرا سی بھی کی ہو اور وہ نامہ اعمال میں نہ ہو یا کوئی برائی کسی نے نہ کی ہو اور وہ نامہ اعمال میں درج کردی گئی ہو بلکہ بمقتضائے سبقت رحمتی علی غضبی (مسند الحمیدی: ۱۱۲۶) ایسا ہوگا کہ ایک نیکی انسان نے نہ کی ہو اور نامہ اعمال میں درج ہو وہاں داد و دہش اور انعامات بہت ہوں گے، بات بات پر رحمت ہوگی۔

بہانہ رحمت خداوندی:

بعضوں کی بخشش صرف اتنی سی بات پر ہو جاوے گی کہ راستے سے انہوں نے ایک کانٹا ہٹا دیا تھا۔ ایک عورت کی بخشش اس بات پر ہو جاوے گی کہ اس نے ایک کتے کو دیکھا کہ کنوے کے کنارہ پر پیاس کے مارے گیلی مٹی چاٹ رہا ہے، اس کو رحم آیا اور اپنے چرمی موزہ کو اس نے اپنی اوڑھنی میں باندھ کر کنوے میں لٹکا کر پانی نکالا اور اس کو پلایا۔ وہ عورت بدکار تھی لیکن حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے ہماری مخلوق پر رحم کیا ہے لھذا ہم اس پر رحم کرتے ہیں۔ یہ دونوں قصے حدیث میں آئے ہیں اور مکشوفات تو ایسے بہت ہیں مثلاً ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ نیکوکار اور پرہیزگار تھا، اس کا انتقال ہو گیا، کسی نے خواب میں اس کو دیکھا، پوچھا کہئے کیا معاملہ ہوا؟ کہا یہاں مجاہدے اور ریاضتیں تو کچھ کام نہیں آئیں، مطلب یہ ہے کہ ان میں کسر تھی اور وہ اس قابل نہ تھے کہ ان پر بخشش استحقاق سمجھا جاوے اس واسطے کہا گیا کہ کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ مجاہدہ و ریاضت اور اعمال بیکار چیز ہیں، ہرگز نہیں، یہ ضرور کام کی چیزیں ہیں مگر ایسے اعمال کر کون سکتا ہے جو دربار خداوندی میں پیش کئے جاسکیں اس واسطے کہا ہے:

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش — عذر بدرگاہ خدا آورد

بندہ اچھا وہی ہے جو حق تعالیٰ کی بارگاہ میں استغفار کرتا ہے اور اعتراف قصور کرتا ہے۔

ورنہ سزاوار خداوندیش — کس نتواند کہ بجا آورد

ورنہ حق تعالیٰ کی عظمت کے لائق کوئی شخص بھی عبادت نہیں کرسکتا۔

غرض اس نے کہا مجاہدے ریاضت تو کچھ کام نہیں آئے مگر حکم ہوا جاؤ کہ تم نے ایک دن ایک بلی کے بچے پر رحم کیا تھا کہ وہ سردی سے کانپ رہا تھا، تم نے اس کو لحاف میں لے لیا، جاؤ تم کو ہم نے اس کے عوض میں بخشا۔ آدمی کبھی کسی ادنیٰ سے عمل کو بھی حقیر نہ سمجھے کیا خبر کس عمل کو حق تعالیٰ قبول فرمالیں اور بخش دیں۔ حدیث میں ہے یا عائشة لاتسحقری طاعة ونحوه یعنی اے عائشہ کسی نیک عمل کو حقیر نہ سمجھو۔ الحاصل وہاں بات بات رحمت کا بہانہ ہوگی۔ ہاں یہ نہ ہوگا بلا کچھ کئے کسی کو پکڑ لیا جاوے۔ یہ معنی ہیں وھم لا یظلمون کے یعنی کسی کا حق مارا نہیں جاوے گا۔

حبط اعمال کے اشکال کا جواب:

یہاں ایک طالب علمانہ شبہ ہوسکتا ہے وہ یہ کہ حبط اعمال بالکفر ثابت ہے جا بجا نصوص میں وارد ہے اُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ وَ فِی النَّارِ ھُمْ خٰلِدُوْنَ (ان لوگوں کے سب اعمال اکارت ہیں اور دوزخ میں وہ لوگ ہمیشہ رہیں گے) اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا ھُمْ فِیْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (الاعراف:۵) (یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں یہ منجانب اللہ بھی تباہ کیا جائے گا اور فی نفسہ بھی اور فی الحقیقت بھی یہ کام بے بنیاد ہے) وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ ھَبَآءً مَّنْثُوْرًا (الفرقان) (اور ہم نے (اس روز) ان کے (کفار کے) ان (نیک) کاموں کی طرف جو دنیا میں کر چکے تھے متوجہ ہوں سو اُن کو ایسا بے کار کر دیں گے جیسا پریشان غبار) وغیرھا من الآیات تو یہ کہاں صادق ہوا کہ کسی کی نیکی غارت نہ کی جاوے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اس نے دنیا ہی میں خود اپنی نیکی کو غارت کر دیا تھا قیامت کے دن اس کی نیکی غارت نہیں کی گئی اس نے خود دنیا میں اپنے اختیار سے وہ فعل کیا ہے جس کی خاصیت سے دوسرے اعمال غارت ہوجاتے ہیں تو قیامت کے دن وہ خود ہی اپنے اعمال کو غارت کر کے لایا نہ یہ کہ یہاں تو اس کا عمل درست تھا اور وہاں پہنچ کر غارت کیا گیا اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک کمہار نے برتن بنائے مگر بناتا گیا اور توڑتا گیا اور فرض کیجئے کہ اس کے واسطے ایک وقت مقرر تھا کہ اس وقت اس کا کام ختم کر دیا جاوے گا تو اس صورت میں جس وقت اس کا کام ختم کیا جاوے گا ظاہر ہے کہ ایک برتن بھی اس کے پاس نہ ہوگا گو اس نے برتن بنائے ضرور ہیں تو اس حالت میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی نے برتن اس کے توڑ ڈالے یا چھین لئے اس واسطے یہ خالی ہاتھ ہے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس نے خود ہی کوئی برتن باقی نہیں رکھا۔ یہی حالت کافر کی ہے کہ قیامت میں وہ اس واسطے خالی ہاتھ نہ ہوگا کہ کسی نے اس کی نیکیاں چھین

لیس بلکہ وہ دنیا میں ان کو خود ہی تباہ کر کے آیا ہے تو لایظلمون بالکل صادق ہے ایک شبہ تو یہ رفع ہوا، ایک شبہ اور ہے وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے من سن سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها ومن سن سنة سيئة فعليه وزرها من عمل بها او كما قال (سنن ابن ماجۃ: ۲۰۷)(جس نے نیکی کا نیا طریقہ ایجاد کیا اس کیلئے اس کا اجر ہے اور جس نے اس پر عمل کیا اس کا اجر بھی اور جس نے برائی کا طریقہ ایجاد کیا اس پر اس کا وبال ہے اور جو اس پر عمل کرے اس کا گناہ بھی) اس سے معلوم ہوا ہے کہ بعض گناہ انسان پر بلا کئے ہوئے بھی رکھے جائیں گے مثلاً قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا تھا تو حدیث میں آیا ہے کہ قیامت تک جو قتل بھی دنیا میں ہوتا ہے اس کا کچھ حصہ گناہ کا قابیل کو بھی پہنچتا ہے اسی طرح ہر اس گناہ کا حال ہے جس کی اقتداء دوسروں نے کی ہو تو سوال یہ ہے کہ اس نے کیا کیا تھا دوسروں کے عمل اس پر کیوں ڈالے جاتے ہیں، یہ تو وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا) کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس نے کیا کیوں، اس کی اقتدا سے جو گناہ بھی ہوتا ہے اس کا سلسلہ اس تک برابر ملا ہوا ہے اور اس کو ضرور اس گناہ میں دخل ہے۔ اس کی مثال یہ ہے جیسے بچے اینٹوں کی ریل بنایا کرتے ہیں کہ پاس پاس دور تک اینٹیں کھڑی کرتے چلے جاتے ہیں پھر ایک کو گراتے ہیں اس سے دوسری اینٹ گرتی ہے اور دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی۔ اسی طرح جہاں تک اینٹوں کا سلسلہ ہوتا ہے تو گرتی چلی جاتی ہیں۔ اب فرض کر لیجئے کہ اخیر اینٹ کے سامنے ایک شیشی رکھی ہوئی ہے وہ اس اخیر اینٹ سے گری ہے۔ عائد کریں گے یا نہیں، ظاہر ہے کہ ضرور عائد کریں گے حالانکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے تو وہ اینٹ نہیں گرائی جس سے شیشی ٹوٹی ہے۔ میں نے تو ایک دو اینٹیں گرائی تھیں جو شیشی سے بہت دور تھیں اس لئے شیشی توڑنے کا الزام میرے اوپر لگانا بلا وجہ ہے اور ظلم ہے کیونکہ جو کام میں نے نہیں کیا وہ میرے ذمہ لگایا جاتا ہے اس کا جواب آپ یہی دیں گے کہ جب تجھے معلوم تھا کہ یہ اینٹیں اس طرح کھڑی ہیں کہ ایک کے گرانے سے یکے بعد دیگرے سب گر جائیں گی حتیٰ کہ آخری اینٹ شیشی پر گرے گی پھر جب تو نے ایک اینٹ کو گرایا تو ضرور تو نے ہی شیشی کو قصداً توڑا اسی طرح جب ایک شخص نے گناہ کیا اور وہ جانتا تھا کہ یہ فعل مضر ہے اور دوسرے اس کی اقتدا کریں گے تو وہ قصداً اور اختیاراً ہوا اس گناہ کا جو اس کی اقتداء سے ہوگا سبب بنا، تو اب اگر اس کے نامہ اعمال میں دوسرے اقتدا کرنے والوں کی وجہ سے بھی گناہ لکھا گیا تو بے کئے نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا کیا ہوا گناہ لکھا گیا اس سے دوسرا شبہ بھی رفع ہو گیا۔ یہ درمیان میں دو شبہوں کا ازالہ ہو گیا۔

شان رحمت:

اصل بیان یہ تھا کہ قیامت کے دن یہ تو ہوگا کہ بعض نیکی بدون کئے ہوئے نامہ اعمال میں لکھی ہوئی ملیں گی اور یہ نہ ہوگا کہ کوئی نیکی کی ہو اور نامہ اعمال میں لکھی ہوئی نہ ملے۔ یہ شان رحمت ہے کہ عدل کا معاملہ نہیں فرمایا بلکہ فضل کا معاملہ کیا جائے گا ورنہ یہ ہوتا کہ جیسے کی ہوئی نیکی نامہ اعمال میں درج ہونے سے نہ رہتی ایسے ہی کوئی نیکی بلا کئے ہوئے درج بھی نہ کی جاتی جس سے نہ نیکی بڑھتی نہ گھٹتی اور آیت اس معاملہ رحمت کی نفی نہیں کرتی۔ اسی طرح نیکی کے مضاعف ہونے کی بھی نفی نہیں کرتی کیونکہ آیت میں لا یظلمون کا لفظ ہے اس سے یہ مدلول ہے کہ کسی کی حق تلفی نہیں کی جائے گی اور اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ حسنات میں کچھ اضافہ بھی نہیں کیا جائے گا کیونکہ دلائل سے ثابت ہے کہ قیامت میں حسنات میں اضافہ ہوگا۔

معاملات جزا کی تین اقسام:

بیان اس کا یہ ہے کہ معاملات جزا تین قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ظلم اور عدل اور رحمت۔ ظلم یہ ہے کہ کسی کا حق مار لیا جائے اور اس کی کی ہوئی نیکیوں کا اجر نہ دیا جائے اور عدل یہ ہے کہ گناہوں کی سزا دی جائے اور نیکیوں کا اجر برابر سرابر دیا جائے اور رحمت یہ ہے کہ گناہوں کو نظر انداز کیا جائے اور نیکیوں کا اجر بڑھایا دیا جائے۔ حق تعالیٰ بندوں پر ظلم تو کیا کرتے عدل کا برتاؤ بھی نہیں کریں گے بلکہ بہت سے گناہوں کو عفو فرمائیں گے اور نیکیوں کا ثواب قانون سے بہت زیادہ دیں گے کہ ایک نیکی دس نیکی کے برابر تو ضرور ہی ہوگی بلکہ حدیث میں ہے قیامت کے دن مومنین کے ساتھ یہ برتاؤ ہوگا کہ ان کو بعض وہ نیکیاں نامہ اعمال میں لکھی ہوئی ملیں گی جو انہوں نے کی بھی نہیں تھیں اور گناہوں کی بعض کے ساتھ یہ حالت ہوگی کہ اول بندہ کے سامنے چھوٹے گناہ پیش کئے جائیں گے اور بڑے پیش بھی نہیں کئے جائیں گے پھر ان چھوٹوں کی نسبت بھی یہ حکم ہوگا کہ ان کو معاف کرو اور ان کو نیکی سے بدل دو اب کیا ہے اس وقت یہ حالت ہوگی کہ یا تو ڈر رہا تھا کہ کہیں بڑے گناہ پیش نہ ہوں اور یا جب گناہوں کے عوض نیکیاں ملتی دیکھیں تو خود کہے گا کہ میں نے تو اور بھی بڑے بڑے گناہ کئے تھے وہ کہاں ہیں۔ ان کو مجھ پر کیوں نہیں ظاہر کیا گیا اور اس سے غرض یہ ہوگی کہ جب چھوٹے چھوٹے گناہوں کی جگہ یہ نیکیاں ملی ہیں تو بڑے گناہوں پر ان سے بڑی نیکیاں ملیں گی اس امید میں بے ساختہ کہنے لگے کہ میرے بڑے گناہ کہاں گئے؟ سبحان اللہ کچھ حد ہے رحمت کی اور یہ

بھی ہوگا کہ بعض گناہ وہ ہوں گے جو بندہ نے کئے تھے لیکن وہ نامہ اعمال میں لکھے ہوئے نہ ہوں گے۔ پہلی قسم تو وہ تھی کہ گناہ نامہ اعمال میں لکھے ہوئے ہی نہیں ہیں یہ وہ گناہ ہیں جن سے توبہ کر لی گئی ہے اور اہل سنت کی تحقیق تو یہ ہے کہ بلا توبہ بھی عفو ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ کسی گناہ سے توبہ بھی نہ کی ہو اور حق تعالیٰ نے محض اپنی طرف سے اس کو معاف کر دیا ہو۔ غرض کس قدر رحمت ہے کہ بہت سے گناہ جو کئے گئے تھے وہ نامہ اعمال میں نہ ہوں گے اور بہت سی نیکیاں جن کو بندہ نے کیا بھی نہیں وہ نامہ اعمال میں موجود ہوں گی۔ یہ شان رحمت ہے جو عدل سے بالاتر ہے اور ظلم کا تو ذکر ہی کیا۔

قرآن کا عجیب نظم و نسق:

آگے فرماتے ہیں **وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ** قرآن کا کیا نظم و نسق ہے کہ ایک ہی آیت میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی۔ اس جملہ کا ترجمہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کی جزا پوری پوری دی جائے گی اور حق تعالیٰ کو ہر ہر فعل کا علم ہے۔ اس میں ذرا ذرا بھی دیا گو ہم یہ برتاؤ بھی کریں گے کہ کسی کی حق تلفی نہ کریں گے اور پورا پورا اجر دیں گے لیکن ہم کو علم سب اچھے برے اعمال کا ہے۔ حاکم کا یہ کہنا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو ہم جانتے ہیں اس میں یہ اثر ہے کہ سننے والے اس سے کانپ اٹھتے ہیں۔ اوپر چونکہ ترغیب انتہا درجہ کی تھی اس وجہ سے ذرا سی ترہیب بھی شامل کر دی تا کہ تعدیل ہو جائے۔ اب سمجھئے کہ یہاں تک جزاء وسزا کا بیان اجمالی تھا۔ اب اس تمام قصہ کا نتیجہ بطور تفصیل بیان فرماتے ہیں **وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا** اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ہنکائے جائیں گے کفار جہنم کی طرف جماعتیں کی جماعتیں۔ سوق کے معنی ہیں زبردستی چلانا اس سے یہ معنی ادا ہوتے ہیں کہ کفار اپنے قصد واختیار سے جہنم میں نہیں جائیں گے بلکہ جبراً دھکیل کے لے جائے جائیں گے جیسے جانوروں کو مار مار کر لے چلتے ہیں، اسی طرح فرشتے ان کے پیچھے ہوں گے اور دھکیل دھکیل کے لے جاتے ہوں گے کہ چلو چلو یہ معنی مفسرین نے لکھے ہیں۔ زمرا کے معنی ہیں جماعت جماعت یعنی کفار کی جماعتیں ہوں گی، بڑے کفار آگے ہوں گے اور ان سے چھوٹے ان کے پیچھے اور ان سے چھوٹے ان کے پیچھے۔ دیکھئے شان عدل دوزخ میں بھی ظاہر ہوگی کہ کفار میں بھی بقدر مراتب کفر فرق رکھا جائے گا۔ اس کا بیان دوسری آیت میں اس طرح ہے **ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا** فرماتے ہیں کفار کی ہر جماعت سے بھی ہم ان کو الگ چھانٹ لیں گے جو کفر میں اشد تھے اس

سے بھی معلوم ہوا کہ کفار کی جماعتیں ہوں گی اور یہ تفصیل بھی معلوم ہوئی کہ بڑے بڑے کفار الگ ہوں گے اور چھوٹے الگ۔ یہی حاصل ہے زمرا کا اور کفار کی سزائیں بھی جو دوزخ کے اندر ہوں گی علی قدر مراتب متفاوت ہوں گی گو خلود سب کا ہوگا کیا شان ہے کہ کفر پر بھی سزا دیتے ہیں تو عدل سے دیتے ہیں حَتّٰى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا ترجمہ: یہاں تک کہ کفار جب دوزخ کے پاس پہنچ جاویں گے تو دوزخ کے دروازے کھولے جاویں گے، لوگوں نے اس سے استنباط کر کے لکھا ہے کہ دوزخ کے دروازے بند رہتے ہیں اور اس وقت کھولے جاویں گے جب کفار اس کے پاس پہنچ جاویں گے۔ اس میں نکتہ یہ لکھا ہے کہ اگر اس کی گرمی قوی رہے تنور اگر ڈھک دیا جائے تو اس کی گرمی زیادہ ہو جاتی ہے بہ نسبت اس کے کہ کھلا رہے۔ دوزخ مدتوں سے بند ہوگی تاکہ اس وقت دروازے کھلنے سے ایک دم بھپکا نکل کر جھلس دے۔ ایک گرمی آگ کی اور ایک حبس کی اور دونوں سے سزا مقصود ہے۔ حق تعالیٰ کے یہاں کی ہر چیز بڑی ہے، عذاب بھی ہے تو ایسا کہ اس میں کوئی کسر تعذیب میں نہیں رہے گی۔ یہ نکتہ تو لوگوں نے بیان کیا ہے اور دوزخ کے دروازے بند ہونے میں ایک نکتہ اور بھی ہو سکتا ہے اور جس سے اس کے متغائر (الگ) معنی پیدا ہوتے ہیں کیونکہ نکتہ اولیٰ کا حاصل یہ ہے کہ یہ بیان ہے شان تذیب کا اور اس نکتہ ثانیہ کا حاصل یہ ہے کہ یہ بیان ہے شان رحمت کا۔ وہ نکتہ ہے کہ دوزخ کے دروازے اس واسطے بند ہوں گے کہ یہ دکھلا دیا جاوے گا کہ دیکھو ہماری طرف سے اتنی گنجائش دی جاتی ہے کہ پاس پہنچنے تک بھی شاید کسی کو کوئی ٹوٹا پھوٹا ذریعہ نجات مل جاوے۔ ذرہ برابر ایمان بھی نکل آوے تو وہ بچ جاوے اور جب دروازہ تک پہنچنے پر بھی کوئی ذریعہ نجات کا بہم نہ پہنچا تو اب مجبوری ہے۔ اتمام حجت ہو چکا اور کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے دوزخ سے دور رکھا جہاں تک ہو سکتا تھا، بچایا اور پھاٹک بند رکھا مگر کوئی ذریعہ رحمت کا ان کے پاس تھا ہی نہیں۔ اب پھاٹک کھولا جاتا ہے اور ان کو داخل کر دیا جاتا ہے۔ وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ترجمہ: اور دوزخ میں جانے والوں سے خزنہ جہنم کہیں گے کیا تمہارے پاس تمہارے ہی جنس کے رسول نہیں آئے تھے جو تمہارے سامنے حق تعالیٰ کی آیتیں پڑھتے تھے (یعنی احکام الٰہی سناتے تھے) اور اس دن کے دیکھنے سے ڈراتے تھے یہ بھی اتمام حجت ہے کہ ان سے اقرار بھی لے لیا جائے تاکہ وہ نہ کہہ سکیں کہ ہم پر ظلم ہوا اور اس میں اول یاد دلایا پیغمبروں کے آنے

کو جس کا حاصل یہ ہوا کہ اسباب ہدایت مہیا تھے۔

مناسبت مجانست سے ہوتی ہے:

مگر افسوس! ہے کہ تم نے ان اسباب سے کام نہیں لیا، پھر کہتے ہیں **منکم** یعنی وہ رسول کوئی غیر نہیں تھے۔ تمہارے ہی بھائی بند تھے یعنی فرشتے یا جن نہیں تھے بلکہ از جنس انسان تھے جن سے بوجہ مجانست کے بہت نفع کی امید تھی۔ یہ بھی حق تعالٰی کی رحمت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہم ہی میں سے بھیجا کیونکہ مناسبت ہوتی ہے مجانست سے اور نفع موقوف ہے مناسبت پر تو اگر انبیاء علیہم السلام ہمارے مجانس نہ ہوتے تو ان سے اتنا نفع نہ ہوتا یہ عین رحمت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہمارا ہم جنس پیدا کیا یہی وجہ ہے کہ ان کو ہم پر غایت درجہ کی شفقت ہوتی ہے اگرچہ اتمام حجت کے لئے یہ بھی کافی تھا کہ دنیا میں ایک فرشتے کو بھیج دیتے کہ وہ احکام الٰہی سنا دیتا بلکہ اتنا بھی کافی تھا کہ کتاب لکھی ہوئی اتار دیتے کہ لوگ اس میں احکام الٰہی دیکھ لیتے۔ بس تبلیغ ہو جاتی اور اس پر دارو گیر ہو سکتی، مگر ایسا نہیں کیا یہ کس قدر رحمت ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک طبیب تو مریض کو ضابطہ کی حد میں کیف ما تفق دوا بتا دیتا ہے، اس کا لحاظ نہیں کرتا کہ کڑوی ہے یا میٹھی اور ایک طبیب ایسا شفیق ہے کہ دواؤں میں سے وہ دوا بتاتا ہے جو بدمزہ نہ ہو بلکہ شربت بنا کر پلاتا ہے تو حق تعالٰی نے اپنے احکام اس طرح بھیجے ہیں گویا ہم کو شربت بنا کر پلایا ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کو جنس انسان ہی سے پیدا کیا جس کا اثر یہ ہے کہ انہوں نے صرف ضابطہ کی تبلیغ نہیں کی۔ تبلیغ بھی کی اور ہدایت کے لئے دعا بھی کی اور دل و جان سے توجہ بھی کی۔ انبیاء علیہم السلام محض منادی نہیں تھے بلکہ تربیت کنندہ اور اتالیق بھی تھے کہ احکام الٰہی کو پہنچایا اور ان پر خود عمل کر کے دکھایا اور نمونہ قائم کیا اور بات بات پر نگرانی کر کے درست کر دیا۔ بلکہ اتالیق بھی نہیں.....

انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں کے باپ بھی تھے:

یوں کہنا چاہئے کہ امت کے باپ تھے کہ ہر وقت ان کو امت کی اصلاح ہی کی فکر رہتی تھی جیسے باپ اولاد کے پیچھے کھپ جاتا ہے اور یہی چاہتا ہے کہ ان میں کوئی کسر نہ رہے۔ انبیاء علیہم السلام نے تبلیغ بھی کی، اصلاح کی تدبیریں بھی کیں اور دعائیں بھی کیں۔ یہ بات اس صورت میں ہرگز نہ پیدا ہوتی کہ انبیاء علیہم السلام غیر جنس ہوتے۔ غرض **منکم** کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ایسے پیغمبر آئے تھے جو تمہارے اوپر نہایت شفیق تھے اور انہوں نے کوئی دقیقہ تمہاری خیر خواہی

میں اٹھا نہیں رکھا، اب تمہارے پاس کیا عذر ہے اور یتلون مضارع کا صیغہ لایا گیا ماضی کا صیغہ نہیں لایا گیا کیونکہ مضارع کا صیغہ تکرار پر دلالت کرتا ہے کیا معنی کہ انہوں نے صرف ایک دفعہ تبلیغ کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ بار بار تبلیغ کی ینذرونکم یعنی اس دن کی پیشی سے تم کو ڈراتے تھے کہ خدائے احکم الحاکمین کے سامنے جواب دہی کرنا ہوگی اور اس وقت کوئی عذر وحیلہ نہ ہوگا اور الم یاتکم بعینہٖ استفہام لایا گیا بجائے اتاکم کے کیونکہ اتاکم میں صرف اخبار ہوتا ہے جو مقتضی جواب کو نہیں ہوتا اور استفہام مقتضی جواب کو ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک تو یوں کہا جاوے کہ تمہارے پاس ہمارا پروانہ پہنچا تھا اور تم نے اس کی تعمیل نہیں کی اور ایک یوں کہا جاوے کہ کیا تمہارے پاس پروانہ نہیں پہنچا تھا، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے ہے کہ اول اس کا جواب دو جب وہ جواب دے گا کہ حضور پہنچا تھا اس کے بعد اس پر یہ الزام متوجہ ہوگا کہ باوجود پروانہ پہنچنے کے تم نے تعمیل حکم کیوں نہیں کی۔ غرض استفہام مقتضی جواب کو ہوتا ہے اس کا فائدہ یہ ہے کہ وہ اعتراف کر لیں اور اقراری مجرم ہو جاویں اور یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہم کو صرف شہادت سے سزا دی گئی۔ چنانچہ اس استفہام کے جواب میں وہ اقرار کریں گے قالو بلی کہیں گے ہاں پیغمبر بے شک آئے تھے وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ہماری قسمت ہی میں عذاب لکھا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسئلہ جبر سے تمسک کریں گے اور اس طرح اپنی برأت کریں گے کہ ہمارا قصور نہیں کیونکہ ہماری قسمت میں ازل سے یہی لکھا گیا تھا جس کے آگے ہم مجبور محض تھے کیونکہ مسئلہ جبر جو خلاف واقع ہے اور وہ اس لفظ کو قیامت میں کہیں گے جہاں انکشاف حقائق ہو چکا ہوگا۔ اصل یہ کلمہ حسرت کا ہے گو عنوان جبر کا ہے۔ اس کی مثال ہمارے محاورہ میں یہ ہے کہ کسی سے کوئی فاش غلطی ہو جاوے اور اس کی وجہ سے نقصان عظیم اٹھاوے تو وہ اس غلطی سے پچھتاتا ہے اور جب لوگ اس سے کہتے ہیں کہ تجھے کیا سوجھا تھا جو ایسا کام کر بیٹھا تو وہ نہایت درجہ ندامت اور حسرت سے کہتا ہے ارے میاں قسمت ہی پھوٹ گئی۔ یہاں بھی ظاہر میں اس کے وقوع کو قسمت کی طرف منسوب کیا گیا ہے مگر مطلب یہ نہیں ہے کہ مسئلہ جبر سے تمسک کرتے ہیں ورنہ یوں کہتے ارے میاں مجھ سے کیا قصور ہوا، قسمت میں یہی تھا میں کیا کرتا ان الفاظ کی بندش اور لہجہ بتاتا ہے کہ حسرت کا کلمہ ہے اسی طرح وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ہے کہ اس سے مقصود اپنے فعل کو تقدیر پر حوالہ کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اظہار حسرت ہے قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا کہہ جائے گا یعنی فرشتے کہیں گے اچھا دوزخ میں چلو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

ادخلو صیغۂ امر ہے جو چاہتا ہے استقبال کو جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس جواب کے بعد دخول ہو گا اور یہ حکم اس گفتگو کے بعد ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکالمہ اہل دوزخ اور فرشتوں میں جہنم کے دروازہ سے باہر ہوگا، گو آیت میں کوئی لفظ قطعی الدلالت ایسا نہیں ہے جس سے کہا جاوے کہ یقیناً اور قطعاً یہ مکالمہ خارج جہنم ہی ہوگا لیکن الفاظ اور ترتیب سے صراحتاً یہی معلوم ہوتا ہے اور کوئی قرینہ اس کے خلاف پر موجود نہیں لھذا یہی کیا جاوے گا کہ یہ مکالمہ خارج جہنم ہی ہوگا تو کیا عدل ہے کہ سزا سے پہلے مجرم سے اقرار لے لیا اور کوئی حجت اس کی باقی نہیں رکھی، ابواب جہنم کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جہنم کا دخول جہنم میں دروازوں سے ہوگا۔

پل صراط:

یہاں حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے اور یہ مضمون اسی آیت کے تحت لکھا ہے یا سورۃ حدید میں لکھا ہے کہ پل صراط پر کفار سے عبور نہیں کرایا جاوے گا بلکہ پل صراط پر صرف مومنین اور منافقین اتارے جاویں گے کیونکہ پل صراط کے بارہ میں وارد ہے کہ وہ ایک پل ہے جو جہنم کے اوپر بچھایا جاوے گا اور اس پر چلنے والے بعضے پار اتر جاویں گے (وہ مومنین ہوں گے) اور بعض پار نہ اتر سکیں گے بلکہ کٹ کر دوزح کے اندر گر پڑیں گے۔ پس اگر کہا جاوے کہ وہ کٹ کر گرنے والے عام کفار ہوں گے تو ان کے متعلق یہ مضمون کہاں صادق ہوگا اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَھَنَّمَ کیونکہ اوپر سے گرنے والے کو داخل من الوسطہ کہا جاسکتا ہے داخل من الابواب نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں ایک گروہ کفار کا بھی ایسا ہوگا جو صراط پر اتارا جاوے گا اور وہ منافقین کا گروہ ہے اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ صراط جنت کی سڑک ہے کہ اس سے عبور کر کے جنت میں جاسکیں گے تو اس پر چلنے کے مستحق وہی ہوسکتے ہیں جو جنت میں جانے کا ارادہ رکھیں اور وہ مومنین ہیں یا وہ جن میں شبہ ہے مومنین کا یعنی مشابہت ہے مومنین کے ساتھ اور وہ منافقین ہیں جو زبان سے مدعی ہیں مومن ہونے کے۔ مومنین تو حقیقتاً جنت کے مستحق ہیں اور منافقین صرف ظاہراً وادعاً۔ چنانچہ اس کا اثر یہ ہوگا کہ مومنین عبور کر جاویں گے اور منافقین کٹ کر جہنم میں گر جاویں گے۔ یہ خلاصہ ہے شاہ صاحب کی تحقیق کا کہ کافر محض جس نے زبان سے بھی ایمان ظاہر نہیں کیا پل صراط پر نہیں چلایا جائے گا بلکہ یہ لوگ ابواب جہنم سے داخل کئے جائیں گے۔ پل صراط پر صرف مومنین چلائے جائیں گے خواہ حقیقی مومن ہوں یا ادعائی خلدین فیھا حال مقدرہ ہے، ادخلو کی ضمیر انتم سے مطلب یہ ہے کہ جہنم میں جاؤ۔ اس حال میں کہ خلود تمہارے واسطے تجویز شدہ ہے۔ فبئس مثوی المتکبرین پس وہ بری ہے جگہ متکبرین کی۔ یہاں

یہ بات قابل غور کرنے کے ہے کہ متکبرین سے مراد کون لوگ ہیں؟ ظاہر ہے کہ وہی کفار مراد ہیں جن کو دروازہ جہنم سے داخل کیا جائے گا کیونکہ ان ہی سے خطاب ہو رہا ہے۔ نیز سب جانتے ہیں کہ دوزخ کفار ہی کی مستقل جگہ ہے، گنہگار مسلمانوں کے لئے جہنم مثوی نہیں ہے۔ عارضی جیل خانہ ہے تو ان ہی کو اوپر کفار کہا گیا ہے۔ وَسِیْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا میں اور ان ہی کو یہاں متکبرین کہا گیا اور ظاہر ہے کہ اگر چور کو سزا دی جائے اور یوں کہا جائے کہ چور کی یہ سزا ہے تو علت سزا کی چوری ہی ہوگی اس طرح جب کہا گیا وَسِیْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی جَهَنَّمَ زُمَرًا یعنی کفار جہنم کی طرف ہنکائے جاویں گے تو جہنم میں جانے کی علت کفر ہی کو کہا جاوے گا اور جب کہا گیا فَبِئْسَ مَثْوَی الْمُتَکَبِّرِیْنَ تو اس سے برے ٹھکانے پانے کی علت تکبر ہی کو کہا جاوے گا اور دونوں جگہ مجرم ایک ہی گروہ ہے تو حاصل یہ نکلا کہ اس گروہ کی اس سزا کی یعنی دخول جہنم کی علتیں دو بیان ہوئیں، کفر اور تکبر۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ دونوں ایک جز ہیں یعنی ایک مفہوم کے دو نام ہیں، جیسے اسد بھی شیر کو کہتے ہیں اور لیث بھی اسی کو کہتے ہیں۔ یہ دونوں الگ الگ چیز ہیں اور ان میں سے ہر ایک علت ہے۔ دخول جہنم کی غرض ان دونوں میں کیا علاقہ ہے۔ تو سمجھ لیجئے کہ دونوں مفہوم کے لحاظ سے تو ایک نہیں ہیں کیونکہ کفر اور تکبر کو کسی نے مرادف نہیں کیا باعتبار مفہوم لغوی کے دونوں علیحدہ چیزیں ہیں تو اب یہ کہا جاوے گا کہ دونوں علیحدہ علیحدہ علتیں ہیں دخول جہنم کی، لیکن ان دونوں میں ہر ایک مستقل علت نہیں ہے بلکہ ایک علت ہے اور ایک علت العلت، بیان اس کا یہ ہے کہ علت جس سے مراد سبب ہے دو قسم پر ہے ایک سبب اور ایک سبب السبب جیسے امتلاء عروق بھی سبب ہے حمی کا اور عفونت اختلاط بھی سبب ہے حمی کا لیکن عفونت سبب ہے اور امتلا سبب السبب ہے، امتلا سے عفونت پیدا ہوتی ہے اور عفونت سے حمی پیدا ہوتا ہے پس امتلا اور عفونت دونوں کو سبب حمی کہہ سکتے ہیں لیکن واقع میں سب عفونت ہے اور امتلا سبب السبب ہے ، اسی طرح کفر اور تکبر دونوں کو سبب کہہ سکتے ہیں دخول جہنم کا لیکن درحقیقت دخول جہنم کا سبب قریب کفر ہے اور تکبر سبب السبب ہے یعنی تکبر سبب ہے کفر کا جو سبب ہے دخول جہنم کا۔

کفر تکبر کی فرع ہے:

اس وجہ سے قرآن میں کہیں تکبر کو علت قرار دیا ہے دخول جہنم کے لئے اور کہیں کفر کو اور غور سے دیکھا جاوے تو یہ بالکل واقعی بات ہے کہ کفر اور تکبر میں اصل تکبر ہی ہے اور کفر تکبر کا نتیجہ اور فرع ہے اور کفار کو جہنم میں لے جاوے گا تو تکبر ہی لے جاوے گا اس لحاظ سے دخول جہنم کے محل میں فَبِئْسَ مَثْوَی الْمُتَکَبِّرِیْنَ (تکبر کرنیوالوں کیلئے برا (ٹھکانا) ہے) کہنا بالکل برمحل ہے جو

لوگ کفر میں مبتلا ہیں وہ اس وجہ سے مبتلا اور غلطی سے اس بلا پر پڑ جاتے ہیں بلکہ وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کو حق بات کے قبول کرنے میں کسی سے چھوٹا بننا پڑتا ہے۔ اس واسطے باوجود حق کو جاننے کے اس کو قبول نہیں کرتے۔ حق بات اول تو عقل ہی سے معلوم ہو جاتی ہے لیکن اس کو اگر کافی نہ کہا جاوے تو حق تعالیٰ کی یہ بھی رحمت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھیج کر اس کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے ایسا کہ اس میں کوئی خفا باقی نہیں رہا اور انبیاء علیہم السلام کے بعد علماء کے ذریعہ سے اس کو بالکل آشکارا کر دیا ہے موٹی بات ہے کہ حجت میں کوئی فریق اہل حق سے کبھی نہیں جیت سکا۔ جب اہل حق ہمیشہ غالب رہتے ہیں تو اس کو قبول نہ کرنے کی کون سی وجہ اور اس کے مقابل باطل کو قبول کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ بجز تکبر کے کچھ بھی وجہ نہیں کیونکہ اوپر کی تقریر سے جب صاف ظاہر ہو گیا کہ کفار کا باطل کو اختیار کرنا اس وجہ سے نہیں کہ حق بات میں کچھ خفا ہے تو معلوم ہوا کہ باوجود وضوح کے قبول حق سے کوئی اور ہی مانع ہے وہ مانع سوائے عار کے کچھ نہیں ہے کسی کو اس سے عار آئی کہ آباؤ اجداد کے خلاف کیسے نیا دین قبول کریں، کسی کو اس سے عار ہوئی کہ ایک معمولی اپنے ہی ہم جنس آدمی کے کہنے سے نئی بات کیسے مان لیں۔ چنانچہ قرآن میں بعض کا قول نقل فرمایا گیا ہے وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (اگر تم اپنی طرح کے انسان کا کہنا مانا تو تم خسارہ میں پڑ جاؤ گے) اور بعض کو اس سے عار ہوئی کہ ہم معمولی لوگوں کے برابر کیسے بنیں؟ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا قول حق تعالیٰ نے نقل کیا ہے قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَکَ وَاتَّبَعَکَ الْاَرْذَلُوْنَ یعنی ہم تمہارا کہنا کیسے مان لیں حالانکہ تمہارے متبعین تو معمولی لوگ ہیں کوئی بڑے مالدار اور رؤسا تمہارے پیرو نہیں۔ یہ حماقت دیکھئے کہ تمول اور ریاست کو اتباع حق کا مدار قرار دیا حالانکہ غور کر کے دیکھئے تو جتنے شرور ہیں وہ ان ہی لوگوں سے شروع ہوتے ہیں جو مالدار ہیں اور امور خیر میں ہمیشہ غرباء ہی سبقت کرتے ہیں۔ اس قوم کو قبول حق سے یہ عار مانع ہوا کہ ہم معمولی لوگوں کے برابر کیوں بنیں اور اگر کوئی دلیل ان کے پاس ہوتی تو حضرت نوح علیہ السلام کے مقابلہ میں اس کو ضرور پیش کرتے۔ معلوم ہوا کہ دلیل تو کچھ نہ تھی حق واضح ہو چکا تھا لیکن یہی عار مانع تھی اور کہاں تک واضح نہ ہوتا۔ حضرت نوح علیہ السلام تقریباً ایک ہزار برس اپنی قوم میں رہے اور اس طویل مدت میں انہوں نے کون سا دقیقہ اظہار حق میں چھوڑ دیا ہوگا حق وہ چیز ہے جو کبھی چھپتا ہی نہیں۔

حق کی پہچان:

میں نے ایک مکتوب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا دیکھا ہے جو بیاور ضلع اجمیر کسی کو لکھا

تھا۔ اس مکتوب میں یہ الفاظ تھے کہ حق وہ ہے جو مدلول ہو، نص کا بلا کلفت مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آپس میں کسی بات میں جھگڑتے ہیں ایک فریق کہتا ہے کہ قرآن سے یہ ثابت ہے اور دوسرا فریق کہتا ہے کہ یہ ثابت ہے تو اس میں قول فیصل یہ ہے کہ اپنے اغراض اور خیالات کو الگ کر کے اور ان سے بالکل قطع نظر کر کے دیکھو کہ نص قرآنی کا مدلول بلا کلفت کیا ہے جس میں اونچ نیچ اور تکلف اور تاویل کی بالکل ضرورت نہ ہو، بس وہی حق ہے۔ وہ اپنے خیال کے موافق ہو یا مخالف مطلب یہ ہے کہ حق تو چھپتا ہی نہیں اس کو قصداً اعراض اور تاویلوں سے چھپایا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو کوئی بھی کفر اختیار کرتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ حق اس سے پوشیدہ رہا، حق تو پوشیدہ رہنے کی چیز ہی نہیں، حق ضرور واضح ہو جاتا ہے لیکن عار سبب ہوتی ہے کفر کا، اور عار کی حقیقت تکبر ہے تو تکبر سبب ہوا کفر کا۔

کفر تکبر کی شاخ ہے:

اب تکبر اور کفر دونوں میں علاقہ معلوم ہو گیا وہ یہ کہ تکبر سبب ہے کفر کا اور کفر سبب ہے دخول جہنم کا تو تکبر بھی سبب ہوا دخول جہنم کا لیکن بواسطہ یعنی سبب السبب ہوا اور بنا بر تقریر مذکور متکبرین کے لفظ میں اشارہ ہے تمام عقائد اور اخلاق کی تکبر ہی سے پیدا ہوتی ہے اور یہی تکبر اصل ہے ہر ذمیمہ کی اور تکبر کا نتیجہ بیان کیا گیا دخول جہنم تو اس میں ہر برے عقیدے اور ہر ذمیمہ کی برائی آ گئی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کہا جاوے کہ میٹھا کھانے سے خون میں گرمی پیدا ہوتی ہے تو اس میں گڑ بھی آ گیا جو جڑ ہے مٹھائیوں کی اور جلیبی بھی آ گئی اور قلاقند بھی۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ تکبر ہی سبب ہوا ہے ابلیس کے کفر کا اور اس کے ملعون ہونے کا تو خیال کرنے کی بات ہے کہ لوگ کفر سے تو بچتے ہیں اور اس کے نام سے بھی ڈرتے ہیں جو ایک شاخ ہے کبر کی اور کبر سے نہیں بچتے اور اس سے نہیں ڈرتے حالانکہ وہ اصل ہے کفر کی، حیرت ہے شاخ سے تو ڈرا جائے اور جڑ سے نہ ڈرا جائے۔ یہ ایسا ہوا جیسے کوئی جلیبی اور قلاقند سے تو بچے لیکن گڑ خوب کھاوے۔

کبر دلوں کے اندر ایک چنگاری ہے:

کبر دلوں کے اندر ایک چنگاری ہے جو راکھ سے دبی ہوئی رکھی ہے۔ اس کا انتظار نہ کیجئے کہ جب وہ ظاہر ہو گی اور آگ بھڑک اٹھے گی، اس وقت بچا لیں گے کیونکہ جس وقت آگ بڑھک اٹھتی ہے پھر کسی کے بس میں نہیں آتی۔ مال اور اسباب کو تو جلاتی ہی ہے، بجھانے والے کو بھی لپیٹ لیتی ہے۔ آگ سے زیادہ چنگاری سے حفاظت کیجئے کیونکہ آگ کی طرف تو التفات ہوتا

بھی ہے اور آدمی اس سے ہوشیار ہو ہی جاتا ہے مگر چنگاری کی طرف التفات کم ہوتا ہے اور وہ دبے ہی دبے اپنا کام کر جاتی ہے تو اس کا انتظار کیوں کیا جائے کہ جب کفر تک نوبت آئے گی اس وقت تکبر کا علاج کر لیں گے، پہلے ہی سے اس کی تدبیر کیوں نہ کی جائے تاکہ کفر تک نوبت ہی نہ آئے۔ مولانا کہتے ہیں:

علت ابلیس انا خیر بد است این مرض در نفس ہر مخلوق ہست

''ابلیس کی بیماری اپنے کو بہتر سمجھنے کی تھی اور یہ مرض ہر مخلوق کے اندر موجود ہے۔''

اس سے مراد ابلیس کا وہ لفظ ہے جو اس نے اس وقت کہا تھا جب اس کو سجدہ کا حکم ہوا۔ انا خیر منہ یعنی میں آدم سے بہتر ہوں تو اس کو کیوں سجدہ کروں؟ دیکھئے اس کے دل میں ہمیشہ سے کبر تھا اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا جس سے آخر کار نوبت کفر تک آ ہی گئی۔ چنانچہ خدا تعالیٰ کے حکم کے سامنے انکار سے پیش آیا اور ہمیشہ کے لئے ملعون اور جہنمی ہو گیا۔ مولانا اس واقعہ کو بیان کر کے ہم کو ہوشیار کرتے ہیں۔ این مرض در نفس ہر مخلوق ہست۔ مطلب یہ ہے کہ ابلیس کا واقعہ سن کر ہنسو مت، اپنی خبر لو، کیونکہ وہ مسالہ تمہارے اندر بھی موجود ہے۔ اتنا فرق ہے کہ وہاں اس مسالہ میں رگڑ لگنے کی دیر ہے اور ایک مٹی کے تیل کا پیپہ بھی موجود ہے پھر جہاں دیا سلائی ہو وہاں تو ہر وقت ہی خطرہ ہے کہ خدا جانے کس وقت مسالہ میں رگڑ لگ جاوے اور تیل میں آگ لگ کر بھڑک جائے اور سب گھر بار پھونک ڈالے۔ مولانا ایک پیپہ مٹی کے تیل کا موجود ہے وہ کیا ہے نفس جس میں ہر وقت استعداد ہے شرکی۔ بس چنگاری پڑنے کی دیر ہے (تم ہو تو مٹی کے مگر تیل کے ساتھ ہو کہ آگ لگی بھڑکی) جب تک تکبر اندر موجود ہے ہرگز کوئی شخص مامون نہیں ہو سکتا۔

تکبر مضر علم ہے:

مگر عجیب بات ہے کہ یہی سب سے خطرناک چیز ہے اور اسی کا علاج نہیں کیا جاتا۔ اچھے اچھے نمازی اور پرہیز گار ہیں جن کے لوگ معتقد ہیں مگر ان کے اندر یہ بلا بھری ہوئی ہے کہ اس کو کچھ گناہ اور عیب ہی نہیں سمجھا جاتا، معمولی گناہوں سے بچتے ہیں اور کبر جیسے گناہ کی کچھ پرواہ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دین نام رکھا گیا ہے صرف اعمال ظاہری کا اور اعمال باطنی کو دین کے اندر داخل ہی نہیں سمجھا جاتا۔ پس نیچا کرتا پہن لیا اور پانچوں وقت کی نماز پڑھ لی اور پاجامہ شرعی پہن لیا اور اپنے آپ کو شبلی وقت سمجھنے لگے خواہ باطنی معاصی میں سر سے پیر تک آلودہ ہوں اور یہ حالت ہو جو ایک بزرگ کہتے ہیں:

از بروں چوں گور کافر پر حلل و اندروں قہر خدائے عز و جل

''باہر سے مثل کافر کی قبر کے خوب ٹیپ ٹاپ ہے اور اندر خدائے تعالیٰ کا قہر ہو رہا ہے۔''

از بروں طعنہ زنی بر بایزید   وز درونت ننگ می دارد یزید

''باہر سے تو ایسے صوفی کہ بایزید بسطامی کو بھی شرمندہ کریں اور باطنی حالت اس قدر خراب کہ یزید بھی شرمندہ ہو جائے۔''

آفت علم: یہ مرض ایسا عام ہوا ہے کہ کوئی بھی اس سے خالی نہیں۔ الا ماشاء اللہ خصوصاً اہل علم کسی نے سچ کہا ہے **آفة العلم الخیلاء** یعنی علم کی آفت تکبر ہے اور اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ وہ آفت جو علم سے پیدا ہوتی ہے اور ایک یہ کہ وہ آفت جو مانع ہے حصول علم سے کوئی معنی بھی لئے جاویں یہ بات ہر صورت میں صادق ہے کہ تکبر مضیع علم ہے۔ چنانچہ جس کے قلب میں تکبر ہے اس کے قلب میں نور علم نہیں ہو سکتا۔ غرض کبر بد ترین مرض ہے اور یہ علماء کے حصہ میں آیا ہے۔ جاہل بے چاروں میں ایسا بڑا مرض پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اہل علم کا جیسا مرتبہ بڑا ہے ایسے ہی ان کا مرض بھی سب سے بڑا ہے اس لئے ایسے علماء سے جو اس آفت میں مبتلا ہوں جہلاء ہی اچھے، کیونکہ ان میں اتنا بڑا مرض تو نہیں ہے اور ایسے علم سے جس کے ساتھ تکبر بھی ہو وہ جہل اچھا جس کے ساتھ تکبر نہ ہو اس کو سن کر لوگ کہیں گے کہ علم کی مذمت کر دی حالانکہ علم تو ہر حال میں اچھی ہی چیز ہے علم ہی ایک روشنی ہے جس سے بھلے برے میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عینک اس غرض سے لگائی جاتی ہے کہ آنکھ کی روشنی بڑھے مگر اس سے یہ فائدہ جب ہی تو نکلے گا کہ طریقہ کے موافق استعمال کی جائے ورنہ اگر عینک کو کان پر رکھ لیا جائے تو کیا فائدہ یا اس کے شیشہ پر چونا لپیٹ دیا جائے یا کالک لگا دی جائے تو کیا کام دے سکتی ہے۔ ایسی عینک کے ہونے سے تو نہ ہونا اچھا کیونکہ وہ تو رہی سہی بصارت کو بھی کھوتی ہے اور خواہ مخواہ کا بوجھ بھی بندھتا ہے۔ یہی حالت علم کی ہے کہ اگر اس کو طریقہ سے استعمال کیا جائے یعنی اس سے اپنے نفس کی اصلاح کا کام لیا جائے تو بہت کام کی چیز ہے اور سرتا پا نور ہی نور ہے اور اگر اس سے یہ کام نہ لیا جائے بلکہ دوسروں سے لڑنے جھگڑنے، بڑا بننے کے لئے استعمال کیا جائے تو بیکار بلکہ مضر ہے۔ تو یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوا کہ علم ہر حالت میں اچھی چیز نہیں بلکہ بعض حالتوں میں قابل مذمت بھی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ بعض ان پڑھ لوگ پڑھے ہوؤں سے اچھے ہیں۔ ان پڑھ لوگوں کے ذہن میں کبھی یہ وسوسہ بھی نہیں آتا کہ ہم دوسروں سے اچھے ہیں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن میں ہر وقت یہی بات بھری رہتی ہے کہ ہم دوسروں سے اچھے ہیں، ان پڑھ لوگ اتنی بصیرت تو رکھتے ہیں کہ اپنے عیبوں کو جانتے ہیں گو اجمال

ہی کے مرتبہ میں سہی۔ چنانچہ وہ جانتے ہیں کہ ہم جاہل ہیں اور یہ حضرات اتنی بصیرت بھی نہیں رکھتے کہ اپنے عیب کو دیکھ سکیں کہ ہم میں تکبر ہے، حسد ہے، عجب ہے وغیرہ وغیرہ۔

پس وہ اگر چندھے ہیں تو یہ اندھے ہیں۔ ہم دوسروں کو کیا کہیں خود اپنے ہی آپ کو کہتے ہیں کہ یہ مرض ہم میں موجود ہے۔ مرض کا وجود علامات سے پہچانا جاتا ہے ہم جب کسی سے ملتے ہیں تو ابتداء بالسلام کیوں نہیں کرتے طبیعت اس سے کیوں رکتی ہے کیا یہ اس کی علامت نہیں ہے کہ ہم کو دل میں اپنے بڑے ہونے کا خیال ہے، اگر اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھتے تو ابتدا بالسلام سے کیوں عار آتی ہے، پھر جب علامت سے ثابت ہوگیا کہ مرض موجود ہے اور مرض بھی کون سا بدترین امراض۔ تو پھر ہم کس بات پر بھولے بیٹھے ہیں اور وہ کون سی خوبی ہے جس کی بنا پر دوسرے سے اپنے آپ کو اچھا سمجھتے ہیں۔ کیا یہ بات قابل اصلاح نہیں ہے۔ ضرور ہے اور اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ یوں سوچنا چاہئے کہ تم اگر اس دوسرے شخص سے بڑھے ہوئے ہو جس کو سلام کرنے سے عار آتی ہے تو کس بات پر بڑھے ہوئے ہو۔ بڑھنے اور گھٹنے کا معیار بھی اگر معیار علم ہے اور وہ تم میں موجود ہے اور اس میں نہیں ہے تو خیال کرو کہ علم فی نفسہٖ مقصود چیز نہیں بلکہ علم صرف اس وجہ سے مقصود ہے کہ وہ عمل کا ذریعہ ہے تو جب تم دوسرے سے ملو تو اس وقت کا عمل سلام کرنا ہے اور وہ تم نے نہیں کیا تو تمہارا علم بیکار رہا کیونکہ موصل الی المقصود نہ ہوا جب بیکار رہا تو باعث فضیلت بھی نہ ہوا، تو تم اس سے بڑھے ہوئے نہ ہوئے بلکہ گھٹے ہوئے اور اگر معیار فضیلت مال ہے تو اگر اس کے پاس مال تم سے کم ہے اور تمہارے پاس مال اس سے زیادہ ہے تب بھی تعلقات قائم رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ مال کی ترقی یا بقاء تجارت سے ہوتی ہے اور تجارت گور وپیہ سے ہوسکتی ہے مگر اس کے لئے تعلقات بڑھانے کی ضرورت ہے اور سلام ایک عمدہ ذریعہ ہے تعلق بڑھانے کا، بس یہ بھی اسی بات کا مقتضی ہے کہ تم ہی اس کو سلام کرو۔ غرض آدمی کو اگر اپنی اصلاح کا خیال ہو تو ہر حال میں کوئی نہ کوئی وجہ اور صورت نفس سے تکبر چھڑانے کی نکال سکتا ہے۔ یہ سب باتیں سمجھ دار آدمی کے لئے ہیں اور عمل کرنے والے کے لئے ورنہ مناقشہ اور جھگڑا کرنے کو تو بڑی گنجائش ہے۔

بحث مباحثہ میں بڑی گنجائش ہے:

ایک طالب علم کا قصہ ہے کہ راستہ میں ان کی ایک جاہل آدمی سے ملاقات ہوئی، انہوں نے اسے سلام نہیں کیا۔ یہ مرض اہل علم میں ہوتا ہی ہے کہ اس وقت اسی کا بیان ہو رہا ہے، اس جاہل نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کیا آپ نے کتاب میں ابتدا بالسلام کرنے کی فضیلت نہیں

پڑھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں پڑھی ہے مگر قاعدہ یہ ہے کہ چھوٹا آدمی بڑے کو سلام کرے، تم جاہل ہو ہم عالم ہیں لھذا تم چھوٹے ہو اور ہم بڑے، تم کو چاہئے تھا کہ ہمیں سلام کرتے، ان دونوں میں گفتگو بہت بڑھ گئی حتیٰ کہ وہ شخص ان کو پکڑ کر ان کے استاد کے پاس لے گیا اور سارا قصہ سنایا۔ استاد نے طالب علم صاحب سے کہا کہ بھائی یہ قضیہ مسلم سہی کہ چھوٹا آدمی بڑے کو سلام کرے مگر تم کو یہ سوچنا چاہئے تھا کہ بڑا اور چھوٹا ہونا اپنے خیال کا معتبر نہیں۔ ممکن ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک وہ بڑا ہو۔ استاد نے یہ سچی بات کہی اور صحیح تعلیم دی مگر طالب علموں کی ذہانت دیکھئے، آپ فرماتے ہیں کہ یہی بات تو اس جاہل کو بھی سمجھنا چاہئے تھی کہ ممکن ہے عنداللہ میں بڑا ہوں لھذا اس کو ابتداء بالسلام کرنا چاہئے تھی۔ دیکھئے کیا جواب دیا ہے کہ جاہل تو جاہل استاد کو بھی بند کر دیا حاصل یہ کہ قیل وقال اور بحث مباحثہ کو تو بہت گنجائش ہے اور کوئی ایسی بات نہیں جس کا جواب نہ ہو سکے مگر اس سے کام نہیں چلتا اور یہ طریقہ کچھ مفید نہیں۔ یہ طریقہ دنیا کے تو کسی کام میں اختیار کر کے دیکھئے معلوم ہو جائے گا کہ اس سے کیسا کام چلتا ہے۔ مثلاً کھانا پکانا سیکھنا ہو اور کسی کو اس کام کے لئے استاد بنایا وہ کہتا ہے کہ شوربے میں اتنا مسالہ اور اتنا نمک اور اتنا پانی ڈالو آپ بجائے اس کی اطاعت کرنے کے قیل وقال شروع کر دیں اور ذہانت سے کام لینے لگیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ اتنا پانی اتنا ہی مسالہ اتنا ہی نمک چاہئے۔ ہم یوں کیوں نہ کریں کہ جتنا پانی بتایا ہے اتنا ہی نمک ڈال دیں تو اس قیل وقال سے جیسا کھانا پکے گا معلوم ہے گو استاد آپ کی ذہانت کے سامنے لاجواب ہو جائے لیکن ہے یہی بات کہ یہ طریقہ مفید اور موصل الی المطلوب نہ ہوگا، اس قیل وقال سے کچھ کام نہیں چل سکتا، مفید طریقہ یہی ہے کہ استاد کے بتانے کو بے چون و چرا تسلیم کر لو اور ذہانت کو چھوڑ دو پھر دیکھو کہ کھانا پکانا کیسے جلدی آتا ہے اور کھانا کیسے مزیدار پکتا ہے۔

تہذیب نفس میں مصروف ہونے کی ضرورت:

جو آدمی کام کرنے والا ہوتا ہے وہ قیل وقال میں کبھی نہیں پڑا کرتا اس کی نظر کام پر ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح تہذیب نفس میں مشغول ہونے والے کو دوسرے کو الزام نہیں دینا چاہئے کیونکہ یہ طریقہ مفید نہیں اگر دوسرے کو الزام دے بھی دیا تو اس کا کام کیا ہوا یعنی اس کو تہذیب نفس کیا حاصل ہوئی یہ تو ایسی بات ہوئی جیسے ایک شخص بتلائے کہ تمہارے منہ پر کالک لگ گئی ہے اور سننے والا بجائے اپنی کالک چھوڑانے کے اس کو الزام دینے لگے کہ تیری بھی تو ناک ٹیڑھی ہے، یہ بات اگرچہ واقع میں سچی بھی ہو اور الزام بے جا نہ ہو تب بھی یہ دیکھو کہ تم کو اس الزام دینے کی طرف

متوجہ نہ ہونا چاہئے ،اگر دوسرا کسی بات میں گھٹا ہوا بھی ہے تب بھی اس کو اس کے مقابلہ میں اپنے نفس کو بڑھانے سے کیا فائدہ! اس صورت میں اس نے نفس کی تربیت نہیں کی بلکہ ایک برائی زیادہ کرلی اور حاصل یہ ہوا کہ پہلے تو شاید اس دوسرے شخص سے کسی بات میں بڑھا ہوا بھی ہو لیکن اب یعنی جبکہ اپنے نفس کو اس سے بڑا سمجھا یقیناً اس سے گھٹ گیا۔ دوسرے کو الزام دینے کا یہ نتیجہ ہوا۔ اب بتلائیے یہ طریقہ مذکور صحیح ثابت ہوا یا یہ طریقہ، آئندہ کہ ہر شخص ہر بات کو تحقیق کی نظر سے دیکھے اور دوسرے کو الزام دینے سے قطع نظر کرلے، اگر کسی بات میں دوسرے کو گھٹا ہوا دیکھا ہے تو اس وقت یہ سوچے کہ ہم بھی کسی بات میں اس سے گھٹے ہوئے ہیں یا نہیں کیونکہ ہر شخص میں کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور کچھ برائیاں بھی، اگر اس شخص میں ایک برائی ہے تو ممکن ہے کہ ہم میں بہت سی برائیاں ہوں یا ایک ہی برائی ہو لیکن اس کی برائی سے بدتر ہو پھر کس طرح اس کو ہم گھٹا ہوا سمجھتے ہیں اور کیوں دوسرے کو اپنے آپ سے کم درجہ سمجھ کر سلام میں ابتداء کرنے سے عار آتی ہے۔ میں نے تدبیر بتادی اس رذیلہ کے نکالنے کی لیکن یہی مقدمات ہیں جن سے آدمی یہ مفید کام بھی لے سکتا ہے اور اچھا اور کارآمد نتیجہ نکال سکتا ہے اور یہی مفید مقدمات ہیں کہ اگر ان کو اس طالب علم کی طرح الٹی ترتیب دے دی جائے تو نتیجہ غیر مفید اور برا نکل سکتا ہے، جیسا اس طالب علم نے کہا تھا کہ جیسا مجھے کہا جاتا ہے کہ یوں سمجھو کہ ممکن ہے واقع میں وہ جاہل اچھا ہو، ایسے ہی اس جاہل سے بھی تو کہنا چاہئے کہ یوں سمجھ کر ممکن ہے واقع میں ہر طرح تجھ سے میں بڑا ہوا ہوں، لھذا وہ مجھے سلام کرے، دیکھئے یہ وہی مقدمات ہیں جن کا حاصل یہ تھا کہ ہر شخص میں خوبیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ ان سے ایک طرح تو مفید اور نہایت کارآمد نتیجہ نکلا تھا اور انہی سے اسی ترتیب کے ساتھ ایسا برا اور مُضر نتیجہ نکلا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طالب علم نے وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو غلط ہے۔ غرض ہم لوگ دوسرے کو اپنے سے کم ثابت کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی برائی اس کی تلاش کر لیتے ہیں اور اس میں جو بھلائی ہوتی ہے اس پر نظر نہیں کرتے۔

ابتداء بالسلام نہ کرنے کی منشاء:

بجائے اس کے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنے عیبوں پر نظر ڈالو اور دوسروں کے ہنروں پر۔ اپنے اندر ہزار ہنر ہوں تو ان کو مت دیکھو اور ایک بھی عیب ہو تو اس کو دیکھو اور دوسرے میں ہزار عیب بھی ہوں تو ان کو مت دیکھو اور ایک بھی ہنر ہو تو اس کو دیکھو، نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنے آپ کو اس سے ہر حال

میں کم سمجھو گے اور اس کو خود سلام کرو گے تو کبر تمہارے پاس بھی نہیں آئے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر تم میں ہزار ہنر ہیں اور ایک عیب ہے تو اس طریقہ سے اس ایک عیب سے بھی نظر نہ چوکے گی اور کبھی نہ کبھی وہ عیب بھی تم میں سے نکل جائے گا اور تم سراپا ہنر ہو جاؤ گے۔ یہ طریقہ اچھا ہے یا وہ طریقہ اچھا ہے کہ دوسروں ہی کے عیبوں کو دیکھتے رہو اور اس میں پڑ کر اپنے عیب سے غافل رہو تا کہ دوسرے اور عیب بھی تم میں پیدا ہوتے جائیں اور رفتہ رفتہ سراپا عیب بن جاؤ، سمجھ دار اور عمل کرنے والے کے لئے ان ہی مقدمات میں سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے اور قیل وقال کرنے والے اور حجتیں چھاننے والے کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا کیونکہ یہی مقدمات وہ بھی پیش کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جس کو خود اصلاح منظور نہ ہو اس کو کیونکر سمجھایا جائے۔ غرض یہ آفت اور کج روی سب میں ہے، اہل علم بھی اس سے خالی نہیں بلکہ ان میں یہ مرض عوام سے زیادہ ہے۔ ہم خود اپنے آپ ہی کو کہتے ہیں کہ ہم ابتدا بالسلام نہیں کرتے اس کا منشاء ہی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا ہے یا راستے میں علو چاہتے ہیں جدھر کو نکلیں نظریں ہم پر اٹھ جاتیں، یہ سب بڑا بننا اور کبر ہی ہے۔

بعض کبر بصورت تواضع ہوتا ہے:

اور بعض اوقات راستے میں اس طرح دبے ہوئے اور جھکے ہوئے چلتے ہیں جن سے معلوم ہو کہ بڑے متواضع ہیں حالانکہ دل میں یہ ہوتا ہے کہ اسی متواضعانہ ہیئت کو دیکھ کر لوگوں کی نظریں ہماری طرف اٹھیں۔ یہ ایک کبر دقیق ہے اس کا پتہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ کے ایک مقولے سے چلا، فرمایا تھا کہ بعض کبر بصورت تواضع ہوتا ہے جیسا کہ بعض متصنعین میں دیکھا جاتا ہے کہ جب کسی مجمع میں پہنچے تو صف نعال میں بیٹھ گئے، اس کے سوا کوئی جگہ ہی نہیں اختیار کرے، لوگ جانتے ہیں کہ یہ فلاں شخص ہیں یا وضع قطع اور صورت وشکل سے بھی سفید پوش اور شریف پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں، پڑھے لکھے کی صورت چھپتی نہیں ہے اب لوگ اصرار کرتے ہیں کہ حضرت یہاں تشریف لائیے صدر مقام پر بیٹھئے آپ کہاں بیٹھ گئے، ہم سب کو شرمندہ کر دیا، یہ جگہ آپ کے بیٹھنے کی نہیں۔ آپ کو خدا تعالیٰ نے بڑا رتبہ دیا ہے مگر یہ ہیں کہ جوں جوں اصرار ہوتا جاتا ہے اور اسی جگہ پر جمے جاتے ہیں اور نہایت عاجزی سے کہتے ہیں کہ بھائی میں تو اس جگہ کے بھی قابل نہیں، من آنم کہ من دانم (میں اپنے آپ کو خوب جانتا ہوں) سفید کپڑوں کو یا ظاہری تقدس کومت دیکھو، اندر تو میرے سارے عیب ہی بھرے ہوئے ہیں۔ (سچ کہتا ہے واقعی سارے عیب ہی بھرے ہوئے ہیں کیونکہ ام العیوب یعنی کبر موجود ہے) کتنا ہی کہئے مگر وہ اپنی جگہ سے

نہیں ہٹتے بلکہ اور نیچے کو کھسکتے جاتے ہیں، یہ وہی کبر ہے جس کو مولانا نے فرمایا کہ بعض کبر بصورت تواضع ہوتا ہے، صورت تو ایسی کہ بالکل سراپا متواضع معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگ ہم کو متواضع سمجھیں اور اس طرح ان کے دلوں میں ہماری وقعت اور بڑائی آ جائے تو بڑائی مقصود ہوئی نہ تواضع یہ کبر بڑا خطرناک ہے۔ یہ اس کبر سے اشد ہے جو بعض دنیاداروں میں ہوتا ہے کہ کھٹ پٹ کرتے ہوئے آئے اور سب سے اونچی جگہ بیٹھ گئے، یہ بھی کبر ہے مگر دونوں میں فرق ہے اس سے نیچے بیٹھنے والے کا کبر اشد ہے کیونکہ وہ چھپا ہے اور یہ ظاہر ہے اس تپ دق اوپر کے بخار سے زیادہ خطرناک ہے۔ دوسرے اس لئے اشد ہے کہ یہ فعل صف نعال میں بیٹھ جانا اور تواضع کی صورت اختیار کرنا محمود عند الناس ہے اس سے زیادہ رفعت حاصل ہونے کی امید ہے اور اسی واسطے اس کو اختیار کیا جاتا ہے اور اس شخص کی وضع جو کہ خود آ کر اونچی جگہ پر بیٹھ گیا ہے لوگوں کے نزدیک بھی محمود نہیں اس سے اتنی رفعت حاصل ہونے کی امید نہیں جتنی اس میں تھی تو یہ بڑا ہوا اس سے اور ایک وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنی وضع قائم رکھنے کے لئے اپنے بھائی کا کہنا نہ مانا یہ صف نعال میں دوسروں کی دل شکنی کر کے اس لئے بیٹھتا ہے کہ اپنی وضع میں فرق نہ آ جائے۔

حقیقی تواضع:

کوئی یوں نہ کہے کہ یہ تو فرش پر بیٹھنے والے تھے کرسی پر کیوں بیٹھ گئے۔ یہ شخص آن پرست بعض لوگوں کو وضعداری میں اس قدر غلو ہوتا ہے کہ اس کے لئے رقمیں خرچ کرتے اور دقتیں اٹھاتے ہیں مگر اپنی وضع میں فرق نہیں آنے دیتے۔ حقیقت اس کی محض کبر ہے کہ ہم اتنے بڑے ہیں کہ کوئی ہم سے ہماری وضعداری نہیں چھڑا سکتا۔ یہ سب شیطانی دھندے ہیں۔ وضع کیا چیز ہے اور قطع کیا چیز ہے اور آن کیا چیز ہے اپنے آپ کو اتنا بڑا ہی کیوں سمجھے کہ اس کے لئے کوئی خاص وضع مقرر ہو بندہ کا حق تو یہ ہے کہ جس وردی اور جس وضع میں سرکار رکھیں اسی میں رہے اپنی رائے اور ارادے کو بالکل فنا کر دے، ادنیٰ حالت میں رکھیں تو ادنیٰ حالت میں رہیں اور اعلیٰ حالت میں رکھیں تو اعلیٰ حالت میں رہیں، نہ اعلیٰ کو خود اختیار کرے نہ ادنیٰ کو۔ یہ ہے تواضع حقیقی۔

بنی اسرائیل پر نزول من وسلویٰ کا واقعہ:

ورنہ پھر یوں کہنا چاہئے کہ بنی اسرائیل بڑے متواضع تھے کہ انہوں نے ایک اعلیٰ درجہ کے کھانے کو چھوڑ کر ادنیٰ درجہ کے کھانوں کو اختیار کیا تھا، ان پر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے من و

سلویٰ اتارا تھا اور یہ وہ اعلیٰ درجہ کی غذا ہے کہ بڑے اس کو شیرینی ترنجبین کی ملتی تھی اور نمکین غذاؤں کا گوشت ملتا تھا اور لطف یہ کہ یہ چیزیں خود بخود ان کے پاس آجاتی تھیں ان کو کچھ خرچ کرنے اور محنت و مشقت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کیسی اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے بطور امتنان کے متعدد جگہ فرمایا ہے وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى (اور ہم نے تم پر من وسلویٰ نازل کیا) مگر انہوں نے اس حالت کو پسند نہیں کیا اور یہ کہ لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا یعنی ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے، خدا تعالیٰ سے کہئے کہ ہمارے واسطے کچھ سبزئیں زمین سے پیدا کرے جیسے ترکاریاں اور کھیرے اور گیہوں اور مسور اور پیاز تو ان کے اس فعل کو بھی تواضع کہنا چاہئے کیونکہ انہوں نے اعلیٰ چیز کو چھوڑ کر ادنیٰ کو اختیار کیا جیسے وہ صف نعال میں بیٹھنے والا باوجود لوگوں کے اصرار کے ادنیٰ جگہ کو اختیار کرتا رہے مگر دیکھئے اس کی نسبت ان کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کیا فرماتے ہیں قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَيْرٌ یعنی فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا بدلتے ہو تم ایک اعلیٰ درجہ کی چیز کو ادنیٰ درجہ کی چیز سے، یہ بطور انکار کے فرمایا معلوم ہوا کہ ان کا یہ فعل پسند نہیں ہوا حالانکہ سب جانتے ہیں کہ تواضع یا زہد صفت محمود ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر انکار فرما رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کا یہ فعل تواضع اور زہد میں داخل نہ تھا ورنہ آپ اس پر کیوں انکار کرتے۔ پیغمبر سے زیادہ تو کوئی صاحب بصیرت نہیں ہوسکتا، اس سے صاف معلوم ہوا کہ بعض وہ فعل بھی جو صورتاً تواضع بھی ہوتا ہے بنی اسرائیل کے اس سوال کے الفاظ ہی بتلا رہے ہیں کہ یہ زہد اور تواضع نہ تھا بلکہ ایک شرارت اور حق تعالیٰ کی نعمت سے اعراض تھا۔ دیکھئے پیغمبر کے سامنے کہتے ہیں لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ یعنی ہم سے یہ ہرگز نہ ہوگا کہ ایک ہی کھانے پر بس کریں اگر یہ تواضعاً کہا جاتا تو اس کے لئے ایسے الفاظ ہوتے کہ حضرت ہم اس قیمتی اور اعلیٰ غذا کے قابل نہیں ہیں، ہمارے نفس اس سے پھول جائیں گے اس لئے خدا تعالیٰ سے دعا فرمادیجئے کہ ہمیں کوئی اور چیز دیں جو ہماری حیثیت کے لائق ہو لیکن نہیں انہوں نے بجائے عاجزی کے کلمات کے ایک نہایت سخت لفظ کہا جس میں تمرد (سرکشی) پایا جاتا ہے کہ ہم ہرگز ایسا نہیں کریں گے کہ ایک ہی کھانا کھاتے رہیں۔ تواضع تو عبودیت کا شعبہ ہے جس کو عجز و نیاز لازم ہے عاجزانہ الفاظ ایسے نہیں ہوتے۔ غرض یہ فعل تواضع نہ تھا، اسی واسطے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس فعل پر انکار کیا اور آگے دیکھئے حق تعالیٰ کی طرف

سے اس پر کیا انعام ملا، فرماتے ہیں وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَبَآءُ وُ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ یعنی ان کے لئے مقرر کر دی گئی خواری اور محتاجی اور انہوں نے خدا تعالیٰ کا غضب اپنے اوپر لیا، یہ اس تواضع کا انعام ملا حالانکہ تواضع تو بڑی چیز ہے جس کا صلہ یہ ہے من تواضع لله رفعه الله (مشکوٰۃ المصابیح :۵۱۱۹) یعنی جو کوئی تواضع اختیار کرتا ہے اس کو حق تعالیٰ رفعت اور بلندی دیتے ہیں اور یہاں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کو ذلت اور پستی دی گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ فعل ان کا تواضع تھا ہی نہیں۔ لیجئے خود حق تعالیٰ کے قول سے اس مقولہ کی تصدیق ہو گئی کہ بعض تواضع حقیقت میں تکبر ہوتا ہے تکبر اور عبودیت دو متضاد چیزیں ہیں اگر عبد بننا ہے تو اپنی رائے کو چھوڑ دینا چاہئے یہ بھی اپنی رائے ہے کہ ایک وضع اختیار کر لی ہے جس کو کوئی چھڑا ہی نہیں سکتا یہ تواضع نہیں ہے علیٰ ہذا البعضوں نے زہد کو اپنی وضع بنایا ہے کہ کھانے کی کوئی چیز چھوڑ دی ہے۔

مثلاً اناج نہیں کھاتے یہ بھی صورتاً زہد ہے اور حقیقت میں وہی تکبر ہے جس سے صرف یہ مقصود ہے کہ شہرت ہو کہ شاہ صاحب ایسے کامل ہیں کہ دنیا سے کچھ تعلق ہی نہیں رکھتے، حتیٰ کہ اناج نہیں کھاتے ایسی ضروری اور محبوب چیز کو خدا تعالیٰ کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

زہد کی حقیقت:

صاحبو! غور سے دیکھئے تو شاہ صاحب نے اناج کو خدا تعالیٰ کے لئے نہیں چھوڑا بلکہ نفس کے لئے چھوڑا ہے تا کہ یوں کہا جائے کہ شاہ صاحب بڑے کامل زاہد ہیں یہ حب جاہ ہے جو امراض میں سے ہے۔ یہ زہد نہیں ہے جو عملاً کمالات میں سے ہے۔ زہد کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا نعمت دے اور اس کو استعمال نہ کرے۔ دیکھئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خلق لکم ما فی الارض جمیعا یعنی خدا تعالیٰ نے تمہارے واسطے وہ سب چیزیں پیدا کیں جو زمین میں ہیں، یہ کیسی عبودیت ہے کہ خدا تعالیٰ تو فرمادیں کہ یہ چیزیں تمہارے واسطے ہیں اور تم ان سے منہ پھیر لو، ایسے شخص کو جو اناج نہیں کھاتا یہ چاہئے کہ اس آیت کی تفسیر میں ایک استثناء بڑھاوے الا اناج کہ اور سب چیزیں تو پیدا کی ہیں ہمارے واسطے مگر اناج یہ اچھی عبودیت ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں بھی اصلاح کی نوبت آ گئی۔ حضرت عبودیت کا خلاصہ اپنی رائے کو فنا کر دینا ہے اور اپنی رائے کو کچھ سمجھنا یہ عبودیت کی ضد اور تکبر ہے۔ بس بندہ کی شان تو یہ ہے کہ کسی بات میں بڑا بنے ہی نہیں، بلکہ جس چیز میں ذرا سا بھی تکبر پائے اس سے دور بھاگے۔ اگر ململ پہننے سے تکبر ہوتا ہے تو وہ نہ پہنے اور گاڑھا پہننے سے تکبر ہوتا ہے تو وہ نہ پہنے۔ کبھی گاڑھا پہننے سے بھی تکبر ہوتا ہے اور وہ تکبر اس

تکبر سے گاڑھا ہوتا ہے جو ململ سے ہوتا ہے جیسا ململ پتلا ہے ایسا ہی اس کا تکبر بھی پتلا ہوتا ہے یہاں گاڑھا پہننے سے مقصود یہ ہے کہ لوگ یوں کہیں کہ شاہ صاحب بڑے متواضع ہیں، بڑے زاہد ہیں اور اس سے شاہ صاحب کا نفس پھولنے لگے، میں سچ کہتا ہوں کہ اس وقت گاڑھے سے وہ ململ ہی اچھی ہے اس وقت یہ گاڑھا حق تعالیٰ کو پسند نہیں، ململ پسند ہے۔

مخفی تکبر: خلاصہ یہ کہ ایک کبر بشکل کبر ہوتا ہے اور ایک کبر بشکل تواضع ہوتا ہے اور یہ اہل علم میں زیادہ ہوتا ہے اور یہ ایسا مخفی کبر ہے کہ اس کا پتہ دوسروں کو تو کیا صاحب مرض کو بھی نہیں چلتا، عوام تو علماء کے ساتھ ایسا عقیدہ رکھتے ہیں کہ علم کا نام آتے ہی ان کی ہر بات کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں اور یہ عالم صاحب حقیقت سے ناآشنا اور افعال کی صورت اچھی پا کر مطمئن ہیں کہ ہم عالم باعمل ہیں، تواضع ہم میں موجود ہے، زہد ہم میں موجود ہے، حالانکہ نہ تواضع ہے نہ زہد صرف تکبر ہی تکبر ہے اگر کسی حقیقت شناس کے پاس بیٹھتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ کیا ہے؟ کچھ تو یہ خود اس غلطی میں مبتلا ہیں اور کچھ لوگوں کے منہ سے تعریف سن سن کر ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ کوئی بات تو ہے جو ہماری تعریف کی جاتی ہے۔ غرض سرتاپا مریض ہو گئے اور مرض کے ساتھ خدر یعنی سن کر مرض بھی ہو گیا کہ مرض کا حس باقی نہیں رہا بلکہ حس الٹا ہو گیا کہ مرض کو صحت سمجھنے لگے۔

علماء کی خیر خواہی نفس:

یہی وجہ ہے کہ آج کل اس بات کو علماء کے کمالات سمجھا جاتا ہے، اگر کوئی غلطی ہو جاوے تو اس سے علی الاعلان رجوع نہ کیا جاوے، اس کی ہمت نہیں ہوتی بلکہ ایک تاویل سے اخفاء کی ضرورت ذہن میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر علی الاعلان رجوع کیا جاوے گا تو عوام کے ذہن سے ہماری وقعت اٹھ جائے گی اور ان کے ذہن میں یہ بات آ جائے گی کہ ان کو کچھ علم نہیں ہے اور آئندہ کے لئے ہمارے فتوے کا اعتبار نہ کریں گے، پھر شریعت کا حکم ان کو کیسے معلوم ہوگا اور ہدایت کیسے ہو سکے گی۔ گویا مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ ہیں کہ ان کو علم سے محروم رکھنا نہیں چاہتے۔ میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ یہ مسلمانوں کی خیر خواہی نہیں ہے بلکہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ اپنے نفس کی خیر خواہی ہے۔ فقط یہ منظور ہے کہ ہماری وقعت اور جاہ میں فرق نہ آوے اور ہم بڑے بنے رہیں۔

باطل کی نصرت جائز نہیں:

اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اپنے ایک بزرگ سے غلطی ہو گئی ہو اور ان کو واضح بھی

ہو گیا ہو کہ یہ غلطی ہوئی ہے لیکن معتقدین اس کو غلطی نہیں کہتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اس کا ثواب ہونا ثابت کر دیں اور بات بنے یا نہ بنے مگر اس کی پروش کئے جاویں گے اور اس غلطی کی پرورش کو بزرگوں کی نصرت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ نصرت جائز نہیں، نصرت حق کی چاہئے نہ کہ باطل کی۔ یاد رکھو کہ ایک غلطی تو وہ ہوئی جوان بزرگ سے ہوئی تھی اور دوسری غلطی یہ ہے کہ آپ اس کو نباہ رہے ہیں اور یہ آپ کی غلطی اشد ہے پہلے غلطی سے، کیونکہ وہ نادانستگی سے ہوئی اور یہ دیدہ دانستہ ہے یا یہ کہو کہ وہ خطا ہے اور یہ عمد، اور غور کیا جاوے تو در حقیقت یہ ان بزرگ کی نصرت ہے ہی نہیں بلکہ ان پر کبر کی حمایت ہے، حقیقت اس کی یہ ہے کہ نفس رائے دیتا ہے کہ اگر اپنے بزرگ کی غلطی تسلیم کرو گے تو اس سے اپنی حماقت ظاہر ہو گی کیونکہ سننے والے کہیں گے کہ یہ بھی اچھے شخص کے معتقد ہیں جس سے ایسی ایسی غلطیاں ہوتی ہیں، بس یہ حقیقت اس نصرت کی کہ نفس نسبت الی الحماقت سے بچنا چاہتا ہے مگر اس کے واسطے یہ مقدمات سوجھاتا ہے کہ وہ بزرگ ہیں، ان کی نصرت خدام کے ذمہ ہے۔ ایک ادنیٰ مسلمان کی نصرت بھی مسلمان کے ذمہ حق ہے چہ جائیکہ ایک بڑے بزرگ کی، یہ دھوکہ ہے......

نفس، نسبت الی الحماقت سے بچنا چاہتا ہے:

نفس کا کہ ایک بڑی بات کو ایسی اچھی صورت پہنا دی گئی ہے مگر حقیقت اس کی وہی ہے کہ نفس نسبت الی الحماقت سے بچنا چاہتا ہے اور ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے اس واسطے یہ الٹی سیدھی ہانکے جاتے ہیں، کیا ٹھکانا ہے اس دھوکہ کا کہ بڑا گہرا دھوکہ ہے اور بہت سی تہوں میں لپٹا ہوا کبر ہے اسی واسطے کسی جاننے والے نے کہا ہے کہ سب سے بڑا مولوی نفس ہے کہ کیسی کیسی دور کی سوچتا ہے اور کتنی دور سے پکڑتا ہے۔ یہ دو واقعے میں نے بطور مثال کے بیان کئے ہیں ورنہ سینکڑوں امور میں یہی بات ہے کہ ظاہر میں صورت اچھی ہے کہیں تواضع ہے، کہیں زہد ہے، کہیں نصرت ہے، کہیں ایثار ہے، کہیں نصیحت اور ہدایت ہے لیکن حقیقت ان کی کچھ بھی نہیں ہے سوائے کبر کے مگر افسوس کہ ان لوگوں میں حتیٰ کہ علماء میں بھی حس نہیں رہا کیونکہ سر سے پاؤں تک اسی میں مبتلا ہیں اور کبر طبیعت ثانیہ بن گیا ہے جب اس کا حس ہی نہیں رہا تو علاج کی طرف توجہ کیسے ہو، مگر میں پھر بھی بتائے دیتا ہوں کہ اس کا علاج کچھ نہیں ہے سوائے ایک بات کہ اور وہ بات یہ ہے: ؎

نفس نتواں کشت الا ظل پیر دامن آں نفس کش را سخت گیر

”نفس نہیں فنا ہو سکتا ہے جب تک پیر کا دامن نہ پکڑے اس نفس کو مارنے والے کا دامن

خوب مضبوط پکڑے تاکہ جب اس پر ڈانٹ بھی پڑے تب بھی نہ چھوڑے۔''

مگر یہ بھی یادرکھئے کہ سایہ میں آنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دھوپ میں سے ہٹ کر اس کے سایہ میں کھڑے ہوجاؤ بلکہ اس کے معنی ہیں اس سے تعلق پیدا کرنا اور اس کا اتباع کرنا تاکہ اس کے اخلاق کا اثر تم پر پڑے۔ صاحبو! صحبت اور تعلق کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ سائنس سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ نفس میں مسارقت کا مادہ ہے یعنی دوسرے سے اثر لینے کا (مسارقت سرقہ سے مشتق ہے سرقہ کے معنی ہیں چوری چوری کے نام سے نہ چونکئے گا چوری دو طرح کی ہوتی ہے جائز اور ناجائز۔ جائز چوری میں کچھ حرج نہیں۔ غرض نفس چوری کرتا ہے یعنی جس سے اس کو تعلق وارتباط اور محبت ہو، دزدیدہ اس کے اخلاق اپنے اندر لے لیتا ہے، اگر اچھے ہیں تو اچھے اور برے ہیں تو برے۔

دوستی کے بارے میں ضرورت احتیاط:

یہی راز ہے اس حدیث کا المرء علی دین خلیله فینظر من یخالله (سنن الترمذی: ۲۳۷۸) یعنی آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے تو چاہئے کہ ہر شخص غور کرلیا کرے کہ میں کسی سے دوستی کررہا ہوں، اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوست کا اثر دوست کے دین پر ضرور پڑتا ہے اور یہ بات واقعات سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ کفار میں بہت سے آدمی ایسے بھی ہیں جو اسلام کو حق جانتے ہیں لیکن اپنے ملنے والوں اور دوستوں کے شرم ولحاظ سے مسلمان نہیں ہوتے۔ دیکھئے ان کی دوستی نے ان کو دین سے باز رکھا تو یہ سچ ہوا کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، ایسے واقعات بہت ہیں اور بہت جگہ ایسا ہوا ہے کہ ایک مسلمان کسی بددین کے پاس اٹھتا بیٹھتا رہا اور اس پر یہ اثر ہوگیا کہ نعوذ باللہ مرتد ہوگیا۔ غرض یہ بالکل سچا مضمون ہے صحبت کے بارے میں بڑی احتیاط کرنی چاہئے۔ آدمی کبھی یہ نہ سمجھے کہ میرے اوپر کیا اثر ہوسکتا ہے، ضرور اثر ہوتا ہے اور اس طرح سے ہوتا ہے کہ خبر بھی نہیں ہوتی۔

صحبت میں ہمیشہ متبوع کا اثر ہوتا ہے:

اس پر ایک شخص نے ایک دفعہ اشکال کیا کہ جب صحبت میں یہ اثر ہے کہ ہر شخص میں دوسرے کے اخلاق آجاتے ہیں تو جب ایک نیک اور ایک بد کی باہم صحبت ہوگی تو بد کے اخلاق بھی نیک کی طرف متعدی ہوں گے اس لئے نیک کو بد سے بچنا ضروری ہوا اور بد کو صحبت نیک حاصل کرنے کا حکم ہے تو دونوں کا اجتماع کیونکر ہوگا، حاصل یہ ہوا کہ نیک کو تو حکم ہے بد سے الگ رہنے کا اور بد کو حکم ہے

صحبت نیک اختیار کرنے کا تو اس صحبت کے حاصل ہونے کی صورت کیا ہے؟ میں نے کہا واقعی بے ڈھب شبہ ہے مگر اسی وقت دل میں جواب آ گیا جس سے شبہ حل ہو گیا اور یہ بات تجربہ اور واقعات کے دیکھنے سے ماخوذ ہے وہ یہ کہ صحبت کا اثر ہونے کے لئے تابعیت شرط ہے یعنی متبوع کا اثر ہوا کرتا ہے تابع پر نہ کہ تابع کا متبوع پر، یہ ہے قاعدہ کلیہ اور یہی مدار ہے صحبت نیک کے حکم کا اور صحبت بد سے ممانعت کا حاصل یہ ہوا کہ بد کے پاس تابع ہو کر نہ جاؤ چنانچہ امرکی صحبت سے جو اہل اللہ نے بہت اہتمام کے ساتھ منع کیا ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ان کو مقصود بنا کر ان کے پاس نہ جاؤ اگر اس طرح جانا ہو کہ ان کو مقصود نہ بنایا جاوے اور ان کے تابع نہ بننا پڑے تو کچھ حرج نہیں۔ مثلاً وعظ و نصیحت کے لئے یا کسی معاملہ کے لئے مثلاً اپنی کوئی چیز جیسے مکان یا جائیداد وغیرہ بیچنا ہو اس کے لئے جانا ممنوع نہیں کیونکہ یہ ان کو مقصود بنانا نہیں ہے اس میں ضرر نہ ہوگا۔

امراء کی صحبت کی خاصیت:

مگر میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ یہ بھی جب ہے کہ وہاں جا کر کسی قسم کی بھی تابعیت پیدا ہو جانے کا خوف نہ ہو کیونکہ امراء کی صحبت میں اکثر ایک زہریلا مادہ ہوتا ہے کہ وہاں جا کر ہر شخص کو تابع بننا پڑتا ہے اور اس کی ہاں میں ہاں ملانا پڑتی ہے اگر ذرا بھی اس بات کا خوف ہو تو اس شخص کو جو اپنے قلب کی محافظت کرنے والا ہے ایسی جگہ نہ جانا ہی بہتر ہے۔ یہ بات اہل علم کو خصوصاً خوب یاد رکھنی چاہئے۔ بعض وقت امراء اہل علم کو اس طرح بلاتے ہیں کہ علماء کو تابع بنانا نہیں چاہتے بلکہ متبوع بنا کر بلاتے ہیں مثلاً وعظ کہنے کے لئے بلاتے ہیں یا دعوت کرتے ہیں اور ادب و اکرام کے ساتھ بلاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں آدمی تابع نہیں بنتا اور ظاہراً کچھ حرج نہیں معلوم ہوتا لیکن میں اہل علم کو مشورہ دیتا ہوں کہ اس معیار کو پیش نظر رکھیں اور خوب غور سے کام لیں کہ وہاں جا کر ہمیں کسی بات میں دبنا تو نہ پڑے گا اور کسی بات میں ہاں میں ہاں تو ملانا نہ پڑے گی اور کسی بات میں مداہنت اور سکوت عن الحق تو کرنا نہ پڑے گا، اگر ذرا بھی اس بات کا اندیشہ ہو خواہ اس امیر کے جبروت اور سطوت کی وجہ سے یا اپنے ضعف قلب کی وجہ سے تو ہرگز نہ جائیں اور اگر باطل اطمینان ہو کہ اس میں کوئی بات پیش نہ آئے گی تو مضائقہ نہیں مگر اس کے ساتھ اتنا میں پھر بھی کہے دیتا ہوں کہ گو ہر طرح کا اطمینان ہو لیکن پھر بھی امیر کی صحبت ان مفاسد سے خالی نہیں ہوتی۔ الا ماشاء اللہ، غرض میری رائے یہ ہے کہ اہل علم کو اس میں نرمی نہیں برتنی چاہئے اور ہر قسم کے اطمینان کی صورت میں بھی امراء کی صحبت میں تقلیل ضرور چاہئے کیونکہ امراء کی صحبت میں خاصیت ہے متبوعیت کی یعنی

ہر شخص کو تابع بنا لینے کی اور جب آدمی تابع بن گیا تو حسب قاعدہ مذکورہ نفس مسارقت ضرور کرے گا اور اس کے اخلاق کا تعدیہ ضرور ہوگا۔ بحمد اللہ اب وہ اشکال حل ہو گیا کہ صحبت نیک کیسے حاصل ہو جبکہ نیک کو بھی حکم ہے صحبت بد سے بچنے کا حاصل حل کا یہ ہوا کہ نیک آدمی بد کا تابع ہو کر نہ رہے تو صحبت بد اس کو مضر نہیں نہ اس سے بچنے کا حکم ہے بلکہ طالب اصلاح کو چاہئے کہ خود تابع بنے اور اس کو متبوع بنا دے یہ تو اشکال درمیان میں آ گیا تھا اصل بیان یہ تھا کہ صحبت ضرور موثر ہے اور یہ بات سائنس سے بھی ثابت ہے تو اگر اپنے اخلاق کی اصلاح کرنا ہے تو کسی ایسے شخص کی صحبت اختیار کیجئے جو اخلاق حمیدہ رکھتا ہو اور اس سے تعلق پیدا کیجئے اور اس کا اتباع کیجئے یہ ہے علاج جس سے برے اخلاق دور ہوتے ہیں اور اچھے اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور نرے پڑھنے پڑھانے سے یہ کام بھی نہیں ہو سکتا۔

صحبت عجب چیز ہے:

صحبت عجب چیز ہے، صحبت جب شرائط کے ساتھ یعنی مع قصد تابعیت پائی جاوے تو ضرور موثر ہوتی ہے تجربہ کر لیجئے کہ ایک غصیار آدمی جو بات بات پر لوگوں سے لڑتا ہو چند روز ایک حلیم اور بردبار آدمی کے پاس بیٹھے تو اس میں حلم پیدا ہو جائے گا یا اس کے برعکس ایک حلیم اور سرد مزاج آدمی کسی غصیارے آدمی کے یا کسی حکومت والے کے پاس چند روز بیٹھے تو اس میں ضرور کچھ نہ کچھ تیزی اور گرمی پیدا ہو جائے گی۔ حیاء دار آدمی کے پاس بیٹھنے سے حیا اور بے حیا آدمی کے پاس بیٹھنے سے بے حیائی اور بک بک کرنے والے کے پاس بیٹھنے سے بک بک کرنا اور فضول گوئی اور خاموشی اور باوقار آدمی کے پاس بیٹھنے سے سکوت اور وقار پیدا ہوتا ہے۔ یہ آثار صحبت سے پیدا ہوتے ہیں اتنے لکھنے پڑھنے اور کتابوں کو دیکھنے سے نہیں ہوتے اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب میں تو ایک مضمون دیکھا جو اس وقت ذہن میں آ گیا پھر جاتا رہا اور صحبت میں واقعات پیش آتے ہیں جس سے اس کا استحضار بار بار ہوتا ہے مثلاً حلیم شخص کے پاس بیٹھو گے تو بار بار اس کو صبر و تحمل کرتے دیکھو گے اور اس کے فوائد بھی دیکھو گے اور متعدد مرتبہ اس کا استحضار ہوگا تو تم بھی صبر کرنے لگو گے یہ فرق ہے نرے صحبت اور علم میں یہاں وہ لفظ پھر یاد رکھئے کہ صحبت کا اثر جب ہی ہوتا ہے جبکہ اس شخص کو جس کی صحبت اختیار کی ہے متبوع بناؤ نرا پاس آنا جانا کافی نہیں اس کو میں نے کہا تھا کہ پیر کے سایہ میں آنے کے معنی یہ نہیں کہ دھوپ سے اٹھ کر اس کی چھاؤں میں آ جائے بلکہ اس سے تعلق پیدا کرنا اور اس کے اتباع کا قصد کرنا مراد ہے۔ یہ مطلب ہے ظل پیر کا اس کا اثر اس طرح ہوتا ہے کہ جب تم نے اس کو بڑا سمجھا اور متبوع بنایا اور اپنے آپ کو تابع بنایا اور وہ علوم میں بھی کامل ہے اور عمل میں بھی

تو اس کے پاس رہنے سے علوم کان میں پڑیں گے مثلاً غصہ کا علاج معلوم ہوگا کہ جب غصہ آوے تو آدمی کو چاہئے کہ وہاں سے ٹل جاوے اس سے جوش فرو ہو جاتا ہے یا یہ کہ غصہ کسی کا خطاوار ہو۔ یہ خیال آتے ہی غصہ فرو ہو جائے گا یہ نکتے کان میں پڑیں گے اور وقت پر رہبری کریں گے جب بار بار یہ باتیں کان میں پڑیں گی تو کہاں تک اثر نہ ہوگا ایک وقت چوکو گے دو وقت چوکو گے تیسری دفعہ تو اصلاح ہو ہی جائے گی اور چند روز میں انشاء اللہ غصہ کے روکنے کی قدرت حاصل ہو ہی جائے گی۔

صحبت اہل اللہ کی قوت جاذبہ:

یہ سب تو ظاہری ہے اہل اللہ کے پاس رہ کر اصلاح ہونے کا کہ ان کی صحبت میں اچھی اچھی باتیں کان میں پڑتی رہیں گی اور کبھی نہ کبھی اثر کریں گی۔ ایک سبب باطنی بھی ہے وہ یہ کہ جب تم ان کے پاس رہو گے اور تعلق بڑھالو گے تو ان کو تم سے محبت ہو جائے گی تو ان سے دو طرح اصلاح ہوگی ایک تو یہ کہ وہ دعا کریں اور ان کی دعا مقبول ہوتی ہے تو حق تعالیٰ تم پر فضل فرماویں گے اور اکثر یہ کہ ان کی دعا باذن حق ہوتی ہے تو ان کے منہ سے دعا نکلنا اس بات کی علامت سمجھنا چاہئے کہ حق تعالیٰ کے فضل ہونے کا وقت ہی آ گیا۔ دوسری وجہ بڑی خفی ہے وہ یہ کہ تمہارے اعمال میں ان کی محبت سے برکت ہوگی اور جلد جلد ترقی ہوگی جو کام چار دن میں ہوا ایک دن میں ہوگا اور بہت جلد اصلاح ہو جائے گی۔ یہ ایسی بات ہے جس کو سائنس والے نہیں سمجھ سکتے لیکن اگر وہ چاہیں تو بہت آسانی سے سمجھ بھی سکتے ہیں۔ یہ لوگ ہر بات میں نظیر مانگا کرتے ہیں دلیل سے، ان کی سمجھ میں بات نہیں آتی۔ اس کی نظیر بھی لیجئے وہ یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مقناطیس میں ایک قوت جاذبہ ہے جس سے وہ لوہے کو کھینچ لیتا ہے ہم کو اس کی کنہ بتلانے کی کوئی ضرورت نہیں، ہم ایسے نظیر دیتے ہیں جو ان کے ہاتھوں میں موجود ہے اس کی وجہ وہ خود بھی نہیں بیان کر سکتے مگر اس قوت جاذبہ کا انکار نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے سامنے موجود ہے بس یہی قوت جاذبہ اہل اللہ کے قلب میں ہے جو طالب کو ان سے تعلق رکھنے والے کو ایسا ہی کھینچ لیتی ہے جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتا ہے اب باطنی برکت کا بیان اہل سائنس کی سمجھ کے موافق بھی ہو گیا یعنی ان کے قلب میں ایک قوت کشش ہے جو طالب کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ان کا قلب حق تعالیٰ سے ملا ہوا ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ طالب کے کل کو ان کی صحبت اور تعلق سے حق تعالیٰ کا قرب ہو جاتا ہے اور ان کی صحبت سے نفع ہونے کے چار سبب ہوئے ان کے پاس جا کر علوم نافعہ کا کان میں پڑنا، ان کے افعال کی تقلید کرنا، ان کی دعا، ان کی برکت، جس کو میں نے سبب خفی کہا تھا اور جس کا بیان بحمد اللہ بقدر ضرورت ہو گیا۔ اہل اللہ کے پاس

رہنے سے ان چار صورتوں سے اثر ہوتا ہے یہ بات کسی اور طرح حاصل نہیں ہو سکتی اس واسطے کہا تھا:

نفس نتواں کشت الاظل پیر

(نفس اس وقت تک فنا نہیں ہوتا جب تک پیر کا دامن نہ پکڑ لے)

صحبت شیخ کیوں ضروری ہے:

مولانا نے حصر کر دیا ہے اصلاح کو صحبت شیخ میں اور بالکل سچی اور واقعی بات ہے کہ اصلاح بدون کسی کو بڑا بنائے ہوئے نہیں ہو سکتی، بہت سے پڑھے لکھے اور دیندار لوگ بھی اس بات میں غلطی پر ہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ بس کتابوں کا پڑھ لینا اور مطالعہ میں رکھنا اصلاح کے لئے کافی ہے۔ یاد رکھو کہ اور کتابیں تو کیا وہ کتابیں بھی جو اسی فن اصلاح اخلاق کی ہیں جیسے احیاء العلوم وغیرہ ان سے بھی اصلاح نہیں ہوگی جب تک کسی کے ماتحت نہیں بنو گے اور جب تک کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ ہوگا اور جب تک کوئی یہ کہنے والا نہ ہوگا کہ تم بڑے نالائق ہو یہ حرکت کیوں کی۔ یاد رکھو محض ایک بات کی برائی معلوم ہو جانے سے وہ بات چھوٹ نہیں جاتی۔ دیکھو شرابی شراب پیتا ہے حالانکہ جانتا ہے شراب بری چیز ہے مگر اس جاننے سے شراب چھوٹتی نہیں۔ ہاں اس سے چھوٹتی ہے کہ کوئی اس سے بڑا اس پر مسلط ہو اور جب یہ شراب پئے تو تھوڑی گوشمالی کر دیا کرے اس میں اثر ہے اور اس میں نہیں دیکھئے شراب جس کو پینے والا خود بھی برا جانتا ہے بدون کسی بڑے کے دباؤ کے نہیں چھوٹتی تو وہ برائیاں جن کی برائی خود فاعل کو بھی معلوم نہیں ہے وہ بغیر دوسرے کی روک ٹوک کے کیسے چھوٹ سکتی ہیں اور وہ صفحات جن کا اختیار کرنا نفس پر بہت شاق ہے نفس ان کا خوگر بدون دباؤ کے کیسے ہو سکتا ہے جیسے تواضع جس کا ذکر ہو رہا تھا کیونکہ تواضع کے معنی چھوٹا بننے کے ہیں۔ آدمی چھوٹا بننا کبھی گوارا نہیں کرتا تو جب تک کوئی بڑا اس پر مسلط نہ ہو یعنی معنی ہیں ماتحت ہونے کے اس وقت تک تواضع پیدا نہیں ہو سکتی۔ غرض نرے علم سے اصلاح نہیں ہو سکتی۔ بار بار نگرانی کرنے اور عادت ڈالنے سے ہوتی ہے اور عادت بدون دوسرے کو بڑا بنائے ہوئے نہیں ہو سکتی۔

تکبر تمام اخلاق ذمیمہ کا اصل الاصول ہے:

اور اصل الاصول تمام اخلاق ذمیمہ کی کبر ہے اور اس کے شعبے اس قدر مخفی ہیں کہ بڑے بڑے علم والوں کو بھی پتہ نہیں چلتا جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ بہت سے لوگوں میں کبر بصورت تواضع ہوتا ہے اور اس وصف میں اہل علم زیادہ حصہ رکھتے ہیں اور دیا سلائی کے مصالحہ کی طرح یہ

مادہ سب میں موجود ہے کسی کو بے فکر نہ ہونا چاہئے نہ معلوم کس وقت رگڑ لگ جاوے اور جل اٹھے اور سب خانما کو پھوک دے۔ یہ کبر وہ چیز ہے جو سبب ہوا ہے ابلیس کے کافر ہونے اور رجیم ہونے کا۔ حق تعالیٰ نے اس کے اور اس کے تمام شعبوں کی برائی بیان فرمائی ہے فبئس مثوی المتکبرین میں اور چونکہ تمام اخلاق ذمیمہ کبر ہی سے پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے اور وقت وسیع ہوتا تو بقدر ضرورت بیان بھی کر دیتا تو اس سے اشارہ ہو گیا تمام اخلاق کے اصلاح کی ضرورت کی طرف۔ یہاں تک بیان تھا کفار کی حالت کا قیامت میں اب آگے مومنین کی حالت کا بیان فرماتے ہیں وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے اور ہنکائے جائیں گے وہ لوگ جو حق تعالیٰ سے ڈرتے تھے یعنی مومنین جنت کی طرف گروہ کے گروہ ہنکائے جانے میں ایک معنی زبردستی کے پائے جاتے ہیں جو سوق کی تذلیل کو مستلزم ہے۔ گویا یہ معنی ہوئے کہ زبردستی دھکے دے کر مومنین کو جنت کی طرف لے جایا جائے گا حالانکہ اہل جنت کی تذلیل خلاف واقع ہے۔ عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ جنت محل اکرام ہے نہ کہ محل تذلیل اور نقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ ایک آیت میں صاف آیا ہے اولئک فی جنت مکرمون اس واسطے وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا کی تفسیر میں مفسرین نے یہ لفظ لکھا ہے اے بلطف یعنی اہل جنت کو جنت کی طرف زبردستی لے جایا جائے گا مگر نہ تذلیل کے طور پر بلکہ لطف اور اکرام اور خوشی کے ساتھ جیسے کوئی اپنے بہت عزیز دوست کو بغل میں ہاتھ ڈال کر گھر کی طرف کھینچتا ہے کہ چلو جی جلدی کرو تم کو جانا پڑے گا ہم تم کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے اسی طرح اہل جنت کو فرشتے تقاضا کر کے جلدی جلدی بہشت کی طرف لے چلیں گے تو یہ سوق عزت کی بات ہے نہ ذلت کی اس کو سوق کہا گیا۔ مشاکلۃ کیونکہ اول گروپ کے لئے سوق کا لفظ آ چکا ہے گو دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اس میں اشارہ ہو گیا اس بات کی طرف کہ صورۃً ان چیزوں کا یکساں ہونا حقیقتاً یکساں ہونے کو مستلزم نہیں سوق اہل جنت کے لئے بھی ہو گیا اور اہل دوزخ کے لئے بھی مگر دونوں میں باہم کچھ نسبت نہیں اور یہ بات اخلاق میں بھی بہت مطرد ہے کہ خلق محمود و مذموم میں بہت تشابہ ہوتا ہے۔ اسی واسطے میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ کسی مبصر کے سپرد کر وا اپنے آپ کو اپنی رائے کے بھروسہ پر نہ رکھو بسا اوقات تواضع حقیقت میں تکبر ہوتا ہے غرض سوق دونوں گروہ کے لئے ہو گا مگر وہاں عذاب کی طرف ہو گا اور یہاں ثواب کی طرف زمراً کے معنی وہی ہیں جو پہلے گزرے یعنی جماعتیں کی جماعتیں حَتّٰى إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ

طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ (یہاں تک کہ جب اس جنت کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے سے کھلے ہوں گے اور وہاں کے محافظ فرشتے ان سے کہیں گے السلام علیکم تم مزہ میں ہو اور ہمیشہ رہنے کیلئے اس جنت میں داخل ہو جاؤ) واؤ فتحت کا حالیہ ہے یا عاطفہ ہے اور دوسرے معطوفات اسی پر مترتب ہیں اور دونوں تقدیروں پر یہ سب جملے اذا کے تحت میں ہیں اور ترکیب میں شرط ہیں آگے جزا ان کی بیان نہیں کی گئی کہ جب یہ سب کچھ ہوگا تو کیا ہوگا یہ سب جنت کے باہر ہوگا جیسا کہ ادخلوا سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ ادخلوا (داخل ہو) صیغۂ امر ہے جو چاہتا ہے استقبال کو۔ اس کی تقریر پہلے فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ (دوزخ کے دروازوں میں سے داخل ہو) میں ہو چکی ہے۔ جزا کے بیان نہ کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ آگے ایک بات ہو تو بیان کی جاوے، جانے کیا کیا ہے کہاں تک بیان کیا جاوے۔ نیز یہ کہ جو کچھ ہے وہ بات کہنے کی ہے ہی نہیں جب دیکھو گے تب ہی سمجھ میں آوے گی یہ مضمون اس حدیث میں صراحۃً موجود ہے اعددت لعبادی الصالحین مالاعین رات ولا اذن سمت ولا خطر علی قلب بشر (مسند احمد ۲: ۴۳۸) یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیزیں تیار کی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی کے دل میں اس کا خیال آیا، پھر اگر و فتحت کا واؤ عاطفہ ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ جنت کے دروازے پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے بلکہ اس وقت کھلیں گے جبکہ اہل جنت ان کے پاس آویں گے جیسے دوزخ کے دروازوں کے متعلق تھا کہ اس وقت کھولے جاویں گے جس وقت اہل جہنم ان کے پاس آویں گے سو جہنم کے دروازے پہلے سے کھلے نہ ہونے کے وجوہ تو اوپر معلوم ہوئے۔

بوقت دخول ابواب جنت کھولے جانے میں حکمت:

جنت کے بارہ میں بھی ہمارے استاد رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ جنت کے دروازہ بھی پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے بلکہ بعد میں کھولے جاویں گے اور اس میں چند نکتے ہیں ایک تو یہ نکتہ کہ عادت ہے کہ دفعتاً نعمت پر نظر پڑنے سے حظ زیادہ ہوتا ہے مثلاً ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی کو ایک لاکھ روپیہ ملنے والا ہے اول اس کو خبر ملی کہ کلکتہ میں میرا اتنا روپیہ ہے پھر وہاں سے اس کی روانگی کی خبر ملی کہ وہاں سے چل دیا پھر معلوم ہوا کہ الہ آباد بینک میں آ گیا ہے پھر معلوم ہوا کہ مراد آباد کے خزانہ میں آ گیا ہے حتی کہ لا کر سامنے رکھ دیا گیا تو اس کو خوشی تو ضرور ہوگی مگر اتنی جتنی اس صورت میں ہوگی کہ ایک شخص کو مطلق خبر نہیں اور وہم و گمان میں بھی نہیں کہ میرا کہیں اتنا روپیہ ہے یکلخت کوئی

سب روپیہ سامنے لاکر رکھ دے کہ یہ تم کو ملا ہے اس صورت میں ایسا حظ ہوگا کہ عجب نہیں مارے خوشی کے شادی مرگ ہو جاوے۔ ایسے واقعات ہوئے بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ کسی ملزم کو پھانسی کا حکم ہوا، پھر اپیل میں رہائی کا حکم ہوا تو اس حکم کو یکلخت نہیں سنایا گیا اس وجہ سے کہ ناامیدی کے بعد ایک دم یہ خبر سن کر کہیں مارے خوشی کے مر نہ جائے اس کی وجہ زیادت حظ وسرور ہی ہے۔

معلوم ہوا کہ ایک دم نعمت پر نظر پڑنے میں زیادہ حظ ہوتا ہے بہ نسبت نظر تدریجی کے، اس واسطے جنت کے دروازے بند ہوں گے اور جب جنتی اس کے پاس پہنچیں گے تب ایک دم کھول دیئے جائیں گے اور ایک نکتہ ہے اس کے سمجھنے کے لئے دو مقدموں کو ملانے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اہل جنت، جنت میں جانے کے بعد باہر نہیں نکلیں گے۔ ایسی جگہ میں سے کون نکلنا گوارا کرتا ہے، ہاں اہل دوزخ بعض دوزخ میں سے نکلیں گے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چند روز کے بعد نجات پا کر نکالے جائیں گے۔ غرض اہل جنت اندر جانے کے بعد پھر باہر نہ نکلیں گے۔ ایک مقدمہ یہ ہوا اور ایک مقدمہ یہ ہے کہ جنت باہر سے بھی مزین ہے اگرچہ عادت یہ ہے کہ باغ کو باہر سے نہیں سجایا کرتے جیسا کہ مشہور ہے:

بنقاش احتیاجے نیست دیوار گلستان را

(نقاش کو نقش ونگار کیلئے گلستان کے دیوار کی ضرورت نہیں)

مگر وہاں ایسا نہیں، وہاں اندر سے تو جنت ہے ہی جیسی ہے باہر سے بھی مزین اور مرصع ہے اور یہ ظاہر ہے کہ باہر کی زینت ایسی نہیں ہوسکتی جیسی اندر کی ہوگی کیونکہ اندر کی زینت مقصود اصلی ہے اور باہر کی بالتبع اور مقصود اور تابع میں فرق ہوتا ہے تو اگر دروازے جنت کے پہلے سے کھول دیئے جاویں تو اندر کی زینت کے سامنے باہر کی زینت کو کون دیکھے، اس واسطے اول دروازے بند ہوں گے تاکہ باہر کی زینت کو بھی دیکھ لیں پھر کھول دیئے جاویں گے کیونکہ اندر سے باہر کون آوے گا۔ نیز اس واسطے بھی جنت کے دروازے پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے کہ جہنم میں تو لوگ بجبر واکراہ جاویں گے تو اگر دروازہ کھلے ہوئے ہونے کی کوئی وجہ ہوسکتی ہے تو جہنم کے لئے ہوسکتی ہے کہ سب سامان عذاب کا تیار ہوگا صرف دھکیل دینے کی ضرورت ہوگی۔ اگر دروازے بند ہوں تو شاید کچھ دیر لگے اور یہاں تو خوشی سے جاویں گے اور ہر قسم کا اطمینان ہوگا تو مزے لیتے ہوئے اور سیر کرتے ہنستے بولتے ہوئے جاویں گے تو کیا جلدی ہے کہ دروازے پہلے سے کھلے ہوئے ہوں۔ باہر کی سیر کر کرا کے جب اندر جانا چاہیں گے کھول دیئے جائیں گے۔ ان میں بعض

نکتے حضرت استاذ نا علیہ الرحمتہ کے ارشاد فرمائے ہوئے ہیں ۔ یہ تقریر اس صورت میں ہے کہ وفتحت کا واؤ عاطفہ لیا جاوے کیونکہ اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دروازے پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے اور اگر واؤ کو حالیہ لیا جاوے تو حال قید ہوتا ہے عامل کے لئے تو معنی یہ ہوں گے کہ آئیں گے جنت کے پاس اس حال میں کہ دروازے کھلے پڑے ہوں گے اس صورت میں اس کا یہ مدلول ہوگا کہ دروازے پہلے سے کھلے ہوئے ہوں گے۔

اشتیاق جنت:

اس کے لئے دوسرا نکتہ ہوگا کہ وہ بھی لطف سے خالی نہیں۔ وہ یہ ہے کہ جنت مشتاق ہوگی اہل جنت کی جیسے کوئی بڑا عزیز مہمان گویا کسی کا بچہ مدت کے بعد دور دراز سے آوے تو اس کے لئے ماں گود پھیلائے بیٹھی ہوتی ہے تو جیسے جنتی مشتاق ہیں جنت کے، جنت بھی ان کی مشتاق ہے اور اس میں جو کچھ خدم وحشم حور وغلمان ہیں وہ سب بھی مشتاق ہیں۔ یہ مضمون حدیث سے بھی ثابت ہے۔ یہ تو اہل جنت کے لئے لذت جسمانی ہوئی کہ ایک قول پر دروازے بند ہوں گے اور سیر کرتے ہوئے اور باہر کی آرائش دیکھتے ہوئے اطمینان کے ساتھ جاویں گے، پھر ایک دم دروازے کھول دیئے جاویں گے یا دوسرے قول پر دروازے کھلے ہوئے ہوں گے اور جنت مافیہا ان کی مشتاق ہوگی۔

لذت روحانی:

آگے لذت روحانی کا بیان ہے **وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا** کہیں گے ان سے وہاں کے کارکن یعنی فرشتے **سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ** یہ اکرام ہے ان کا اور اظہار عظمت ہے کہ فرشتے ان کو سلام کریں گے اور مبارک باد دیں گے کہ تم اچھے ہو۔ اب چین کرو اور جنت میں چلو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، کیسی خوشی کا وقت ہے اہل جنت جوش میں آ کر کہیں گے **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ** حق تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا۔ ایمان لانے پر ہم سے جنت کا وعدہ کیا تھا سو اس کو کر کے دکھا دیا۔ یہاں ایک معقول شبہ ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ کا وعدہ پورا ہونا تو واجب اور ضروری ہے اس کے خلاف ہونا محال ہے، پھر اس پر احسان ماننے اور شکر کرنے کے کیا معنی جو چیز ضروری اور یقینی ہے وہ تو ضرور ہی واقع ہوگی چاہے کوئی خوش ہو یا ناخوش۔ اول تو یہ شبہ کسی نمک حرام ہی کو ہوسکتا ہے ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ وعدہ کے بعد اس کا پورا ہونا یقینی سہی لیکن شروع سے وعدہ

ہی کیوں کیا گیا۔ ہمارا خدا تعالیٰ کے ذمہ کیا آتا تھا جو ہم سے وعدہ کیا گیا، خود ہی مہربانی فرمائی کہ ہم کو ایک وعدہ کا امیدوار بنایا۔ یہ وعدہ بھی ایک فضل ہے اور اس کا ایفاء بھی جو کہ اس وعدہ پر مرتب ہے۔ دوسرا فضل ہے دوسرے یہ کہ وعدہ تو کیا تھا مگر کس شرط سے کیا تھا یعنی اس کے ساتھ کچھ شرط بھی تھی۔ اس شرط کا پورا کر دینا یہ تو واجب نہ تھا اس کو محض اپنے فضل سے پورا کیا، مان لیا جائے کہ ایمان لانا آپ کا فعل تھا مگر اس پر جزاء موعود کا مرتب ہونا موقوف تھا اس کے باقی رہنے پر اور یہ بقاء ایمان آپ سے نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ ادھر ہی سے فضل ہوا کہ اس کو باقی رکھا گیا ممکن تھا کہ حق تعالیٰ اس کو باقی نہ رکھتے تو اس صورت میں اس جزاء کے بھی آپ مستحق نہ ہوتے اور اس وعدہ کا پورا ہونا جو ایمان پر کیا گیا تھا ضروری نہ ہوتا کیونکہ اس کی شرط نہ پائی گئی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اس شرط کو موجود کیا گیا اور اس پر اس وعدہ کا ایفا کیا گیا یہ محض فضل سے ہوا یا نہیں تو اب یہ احسان ماننا کہ بالکل بجا ہوا کہ شکر ہے خدا کا جس نے اپنا وعدہ ہم سے پورا کیا اور یہی معنی ہیں اس سوال کے رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَ لَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ (اے ہمارے رب ہمیں وہ عطا فرما جس کا آپ نے اپنے رسولوں کی معرفت ہم سے وعدہ فرمایا اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر تو خلاف نہیں کرتا) کیونکہ اس پر بھی یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ جب وعدہ کر لیا گیا تو پھر اس کے پورا کرنے کا سوال کیا معنی! وہ تو خود ہی پورا ہوگا اس کے خلاف تو ہو ہی نہیں سکتا، پھر مانگنے کی کیا ضرورت ہے اس کا جواب بھی یہی ہے کہ وعدہ بے شک کیا گیا ہے لیکن وہ وعدہ مشروط ہے بقاء ایمان کے ساتھ تو سوال درحقیقت اس بات کا ہے کہ یا اللہ ہم کو رسولوں کے طریقوں پر قائم رکھنا تا کہ اس وعدہ کے ہم مستحق ہوں، تیسرے ایفاء جو واجب ہے تو واجب علی اللہ نہیں ہے کہ موجب احسان نہ ہو واجب من اللہ ہے اور وہ موجب احسان ہوسکتا ہے **واورثنا الارض** اور وارث بنایا ہم کو زمین کا۔ اس زمین کا، اس زمین سے مراد جنت کی زمین ہے کیونکہ جنت ہی کا بیان ہو رہا ہے، نیز آگے اس کی تصریح **نتبوأ من الجنة** میں موجود ہے اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں بھی زمین ہے اور اس کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب زمین ہے تو آسمان بھی ہے۔

خلود جنت:

یہ ثابت ہے کہ جنت کے لئے خلود ہے تو اس کے آسمان اور زمین کے لئے بھی خلود ہوا تو اس سے ایک اور آیت کا اشکال بھی رفع ہوتا ہے وہ آیت وہ ہے جس میں اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کے لئے یہ لفظ ہے خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ جس کا ترجمہ یہ ہے

کہ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں اس وقت تک رہیں گے جس وقت تک زمین و آسمان رہیں گے جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور نار دونوں میں قیام کے لئے ایک خاص مدت مقرر ہے جو کہ مدت ہے بقاء سماوات والارض کی اور جب کوئی مدت مقرر ہوئی تو خلود کہاں رہا اور یہ دوسری تصریحات کے خلاف ہے اس اشکال کے جواب کے لئے لوگوں نے تاویلیں کی ہیں ایک تاویل جو تفسیر مذکور کی بنا پر ہے یہ ہے کہ سماوات والارض سے مراد جنت کے آسمان اور زمین ہیں اور جنت کے لئے خلود ہے تو ان کے واسطے بھی خلود تو گو دونوں فریق کے لئے مدت مقرر کی گئی مگر وہ مدت خود لامتناہی ہے تو ان کا رہنا بھی لامتناہی ہوا اور یہی معنی خلود کے ہیں تو یہ معنی ہوئے کہ اہل جنت اور اہل دوزخ جنت اور دوزخ میں رہیں گے جب تک دونوں کے آسمان اور زمین کا وجود ہے اور ان کا وجود کب تک ہے ہمیشہ کے لئے ہے اور ان کا رہنا بھی ہمیشہ کے لئے ہوا۔

اِلّا ماشاء ربک کی تفسیر:

باقی اس آیت میں جو لفظ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ (مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار جو چاہے) وارد ہے مختصراً اس کو بھی سمجھ لینا چاہئے۔ یہ استثناء ہے خلود سے معنی یہ ہیں کہ خلود ہوگا مگر ان کے لئے جن کو حق تعالیٰ نہ چاہیں تو اس سے ظاہراً سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی جنت سے نکالا بھی جاوے گا حالانکہ یہ خلاف واقع اور خلاف تصریحات نصوص ہے اس کی توجیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ استثناء کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ایک وہ جو بعض اہل نار کے لئے ہوں گی بعض لوگ (یہ عصاۃ مومنین ہیں) گناہوں کی وجہ سے چندروز کے لئے جہنم میں جاویں گے پھر نکال لئے جاویں گے تو خلود نہ ہونے کی یہ صورت ہوگی کہ بعض گنہگار اولاً جہنم میں جاویں گے پھر جہنم سے نکال کر جنت میں جاویں گے اور جنت میں ہمیشہ بطور خلود کے رہیں گے اور کبھی نکالے نہ جاویں گے مگر یہ خلود ان کا ابتداء کی طرف سے ان لوگوں کے خلود سے کم ہے جو ابتداءً جنت میں جاویں گے تو خلود جنت بھی بعض کے لئے اسی طرح استثناء کا مصداق بن سکتا ہے یہ تاویل اکثر لوگوں نے لکھی ہے۔ مادامت السموات والارض کی اور بعض اہل زیغ اس قید کو دیکھ کر اس کے قائل ہو گئے کہ جنت اور نار فنا ہو جاویں گے اور خلود سے مراد مکث طویل لے لیا اور کہا کہ گو جنت اور نار کارہ میں ہزاروں لاکھوں برس قیام رہے مگر اخیر میں فنا ہو جائیں گے لیکن یہ بالکل غلط ہے اور اہل حق کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ اہل حق سب خلود ہی کے قائل ہیں اور انہوں نے اس آیت مادامت السموات والارض (جس وقت

تک آسمان وزمین رہیں گے) میں وہی تاویل کی ہے جو میں نے بیان کی۔اس تاویل سے معنی بن گئے اور اشکال رفع ہو گیا مگر ایک معنی اور بھی ہو سکتے ہیں۔ابتداء میں، میں نے کہا تھا کہ آج کے بیان میں، میں اپنی طرف سے کچھ نہ کہوں گا مگر عادت پڑی ہوئی ہے کہ جب کوئی مضمون قلب میں آ جاتا ہے تو بلا بیان کئے طبیعت نہیں مانتی۔علت جاتے جاتے ہی جاتے جاوے گی تو اس وقت میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے اس کو میں بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ تاویل مذکور بن تو گئی اور اشکال رفع ہو گیا لیکن اس عنوان سے فائدہ کیا نکلا خلدین فیها کے بعد ما دامت السموات والارض (جس وقت تک آسمان وزمین رہیں گے) کی ضرورت کیا تھی۔یہ کیوں فرمایا کہ ہمیشہ رہیں گے جب تک جنت کے آسمان زمین رہیں گے بیان خلود کے لئے تو خلدین فیها بھی کافی تھا۔اس عنوان سے تو خواہ مخواہ ایک اشکال پیدا ہو گیا۔یہ جملہ نہ ہوتا تو کوئی بھی اشکال نہ ہوتا۔یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ تاکید ہے خلود کی یہ ایسا ہے جیسے کسی کو کہیں تمہیں گاؤں دیا، پوچھا گیا کب تک کے لئے، جواب دیا جب تک گاؤں ہے۔اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ مدت کی تحدید کر دی کہ جب تک گاؤں آباد ہے اس وقت تک یہ زمین اس کو دی اور جب گاؤں اُجڑ جاوے تو واپس لے لی جاوے گی بلکہ یہ لفظ اس واسطے کہا گیا ہے کہ عادت یہ ہے کہ گاؤں مدتوں رہتا ہے۔آدمی کی عمر سے زیادہ گاؤں کی عمر ہوتی ہے تو یہ مراد ہے کہ تمہیں تمام عمر کے لئے اور ہمیشہ کے لئے دیا گیا اور کبھی واپس نہیں لیا جائے گا۔ قرآن شریف میں محاورات کی رعایت بہت ہے تو مادامت السموات والارض (جس وقت تک آسمان وزمین رہیں گے) سے مراد تحدید نہیں بلکہ وہی معنی مراد ہیں جو اس لفظ سے مراد تھے کہ جب تک گاؤں رہا یہ کہ ان دو ہی چیزوں کو کیوں بیان کیا یعنی سموات اور ارض کو یوں کیوں نہ فرمایا دامت الجنت اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مکان میں فرش اور چھت اصل ہوتا ہے تو تمام اجزاء میں سے ان اجزاء کا نام لیا جو اصل ہیں تو اب یہ ایسا ہو گیا جیسے کسی کو گاؤں میں گھر دیں اور کہیں یہ گھر تمہیں دیا۔اس وقت تک کے لئے جب تک کہ یہ گاؤں ہے کہ اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ ہمیشہ کے لئے اور گاؤں کا نام اس واسطے لیا گیا ہے کہ اگر گھر کا نام لیتے اور یوں کہتے کہ جب تک گھر ہے تو ہمیشگی پر دلالت نہ ہوگی کیونکہ گھر منہدم ہونے والا ہے اور گاؤں منہدم ہونے والا نہیں تو گاؤں کا نام لینے سے ہمیشگی پر دلالت ہوگی اسی طرح جنت کے ان اجزاء کا نام لیا جو اصل اور عمود ہیں اور بہ نسبت دیگر اجزاء کے عادتاً دیرپا ہو سکتے ہیں تو اس سے اور تاکید ہوگئی خلود کی یہ نکتہ ہوا مادامت السموات والارض میں (الله اعلم) واورثنا الارض مالک بنا دیا ہم کو زمین کا یعنی جنت کی زمین کا

جبکہ آگے تصریح موجود ہے اور کسی خاص حصہ کا مالک نہیں بنایا بلکہ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ جنت میں سے جہاں ہم چاہیں جگہ لے سکتے ہیں۔ یہ آزادی ہوگی کہ جہاں جس کا جی چاہے گا وہاں پہنچ جائے گا۔ ایسا نہ ہوگا جیسے کوئی نظر بند ہوتا ہے کہ کسی ایک باغ میں یا ایک شہر میں رہتا ہے کہ اس سے باہر نہیں جا سکتا۔ اہل جنت کے لئے کوئی حد نہ ہوگی۔ بے قید کھلے آزاد ہوں گے جہاں چاہیں جائیں، جو چاہیں کریں، دوستوں سے ملیں، تہہ خانہ میں رہیں، دیواروں سے لپٹیں، چھت پر چڑھیں۔ غرض کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہوگی۔ کسی بات سے دل مارنا نہ پڑے گا۔ عجب لطف ہوگا۔ بقول مولانا محمد یعقوب صاحب کے چھوٹی سی خدائی ہوگی، چھوٹی سی کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی خدائی میں تو سب کچھ اختیار اور ارادہ سے ہوتا ہے اور اس میں ان کے اختیار سے تو کچھ نہ ہوگا مگر مرضی کے موافق سب کچھ ہو جاوے گا یعنی جس چیز کو ان کا جی چاہے گا فوراً حق تعالیٰ اس کو حکم دیں گے اور وہ ہو جائے گی۔ یہی معنی ہیں اس آیت کے لَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْاَنفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ترجمہ: تمہارے واسطے اے اہل جنت! جنت میں وہ ہے جس کو تمہارا دل چاہے اور جس سے آنکھیں لذت پائیں، ما کا لفظ عام ہے تو جو کچھ کسی کا جی چاہے وہی ہوگا مثلاً چھت دار مکان میں بیٹھے ہیں اور دل چاہا کہ چھت نہ رہے تو چھت فوراً ہٹ جائے یا میدان میں ہیں اور جی چاہا کہ اس جگہ چھت دار مکان ہوتا تو فوراً خدا تعالیٰ کے حکم سے ایک آن میں جیسا مکان خیال میں آیا تھا ویسا ہی موجود ہو جاوے گا اور جی چاہا کہ سائبان نہ رہے تو فوراً ہٹ جائے گا۔ ایک پرند خوبصورت درخت پر بیٹھا ہے، جی چاہا کہ اس کے کباب کھائے، بس یہ خیال آنا تھا اور وہ کباب بن کر رقاب میں تیار ہو کر سامنے آ گیا۔ مزے سے کھائیے، لطف یہ کہ یہاں کباب کھائے گئے اور ادھر دیکھتے ہیں کہ وہی پرندے بیٹھے چہچہا رہے ہیں، جنت کی ہوا میں حیات ہے۔ جیسے کسی نے کشمیر کی تعریف میں کہا ہے:

ہر سوختہ جاں کہ بہ کشمیر در آید　　　　گر مرغ کباب ست کہ بابال و پر آید

"جو سوختہ جان کشمیر آ جائے اگر مرغ کا کباب ہے تو بھی وہ مرغ بال و پر کے ساتھ زندہ ہو جاوے۔"

(یہ عرفی کا شعر ہے) یہ کشمیر کے بارہ میں تو مبالغہ ہے اور جنت کے بارہ میں حقیقت ہے۔ قرآن شریف میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اكلها دائم یعنی اس کے میوے ہمیشہ رہنے والے اور غیر فانی ہیں۔ میوہ درخت سے ٹوٹ کر آنے کے بعد کھا لیا جائے گا اور درخت پر بجنسہٖ موجود رہے گا۔ اس پر ایک معقولی صاحب نے اعتراض کیا کہ جو یہ کھا لیا گیا تو فنا ہو گیا، پھر دوام کہاں رہا۔ میں نے کہا دوام نوعی مراد ہے نہ کہ شخصی یعنی جس کو کھایا وہی نہیں رہے گا بلکہ اسی جنس کا دوسرا

اس کی جگہ فوراً پیدا ہو جائے گا تو دائم صحیح رہا۔ غرض جو چاہیں گے فوراً موجود ہو جائے گا، دھوپ چاہیں تو دھوپ ہو جائے گی، سایہ ہٹ جائے گا۔ اس سے مراد دنیا کی سی دھوپ نہیں جس سے تکلیف ہو بلکہ وہاں کی سی دھوپ جو جنت کے لائق ہے جس سے تکلیف بالکل نہ ہو۔ یہ اس واسطے کہہ دیا کہ شاید کوئی اعتراض کرے کہ قرآن میں تو صاف موجود ہے **لا یرون فیھا شمسا ولا زمھریرا** یعنی اہل جنت، جنت میں نہ دھوپ پائیں گے اور نہ سردی اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں دھوپ نہ ہوگی اور میں نے کہا کہ کوئی دھوپ کو چاہے گا تو جنت میں دھوپ بھی ہو جائے گی۔ مطلب یہ کہ ایسی دھوپ نہ ہوگی جس سے تکلیف ہو۔ زمھریر کے مقابلہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ زمھریر سخت سردی کو کہتے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ وہاں نہ ایسی چھاؤں ہوگی جس سے سردی لگے اور نہ ایسی دھوپ ہوگی جس سے گرمی لگے، پس ایسی دھوپ کا ہونا جو موجب تکلیف نہ ہو اس آیت کے خلاف نہ ہوا اور وہ بھی ہر وقت نہیں بلکہ اگر کسی کا جی دھوپ کو چاہے تو ہو جائے گی۔ بعضوں کا دل چاہے گا کہ ہمارے بیٹا ہوتا (ہائے کوئی بے اولاد ہوگا) یہ بھی ہو جائے گا۔ وہاں کیا دیر لگتی ہے، فوراً تیار پلا پلایا برابر کا فرزند موجود، کسی کا کھیتی کو دل چاہے تو آناً فاناً میں کھیتی تیار اور غلہ اُگایا ہوا صاف شدہ سامنے آ کر ڈھیر ہو گیا۔

جنت کی عجیب وغریب نعمتیں:

یہی سوال حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا تو ایک شخص نے کہا کہ یہ کھیتی مانگنے والی کوئی انصاری ہوگا۔ یہ اس واسطے کہا کہ انصار اہل زراعت تھے۔ میں نے اپنے استاذ علیہ الرحمۃ سے سنا ہے ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ غالباً کسی روایت میں دیکھا ہوگا کہ جنت میں یہ بھی ہوگا کہ ایک پھل ہاتھ میں لیا کھانے کے لئے اور اس میں سے ایک دم ایک حور نکل آئی۔ السلام علیکم پس دیکھ کر طبیعت پھڑک گئی، بعض میں سے ایک جوڑا پوشاک کا نکل آیا، یہ بھی ایک حظ ہے کہ ایک نامعلوم چیز دفعتاً پیدا ہو جاوے، نعمت کے ملنے سے خوشی تو ہر طرح ہوتی ہے لیکن اگر اس طرح ملے کہ اس کا وہم وگمان بھی پہلے سے نہ ہو تو عجیب حظ ہوتا ہے۔ ایک رئیس کا قصہ اپنے استاذ علیہ الرحمۃ سے سنا ہے کہ ان کے یہاں دو قصباتی مہمان آئے تو باورچی نے ان کے سامنے ناشتہ لا کر رکھا جس میں صرف ایک دسترخوان ڈیڑھ بالشت کا اور ایک چھوٹا پیالہ قورمہ کا اور ایک طشتری میٹھے چاول کی اور چار پتلی پتلی چپاتیاں، اس مختصر ناشتے کو دیکھ کر مہمانوں کا جی جل گیا کہ یہ رئیس لوگ جیسے خود کم کھاتے ہیں جس کی وجہ دودھ گھی کی کثرت ہے ایسے ہی دوسروں کو بھی سمجھتے ہیں۔ خیر جبراً وقہراً وہ

چاول اور چپاتیاں جھلا کر جلدی سے ختم کر دیں اور چپ ہو کر بیٹھ رہے۔ خادم نے کہا حضرت نوش فرمایئے، یہ اور جل گئے اور کہا کیا کھائیں؟ اس نے پیالہ کو اٹھا کر توڑ کر سامنے رکھ دیا یہ نمکین بالائی جمائی ہوئی تھی اس کے بعد اس طشتری کے بھی ٹکڑے کر کے آگے رکھ دیئے وہ میٹھی بالائی، پھر دستر خوان اٹھا کر ٹکڑے کر کے سامنے رکھ دیا کہ جناب ابھی تو بہت کھانا موجود ہے، آپ گھبرایئے نہیں یہ دستر خوان باقر خوانی روٹی تھی، پورا دستر خوان ان سے کھایا بھی نہ گیا اور پیٹ بھر گیا، تب ان کی آنکھیں کھلیں۔ دیکھئے اگر پہلے ان مہمان صاحب سے کہہ دیا جاتا کہ دستر خوان یہ ہے اور پیالہ یہ ہے تو اتنا حظ نہ آتا جتنا کہ دفعتاً معلوم ہونے کے بعد کھانے سے ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ نعمت کا ایک غیر متوقع صورت اور نئی طریق سے نمودار ہونا باعث زیادت حظ کا ہوتا ہے اس کے واسطے کوششیں کی جاتی ہیں اور روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔

نعمائے دنیا:

ایک مسلمان راجہ نے ایک مرتبہ لیفٹیننٹ گورنر کے لئے کسی کاری گر سے ایک مٹھائی کا انار بنوایا جس کی صورت بالکل انار کی سی تھی، دانے بھی ویسے ہی تھے، چھلکا بھی ویسا ہی تھا مگر تھی سب مٹھائی۔ ایک انار کے بنوانے میں ڈیڑھ سو روپیہ خرچ ہوئے تھے (دیکھئے خدا تعالیٰ کی نعمتیں ڈیڑھ سو روپیہ میں ایک انار تیار ہوا اور پھر بھی نقلی کا نقلی کہ نہ اس میں دانہ اصلی جیسا، نہ گٹھلی اصلی جیسی، بس صورت ہی صورت تھی اور خدا کے بنائے ہوئے اصلی انار جس کے برابر یہ ڈیڑھ سو روپیہ کا انار کبھی نہیں ہوسکتا پیسے کے دو دو آتے ہیں، سبحان اللہ) اور ایک شخص نے بیان کیا کہ کسی دعوت میں ایک رقاب میں چنبیلی کے پھول لائے گئے کہ وہ حقیقت میں چاول پکے ہوئے تھے۔ کاریگر کی صنعت اور محنت دیکھئے کہ کوئی مصالحہ تیار کیا جس میں ایک ایک چاول کو آدھا آدھا ڈبو کر پکایا گیا۔ اس کے اثر سے وہ آدھا پھول کی طرح کھل گیا اور آدھا ڈنڈے کی طرح رہ گیا اور بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ رقاب چنبیلی کے پھولوں سے بھری ہوئی ہے۔ پھول اٹھانے کے لئے ہاتھ ڈالا گیا تو معلوم ہوا کہ چاول ہیں اور کھانے کی چیز ہے۔ دیکھئے کتنا بکھیڑا کیا گیا صرف اس واسطے کہ نیا حظ حاصل ہو۔ اسی طرح جنت میں طرح طرح سے نئے حظ حاصل ہوں گے، پھل میں سے کوئی پرند خوش الحان نکل آیا یا کوئی حور نکل آئی تاکہ اہل جنت کو ایک جدید حظ حاصل ہو۔ سبحان اللہ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ترجمہ: ہم جنت میں جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ اہل جنت سیر کرتے پھریں گے اور بالکل آزادی ہوگی۔ جہاں چاہیں پھریں اور جہاں چاہیں پھریں۔ کہیں

روک ٹوک نہ ہوگی۔ بالکل مخلے بالطبع ہوں گے۔ اس آزادی کا ترجمہ کسی مسخرہ نے آوارہ گردی کیا تھا۔ خیر لفظی ترجمہ تو برے عنوان سے یہ ہوسکتا ہے مگر یہ وہ آوارہ گردی نہیں ہے جو دنیا میں بری سمجھی جاتی ہے کیونکہ آوارہ گردی دنیا میں اس وجہ سے عیب ہے کہ مانع عن الکمالات ہے دنیا میں ضرورت ہے انسان کو بہت سے کمالات حاصل کرنے کی، پڑھنے لکھنے کی، صنعت وحرفت حاصل کرنے کی، روپیہ کمانے کی، مکان بنانے کی، اولاد حاصل کرنے کی وغیرہ وغیرہ اور ان سب کی تحصیل چاہتی ہے مشغولیت اور مصروفیت کو جس سے آوارہ گردی مانع ہوتی ہے لہٰذا عیب سمجھی جاتی ہے اور جنت میں کوئی کمال حاصل کرنا نہیں ہے وہاں ہر چیز کا ذمہ حق تعالیٰ نے لیا ہے ہم کو کسی مصروفیت اور مشغولیت کی ضرورت نہیں تو وہاں ادھر ادھر آزاد پھرنا جس کو آوارہ گردی سے تعبیر کیا گیا تھا کسی کمال کی تحصیل میں مانع نہیں۔

دوستوں سے ملنا بڑی چیز ہے:

بلکہ تمام کمالات کے حصول کا ثمرہ ہے کہ ہم ایسے فارغ ہیں کہ کسی کمال کی تحصیل باقی نہیں، پھر آزادی سے کیوں نہ پھریں۔ اس واسطے خوشی میں کہتے ہیں نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ اہل جنت آپس میں احباب سے بھی مل سکیں گے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے جنت کی اس وقت سے تمنا ہوگئی گویا جب سے سنا ہے کہ وہاں دوستوں سے ملاقات ہو سکے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوستوں سے ملنا بڑی چیز ہے اور ایسی نعمت ہے جس کی وجہ سے جنت کی تمنا ہوگی۔ گویا جنت ذریعہ ہے دوستوں سے ملنے کا تو دوستوں سے ملنا لذات جنت کا مکمل ہوا، مگر وہی دوست جو خدائی دوست ہیں۔ فنعم اجر العاملین ترجمہ: پس کیسا اچھا اجر ہے عمل کرنے والوں کا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ جنت اور مافیہا جو کچھ ملا ہے یہ سب عمل کی بدولت ملا ہے بڑی چیز عمل ہے جس سے آج کل غفلت ہے، عوام کی تو کیا شکایت کی جاوے اس واسطے کہ وہ علم ہی نہیں رکھتے۔ جو شخص ایک چیز کو جانتا ہی نہیں وہ اگر اس کے متعلق کوئی غلطی کرے تو چنداں تعجب کی بات نہیں، تعجب اس شخص سے ہوتا ہے جو جانتا ہے اور پھر غلطی کرتا ہے۔ ایک شخص وہ ہے کہ زہر کو پہچانتا اور جانتا نہیں وہ اگر کھالے تو کچھ تعجب نہیں اور اس شخص سے بہت تعجب ہوگا جو زہر کو پہچانتا اور جانتا ہے اور پھر کھاتا ہے۔ گو اس پر چاندی کا ورق لپیٹ کر یا قند چڑھا کر اور کیوڑہ اور بید مشک کی خوشبو دے کر کھاتا ہو اس کو کوئی معذور نہیں کہے گا۔ آج کل خدا کا نام لینے والے اور طریق کو جاننے والے دو گروہ ہیں۔ اہل علم، اہل احوال۔ بلفظ دیگر علماء اور فقراء، ایک گروہ علم پر مرتا ہے اور ایک

فرق احوال پر، علماء اس میں مست ہیں کہ پڑھے جاؤ اور پڑھائے جاؤ، فلانے کا قول اس میں یہ ہے اور فلانے کا یہ ہے اور بڑی دوڑان کی قیل وقال ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے:

علم ظاہر سر بسر قیل ست و قال نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

(علم ظاہر سراسر قیل وقال ہے نہ اس سے کیفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ حال)

دین کی حقیقت حصول عبودیت ہے:

علم ظاہر سر بہ سر یعنی تمام تر قیل وقال ہے، نہ اس سے کیفیت حاصل ہوتی ہے نہ حال حاصل ہوتا ہے۔ ان کا خیال اس طرف کبھی نہیں جاتا کہ کسی چیز کا مقصود بالذات بھی ہوتا ہے یا مقصود کسی خاص چیز سے تمتع ہے اور علم صرف اس کا ذریعہ ہے۔ مثلاً مٹھائی ایک لذیذ چیز ہے اور قوی اور کثیر الغذا شئے ہے تو کیا صرف اس کی ماہیت کا جان لینا یا اس کے خواص کا جان لینا مقصود ہے اور یہیں انتہا کر دینا چاہئے یا مقصود مٹھائی کا کھانا اور اس سے لذت اٹھانا اور بدن کو پرورش کرنا ہے اور ان کی ماہیت اور خواص کا علم اِن اغراض کے حصول کا ذریعہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ مقصود اور کام کی بات ثانی ہے نہ کہ اول علماء اسی غلطی میں مبتلا ہیں کہ علم دین کو مقصود سمجھ رکھا ہے اور تمتع بالدین کو نہیں، میں ان دونوں میں فرق بتاتا ہوں اور وہ کچھ غامض بات نہیں، فرق وہی ہے جو مٹھائی کی ماہیت اور خواص کے جاننے اور مٹھائی کے کھانے میں ہے۔ اصل غلطی یہ ہے کہ دین نام رکھا ہے صرف احکام دین کے جاننے کا اور جب یہ حاصل ہے تو سمجھتے ہیں کہ ہم کو دین حاصل ہے حالانکہ دین نام ہے اس تعلق کے درست کرنے کا جو بندہ اور حق تعالیٰ کے درمیان میں ہے۔ جس کے لئے مختصر اور جامع لفظ عبودیت ہے اس کے حاصل کرنے کا نام دین ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جو بلا اہتمام حاصل ہو جائے بلکہ اس کے لئے کچھ طریقے ہیں جن کو خود خدائے تعالیٰ نے بتایا ہے اور وہ ایسے طویل اور غامض ہیں جن کے بتانے اور سمجھانے کے لئے انبیاء علیہم السلام کو بھیجنے کی ضرورت ہوئی، وہ مدرک بالرائے نہیں۔ ان طریقوں کے جاننے کا نام علم دین ہے تو چونکہ یہ اچھی اور ضروری چیز کا علم ہے اس واسطے یہ بھی اچھا اور ضروری ہے لیکن مقصود بالذات نہیں بلکہ محض ذریعہ ہے تو ذریعہ میں مست ہو جانا مقصود سے رہ جانا ہے اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک حلوائی کامل فن ہے اور بڑا استاد ہے، تمام شہر اس کا شاگرد ہے، کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ مٹھائی ایسی نہیں جس کا بنانا وہ نہ جانتا ہو اور ساری عمر اس نے یہی کام کیا کہ مٹھائی بنائی اور بیچی اور لوگوں کو کھلائی، لیکن میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر اس نے مٹھائی کو منہ میں نہ رکھا ہو تو ساری عمر اس کا منہ میٹھا ایک دفعہ

بھی نہ ہوا ہوگا۔ اس سے تو وہ شخص اچھا ہے جس کو مٹھائی بنانی تو ایک بھی نہیں آتی مگر لڈو اسی سے خرید کر یا مانگ کر یا جس طرح بھی ہو گود میں بھر رکھے ہیں اور کھا رہا ہے اور مزے لے رہا ہے اور مقصود اس کو حاصل ہے، یہی حالت ان عالم صاحب کی ہے کہ ساری عمر علم دین کی خدمت میں صرف کی اور علم کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور تمام شہر ان کا شاگرد ہے، ہزاروں کو ان سے فیض ہو رہا ہے مگر حقیقت حال یہ ہے کہ یہ اس حلوائی کی طرح گدی پر چڑھے بیٹھے ہیں اور شاگردوں کو بھی بتلا رہے ہیں اور مٹھائی تمام شہر کو بھی کھلا رہے ہیں مگر خود کبھی نہیں کھائی ، واللہ باللہ ان کا منہ میٹھا نہیں ہونے کا۔ ہزاروں آدمی ان کی بدولت دیندار ہو جاویں گے مگر ان کو دین کا ذائقہ بھی نہیں معلوم ہونے کا، پس دین کا نام اس تعلق کا ہے جو حق تعالیٰ کے ساتھ ہے، جس کا نام عبودیت ہے، جس کی ضد تکبر ہے، اہل علم اس کو غور کر لیں کہ ان میں عبودیت ہے یا اس کی ضد، بس اس کی تفصیل میں زیادہ نہیں کرتا کیونکہ وہ علم رکھتے ہیں اور ان کی ماہیتوں کو وہ خود جانتے ہیں، بس شکایت میں اس کی کرتا ہوں کہ اپنے احوال میں غور کیوں نہیں کرتے اور کیوں ہر وقت نگرانی نہیں رکھتے اور اگر خود سمجھ میں نہیں آتا تو کسی فن کے جاننے والے سے کیوں نہیں مشورہ کرتے اور کیوں اس کے سامنے اپنے حالات عرض نہیں کرتے تاکہ وہ بتلائے کہ اتنا حصہ اس میں عبودیت کا ہے اور اتنا تکبر کا، علم کو منتہائے عروج کیوں قرار دے لیا ہے مگر جیسا کہ دوسروں کی اس سے اصلاح کرتے ہیں اپنی بھی تو کریں، مٹھائی بیچ بیچ کر دوسروں کا منہ میٹھا کرتے ہیں، اپنا بھی تو کریں۔

علم دین اور تمتع بالدین میں فرق:

اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ علم دین اور تمتع بالدین میں کیا فرق ہے؟ تمتع بالدین مقصود ہے علم دین بالذات مقصود نہیں، ہاں علم ذریعہ ہے تو ذریعہ کو حاصل کر کے بیٹھ نہ رہو، ذریعہ کو مقصود نہ بناؤ بلکہ اس سے وہ چیز حاصل کرو جس کا وہ ذریعہ ہے، سیڑھی بناؤ چھت پر چڑھنے کے لئے بدون اس کے کام نہ چلے گا مگر سیڑھی بنانے ہی میں نہ رہ جاؤ بلکہ چھت پر بھی تو چڑھو اور سیڑھی بھی اتنی ہی بناؤ جتنی چھت پر چڑھنے کے لئے کافی ہو نہ یہ کہ ہزاروں گز لمبی بنائے جاؤ اور ساری عمر اس میں صرف ہو جاوے چاہے چھت پر بارش ہوتی رہے اور ٹپک ٹپک کر گر ہی پڑے اور سارے گھر کو لے بیٹھے۔ غرضیکہ علم ذریعہ ہے عبودیت حاصل کرنے کا، اس کو خود مقصود مت بناؤ بلکہ اس کے ذریعہ سے عبودیت حاصل کرو اور اس کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ ساری عمر اس میں صرف ہو جاوے، مقصود کی تکمیل رہ جاوے اور نفس وشیطان تمہارا کام تمام کر دیں اور ایسی حالت میں موت آ جاوے، بس مقصود پر نظر رکھو خوب سمجھو کہ اگر عالم اور محقق نہ ہوں گے تو کچھ

حرج نہیں اور بندہ نہ ہوں گے تو حرج ہے۔ عبودیت حاصل کرو اور یہی سمجھو کہ عبودیت نام صرف نماز روزہ کا نہیں بلکہ اصلاح باطن اور تہذیب اخلاق بھی اس کا جزو ہے بلکہ جزو اعظم ہے تمام اجزاء دین کی تکمیل کا نام دین ہے۔ عبادات، معاملات، معاشرات، عادات اور اخلاق سب دین ہی ہیں صرف عبادت پر بھی بس نہ کرو، نرے علم پر بس کرنا تو کیا یہ تو فرقہ علماء کی کوتاہی کا بیان ہوا۔

فقراء کی مقصود سے دوری:

اب لیجئے فقراء کو کہ وہ صرف کیفیت و حال میں مست ہیں۔ علماء نے علم کو مقصود سمجھا تھا، انہوں نے حال کو مقصود سمجھا ہے حالانکہ مقصود ابھی دور ہے اگر کسی کو کشف ہونے لگا یا رقت طاری ہونے لگی یا انوار نظر آنے لگے یا دست غیب یا اور کوئی کرامت حاصل ہوگئی تو بس دوڑ ختم ہوگئی اور حاصل ہوگئی اب ان کو اعمال کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ گویا اعمال اس واسطے کئے جاتے تھے کہ یہ کیفیت حاصل ہو جاوے۔ صاحبو! واقع میں اس کا عکس ہے کہ مقصود اعمال ہیں اور یہ کیفیات اس واسطے طاری ہوتے ہیں کہ اعمال کا شوق بڑھے، اس کی مثال ایسی ہے کہ بخار کے لئے دوا دی جاتی ہے مگر بعض وقت وہ کڑوی ہوتی ہے تو اس سے مریض کو نفرت ہوتی ہے اس واسطے اس پر قند چڑھا دیتے ہیں تا کہ خوش ذائقہ معلوم ہو اور طبیعت قبول کر لے یا سونے چاندی کے ورق لپیٹ دیتے ہیں تا کہ خوش منظر ہو جاوے اور مریض خوشی سے کھا لے۔ اب کوئی قند کو اور سونے چاندی کے ورق کو مقصود سمجھ لے اور اسی کا طالب اور خریدار رہے اور اسی کو طبیب سمجھے جو قند اور ورق دے تو یہ غلطی ہوگی یا نہیں۔ اصل مقصود بخار کی دوا ہے چاہے کیسی ہی کڑوی کیوں نہ ہو اور اسی سے بخار کو فائدہ ہوگا۔ قند اور ورق اس پر ہوں تو خوش گواہی کا باعث ہے اور نہ ہوں تو مقصود میں کچھ خلل نہیں۔ قند اور ورق کی تلاش میں اتنا مت پڑو کہ اصل دوا ہی سے رہ جاؤ اور اسی کو طبیب کی قابلیت اور شفقت کا معیار مت سمجھو، ایسا نہ ہو کہ اس دھوکہ میں بخار بڑھ جاوے اور ہڈیوں میں رچ جاوے اس وقت یہ قند اور ورق کام نہ آویں گے۔ غرض کام کی چیز دوا ہے اور قند و ورق صرف حلق میں اتر جانے کے معین ہیں۔ اب سمجھو کہ حالات اور کیفیات قند اور ورق کے مثل ہیں کہ طالب کے لئے سلوک میں باعث ازدیاد شوق ہوتے ہیں یہ خود مقصود نہیں ہیں کہ ان کے حاصل ہونے کے بعد اصلی چیز یعنی تقرب الی اللہ کی ضرورت نہ رہے اور تقرب الی اللہ عبودیت سے ہوتا ہے۔ عبودیت کا حاصل ابھی باقی ہے اور عبودیت نام ہے اعمال کا یعنی دین کے اجزاء خمسہ کی تکمیل کا جو کہ عبادات اور معاملات اور عادات اور معاشرات اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ اصل دوا یہ ہے کہ

کیفیات اور حالات قند وورق ہیں، ان پر مت بھولو، ان کو ذریعہ اور معین سمجھو اور مقصود پر نظر رکھو، نری کیفیات سے کچھ نہیں ہوتا۔ عرفی سچ کہہ گیا ہے:

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال   صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

''اگر اے عرفی صرف رونے سے محبوب مل جاتا تو سو برس تک میں رونے کی تمنا کرتا۔''

اصل مقصود عمل ہے:

یہاں تک تو دونوں فریق کی کوتاہی کا بیان ہو گیا، سو یاد رکھو کہ جنت اور جو کچھ آخرت میں ملے گا وہ عمل سے ملے گا نہ علم اور حال سے، اسی واسطے کہتے ہیں **فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ وَتَرَی الْمَلٰٓئِکَةَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ** اور دیکھو گے فرشتوں کو پرے کے پرے عرش کے آس پاس کہ تسبیح کرتے ہوں گے حق تعالیٰ کی اور حمد کرتے ہوں گے۔ تسبیح کہتے ہیں تنزیہ کو صفات رذیلہ سے اور تحمید کہتے ہیں اثبات صفات جمیلہ کو **وَقُضِیَ بَیْنَھُمْ بِالْحَقِّ** ترجمہ: اور بندوں کے درمیان یہ حکم اور فیصلہ بالکل صحیح طور پر کیا ہوا ہوگا یعنی ان کے اعمال کی یہ جزا ہوگی کسی کا حق مارا نہ جاوے گا، **قضی** کے لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ ہوگا خدائے تعالیٰ کے حکم سے ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی حکومت اور الوہیت اور اہل جنت کی عبودیت اب بھی ختم نہ ہو جائے گی۔ الوہیت تو کیا ختم ہوتی اس کا ظہور بھی ختم نہ ہوگا۔ یہ اس کا ظہور ہی تو ہے کہ فرشتے تسبیح اور تحمید برابر کرتے ہوں گے جیسا کہ اب کرتے ہیں۔

ذکر اہل جنت کی طبیعتوں میں داخل ہوگا:

اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جب فرشتے ذکر کرتے ہوں گے تو اہل جنت بھی ذکر کرتے ہوں گے کیونکہ ذکر تمام نعمتوں سے اعلیٰ نعمت ہے۔ جب فرشتوں کو نصیب ہے تو اہل جنت کو کیوں نصیب نہ ہوگی، اصل مقصود تو جنت سے نعمتیں ہی دینا ہے اور مستقل نصوص سے بھی ان کا مشغول ذکر ہونا ثابت ہے **لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْھَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِیْمًا اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ دعواھم فیھا سبحنک اللھم** (اس میں لغو اور گناہ کی بات نہیں سنیں گے سوائے سلام سلام کی بات کہیں اور کہیں گے سب تعریفیں اللہ کے لائق ہیں جس نے ہم سے رنج والم دور کرنا ہے) اور خود اس مقام پر ہے **وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَہٗ** (اور سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنا وعدہ تم سے سچا کیا) ہاں اہل جنت اس کے مکلف نہ ہوں

گے یعنی ایسا نہ ہوگا جیسا دنیا میں ہے کہ یہاں ذکر کرنے کا حکم ہے اور طبیعتوں میں تقاضے اس کے خلاف رکھے ہوئے ہیں جو ذکر سے مانع ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے ذکر کے لئے قصد و اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے اور ذکر سے یہاں تکان بھی ہوتا ہے مگر وہاں نہ قصد کی ضرورت ہوگی، نہ اہتمام کی ، نہ ذکر سے کچھ تکان ہوگا بلکہ ذکر داخل طبیعت ہوگا اور اندر سے خود طبیعت کے فعل سے ذکر برابر ہوتا رہے گا جیسے یہاں سانس لینے کا حال ہے کہ یہ بھی ایک حرکت ہے اور بہت سے اعضاء کے فعل سے اس کا وجود ہوتا ہے مگر اس کے لئے قصد کی ضرورت ہے نہ کہ اہتمام کی حتیٰ کہ سوتے میں بھی خود بخود جاری رہتا ہے اور نہ اس سے کچھ تکان ہوتا ہے بلکہ قوت اور بقائے حیات سب اس پر موقوف ہے۔ اسی طرح جنت میں ذکر ہوگا کہ سانس کے ساتھ خود تسبیح اور تحلیل سب جاری ہوگی۔ ذاکرین کے لئے بڑے بڑے مزے کی بشارت ہے کہ وہاں پاس انفاس جاری ہوگا اور بے تکان ہر وقت مزے لیں گے اور دنیا کی طرح کسی وقت تھک کر بند کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

ذکر محبوب سننے میں عجیب لذت:

فرشتوں کے ذکر میں اہل جنت کو ایک لطف اور ہے جس کو عشاق جانتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ محبوب کا ذکر اپنی زبان سے تو لذیذ ہے ہی محبوب کے ذکر کا دوست سے سننا بھی لذیذ ہے۔ اہل ذکر اور اہل قلب اسی واسطے تو سماع پر مرتے ہیں۔ سماع سے مراد سمع مروج مع مزامیر نہیں **لا حول و لا قوۃ** یہ تو ایسا ہے جیسے فرینی میں غلیظ ملا دینا، ذکر مامور بہ اور محمود شے ہے جسے فرینی لطیف اور مرغوب چیز ہے اس میں مزامیر کو ملا دینا ایسا ہے جیسا فرینی میں غلیظ ملا دینا یہ کثیف اور نا مرغوب اور قابل نفرت چیز ہے۔ سماع سے مراد اچھی آواز کے ساتھ دوسرے سے کوئی اچھا کلام سن لینا مثلاً قرآن شریف کسی خوش آواز قاری سے سننا یا کوئی شعر اشعار متعلق سلوک دوسرے سے سن لینا چونکہ ذاکر اپنی زبان سے ذکر کرتے کرتے اس سے ایسا مانوس ہو جاتا ہے کہ اس سے التذاذ باقی نہیں رہتا یعنی اس کی لذت کا حس نہیں رہتا اس وقت کان سے جو ذکر سنتا ہے اس سے زیادہ لذت پاتا ہے حتیٰ کہ اضطرار کی سی حالت ہو جاتی ہے کہ بلا اس کے چین ہی نہیں آتا۔ حقیقی سماع یہ ہے کہ جس میں لوگوں نے اس قدر غلو کیا ہے کہ محتاج بیان نہیں۔ اس کی اصل یہ ضرور ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے سے قرآن سنا تھا۔ بس اس کو بعض لوگوں نے آڑ بنا کر تمام لہو ولعب اور منہیات کا دروازہ کھول دیا۔ انصاف سے دیکھئے اس سے تو صرف اتنا ہی سماع ثابت ہوتا ہے جتنا

میں نے بیان کیا اور اگر اس میں کوئی توسع کرے تو ایسا ہوگا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کھانا پینا بھی ثابت ہے تو کیا اس سے گندی چیزوں کے کھانے کا بھی ثبوت ہو جاوے گا۔ غرض محبوب کے ذکر کا سننا بھی لذیذ ہے۔ اس واسطے فرشتے ذکر کرتے ہوں گے تاکہ یہ لذت بھی اہل جنت کو حاصل ہو۔

ربط آیات متلوہ:

جنت میں حوروں کا گانا بجانا بھی ہوگا کیونکہ یہ بھی لذت سے خالی نہیں مگر کہاں حوروں کا گانا بجانا کہاں ملائکہ کی تسبیح اور ذکر وہاں مذاق بالکل صحیح ہوں گے اس لئے جو لذت ذکر میں آوے گی وہ گانے بجانے میں نہیں آوے گی۔ **قضی بینھم** (ان کے درمیان فیصلہ کیا جائیگا) کو ما قبل سے ربط یہ ہے کہ بمنزلہ ذکر نتیجہ بعد القیاس کے ہے جیسے کہا جاتا ہے **العالم حادث لانہ متغیر و کل متغیر حادث فی العالم حادث**۔ پہلے **العالم حادث** کو بصورت دعویٰ کے لایا جاتا ہے پھر اس پر دلیل قائم کی جاتی ہے جس کو قیاس کہتے ہیں اس سے وہ دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے۔ اب اس کو پھر دہراتے ہیں اور اب اس کو نتیجہ کہتے ہیں۔ ان آیات میں توحید کا اثبات تھا اور شرک کی نفی تھی **قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْنِّیْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِکَ لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ** میں یہ دونوں دعویٰ مذکور ہیں۔ اس کو آئندہ آیات کے ساتھ تعلق ہے جو دعویٰ دلیل کے ساتھ ہوتا ہے جیسے **العالم حادث** کو **لانہ متغیر حادث** کے ساتھ تعلق ہے۔ آئندہ آیات میں معاد کا ذکر ہے اور یہ ذکر جیسا کہ میں نے شروع میں بیان کیا تھا، اسی مضمون توحید کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے تاکہ قدرت حق تعالیٰ کی ثابت ہو جاوے اور اس خیال کا موقعہ کسی کو نہ رہے کہ حق تعالیٰ کسی بات سے عاجز ہیں اور اس بات کے لئے دوسرے خدا کی ضرورت ہے جیسا کہ بعض مشرکین نے کہا تھا کہ سات معبود ہیں۔ بڑے بڑے کاموں کے لئے خدا ہے جو آسمان میں ہے اور معمولی کاموں کے لئے اور ہیں۔

آثار کمال بھی حق تعالیٰ کے لئے ہے:

معاد کے تمام کارخانہ کے بیان سے ظاہر ہو گیا کہ کمال بھی حق تعالیٰ ہی کے لئے ہے اور آثار کمال بھی حق تعالیٰ ہی کے لئے ہیں۔ کوئی تصرف کسی دوسرے کے لئے نہیں ہے۔ اس سے ربوبیت کے آثار بھی ظاہر ہو گئے اور اُلوہیت کے بھی اور اس سے توحید کی تاکید ہو گئی اور ثابت ہو گیا کہ تکوین بھی حق تعالیٰ ہی کا حق ہے اور تشریع بھی، تکوین اثر ربوبیت ہے اور تشریع اثر اُلوہیت

مضمون معاد سے ان سب باتوں کی اچھی طرح تاکید ہوگئی۔ اب ان دونوں لفظوں میں پھر اسی توحید اور ربوبیت اور الوہیت کے مضمون کا اعادہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ میں اُلوہیت کا بیان ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں ربوبیت کا اور کلام کو ختم کیا مضمون ربوبیت پر اس سے کس قدر رافت ورحمت ٹپکتی ہے۔ معاد کا بیان ختم ہوا۔

ضرورت مدارس:

میں نے اول ہی میں کہہ دیا تھا کہ ان آیات سے مقصود اثبات توحید اور نفی شرک کا بیان کرنا ہے اور ساتھ ساتھ حق تعالیٰ نے شکایت کی ہے اپنے حقوق نہ پہچاننے کی اور یہ حقوق بہت ہیں، ان کے پہچاننے کے لئے علم کی ضرورت ہے اور ایک قسم کے علم کی ضرورت نہیں بلکہ متعدد علوم کی ضرورت ہے۔ علم عقائد کی اور علم احکام کی، عبادات کی، معاملات کی، عادات کی، اخلاق کی اور ان علوم کے لئے بعض ان علوم کی بھی ضرورت ہے جو از جنس مبادی ہیں، جن کو علوم آلیہ کہتے ہیں جیسے صرف ونحو معقول فلسفہ ان سب کی تعلیم کے جو مجالس متکفل ہیں ان ہی کا نام مدارس ہے، اس سے مدارس کی ضرورت ثابت ہوگئی۔ چنانچہ اس ضرورت کو محسوس کر کے جابجا مدارس قائم کئے گئے ہیں جو فیض ان سے ہو رہا ہے وہ سب کو معلوم ہے اور ان مدارس کی ضرورت یاد دلانے اور شوق تازہ کرنے کے لئے ہر سال یہ علمی جلسے ہوتے ہیں، ان سے ان مجالس کی بھی ضرورت ثابت ہوگئی۔ غرض یہ ہے کہ کوئی کام بدون کئے نہیں ہوتا۔ اہل مدارس جو کام کر رہے ہیں اس میں دو وجہ سے ضرورت ہے سب کے شریک رہنے اور ہمدردی کرنے کی۔ ایک تو یہ کہ یہ کام ایک کے کرنے کا نہیں ہے۔ علماء کا کام درس وتدریس ہے تو دوسروں کا کام مالی امداد ہونا چاہئے۔ اگر علماء دونوں کام کریں تو ایک بھی نہیں ہوگا۔ دوسرے یہ کہ یہ کام صرف علماء کی ضرورت سے نہیں کیا جاتا کیونکہ دین کی ضرورت صرف علماء ہی کو نہیں ہے بلکہ ہر ہر فرد مسلمان کو اس کی ضرورت ہے تو کیا وجہ ہے کہ تمام کام علماء ہی کے ذمہ ڈال دیا جاوے۔ انصاف سے دیکھئے تو انہوں نے ایسا بار اپنے ذمہ لے رکھا ہے جو آپ سے نہیں اٹھ سکتا۔ دلیل اس کی یہ کہ اگر وہ کام جو آپ کر رہے ہیں علماء کرنے لگیں تو خیر میں یہ تو نہیں کہتا کہ آپ سے اچھا کرلیں گے گو اس دعویٰ کی بھی گنجائش ہے کیونکہ جس کام کو عوام کر سکتے ہیں اس کو اہل علم کیوں نہیں کر سکتے۔ تاہم برا بھلا تو کر ہی لیں گے اور وہ کام جو علماء کر رہے ہیں اگر آپ کریں تو برا بھلا نہیں کر سکتے لہٰذا آپ کو ان کا ممنون ہونا چاہئے اور غنیمت سمجھنا چاہئے کہ انہوں نے

آپ کے ذمہ ہلکا کام رکھا ہے اور خود بھاری کام لے لیا ہے۔ غرض آپ اپنا کام تندہی سے کئے جایئے وہ اپنا کام کر رہے ہیں اس طرح اس دینی کام کی تکمیل ہوسکتی ہے اور سب کو دینی فیض پہنچ سکتا ہے۔ یہ سب کا کام ہے تو سب کو بتانا چاہئے اور رہی نکتہ چینی، سو یہ ان کا کام ہے جو خود بھی کام کرنا نہیں چاہتے اور دوسرے کو بھی کام کرنے نہیں دیتے۔ ان کے دل میں دین کی ضرورت ہی نہیں ہے، لہٰذا اس کے ذرائع کی بھی ضرورت نہیں ہے اس لئے ان ذرائع کے نہ ہونے سے ان کے دلوں پر کچھ الم اور قلق کا اثر نہیں ہوتا۔ اس نکتہ چینی کے متعلق ذرا تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔

ضرورت مدارس کی عجیب مثال:

میں بعض واضح مثالوں سے اس کی خرابی سمجھا تا مگر بعض مثالیں ایسی ہیں کہ موجب ناگواری ہوسکتی ہے۔ اس واسطے ایک لطیف مثال پر بس کرتا ہوں جس سے توضیح مطلب ہو جاوے گی اور ناگواری بھی نہ ہوگی۔ وہ یہ ہے کہ یہ ان کی نکتہ چینی ایسی ہے جیسے فرشتوں نے کہا تھا جب ان کو خبر دی گئی کہ ہم زمین میں آدم کو خلیفہ بنانے والے ہیں تو انہوں نے کہا کہ **اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا** یعنی اے اللہ آپ اس کو خلیفہ بنائیں گے جو فساد کرے گا، اس کا حاصل یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک مضرت ان کے خلیفہ ہونے کی بیان کر دی۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس کے بعد حق تعالیٰ نے کیا کیا ان کے کہنے کا اتباع نہیں کیا اور اس اشکال سے حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کو ملتوی نہیں کر دیا۔ آپ کا مذاق اس وقت مدارس کے بارہ میں فرشتوں کے مذاق کے موافق ہے کہ آپ نے بھی ایک خرابی کی وجہ سے کام بند کر دینا مناسب سمجھا جیسے ملائکہ نے فساد کے اندیشہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی بعثت کو موقوف کر دینے کی رائے پیش کی تھی، مگر حق تعالیٰ نے اس مضرت پر نظر نہیں فرمائی بلکہ مصلحت کو مقدم رکھا۔

اصلاح در خرابی مدرسہ:

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر کسی کو مدرسہ کے متعلق کوئی اشکال بھی ہے تو یہ کیا ضروری ہے کہ مدرسہ کو جڑ سے اڑا دینے کی کوشش کی جاوے۔ اس خرابی کی اصلاح کی کوشش کیوں نہ کی جاوے۔ آخر جو منافع اور مصالح اور ضرورتیں مدرسہ کے ساتھ وابستہ ہیں وہ کیسے پوری ہوں۔ آپ کا ذہن تو وہاں گیا جہاں فرشتوں کا گیا کہ مضرت کی وجہ سے کام کو جڑ سے اڑا دیا جاوے۔ اس میں آپ پر اعتراض نہیں کیا جاتا بلکہ تعریف کی جاتی ہے کہ آپ کا مذاق فرشتوں کا سا مذاق ہے

لیکن اس کے مقابلے میں دوسرا مذاق اس سے بھی اعلیٰ موجود ہے، وہ ہے جس طرح حق تعالیٰ کا ارادہ ہوا کہ مصلحت کا القا کیا جاوے اور خرابی کو رفع کیا جاوے، یہ مذاق ظاہر ہے کہ اعلیٰ اور ارفع ہے۔ ایسا ہی آپ بھی کیجئے کہ اصلاح کیجئے اور جڑ سے نہ اڑایئے، جڑ سے اڑانے پر ایک افیمی کا قصہ یاد آیا کہ افیم کی پینک میں تھے، ایک مکھی ان کی ناک پر بار بار آ کر بیٹھتی تھی، کئی دفعہ اڑایا مگر بعض مکھی ضدی ہوتی ہے کہ جہاں سے اڑاؤ وہیں آ کر بیٹھتی ہے۔ یہ بہت تنگ ہوئے اور ایک دفعہ غصہ میں آ کر اپنی ناک کو استرہ سے کاٹ ڈالا، اور کھالے حرام زادی اب بیٹھ کہاں بیٹھے گی؟ ہم نے تیرا اڈا ہی نہیں رکھا۔ حضرت یہ جڑ سے اڑانا تو ایسا ہے کہ مکھی کا تو کچھ بھی نہ بگڑا ان صاحب کی ناک گئی، اسی طرح آپ مدرسہ کو جڑ سے اڑا دیں گے تو علماء کا کیا بگڑے گا۔ ابواب رزق بہت سے ہیں وہ اور کوئی مشغلہ تلاش کر لیں گے مگر آپ کی ناک جاتی رہے گی یعنی دینی فیض سے محروم ہو جاؤ گے۔ اس پر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم نکتہ چینی اور اعتراض نہیں کرتے بلکہ اصلاح ہی چاہتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اس سے مخالفت مقصود نہیں ہے۔ میں اس کے متعلق ایک اصول عرض کرتا ہوں۔ اس کو پیش نظر رکھ کر جو کچھ کرنا ہو کیجئے۔ وہ یہ ہے کہ معاملہ خدا کے ساتھ درست کرو جو کچھ کرو اس میں یہ دیکھ لو کہ اس میں ہماری غرض اور نفسانیت شامل ہے یا نہیں اور کسی کے کہنے سننے کی پروا مت کرو، خدا کو حاضر و ناظر جان کر بات کہو، اگر تمہارا دل گواہی دیتا ہے کہ ہمارا معاملہ حق تعالیٰ کے ساتھ صاف ہے اور اس میں کوئی غرض اور خواہش شامل نہیں ہے تو شوق سے کہو۔ اس وقت وہ ضرور ایسی بات ہوگی جو اصلاح کے متعلق ہوگی مگر میں اس کی کچھ علامتیں بھی بتائے دیتا ہوں کیونکہ بعض وقت اپنے ہی فعل میں التباس ہو جاتا ہے اور آدمی سمجھتا ہے کہ یہ میرا فعل خالصاً لوجہ اللہ ہے حالانکہ اس میں بہت سی نفسانیتیں شامل ہوتی ہیں۔

لوجہ اللہ بات کہنے کی علامت:

ایک علامت یہ ہے کہ جو بات لوجہ اللہ ہوتی ہے وہ دل آزار پیرایہ میں نہیں ہوتی، نہ سخت لہجہ میں ہوتی ہے بلکہ ایسی شفقت اور ہمدردی کے ساتھ ہوتی ہے جیسے باپ بیٹے کا کوئی عیب دیکھتا ہے تو اس کو آہستہ سے علیحدگی میں سمجھاتا ہے اور کسی کے سامنے گاتا نہیں پھرتا نہ اخباروں میں شائع کرتا ہے حتیٰ کہ اگر دس برس بھی بیٹا اس کا کہنا نہ مانے تب بھی اس کو یہ گوارا نہ ہوگا کہ کوئی دوسرا آدمی اس کے عیب کو سن لے اور جب سمجھائے گا علیحدگی میں سمجھائے گا، ایسا نہ ہوگا کہ جیسے آج کل مدرسوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ ذرا سی بات خلاف طبع پائی اور جھٹ سے اشتہار مخالف میں شائع

کردیا، اخباروں میں دھوم مچادی اور ساتھ کے ساتھ لکھتے جاتے ہیں کہ ہم کو اصلاح مقصود ہے، ہم مدرسہ کے بدخواہ نہیں ہیں۔ صاحبو! اس علامت کو پیش نظر رکھ کر دیکھئے کیا آپ کا برتاؤ اپنے بیٹے کے ساتھ یہی ہوتا ہے کہ ذرا سا عیب اس میں دیکھیں اور اخبار میں شائع کردیں اور کیا اس کو بھی اس لہجہ میں سمجھاتے ہیں جس لہجہ میں مدرسہ والوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ اگر حق پسند آدمی ہے تو وہ اسی سے بیئت اور نفسانیت کو پہچان سکتا ہے۔

اہلیت کی علامت:

ایک علامت یہ ہے کہ آدمی غور کر کے دیکھے کہ اگر میں ان کی جگہ ہوتا جو مدرسہ میں ہیں اور وہ میری جگہ ہوتے اور وہ مجھ پر اعتراض کرتے تو کیا ان کے اعتراض کو میں ٹھنڈے دل سے سنتا یا مجھے اس سے ناگواری ہوتی۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر اس پر نظر کرے، اگر دل میں دوسرے کے اعتراض سے ناگواری پائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ تم میں اہلیت اور اصلاح کچھ نہیں، صرف تعنت ہے اور یہ جتلانا چاہتے ہو کہ ہم بھی اہل رائے ہیں اور ایک علامت اہلیت کی یہ ہے کہ اپنی بات پر بہت اصرار نہیں ہوتا، صرف حق کو واضح کردینا اور سمجھا دینا ہوتا ہے۔ دیکھو حق تعالیٰ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جا بجا فرمایا

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل دوزخ کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا- اور ان پر مضمون نہ ہوں اگر یہ اعراض کریں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا گیا- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ صرف احکام شریعت کا پہنچانا ہے) وغیرہ وغیرہ جب کفار کے ساتھ بھی یہ معاملہ تعلیم فرمایا گیا ہے تو اہل اسلام کے ساتھ تو کیا ہونا چاہئے، پس جس کو مدرسہ کی اصلاح مقصود ہوتی ہے وہ ایک بار اپنی رائے پیش کر کے اس پر اصرار نہ کرے گا۔

نہ مدرسہ والوں کے درپے ہوگا۔ یہ علامتیں ایسی ہیں جن سے للّٰہیت اور نفسانیت میں بخوبی فرق کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ آدمی انصاف پسند ہو اور عناد نہ رکھتا ہو، دین کے کام میں شیطانیت اور نفسانیت کو شامل نہ کرو، حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صاف رکھو اگر معاملہ حق تعالیٰ کے ساتھ درست ہے اور للّٰہیت کے ساتھ بات کہی گئی ہے تو بات دل کو لگ جاتی ہے اور ہر شخص کے دل پر اثر کرتی ہے اور یہ بات ایک ہی فریق سے نہیں کہی جاتی ہے بلکہ دوسرے فریق سے بھی بلکہ ہر شخص سے کہی

جاتی ہے کہ جو کام کرو خلوص اور للّٰہیت سے کرو، نفسانیت سے نہ کرو ورنہ برکت جاتی رہتی ہے چاہے کیسا ہی نیک کام اور چاہے ذرا سا کام ہو مگر خلوص کے ساتھ ہو تو اس میں برکت ہوتی ہے، چاہے اس کا کوئی بھی معاون نہ ہو۔ دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جس وقت آپ نے تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا ہے کون سا مجمع تھا کہ امید کی جاسکتی تھی کہ یہ کام چلے گا مگر اس میں خلوص ہی خلوص تھا، اس کا نتیجہ دیکھ لیجئے کہ کام کیسا چلا کہ آج تمام عالم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام موجود ہیں۔ کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں مسلمان نہ ہوں۔

اہل مدرسہ سے ضروری گزارش:

میں تو اہل مدرسہ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ مخالفین کے اعتراضات کے دفعیہ وغیرہ کی بھی کوشش نہ کریں، یہ بھی ایک مشغلہ ہے، اپنا کام خلوص سے کئے جاویں۔ سب شور وغل آپ ہی دب جاویں گے۔ اب دعا کیجئے۔ (ختم 10 بجکر 55 منٹ پر)

ایک علم غیر منقول:

بعد وعظ خواجہ عزیز الحسن صاحب نے حضرت والا سے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ جنت میں کسی کو کھیتی کی خواہش ہوگی تو فوراً کھیتی تیار ہو کر خرمن میں غلہ کا انبار موجود ہو جائے گا۔ اس میں کیا حظ ہوگا؟ حظ تو اس میں ہو سکتا ہے کہ زمین جوتی گئی، کاشت ہوئی، کھیتی ہری ہری پیدا ہوئی، کاٹی گئی، تب دانہ تیار ہوا۔ ایک عرصہ تک مشغلہ رہا۔ بہت سے لوگ جمع رہے، ہنسنا بولنا رہا، علیٰ ہذا جنت میں اولاد کی خواہش کسی کو ہوگی تو فوراً برابر کا لڑکا پلا پلایا تیار ہو جاوے گا، اس میں بھی کیا حظ ہوگا؟ حظ تو بتدریج پرورش کرنے میں ہوتا ہے۔ فرمایا وہاں مذاق بالکل صحیح ہوں گے، اصل مقصود پر نظر ہوگی، حصول مقصد سے حظ ہوگا یہ یہاں کی بدمذاقی ہے کہ ذرائع میں لطف آتا ہے حالانکہ ان میں مصائب بھی ہیں۔ کہیں بیل مر گیا، کہیں پانی کم برسا، کھیتی خراب ہوگئی، علیٰ ہذا کہیں حمل کی تکلیف، کہیں وضع کی، کہیں بچہ کی بیماری کی، دنیا میں طبیعتیں ان ہی بکھیڑوں کی خوگر ہوگئی ہیں اس واسطے حظ آتا ہے جیسے بھنگی کے دماغ میں غلیظ کی بو بس جاتی ہے تو اس سے اس کی طبیعت مانوس ہو جاتی ہے ورنہ یہ بکھیڑے کوئی حظ کی چیز نہیں اور یہ بھی عرض کیا کہ حوریں نہایت ہی حسین ہوں گی؟ فرمایا جی ہاں، ان کے حسن کا بیان نہیں ہو سکتا۔ حور دراصل ایک دوسری ہی مخلوق ہے۔ از جنس انسان

نہیں ہے جنت کی مخلوق ہے، عورتوں کے ساتھ اس کو اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ اور کوئی نظیر اس کی یہاں موجود نہیں۔ **ثم بحمد الله الذی بعزته و جلاله تتم الصالحات.**

التماس کاتب:

یہ وعظ احقر نے اپنے عزیز بھائی مولوی حکیم محمد یوسف مرحوم کی طرف سے لکھا ہے۔ عزیز مرحوم وعظ نویسی کے بہت دلدادہ تھے۔ پیشہ طبابت چھوڑ کر بے حد محنت اور جانفشانی کے ساتھ مختصر نویسی سیکھی اور تھانہ بھون میں حضرت والا کے قدموں جا پڑے اور وعظ لکھتے رہے۔ بہت سے وعظ ان کے لکھے ہوئے آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی اور 1339ھ میں انہوں نے انتقال کیا۔ حضرت رحمہ اللہ کو ان کے ساتھ اس قدر انس تھا کہ بعد انتقال بار بار فرمایا کہ بعض اپنے عزیزوں کا رنج میرے دل سے بھول گیا مگر مولوی یوسف کا رنج نہیں بھولتا۔ ناظرین دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ اس وعظ کا ثواب ان کو پہنچا دیں اور جنت الفردوس میں ان کو اعلیٰ درجہ عطا فرمائیں اور جس کسی کو اس وعظ سے کتابت کا یا تصحیح کا یا طبع کا کوئی تعلق ہو سب پر نظر رحمت فرماویں اور حضرت مدظلہ کے فیض مواعظ کو تا بمد تہائے دراز قائم رکھیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

یہاں ایک خواب بھی لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو از قبیل مبشرات ہے، بعد انتقال عزیز مولوی محمد یوسف مرحوم کے احقر محمد مصطفیٰ نے ایک روز بحالت اطمینان خواب میں دیکھا کہ عزیز موصوف سخت بیمار ہیں اور حضرت مولانا مدظلہ ان کے پاس تشریف لائے ہیں۔ ایک شخص نے آ کر کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ مولوی یوسف کی شان میں ایک قصیدہ آسمان سے اترا ہے وہ قصیدہ اس شخص نے سب کے سامنے پڑھا جس میں ایک مصرع یہ بھی تھا:

آنکہ نامش یوسف جناں نشاں

اس قصیدہ کو سن کر حضرت مولانا نے فرمایا کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ مولوی یوسف اس مرض سے جانبر نہیں ہوں گے۔ اس کو سن کر مولوی یوسف پر رنج کا اثر ہوا، لیکن طبیعت کو سنبھال کر کہا کہ میں حق تعالیٰ کے حکم پر بخوشی راضی ہوں، اس کے بعد احقر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ قصیدہ پورا یاد تھا، چاہا کہ فوراً اٹھ کر پنسل کاغذ لے کر لکھ لوں لیکن اٹھتے اٹھتے سب ذہن سے اتر گیا۔ صرف مصرعہ مذکور یاد رہ گیا۔ تعبیر اس کی بالکل ظاہر ہے۔ حق تعالیٰ اس کو وقوع میں لائیں اور حضرت مولانا کا ان کے

سامنے یہ لفظ کہنا کہ تعبیر یہ ہے کہ مولوی یوسف جانبر نہ ہوں گے اور ان کا صبر کرنا دلیل شہادت نصیب ہونے کی ہے خدا ہم چنیں کنا د اور حضرت مولانا کا یہ دل شکن لفظ بحالت مرض ان کے سامنے کہنا خلاف رحم وشفقت نہیں ہے کیونکہ بجنسہ یہی واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم بوقت وفات تشریف لائے اور آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ تم اس مرض سے جانبر نہیں ہو گی۔ انہوں نے عرض کیا میں حق تعالیٰ کے حکم کو بخوشی قبول کرتی ہوں، اس کے بعد رحلت فرما گئیں۔

حضرت فاطمہؓ اس واقعہ کو دیکھ ہی رہی تھیں کمال تعجب ہوا کہ باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے خاص محبت تھی، مرتے وقت ایسا دل شکن لفظ کیوں فرمایا؟ آخر بعد ان کی وفات کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اس میں کیا مصلحت تھی؟ ارشاد فرمایا میں نے ان کا نامہ اعمال دیکھا تو کوئی نیکی ایسی نہ تھی کہ ان میں نہ ہو، سوائے شہادت کے۔ اس واسطے میں نے یہ تدبیر کی کہ ان کو ایک رنج پہنچایا جاوے اور وہ اس پر صبر کریں اور شہادت سے محروم نہ جائیں چونکہ اس وعظ میں زیادہ تر جنت ہی کا بیان ہے اور ایسا بیان ہے کہ شاید حضرت والا کے دوسرے کسی وعظ میں اس جنت کا ایسا بیان نہیں ہوا اس واسطے یوسف جنت نشاں کے ایصال ثواب کے لئے یہ وعظ النسب ہوا۔ نیز یہ وعظ دوسرے وعظوں سے طریقہ بیان میں ممتاز اور نئی شان کا ہے جیسا کہ وعظ شروع میں تحریر کیا گیا ہے اور یوسف مرحوم وعظ کے زیادہ دلدادہ تھے اس واسطے بھی ان کے لئے مناسب ہوا۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم مرحوم نے ایک لڑکا خوردسال چھوڑا ہے اور ان کی تمنا تھی کہ خدائے تعالیٰ اس کو عالم باعمل کریں۔ ناظرین اس کے لئے بھی دعا فرماویں۔

ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا انک رؤف رحیم. صلی اللہ تعالی علی رسوله النبی الامی الکریم . آمین

خَیرُ الحَیَاتُ
و
خَیرُ المَمَاتُ

یہ وعظ ۱۴ شعبان المعظم ۱۳۳۴ھ، بمقام مکان موقوفہ حضرت حکیم الامتؒ تھانہ بھون حضرت والا نے ارشاد فرمایا جس کو شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے قلمبند فرمایا مردوں کے علاوہ سامعین میں ۶۵ مستورات بھی تھیں.

موت کے متعلق لوگوں کے عقائد صحیح نہیں۔ اگر موت کے متعلق عقیدہ درست کرلیا جائے تو یہ خوف بہت کم ہو جائے گا۔ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ مر کر آدمی ایک گھڑے میں اکیلا جا پڑتا ہے اور تمام لذات سے محروم ہو جاتا ہے۔ سو یہ بالکل غلط ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے لوگوں کو موت کی حقیقت بھی معلوم نہیں۔ یاد رکھو کہ موت صرف جسم عنصری کو آتی ہے۔ روح کو موت نہیں آتی۔ بلکہ موت سے صرف اس کا تعلق جسم عنصری سے منقطع ہو جاتا ہے۔

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَھُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاھُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُطُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ

(البقرہ: ۲۴۳ تا ۲۴۵)

(کیا تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو اپنے گھروں سے نکل گئے تھے اور وہ لوگ ہزار ہی تھے موت سے بچنے کے لئے سو اللہ نے ان کے لئے فرما دیا کہ مر جاؤ، پھر ان کو جلایا بیشک اللہ بڑا فضل کرنے والے ہیں لوگوں پر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور اللہ کی راہ میں قتال کرو اور یقین رکھو اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے اور جاننے والے ہیں اور کون شخص ہے کہ اللہ کا قرض دے اچھے طور پر قرض دینا پھر اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر بہت سے حصے کر دے اور اللہ کمی کرتے ہیں اور فراخی کرتے ہیں اور تم اسی طرف لے جائے جاؤ گے)

مقصود بالذات:

ان آیات میں حق تعالیٰ نے ایک مقصود کی تاکید کے لئے ایک قصہ بیان فرمایا ہے اس کے بعد مقصود کی تصریح اور اس کے متعلقات ہیں۔ یہ حاصل ہے ان آیات کا ہر چند کہ اس وقت مجھے ایک خاص

مقصود کے متعلق کچھ بیان کرنا ہے اور اس کی تائید و تاکید کے لئے ان آیات کو تلاوت کیا ہے مگر ان آیات میں جو مقصود بالذات ہے وہ مجھ کو اختلاف غرض سے مقصود تبعاً ہے اور جو مقصود بالغیر ہے وہ اسی اختلاف غرض سے مجھے اس وقت مقصود بالذات ہے کیونکہ جیسے مقصود بالغیر کو مقصود بالذات کے ساتھ ارتباط ہوتا ہے ایسے ہی برعکس کہ مقصود بالذات کو بھی مقصود بالغیر سے ارتباط ہوتا ہے۔ پس جس طرح مقصود بالذات کے ساتھ ارتباط کی وجہ سے مقصود بالغیر کو بیان کیا جاتا ہے ایسے ہی مقصود بالغیر کے ساتھ اسی ارتباط کی وجہ سے مقصود بالذات بھی تبعاً بیان ہو سکتا ہے باقی اس کا مضائقہ نہیں کہ مقصود بالذات خصوصیت و داعی کی وجہ سے مقصود بالغیر ہو جائے اور مقصود بالغیر مقصود بالذات ہو جائے۔ چنانچہ ان آیات میں **مقصود بالذات تو وقاتلوا فی سبیل اللہ** (اللہ کی راہ میں قتال کرو) ہے اور اصل مقصود مقام تشجیع بر قتال ہے اور اس کی تائید و تاکید کے لئے سیاق میں ایک قصہ امم ماضیہ کا آیت **اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ** (کیا تم کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو اپنے گھروں سے نکلے تھے اور وہ لوگ ہزار تھے موت سے بچنے کے لئے) میں مذکور ہوا ہے مگر مجھے اس وقت یہی قصہ مقصود بالذات ہے اور استطراداً مقصود مقام کا بھی بیان کر دیا جائے گا۔ پھر سیاق میں آیت **مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا** (اور کون شخص ہے کہ اللہ کو قرض دے اچھے طور پر قرض دینا) میں **انفاق فی سبیل اللہ** (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) ذکر ہے۔ یہ متعلقات مقصود میں سے ہے کیونکہ قتال کے لئے انفاق کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ دوسرے خود انفاد بھی مثل قتال کے طاعت معتد بہ ہے جس کا نفع متعدی ہے اس لئے بھی اس کو مقصود و مقام سے مناسبت ہے یہ تو مقصود و بیان کی تعیین تھی اور سبب داعی یہ ہے کہ اس وقت بعض امراض شدیدہ کی وجہ سے لوگ پریشان ہیں جو آج کل یہاں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ ہیں بھی شدید مگر نہ اس درجہ جتنا کہ ان کو شدید سمجھ لیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی ناراضگی سے ڈرنے کی ضرورت:

ہماری حالت یہ ہے کہ جس چیز سے ڈرنا چاہئے یعنی جو چیز ڈرنے کی ہے اس سے تو نہیں ڈرتے اور نہ ڈرنے کی چیز سے ڈرتے ہیں۔ ڈرنے کی چیز حق تعالیٰ کی ناراضی اور غضب ہے مگر اس سے ہم بالکل بے پرواہ ہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی لوگوں نے کچھ اپنی حالت کی اصلاح نہیں کی جو شخص جس گناہ میں مبتلا ہے، اسی میں مبتلا ہے۔

بیماری ڈرنے کی چیز نہیں:

بیماری جو در حقیقت ڈرنے کی چیز نہیں ہے اس سے بہت ڈرتے ہیں۔ اس حالت کو دیکھ کر تو

یوں کہنا چاہئے کہ ہم اس بیماری سے اتنا ڈرتے ہیں کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ سے بھی اتنا نہیں ڈرتے جیسا کہ شیخ سعدی رحمہ اللہ اسی کے مناسب ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

گر وزیر از خدا بتر سیدے ہمچناں گز ملک ملک بودے

''کہ اگر وزیر خدا تعالیٰ سے اتنا ڈرتا جتنا بادشاہ سے ڈرتا ہے تو فرشتہ ہو جاتا۔''

یہاں شیخ رحمتہ اللہ نے دو شکایتیں کی ہیں۔ ایک خدا تعالیٰ سے نہ ڈرنے کی، دوسرے بادشاہ سے اس قدر ڈرنے کی یعنی عقل کا مقتضا تو یہ تھا کہ خدا تعالیٰ سے ڈرتا اور بادشاہ سے اس قدر نہ ڈرتا کیونکہ بادشاہ تو ایک ہم ہی جیسا آدمی ہے فی الحقیقت وہ ڈرنے کی چیز نہیں مگر یہاں معاملہ برعکس ہے پھر اگر خدا تعالیٰ سے اتنا ہی ڈرتے جتنا ایک حاکم اور بادشاہ سے ڈرا کرتے ہیں تو ایک درجہ میں تساوی ہو جاتی اوسط برابر ہو جاتا مگر یہاں تو یہ غضب ہے کہ خوف خدا کو خوف حاکم کے ساتھ مساوات کی بھی نسبت نہیں۔ گویا نعوذ باللہ حاکم کا خوف خوف خداوندی پر غالب ہے یہی حالت جہالت کی وجہ سے یہاں ہو رہی ہے جہل کا یہ اثر ہوا کہ بیماری سے جتنا نہ ڈرنا چاہئے تھا اتنا ہی ڈرنے لگے حالانکہ بیماری ڈرنے کی چیز نہیں کیونکہ بہت سے بہت یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسباب موت میں سے ہے سو اسباب موت سے کہاں تک ڈرو گے اس کے تو مختلف اسباب ہیں بعض دفعہ کسی ایسے سبب سے موت آ جاتی ہے جس میں طبیعت بہت ہی کمزور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بعض دفعہ کھانا کھاتے موت آ گئی، بعض دفعہ پانی پینے سے پھندا لگا اور مر گئے، بعض دفعہ سوتے ہوئے کسی جانور نے کاٹ لیا اور ختم ہو گئے۔ بعض دفعہ مکان گر پڑا اور دب گئے اور بعض دفعہ دفعتاً بیٹھے بیٹھے مر گئے جہاں بظاہر کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا مر جانے کے بعد لوگ اسباب تراشتے ہیں۔

مشیت حق ہمیشہ موثر ہوتی ہے:

اس کا سبب ضعف قلب یا انسداد حرکت قلب ہوا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ گڑھت ہمیشہ غلط ہی ہوتی ہے لیکن میں اس کا بھی معتقد نہیں کہ یہ اسباب تراشیدہ صحیح ہی ہوتے ہیں پھر ان میں بعض تو ایسے گھڑنے والے ہیں جو مشیت حق ہی کے معتقد نہیں بلکہ اسباب پر ہی ہر چیز کا مدار رکھتے ہیں حالانکہ حق تعالیٰ نے تعطیل اسباب فی بعض الاوقات کو جا بجا ظاہر کیا ہے اور اگر اسباب کی حقیقت پر غور کیا جاوے تو عقلاً بھی خدا تعالیٰ کی مشیت کو موثر ماننا ضروری ہے کیونکہ میں کہتا ہوں کہ جس حادث کے لئے آپ نے ایک دوسری شے کو سبب مانا ہے وہ سبب بھی تو ایک حادث ہے اس کے لئے کون سبب ہوا اگر اس کے لئے آپ نے تیسری چیز کو سبب بنایا ہم اس میں بھی کلام کریں گے تو اس سلسلہ ممکنات کو لامحالہ واجب پر منتہی کیا

جائے گا ورنہ تسلسل لازم آئے گا اور لاتناہی کے ابطال پر متکلمین دلائل قائم کر چکے ہیں۔

حکماء کی حماقت:

یہ حکماء کی حماقت ہے کہ وہ اجزاء عالم کو حادث بالشخص اور قدیم بالنوع کہتے ہیں کہ ہر ہر فرد تو حادث ہے مگر نوع قدیم ہے حالانکہ وہ خود اس کے بھی قائل ہیں کہ نوع کا وجود بدون شخص کے نہیں ہوسکتا پھر جب ہر شخص حادث ہے تو نوع قدیم کا تحقق کیسے ہوگا؟ غرض دلائل عقلیہ سے بھی اور نقلیہ سے بھی مشیت حق کا مؤثر اصلی ہونا ہر طرح ثابت ہے اور جو شخص ہر بات میں لا تسلیم ہی کا سبق پڑھ لے اس کا علاج متکلمین نے احراق بالنار (آگ میں جلانا) بتایا ہے۔

فطرۃً حق تعالیٰ شانہ کی ہستی اور قدرت ماننے کی چیز ہے:

فطرۃً بھی حق تعالیٰ کی ہستی اور قدرت ماننے کی چیز ہے اور ماننے کی چیز کو بھی نہ ماننا حکم کا تو کوئی بھی جواب نہیں جیسے ایک مجنون پاخانہ کھا رہا تھا، کسی نے ملامت کی تو کہا اس میں حرج ہی کیا ہے یہ تو وہی ہے جو تھوڑی دیر پہلے ہم نے داخل کیا تھا اب وہ ہمارے اندر سے نکل کر برا کیوں ہو گیا۔ ذرا عقلاً کسی عقلی دلیل سے اس کا جواب دیں مگر عرف اور طبیعت سے کام نہ لیں۔ محض عقلی دلیل سے اس کے دعوے کو باطل کریں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس کے ابطال پر وہ کوئی دلیل نہ قائم کر سکیں گے مگر کیا اس سے کوئی یہ کہے گا کہ اس مجنون کی بات صحیح ہے، ہرگز نہیں۔ سب یونہی کہیں گے کہ وہ نالائق پاگل ہے جو ماننے کی چیز کو بھی نہیں مانتا جو اجماعاً ماننے کی چیز ہے اس طرح ہم منکر صانع کو پاگل سمجھتے ہیں کیونکہ وہ بھی ایسے ماننے کی چیز کو نہیں مانتا جس کے ماننے پر اجماع عقلاً و اتفاق مذاہب ہے اور ضرورت فطرت اس پر مزید یہ تو کامل درجہ کی دہریت ہے کہ خدا تعالیٰ ہی کو نہ مانے اور اس کی قدرت مشیت کو کامل نہ مانے بلکہ یہ پہلی قسم سے بھی بدتر ہے کیونکہ یہ شخص خدا تعالیٰ کا قائل ہے اور محض برائے نام قائل ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ فلاں بادشاہ تو ہے مگر پنشن یافتہ ہے کہ اسے اختیارات کچھ نہیں۔

حق تعالیٰ شانہ کی کامل قدرت کو ماننے کی ضرورت:

چنانچہ بعض لوگ خدا تعالیٰ کو ایسا قادر مانتے ہیں جیسے گھڑی کا کوک دینے والا کہ کوک بھر دینے کے بعد گھڑی کے چلنے میں اس کے اختیار کو کچھ دخل نہیں بلکہ اب وہ خود بخود چلتی رہے گی چاہے کوک دینے والا زندہ ہو یا نہ ہو جب تک کوک بھری ہوئی ہے اس وقت تک گھڑی کو اس کی کچھ ضرورت

نہیں۔ایسے ہی یہ لوگ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا کام اتنا ہے کہ اسباب کو پیدا کر دیا اب اسباب سے مسببات اور علل سے معلولات کا وجود خود بخود ہوتا رہے گا۔نعوذ باللہ اس تاثیر و تاثر میں حق تعالیٰ کا کچھ اختیار نہیں وہ اسباب سے مسبب کو مختلف نہیں کر سکتے بس ان لوگوں کو خدا تعالیٰ کو ماننا ایسا ہے جیسے بعض لوگ من تشبہ بقوم فھو منھم (جس شخص نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی پس وہ ان ہی میں سے ہے) سے بچنے کے لئے کوٹ پتلون اور بوٹ سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنتے ہیں کہ ساری ہئیت تو کفار کی سی ہے صرف ٹوپی سے آپ مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ایسے ہی یہ لوگ حق تعالیٰ کے لئے قدرت واختیار (تو ایسا ضعیف مانتے ہیں جیسا کہ دہری منکر صانع مانتا ہے کیونکہ جیسا اختیار یہ مان رہے ہیں وہ بھی نہ ماننے کے مثل ہے مگر الزام دہریت سے بچنے کے لئے برائے نام یوں کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ موجود ہے اور بعض لوگ خدا تعالیٰ کو بھی مانتے ہیں اور ان کی قدرت و اختیار کو کامل بھی مانتے ہیں جیسے عامہ مسلمین مگر سچ یہ ہے کہ یہ بھی محض زبان ہی سے خدا تعالیٰ کی قدرت کو کامل کہتے ہیں۔دل سے یہ بھی کامل نہیں مانتے۔چنانچہ مصائب وحوادث میں ہم اپنے قلب میں وہی ضعف پاتے ہیں جو قائل دہریت کے قلب میں ہوتا ہے۔ہم نے مانا کہ طبیعت کا بھی ایک اقتضاء ہوتا ہے مگر پھر بھی طبیعت کے اقتضاء میں اعتقاد کی وجہ سے کچھ تو فرق ہونا چاہئے جیسے گرم پانی جو بہت گرم ہو جس کی حرارت ناگوار ہو اس میں ٹھنڈا پانی مل جانے سے کچھ تو فرق ضرور ہو جاتا ہے کہ اب حرارت ناگوار نہیں ہوتی اسی طرح اعتقاد قدرت الٰہیہ کی برودت سے طبعی خلجان میں کچھ تو کمی ہو جانا چاہئے۔ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ فرق تو ہے مگر چونکہ ہمارا اقرار ضعیف ہے اس لئے اس فرق کا ظہور نہیں ہوا جیسے گرم پانی کے ایک مٹکے میں لوٹا بھر ٹھنڈا پانی ملا دیا جائے تو پہلے سے گرمی میں کمی تو ضرور ہو گی مگر اس کا احساس نہ ہو گا تو میں کہتا ہوں کہ جو شے اپنے اثر سے خالی ہو وہ معتبر نہیں جس چیز پر غایت مرتب نہ ہو وہ غیر معتد بہ ہے اس لئے یہ اعتقاد جس کا اثر کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا معتد بہ نہیں دنیا میں تو اس سے کچھ نفع نہ ہو گا گو آخرت میں کسی مدت کے بعد کام آئے کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ جس شخص کے قلب میں ادنیٰ ادنیٰ ذرہ ایمان بھی ہو گا وہ بھی کسی نہ کسی وقت جہنم سے نجات پا لیگا مگر اس سے پہلے جو عذاب ہو گا اس کو اختیار کرنا کون سی عقل ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم اس تھوڑے سے عذاب پر راضی ہیں تو یہ شخص قابل خطاب نہیں اس نے جہنم کو دیکھا نہیں اس لئے یہ جرات ہے اگر ایک دفعہ آنکھ بھر کے جہنم کو دیکھ لے پھر نانی یاد آ جائے۔ہم نے مانا کہ ضعیف اعتقاد سے بھی کسی وقت نجات ہو جائے گی مگر کس مصیبت کے بعد اور دنیا میں تو ساری عمر پریشانی ہی رہے گی۔

مسئلہ تقدیر کا حاصل تاثیر قدرت ہے:

حالانکہ حق تعالیٰ نے تقدیر کا مسئلہ تو جس کا حاصل تاثیر قدرت ہے اسی لئے ہم کو بتلایا ہے کہ حوادث میں ہم کو راحت ہو، پریشانی اور گھبراہٹ حد سے زیادہ نہ ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ کہ تم کو جو مصیبت بھی پہنچتی ہے خواہ زمین میں یا تمہاری جانوں میں وہ سب ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں اور یہ کام خدا پر آسان تھا۔ آگے فرماتے ہیں لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ یہ ایک محذوف کے متعلق ہے یعنی واخبرنالکم بذالک لکیلا سو ہم نے تم کو اس مسئلہ تقدیر کی خبر اس لئے دی تاکہ جو چیز تم سے فوت ہو جائے اس پر رنج نہ کرو اور جو چیز تم کو عطا کی جائے اس پر ناز نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی متکبر اترانے والے کو نہیں چاہتے۔

اعتقاد تقدیر کا دینوی نفع:

اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ اعتقاد تقدیر کی تعلیم سے فلاح آخرت کے ساتھ یہ بھی مقصود ہے کہ مسلمانوں کو دنیا میں بھی راحت ہے کہ کسی چیز کے فوت ہونے سے ان کو زیادہ رنج نہ ہوا کرے بلکہ یہ سمجھ کر کہ تقدیر میں یوں ہی تھا صبر و شکر سے کام لیا کریں۔ اب آپ دیکھ لیں کہ اعتقاد تقدیر کا یہ اثر ہمارے اندر کتنا ہے، سو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہم مصائب وحوادث میں ضعف قلب اور قلت اعتقاد کی وجہ سے ایسے ہی پریشان ہو جاتے ہیں جیسا ایک دہری یا منکر تقدیر پریشان ہوتا ہے۔ صاحبو! اگر ہم کو تقدیر پر کامل اعتقاد ہے تو اس کا اثر ظاہر میں بھی تو کچھ ہونا چاہئے۔ یاد رکھو محض زبان سے اتنا کہہ دینا تو آسان ہے کہ ہم کو تقدیر پر اعتقاد ہے مگر امتحان کے وقت ہر شخص کی قلعی کھل جاتی ہے اور امتحان کا وقت یہی ہے جبکہ مصائب وحوادث کا نزول ہو رہا ہے اور کسی کی قلعی نہ بھی کھلے تب بھی حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ معاملہ ہے وہاں تو کوئی حیلہ نہیں چل سکتا۔

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام — در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا باخلق آری جملہ راست — باخدا تزویر و حیلہ کے رواست
کارہا او راست باید داشتن — رایت اخلاص و صدق افراشتن

''میں نے فرض کیا اگر تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے ہی دیا مگر خدا تعالیٰ کو کہاں دھوکہ دے

سکتا ہے، مخلوق کے ساتھ تیرے سب کام درست ہیں خدا تعالیٰ کے ساتھ مکر وحیلہ کب جائز ہے۔ حق تعالیٰ کے ساتھ تو سب کام درست رکھنے چاہئیں اخلاص اور سچائی کا علم بلند کرنا چاہئے۔''

معتقد تقدیر کا غم میں حال:

صاحبو! جو شخص سچ مچ تقدیر کا معتقد ہے اس کو رنج وغم کبھی نہیں ہوتا اور یہ جو کبھی کبھی آپ ان کو مصائب میں دیکھتے ہیں یہ نظر بد سے بچانے کے لے صورت رنج وغم ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

دل ہمی گوید از و رنجیدہ ام   وز نفاق سست او خندیدہ ام

''دل کہتا ہے کہ میں اس سے رنجیدہ ہوں اور نفاق سست سے اس کے خندیدہ ہوں۔''

ان کو ان مصائب سے ایسی کلفت ہوتی ہے جیسے مرچوں کے کھانے والے کو کلفت ہوتی ہے کہ ظاہر میں آنسو جاری ہیں مگر دل میں ہنس رہا ہے اور مزے لے لے کر کھا رہا ہے۔ ان کو اس میں ایسی لذت آتی ہے کہ سلطنت کے بدلہ میں بھی اپنی تنگی اور فقر و فاقہ وغیرہ کو دینا نہیں چاہتے۔

ایک بزرگ کی حکایت:

چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ ایک شہر کے دروازہ پر پہنچے۔ دیکھا کہ شہر پناہ کا دروازہ بند ہے۔ لوگوں سے پوچھا کہ دن میں دروازہ کیوں بند کیا گیا۔ کیا کسی دشمن کا خطرہ ہے؟ لوگوں نے کہا نہیں بلکہ بادشاہ کا باز اُڑ گیا ہے اس لئے دروازہ بند کرادیا کہیں دروازہ سے نہ نکل جائے۔ یہ سن کر آپ بہت ہنسے اور سمجھ گئے کہ بادشاہ محض احمق ہے بھلا باز کو دروازہ سے نکلنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو اوپر سے بھی جا سکتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے بطور ناز کے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ سبحان اللہ یہ تو اتنا احمق ہے اور اس کو بادشاہ بنادیا اور ہم ایسے عاقل اور عارف اور ہماری یہ حالت ہے کہ پیر میں جوتی بھی سالم نہیں، بدن پر کپڑے بھی درست نہیں۔ ان بزرگ کا مقام ابدال کا تھا مگر ناز ہر وقت نہیں چلتا کیونکہ کبھی وہ بھی ناز کرنے لگتے ہیں یہ کیا کہ تم تو ناز کرو اور وہ کبھی نہ کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ بہت اچھا کیا تم اس پر راضی ہو کہ اس بادشاہ کی حماقت و جہالت معہ سلطنت کے تم کو دے دی جائے اور تمہاری معرفت ومحبت معہ فقر و تنگدستی و خستہ حالی کے اس کو دے دی جائے۔ یہ جواب سنتے ہی وہ بزرگ کانپ اٹھے اور فوراً سجدہ میں گر پڑے کہ میں اس گستاخی سے توبہ کرتا ہوں اور اس تبادل پر ہرگز راضی نہیں تو حضرت وہ ایسا شیریں غم ہے جس سے سلطنت کے ساتھ بھی تبادلہ گوارا نہ ہوا اور وہ ایسا درد ہے کہ اگر کوئی ان کی حاضری تکلیف کو دیکھ کر ان پر ترس کھائے اور اس سے نجات اور سکون کی دعا کرے تو خدا تعالیٰ تم کو اس غم سے نجات دے تو وہ یوں کہتے ہیں:

مصلحت نیست مرا سیری ازاں آب حیات　　　ضاعف اللہ بہ کل زمان عطشی

''مجھ کو اس آب حیات سے سیر ہونا مصلحت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہر وقت میری پیاس بڑھائے۔''

مجنوں اور اس کے والد کی حکایت:

اور کیوں نہ ہو، یہ تو محبوب حقیقی کے عاشق ہیں، مجنوں نے تو ایک ادنیٰ مخلوق کی محبت کے غم سے بھی نجات نہیں چاہی جب اس کا عشق مشتہر ہوا اور سوز و گداز سے کھانا پینا متروک ہو گیا اور دیوانوں کی طرح جنگلوں میں پھرنے لگا تو اس کا باپ مکہ معظمہ میں اس کو لایا اور کہا بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر خدا تعالیٰ سے دعا کر کہ لیلیٰ کی محبت میرے دل سے نکال دے تو اس نے رو کر کہا: ؎

یارب لا تسلبنی حبها ابداً　　　ویرحم اللہ عبداً قال امیناً

''پروردگار میری محبت اس سے ہمیشہ ذائل نہ کر اور اللہ تعالیٰ اس بندہ پر رحم کرے جو اس پر آمین کہے۔'' اور کہا: ؎

الٰهی تبت من کل المعاصی　　　ولکن حب لیلیٰ لا اتوب

''خداوند تمام گناہوں سے توبہ کرتا ہوں لیکن محبت لیلیٰ سے توبہ نہیں کرتا۔''

تو جب ایک ادنیٰ مخلوق کی محبت میں غم لذیذ ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ کے عشاق کو اگر مصائب میں راحت ہو تو کیا عجب ہے۔ اب اس کو غم کہنا ہی غلط ہے۔ وہ واقع میں غم نہیں محض صورت غم ہے اور جو واقعی غم ہے اس کا شریعت مقدسہ پر عمل کرنے والے پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیمار ہوتا یا اس کا کوئی عزیز نہیں مرتا یا اس کو دینوی نقصان نہیں ہوتا یہ سب کچھ اسے بھی پیش آتا ہے اور اس سے کلفت بھی اس کی ہوتی ہے مگر پریشانی و حقیقی غم نہیں ہوتا کیونکہ غم کہتے ہیں دل کی گھٹن کو اور تکلیف کہتے ہیں الم دکھن کو۔

اہل اللہ کا مصائب میں جانا:

اہل اللہ کو مصائب میں الم تو ہوتا ہے مگر گھٹن نہیں ہوتی اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی ڈاکٹر تمہارے زخم میں نشتر لگائے اس وقت تم کو الم تو ہوگا مگر رنج و غم نہ ہوگا، گو ظاہر میں تم ہائے ہائے بھی کرو گے مگر دل اندر سے خوش ہوگا اور اس الم پر راضی ہوگا کیونکہ تم اس نشتر کو حکمت کے موافق سمجھتے اور اپنے لئے نافع و مفید خیال کرتے ہو۔ یہی حال اہل اللہ کا ہے، زمانہ کی مصائب و حوادث کے ساتھ کہ وہاں کو عین حکمت اور سراپا مصلحت سمجھتے ہیں اس لئے ہر حال میں خوش ہیں اور یوں کہتے ہیں: ؎

یہی دل کی حسرت ہے یہی آرزو ہے　　　نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے

اولیاءاللہ کو حقیقی خوف وحزن نہیں ہوتا:

غرض جو لوگ شریعت مقدسہ کی تعلیم پر عمل کرنے والے ہیں ان کو غم حقیقی کبھی ہوتا نہیں۔ پس اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (یاد رکھو اولیاء اللہ پر نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں) اپنی حقیقت پر ہے اس میں تاویل کی ضرورت نہیں مطلب یہ ہے کہ ان کو حقیقی خوف وحزن نہیں ہوتا کیونکہ وہ تقدیر پر پورا ایمان رکھتے ہیں جس کا اثر یہی ہے کہ رنج وغم اور تجویز کی جڑ کٹ جاتی ہے جیسا کہ میں نے ابھی ایک آیت سے ثابت کیا تھا لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ (تا کہ جو چیز تم سے فوت ہو جائے اس پر رنج نہ کرو اور جو چیز تم کو عطا کی جائے اس پر نہ اتراؤ) پس قائل تقدیر کو آخرت میں تو خوف وحزن ہوگا ہی نہیں، دنیا میں بھی اس کو غم نہیں ہوتا اس لئے لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (نہ ان پر خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں) ہر حال میں اپنی حقیقت پر ہے اور جو شخص تقدیر کے اعتقاد سے خالی ہے اس کو دنیا میں بھی غم اور آخرت میں بھی اور جس کا اعتقاد ضعیف ہے وہ آخرت میں تو پٹ چھٹ کر جنت میں پہنچ جائے گا مگر دنیا میں عمر بھر ضرور بے چین رہے گا تو کیا اچھا ہو کہ یہاں بھی راحت ہی ہو۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے عمل واعتقاد کو کامل کرو، پھر تمہارے لئے دنیا میں بھی چین ہوگا لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ (ان کو دنیا میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی) اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم کو اس چین کی ضرورت نہیں دنیا میں ہم کو بے چینی ہی منظور ہے تو یہ شخص قابل خطاب نہیں۔ پھر ہم تو جب جانتے ہیں کہ یہ لوگ دنیا کی چیزوں سے بھی صبر کر لیتے مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ چار پیسوں سے بھی صبر نہیں اور آخرت کے بارہ میں ایسی ہمت ہے کہ وہاں کی راحت اور دنیا کی حیات طیبہ سے صبر ہے اس کا نام صوفیہ کی محاورات میں صبر فرعون ہے۔ مولانا اسی کی شکایت فرماتے ہیں: ؎

اےکہ صبرت نیست از فرزند وزن　　　صبر چوں داری زرب ذوالمنن

اےکہ صبرت نیست از دنیائے دوں　　　صبر چوں داری زنعم الماہدوں

"اے شخص تجھ کو اہل وعیال سے صبر نہیں ہے تو حق تعالیٰ سے کیوں صبر تجھ کو آ گیا۔ ذلیل دنیا سے صبر نہیں ہے تو حق تعالیٰ سے کیوں صبر رکھنا ہے۔"

صبر باللہ اشد ہے:

حضرت شبلیؒ سے کسی نے پوچھا ای الصبر اشد کون سا صبر زیادہ سخت ہے؟ فرمایا الصبر باللہ قال لا فالصبر فی اللہ قال لا قال فای قال الصبر عن اللہ یعنی حضرت شبلیؒ نے ایک سائل کے جواب میں فرمایا کہ صبر باللہ اشد ہے اس نے کہا نہیں، کہا صبر فی اللہ اشد ہے، اس نے کہا الصبر عن اللہ خدا تعالیٰ سے چھوٹنے پر صبر کر لینا یہ بہت سخت ہے۔ یہ سن کر حضرت شبلی رحمہ اللہ نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے، اسی صبر کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں فما اصبرھم علی النار (پس کس قدر صبر کرنے والے ہیں آگ پر)

اسباب کو مؤثر سمجھنا غلط ہے:

بہرحال مرگ مفاجات کے اسباب تراشنے والے ایک تو وہ ہیں جو خدا تعالیٰ کے قائل نہیں ہیں۔ ان سے تو چنداں تعجب نہیں ہے مگر افسوس اب تو اکثر مسلمان بھی اسباب تراشتے ہیں اور اسباب ہی کو موثر سمجھتے ہیں پھر ان کو دنیا میں بھی تکلیف ہوتی ہے اور مرتے ہوئے بھی پریشانی ہوتی ہے۔ یہ لوگ حیاتِ طیبہ سے بھی محروم ہیں اور موت سے بھی بہت ڈرتے ہیں۔

موت کے وقت مؤمن کا حال:

شاید یہاں کسی کو شبہ ہو کہ موت سے تو ہر شخص کو کراہت ہوتی ہے اور زندگی ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے کیونکہ یہ تو طبعی امر ہے تو سب ہی کو عام ہے اس کا جواب حدیث شریف میں آچکا ہے، حق تعالیٰ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے درجات بلند فرمائیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کر کے اس اشکال کو حل کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاءہ ومن کرہ لقاء اللہ کرہ اللہ لقاءہ (الصحیح للبخاری ۸: ۱۳۳) کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا چاہتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی لقاء سے کراہت کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی لقاء سے کراہت فرماتے ہیں۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلنا یکرہ الموت (ہم میں ہر شخص موت کو مکروہ سمجھتا ہے) یعنی حق تعالیٰ کی لقاء تو موت کے بعد ہو گی اور موت سے طبعاً ہر شخص کو کراہت ہے تو من احب لقاء اللہ کا مصداق کون ہو گا؟ سب من کرہ اللہ لقاء اللہ ہی کے مصداق ہوں گے اور اس کا جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کون

دے سکتا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ محبت وکراہت مراد ہے سو مومن موت کے وقت لقاء اللہ کا مشتاق ہو جاتا ہے جبکہ اس کو فرشتے بشارتیں سناتے اور تسلی دیتے ہیں اور جنت کی نعمتیں اور راحتیں دکھلاتے ہیں اس وقت اس کی وہ حالت ہوتی ہے جیسے ایک پرندہ پنجرہ میں ہو اور اس کو ایک ایسے سبزہ زار میں رکھ دیا جائے جہاں چار طرف پھول پھلواری اور ہر قسم کے میوہ جات ہوں اور اس طرح کہ ہم جنس پرندے آزادی کے ساتھ اس باغ میں میوے وغیرہ کھاتے پھرتے ہوں اور خوشی سے چہچہاتے ہوں تو اس وقت یہ پرندہ جو پنجرہ میں مقید ہے پھڑ پھڑاتا ہے اور پنجرے سے نکلنے اور اپنی ہم جنسوں کے ساتھ سبزہ زار میں چلنے پھرنے کا مشتاق ہوتا ہے اور کافر موت کے وقت حق تعالیٰ کے پاس جانے سے کراہت کرتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ عذاب کے فرشتے ڈراؤنی صورت میں چاروں طرف کھڑے ہیں۔ میری روح نکلی اور ان لوگوں نے مجھے عذاب کرنا شروع کیا، اس وقت اس کی روح جسم سے نکلنا نہیں چاہتی جیسے پنجرہ کے گرد چاروں طرف بلیاں دانت نکالے بیٹھی ہوں تو اس وقت پرندہ پنجرہ سے نکلنا نہ چاہے گا بلکہ کوشش کرے گا کہ پنجرے ہی سے چمٹا رہے کیونکہ اسی میں خیر ہے پنجرہ سے باہر قدم رکھا اور بلیوں نے اس کو دبوچا تو یہ کراہت مراد ہے جو عین موت کے وقت ہوتی ہے باقی طبعی کراہت مراد نہیں ہے کیونکہ طبعاً زندگی ہر ایک کو عزیز ہے۔

زندگی طبعاً ہر ایک کو عزیز ہے:

چنانچہ کانپور میں ایک قصہ میرے زمانہ قیام میں ہوا تھا، ایک بڑھیا کا لڑکا بیمار ہوا تو وہ ہر ایک سے دعا کراتی پھرتی تھی کہ یہ اچھا ہو جائے اور میں مر جاؤں۔ اتفاق سے اس کو سکتہ ہو گیا جس سے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ مر گیا ہے اس کی تجہیز وتکفین کا انتظام کیا گیا، کچھ دیر میں ہوش آ گیا۔ وہ بڑھیا یہ سمجھی کہ میرا بیٹا بھوت ہو گیا تو اب وہ یہ دعا کراتی تھی کہ اللہ کرے یہ مر جائے کیونکہ اب اسے اپنی موت کا اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ بھوت مجھے ہی نہ کھالے، اسی طرح مولانا جامی رحمہ اللہ نے ایک عورت مہستی نام کا قصہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ مہستی بیمار ہوئی تو اس کی بوڑھی ماں یوں دعا کرتی تھی کاش میں مر جاؤں اور مہستی اچھی ہو جائے۔ ایک دن اتفاق سے اس کے گھر میں ایک گائے اس حیلہ سے آئی کہ اس کے منہ میں ایک ہانڈی پھنسی ہوئی تھی۔ گائے نے کسی کی ہانڈی میں منہ ڈالا تھا پھر منہ باہر نہ نکل سکا کیونکہ وہ پھنس گئی تھی تو اب وہ ہانڈی کو لئے پھر رہی تھی۔ اس بڑھیا نے جو گائے کا یہ حلیہ دیکھا تو یوں سمجھی کہ یہ وہی موت جس کو میں روز بلایا کرتی تھی اب تو بڑی گھبرائی اور کہنے لگی:

گفت اے موت من نہ مہستیم   پیر زال غریب محنتیم

"یعنی اے موت مہستی میں نہیں ہوں وہ تو تیرے سامنے پلنگ پر پڑی ہے اسے لے لے، میں تو غریب محنتن بڑھیا ہوں، مجھے لے کر تو کیا کرے گی۔"

غرض اپنی زندگی ایسی عزیز ہے کہ موت کا خیال آتے ہی بیٹی کو مارنے لگی۔ کم وبیش حیات کی محبت سب کو ہے اہل اللہ بھی اس سے خالی نہیں مگر جس کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہے وہ عین موت کے وقت ہشاش بشاش اور حق تعالیٰ سے ملنے کا مشتاق ہو جاتا ہے۔

کوئی مومن بشارت عندالموت سے محروم نہیں:

مولانا فتح محمد صاحب کے ایک شاگرد مولوی نور احمد صاحب طالب علم تھے، مولانا کے وصال کے بعد وہ اپنے گھر جانے لگے اور سامان وغیرہ باندھ کر سب رکھ دیا تھا کہ دفعتاً طاعون میں مبتلا ہو گئے۔ لوگوں کو بہت صدمہ ہوا کہ بے چارہ کو اس وقت اپنے وطن کی کیسی حسرت ہوگی، سب ان کی تسلی کرنے لگے کہ گھبراؤ نہیں انشاء اللہ تعالیٰ تم اچھے ہو جاؤ گے۔ وہ کہنے لگے کہ اب یوں نہ کہو اب تو خدا تعالیٰ سے ملنے کو جی چاہتا ہے، پھر ان کا جنازہ آیا تو گو ہم جیسوں کا ادراک ہی کیا مگر مجھے ان کے جنازہ پر انوار ہی انوار معلوم ہوتے تھے۔ صاحبو! مومن چاہے کیسا ہی گنہگار رہا ایمان کی وجہ سے تو بشارت اس کو بھی ملتی ہے اس لئے وہ مرتے ہوئے ضرور خوش ہوتا ہے اور جو ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ بھی زیادہ ہوں پھر تو اس کی خوشی کا کیا کہنا بس بشارت عندالموت سے اگر محروم ہے تو کافر ہی محروم ہے۔ مومن چاہے کیسا ہی ہو وہ اس سے محروم نہیں گو اس کے ساتھ معاصی بھی ہوں مگر ایمان کامل ہو تو موت کے وقت اسے حق تعالیٰ سے ملنے کا اشتیاق ہوگا اور قبل موت گو اس درجہ کا اشتیاق طبعی نہ ہو مگر عقلی کراہت بھی نہ ہونا چاہئے کیونکہ ان نعمتوں کا مقدمہ بھی موت ہے اور جب عقلی کراہت نہ ہوگی تو پریشانی بھی اس قدر نہ ہوگی مگر افسوس ہے کہ اس وقت اس بیماری سے پریشانی اس قدر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل ایمان میں بھی کمی ہے، اسی واسطے میں نے اس وقت اس مضمون کو بیان کے لئے اختیار کیا ہے کیونکہ بعض احباب سے معلوم ہوا کہ لوگ بہت زیادہ پریشان ہیں، اس کے بعد انہوں نے بیان کی بھی درخواست کی اور یہ ظاہر کیا کہ بیان سے لوگوں کو تسلی ہو جانے کی امید ہے اس واسطے میں اس مضمون کو اختیار کرتا ہوں۔

اسباب طاعون:

اس وقت میں اسباب طاعون سے بحث نہیں کرتا کیونکہ اس سے مواعظ سابقہ و رسائل میں

فراعت ہوچکی ہے۔ میں نے بارہا اس کو بیان کیا ہے اور وہ مضامین اکثر سامعین کے سنے ہوئے ہیں مگر استطراداً اتنا پھر کہتا ہوں کہ اس کا سبب معاصی ہیں خصوصاً بدکاری اور سود خواری، جیسا احادیث میں مصرح ہے اور افسوس سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے قصبہ میں یہ دو گناہ بہت شائع ہیں ہم کو سب گناہوں سے اور بالخصوص ان دونوں گناہوں سے توبہ و استغفار کرنا چاہیئے۔ اس بحث میں زیادہ تفصیل نہیں کرتا، البتہ اپنے ایک رسالہ کا پتہ بتلائے دیتا ہوں جس کا نام "علاج القحط والوباء" ہے جس کو تفصیل کا شوق ہو وہ اس رسالہ کا مطالعہ کرے، اس میں شبہات کا بھی جواب دیا گیا ہے۔

معاصی بھی طاعون کا سبب ہیں:

ہاں! ایک شبہ کا جواب شاید اس میں نہ ہو اس کو معہ جواب کے اس وقت بیان کئے دیتا ہوں، وہ یہ کہ بعض لوگ شاید یوں کہیں کہ طاعون کے اسباب تو طبعی ہیں پھر معاشی اس کا سبب کیونکر ہو گئے اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کو اسباب طبعیہ کے انکار کی ضرورت نہیں گو تصدیق کی بھی ضرورت نہیں مگر ہم آپ کی خاطر سے تھوڑی دیر کے لئے ان اسباب طبعیہ کو مانے لیتے ہیں مگر اب سوال یہ ہے کہ یہ اسباب طبعیہ طاعون کا سبب ہیں یا سبب اصلی اگر آپ کہیں کہ یہ سبب قریب ہیں تو ہم کہیں گے کہ پھر ان کے سبب قریب ہونے سے معاصی کی سبیت پر کیوں اشکال ہو، ممکن ہے معاصی بھی سبب ہوں اور سبب بعید ہوں اور اگر یہ کہا جائے کہ اسباب طبعیہ سبب قریب بھی ہیں اور یہی اصل سبب ہیں ان کے سوا اور کوئی سبب نہیں تو اس دعوے پر دلیل قائم کیجئے۔

موت کے متعدد اسباب ہونے کی مثال:

کیونکہ مسبب واحد کے لئے اسباب مختلفہ قریب و بعید ہو سکتے ہیں، پھر آپ طاعون کے لئے سبیت کو ایک ہی چیز میں کس دلیل سے منحصر کرتے ہیں۔ دیکھئے اگر ایک شخص نے کسی کو قتل کیا ہو اور اس کی سزا میں اسے پھانسی دی جائے جس سے قاتل مر جائے تو اب بتلایئے یہاں سبب موت کیا ہوا؟ یہاں آپ فوراً سلسلہ نسب بیان کرنا شروع کر دیں گے کہ اول اس نے قتل کیا تھا جس کی وجہ سے ولی مقتول نے عدالت میں دعویٰ کیا پھر اس پر گواہ قائم کر دیئے۔ حاکم نے ثبوت لے کر اس کو مجرم قرار دیا اور فیصلہ میں اس کو پھانسی کی سزا تجویز کی اور اس کے لئے خاص تاریخ مقرر کر دی۔ اور یہ اس تاریخ پر حاضر رہا، کہیں روپوش نہ ہو سکا۔ حاکم نے اپنے فیصلہ کے موافق جلاد کو حکم دیا کہ اسے پھانسی پر لٹکا کر تختہ کھینچ لے اس نے ایسا ہی کیا بالآخر اس کو موت آ گئی۔ دیکھئے

اس شخص کی موت میں چند در چند اسباب کو دخل ہے اگر کوئی فلسفی کہنے لگے کہ یہ سلسہ نسب بالکل غلط ہے بلکہ اس کی موت کا سبب صرف یہ ہے کہ اس کو پھانسی پر لٹکا کر تختہ کھینچ لیا گیا جس کی وجہ سے گلا گھٹ گیا اور آلات تنفس بند ہو گئے اس لئے موت واقع ہو گئی تو آپ اس کو کیا جواب دیں گے؟ یقیناً ہر عاقل یہ کہے گا کہ یہ تو سبب قریب ہے لیکن سبب اصلی وہ جرم قتل ہی ہے جس کی وجہ سے حاکم نے اس کو پھانسی پر لٹکانے کا حکم دیا، اسی طرح یہاں سمجھو کہ طاعون کا اصلی سبب معاصی ہیں جب بندے گناہ کر کے حق تعالیٰ کو ناراض کرتے ہیں تو وہ اپنے جنود کو بنی آدم پر مسلط کر دیتے ہیں جن میں یہ جراثیم بھی داخل ہیں جن کو تم طاعون کا سبب کہتے ہو اور جنات بھی داخل ہیں جن کو حدیث شریف میں سبب کہا گیا ہے وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (تمہارے رب کے جنود کے سوا اس کو کوئی نہیں جانتا) بتلایئے اب کیا اشکال رہا مگر حیرت ہے کہ دنیا کی باتوں میں تو آپ کی عقل ایسی تیز ہے کہ اگر کوئی سائنس دان پھانسی والے مجرم کی موت کا سبب محض آلات تنفس کا بند ہونا بتلائے تو آپ اس کے جواب میں فوراً اسباب کا سلسلہ نسب بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی عاقل نہیں:

لیکن نا معلوم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ضد ہے کہ آپ کی ہر بات میں شبہ ہے اور یہاں یہ جواب کیوں نہیں دیا جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سبب بعید اور اصلی کو بیان فرما رہے ہیں اور تم سبب قریب کو بتلا رہے ہو حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم علاوہ نبی ورسول ہونے کے عاقل بھی اتنے بڑے ہیں کہ کفار بھی اس کے قائل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کوئی عاقل نہیں ہوا۔ یہ ایک شبہ کا جواب استطراداً بیان کر دیا گیا ہے باقی اصل جواب ان شبہات کا وہ ہے جو میں نے چھتاری کے ایک بیان میں عرض کیا تھا جس میں علی گڑھی جنٹلمین بہت تھے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ جو دین میں شبہات کرتے ہیں اور ان کو حل کرنے کے لئے یہ صورت آپ نے اختیار کی ہے کہ جہاں کوئی مولوی صاحب ملیں ان پر مشق کرنے لگے تو یہ تدبیر اچھی نہیں کیونکہ اس طرح تو ساری عمر شبہات ہی میں گزر جائے گی کیونکہ عقلی شبہات کے جوابات بھی عقلی ہوتے ہیں اور عقلی جواب کے مقدمات بھی عقلی ہوتے ہیں۔ آپ کو ان مقدمات عقلیہ میں بھی شبہات ہوں گے پھر ان کا جواب بھی عقلی ہو گا جو مقدمات عقلیہ ہی پر مبنی ہو گا، ممکن ہے اس جواب کے مقدمات شبہ ہو جائے تو یہ سلسلہ غیر متناہی ہے جیسے بچوں کی کپاس کہانی، یہ کمبخت ختم ہی نہیں ہوتی بس ہر

بات کے بعد یوں ہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ کپاس کہانی بوجھو گے، دوسرا کہتا ہے بوجھیں گے، مجھے تو اس کی تفصیل یاد بھی نہیں آتی بچپن کی باتیں اب کہاں یاد آئیں۔

وقت پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

دوسرے اگر فرض کرلیا جائے کہ عقلی جواب کے مقدمات پر آپ شبہ بھی نہ کرسکے اور سلسلہ اعتراض کا ختم ہوگیا جب بھی اس تدبیر سے قلب میں سے شبہات کی جڑ نہیں کٹ سکتی اور شفاء نہیں ہوسکتی۔

بوڑھے ہندو اور سپاہی سلطان محمود غزنوی کی حکایت:

جیسے سلطان محمود جب سومنات آئے تو ان کے ایک سپاہی نے دیکھا کہ ایک بڈھا بت پرست صنم کے سامنے گردن جھکائے بیٹھا ہے اور رام رام کر رہا ہے۔ سپاہی نے تلوار نیام سے نکالی اور کہا او بڈھے کہہ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** بڈھے نے جو تلوار ننگی دیکھی کانپ گیا اور کہا اچھا اچھا کہتا ہوں۔ ذرا تلوار نیام میں تو کرلو تو اس نے ایسا ہی کیا تو لگا ٹالنے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر سپاہی نے کہا کہہ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** ورنہ گردن اڑا دوں گا، کہا اچھا بھائی کہتا ہوں مگر ذرا تم اس تلوار کو پھر نیام میں کرلو اور میرے حواس بجا ہونے دو۔ اس تلوار کو دیکھ کر میرے حواس باختہ ہوئے جاتے ہیں۔ سپاہی نے تلوار بھی نیام میں کرلی اور کہا اچھا اب تو کہو، وہ بت پرست کہنے لگا میاں سپاہی چاہے چھوڑ دیا مارو نوے برس کا رام تو نکلتے ہی نکلتے نکلے گا، ایک دم سے تو نکل نہیں سکتا۔ میں نے یہ حکایت کسی سے سنی ہے یہ تو معلوم نہیں کہ کس سے سنی ہے روایت ہے لیکن بات سچی ہے کہ نوے سال کا رام تو نکلتے ہی نکلے گا ایک دم سے نہیں نکل سکتا۔ شریعت نے بھی تو اس کی رعایت کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے **وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ** (اگر آپ سے کوئی مشرکین میں سے پناہ کا طالب ہو تو آپ اس کو پناہ دیجئے تاکہ وہ کلام الٰہی سن لے پھر اس کو امن کی جگہ پہنچا دیجئے۔ یہ حکم اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ پوری خبر نہیں رکھتے) اسی طرح میں یہ کہتا ہوں کہ آپ کے یہ شبہات تو پرانے اور عمر بھر کے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ ایک مجلس میں ان سے شفا ہو جائے یہ کیونکر ہوسکتا ہے۔

دل میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا کرنا:

اب اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ ہر ملاقات میں ایک شبہ حل کرلیا کریں اور

دوسری ملاقات میں دوسرا شبہ وعلی ہذا، مگر یہ تو سنار کی کھٹ کھٹ ہے، میں آپ کو دوسری تدبیر بتلاتا ہوں جو لوہار کی ایک ہے وہ یہ کہ تم ان شبہات کے پیچھے نہ پڑو، بس اپنے دل میں حق تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا کرلو یا عظمت حاصل کرلو۔ یہ رافع شبہات ماضیہ ہونے کے ساتھ قاطع شبہات مستقبلہ بھی ہے کیونکہ محبت یا عظمت کے بعد محبوب اور معظم کے کسی حکم میں شبہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چور کو گھر میں گھسا کر نکالنا کون سی عقل کی بات ہے۔ تدبیر ایسی کرنی چاہئے کہ چور گھر ہی میں نہ آئے تو یہ تدبیر ایسی ہی ہے کہ اس سے شبہات کا دروازہ ہی بند ہو جاتا ہے۔ بس یہ ہے لوہار کی ایک، اور جو لوگ شبہات کا جواب دے کر تسلی کرنا چاہتے ہیں وہ سنار کی طرح کھٹ کھٹ کرتے ہیں، اس میں وقت بھی بہت صرف ہوتا ہے اور سلسلہ شبہات کا ختم نہیں ہوتا، میں نے اس متعارف طرز کو چھوڑ دیا ہے، آج کل میں تو نئی تعلیم والوں کے ساتھ اسی علاج سے کام لیتا ہوں کہ تم کچھ دنوں ہمارے پاس آ کر رہو اور جو ہم بتلائیں اس کے موافق عمل کرو۔ وہ مدت ہم بتلا دیں گے اس مدت کے گزر جانے پر شبہات بیان کرنا، پھر جواب دیں گے انشاء اللہ اس مدت کے بعد ایک بھی شبہ نہ رہے گا کیونکہ اس مدت کے اندر خدا تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت قلب میں پیدا ہو جائے گی۔ باقی اس کے بغیر میں کسی شبہ کا سننا اور جواب دینا پسند نہیں کرتا بلکہ اکثر لوگوں کو ضابطہ کے جواب سے ٹال دیتا ہوں۔

حکم کے ہر قسم کا سمجھنا ضروری ہے:

چنانچہ میں پچھلے دنوں علی گڑھ گیا تھا تو کالج کے ایک حدیث دان میرے پاس آئے اور حدیث کا متن پڑھا جس میں آیا ہے کہ طاعون معاصی سے آتا ہے اور کہنے لگے یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا حدیث کی مدلول سمجھ میں نہیں آئی یا جنایت وعوبت میں وجہ ارتباط سمجھ میں نہیں آئی۔ کہنے لگے معاصی اور طاعون کا ربط سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا تو ضرر کیا ہوا؟ کیونکہ یہ تو حکم کی لم ہوئی اور ضرورت صرف حکم کے سمجھنے کی ہے ہر لم کا سمجھنا ضروری نہیں، آپ اس کو بدون سمجھے ہی مان لیجئے۔ کیا ہر بات کو اس کی لم سمجھ کر ہی ماننا ضروری ہے، کہنے لگے کہ لم نہ سمجھنے میں ضرر تو کچھ نہیں لیکن معلوم ہو جانے میں نفع ہے کہ اطمینان زیادہ ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل ہے۔ کہنے لگے ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے ولکن لیطمئن قلبی (لیکن تاکہ میرے دل کو اطمینان ہو جائے) میں نے کہا یہ ضرور ہے کہ جو چیز ابراہیم علیہ السلام کے لئے ایک وقت میں نافع

ہووہ آپ کے لئے بھی نافع ہو، بس اس کا جواب ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ خاموش ہو گئے۔ گفتگو کا یہ طریقہ بہت اچھا ہے کہ مدعی کبھی نہ بنے ہمیشہ سائل بنا کرے کیونکہ سائل کو دلیل وغیرہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں وہ تو ایک دفعہ لانسلم (ہم تسلیم نہیں کرتے) کہہ کر چھوٹ جائے گا۔

ایک بے استعداد طالب علم کا حال:

اس میں بہت راحت ہے مگر موقع کا لاتسلم ہو بے موقع نہ ہو ورنہ وہ قصہ ہوگا جیسے ایک بے استعداد طالب علم کو سند فراغ دیتے ہوئے استاد نے یہ گر بتلایا تھا کہ جب تم سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جائے تو جواب میں یہ کہہ دینا کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے اس سے تمہارا جہل مخفی رہے گا۔ واقعی بات تو بہت گہری بتلائی مگر اس کے استعمال کے لئے بھی تو کسی قدر عقل کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ایک شخص سمجھ گیا کہ یہ جو ہر بات کے جواب میں یہی کہتا ہے کہ اس میں اختلاف ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کچھ آتا جاتا نہیں اس کا امتحان کرنا چاہئے۔ اگلے دن اس نے آکر پوچھا کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں آپ کی کیا تحقیق ہے؟ اس احمق نے کہا یہاں بھی وہی جواب دیا کہ اس میں اختلاف ہے اب تو سب پر قلعی کھل گئی۔ یہ ویسا ہی قصہ ہے جیسے طوطی کی دریں چہ شک (اس میں کیا شک ہے) کی حکایت ہے کہ شخص نے طوطی کو یہ جملہ سکھا دیا تھا "دریں چہ شک" پھر بازار میں آکر دعویٰ کیا کہ میری طوطی فارسی بولتی ہے۔ چنانچہ ایک سوداگر نے خریدنے کا قصد کیا مالک نے دام بہت بتلائے۔ سوداگر نے طوطی سے پوچھا کہ کیا تیری قیمت اتنی ہے جتنی مالک بتلا رہا ہے؟ کہا دریں چہ شک (اس میں کیا شک ہے) سوداگر بہت خوش ہوا اور خرید کر گھر لایا۔ اب جو بات بھی کرتا ہے اس کے جواب میں دریں چہ شک ہی آتا ہے۔ کہنے لگا میں بہت احمق تھا جو تجھے اتنی رقم دے کر تجھے لایا۔ طوطی نے کہا دریں چہ شک (اس میں کیا شک ہے) یہاں تو یہ جواب واقعی برمحل تھا۔ بہر حال میں نے خود کوئی دعویٰ نہ کیا بلکہ ان کے سوال ہی میں سے سوال نکالتا رہا، حتیٰ کہ وہ خاموش ہو گئے پھر میں نے ان سے یہ بھی کہہ دیا کہ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ ملانوں کے پاس آپ کے سوالات کے جوابات نہیں ہیں اور یہ خیال نہ کریں کہ اس حدیث کی حقیقت کو آپ کی طرح وہ بھی نہیں سمجھتے۔ بحمد اللہ ہمارے پاس حقائق و اسرار بہت کچھ ہیں مگر ہم آپ کو نہیں بتلاتے۔

احکام کے اسرار کا بیان کرنا علماء کے ذمہ نہیں:

کیونکہ اسرار کا بیان کرنا ہمارے ذمہ نہیں، ہمارے ذمہ احکام کا پہنچانا ہے، پھر میں نے یہ شعر پڑھا:

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ۔۔۔ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

''راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ مجلس عارفین میں کوئی ایسی بات نہیں کہ نہ ہو۔''

اور اگر کوئی یہ کہے کہ گو اسرار کا بیان کرنا ضروری نہیں مگر چھپانا بھی تو ضروری نہیں پھر بیان ہی میں کیا حرج ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ غیر ضروری باتوں کے بیان کے لئے کسی محرک کی ضرورت ہے۔ آپ وہ محرک اپنے اندر پیدا کریں پھر ہم اسرار بھی آپ سے بیان کر دیں۔ وہ محرک ہے انس و بے تکلفی۔ آدمی راز کی باتیں اپنے بے تکلف دوستوں ہی سے کیا کرتا ہے تو آپ پہلے چند بار ہمارے پاس آمد و رفت کیجئے اور انس و بے تکلفی پیدا کیجئے جب کسی وقت طبیعت میں جوش ہوگا یہ اسرار بھی بیان کر دیں جب وہ صاحب اٹھ کر چلے گئے اور ان کے ساتھ اور بھی لوگ اٹھ گئے اور مجلس میں خاص احباب رہ گئے تو پھر میں نے معاصی اور طاعون میں تعلق اور ربط بیان کیا جو اپنے اکابر سے میں نے سنا تھا۔ جب وہ تقریر ختم ہوگئی تو بعض احباب کہنے لگے کہ وہ صاحب اگر اس تقریر کو سنتے تو ان کو بہت حظ آتا اور ہمارے حضرات کے علوم کے گرویدہ اور قائل ہو جاتے۔ میں نے کہا تم جانو اس کو اس تقریر سے ضرر ہوتا، گو اس خاص مسئلہ میں اس کو اطمینان ہو جاتا مگر آئندہ کے لئے یہ ضرر عظیم ہوتا گو اس خاص مسئلہ میں ان کو اطمینان کو مطلوب سمجھے ہوئے تھا۔ اس تقریر سے اس کے خیال کی تائید ہوتی اور اس وقت جو تقریر میں نے ان سے کی ہے گو یہ ان کو ناگوار ہوئی ہوگی مگر اس سے ان کی بڑی غلطی کی اصلاح ہوگئی کیونکہ یہ بات کسی نے بھی آج تک ان سے نہ کہی ہوگی کہ اطمینان ہی کی کیا ضرورت ہے اور آج کل اس غلطی میں بہت لوگ مبتلا ہیں کہ اطمینان کو مطلوب اور ضروری سمجھتے ہیں اور بدون حصول اطمینان کے اوامر و اخبار شرعیہ کی تصدیق نہیں کرتے کہ میں اس پر بے دلیل ایمان لایا، حالانکہ ضرورت اسی کی ہے۔

شبہات کا اصل علاج:

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ شبہات کا اصل علاج یہ ہے کہ محبت و عظمت قلب میں پیدا کی جائے اور یہی علاج اس پریشانی کا بھی ہے جو امراض، وبا وغیرہ سے ہوتی ہے۔ اب سوال یہ رہا کہ صاحب خدا تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت کیسے پیدا ہو۔ سو صاحبو! ہم ساری دنیا کو جنید بغدادی تو نہیں بنا سکتے کہ سب کے سب گناہوں کو چھوڑ کر ولی بن جائیں، مگر الحمد للہ خدا تعالیٰ کے بھروسہ پر کہتا ہوں کہ ساری مخلوق کو جس حال میں بھی وہ ہیں ہم عاشق ضرور بنا سکتے ہیں، پھر محبت کے بعد نہ شبہات قلب میں آئیں گے نہ حوادث سے پریشانی ہوگی اور جس کو پریشانی ہو وہ محبت حاصل کر کے دیکھ لے

کہ پریشانی فوراً رفع ہو جائے گی بشرطیکہ وہ ان تدابیر پر عمل کرے جو اس کی بتلائی جائیں۔

حبِ دنیا کا علاج:

چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے حب دنیا کی شکایت کی، میں نے اس کا علاج ذکر موت و مراقبہ موت تجویز کیا۔ چندروز کے عمل سے ان کو نفع ہوا مگر کہنے لگے کہ اس سے مرض حب دنیا تو کم ہو گیا مگر خود موت ہر وقت سامنے ہونے لگی جس سے جی گھبراتا ہے۔ میں نے کہا اس کا کیا علاج اور گو اس کا علاج بھی ہے مگر وہ مستقل علاج ہے جس کے لئے زیادہ وقت و فرصت چاہئے مگر ان سے نہ ہو سکا، انہوں نے سب چھوڑ چھاڑ دیا۔ بہرحال اگر ہمارے بتلائے ہوئے طریقہ پر استقلال سے عمل کیا جاوے تو انشاء اللہ تعالیٰ چندروز میں محبت و عظمت اور عشق کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور جو شخص کام ہی نہ کرے تو اس کا تو علاج ہی کچھ نہیں۔ لیجئے اب میں آپ سے یہ بھی نہیں کہتا کہ اپنی حالت کو بدلو، تمہیں اختیار ہے بدلو یا نہ بدلو لیکن اس کے ساتھ محبت و عظمت بھی حاصل کر لو اور یہ وسعت میں نے اس بھروسہ پر دی ہے کہ میں جانتا ہوں کہ محبت و عظمت پیدا ہونے کے بعد پھر آپ اس حالت موجودہ پر رہ ہی نہیں سکتے۔ یقیناً خود اس کی اصلاح کرو گے لیکن اس وقت تو آپ جو کچھ کریں گے خود اپنے شوق سے کریں گے نہ کہ ہمارے کہنے سے اور اس میں آپ کا حرج ہی کیا ہے کہ ہنستے گھر بس جائیں، کچھ تکلیف و ناگواری بھی نہ ہو اور عبادات وغیرہ ادا ہونے لگیں اور ناگواری کیسی بلکہ اس کا ایسا شوق ہو جائے کہ بدون ان کے چین ہی نہ آئے گا اور اگر کسی کو یہ بھی ناگوار ہو کہ بدون مشقت و کلفت کے بھی اصلاح کیوں ہو تو وہ قابل خطاب نہیں جیسا کہ بعض لوگ اسی لئے وعظ میں میں آتے کہ کہیں ہم کو ہدایت حق نہ ہو جائے مگر یہ تو وہی طریقہ ہے جو کفار نے اختیار کیا تھا۔ وہ کہتے تھے **لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ** (اس قرآن کو سنو ہی مت اور اس کے بیچ میں غل مچادیا کرو شاید تم ہی غالب رہو)

قرآن کی دلکشی:

کیونکہ قرآن واللہ! ایسا دلکش ہے کہ خالی الذہن نے جہاں سنا وہ متاثر ہوا، خصوصاً وہ خالی الذہن جو عربی زبان کو بھی سمجھتا ہو اس لئے کفار کہا کرتے تھے کہ بس قرآن کو سنو ہی مت، کہیں ہمارے خیالات خود بخود ہی نہ بدل جائیں۔ اس کا تو سننا ہی غضب ہے یہ دوڑ کر لپٹتا ہے۔ واقعی اگر کسی نے خالی الذہن ہو کر تھوڑی دیر کے لئے اس کو سن لیا تو وہ بدون متاثر ہوئے اٹھا ہی نہیں۔

چنانچہ ایک مرتبہ قریش کے چند بڑے بڑے منڈھ اکٹھے تھے۔ اس بارہ میں مشورہ ہو رہا تھا کہ کسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نئے دین کی اشاعت سے روکنا چاہئے۔ مشورہ سے یہ طے ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص کو بھیجا جائے جو آپ کو لالچ یا طمع دلا کر اپنا موافق بنانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اس کام کے لے مغیرہ بن الولید کو تجویز کیا گیا (کیونکہ یہ بڑا تجربہ کار شاعر فصیح اور خطیب بلیغ ہونے کے علاوہ سلاطین کے درباروں میں بھی سفیر بن کر بارہا گیا تھا) اس نے آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر طرح کی طمع اور لالچ دی کہ اگر آپ کو سلطنت مطلوب ہو تو ہم آپ کو بادشاہ بنانے کو تیار ہیں، اگر مال کی ضرورت ہے تو ہم سونا چاندی کے ڈھیر لگا سکتے ہیں، اگر حسین جمیل عورتیں مطلوب ہیں تو عرب کی حسین سے حسین لڑکیاں آپ کے لئے موجود ہیں، مگر اس نئے مذہب کی اشاعت نہ کیجئے اور اگر آپ کو کچھ سحر یا آسیب کا خلل معلوم ہوتا ہو تو آپ فرمائیں کہ ہم کسی طبیب وغیرہ کو لائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کو جو کہنا تھا کہہ چکے، کہا ہاں۔ فرمایا اب میں کہتا ہوں، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ حم سجدہ پڑھنا شروع کی۔ حٰمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ (یہ کلام رحمان رحیم کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے یہ ایک کتاب ہے۔ جس میں آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی ہے ایسے لوگوں کے لئے جو دانشمند ہیں بشارت دینے والا ڈرانے والا ہے۔ اکثر لوگوں نے روگردانی کی پھر وہ سنتے نہیں وہ لوگ کہتے ہیں کہ جس بات کی طرف آپ ہم کو بلاتے ہیں ہمارے دل اس سے پردوں میں ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ ہے اور ہمارے آپ کے درمیان ایک حجاب ہے سو آپ اپنا کام کئے جائیں ہم اپنا کام کئے جائیں) بھلا اوّل تو قرآن خود ہی دلکش اور شیریں ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش آوازی:

پھر اوپر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھنا، آپ کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: کان احسن الناس صوتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ خوش آواز تھے۔ صاحبو! جب ایک ادنیٰ عرب جو عربی طریقہ سے قرآن پڑھتا ہو سننے والوں کو مست کر دیتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھنا تو کیا کچھ ہوگا۔ بس اس کافر کی یہ حالت ہوئی کہ دونوں ہاتھ پیچھے کو ٹیک کر مبہوت بنا ہوا

بیٹھا رہا۔ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی ہے: فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (پھر اگر وہ روگردانی کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو ایسی آفت سے ڈراتا ہوں جیسی عاد وثمود پر آفت آئی تھی) تو یہ کہتا ہوا بھاگا کہ بس اب سننے کی تاب نہیں۔ جب یہ اپنی جماعت میں واپس آیا تو ابوجہل نے دور سے چہرہ دیکھ کر کہا کہ یہ تو جس حال میں گیا تھا اس پر لوٹ کر نہیں بلکہ کچھ بدل کر آ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سن کر متاثر ہو گیا ہے۔

ابوجہل بڑا معبر تھا:

ابوجہل بڑا صاحب فراست تھا اور مؤرخین نے لکھا ہے کہ معبر بھی بہت بڑا تھا اور اس سے معلوم ہوا کہ تعبیر خواص لازمہ بزرگی سے نہیں، ورنہ پھر ابوجہل کو بھی بزرگ مانو، بلکہ اس کا مدار عقل وفراست پر ہے۔ اگر کافر صاحب فراست ہو تو وہ بھی اچھی تعبیر دے سکتا ہے۔ مگر آج تعویذ گنڈوں کی طرح تعبیر کو بھی لوازم بزرگی سے سمجھ لیا ہے۔ بہر حال ابوجہل نے غضب کیا کہ دور سے صورت دیکھ کر ہی پہچان لیا کہ اس کے قلب کی حالت بدلی ہوئی ہے۔ جب پاس آیا تو پوچھا کہو کیا گفتگو ہوئی۔ اس نے کہا کہ میں نے ان کو ہر طرح کی لالچ وطمع دی۔ اس کے جواب میں انہوں نے قرآن کی تلاوت شروع کر دی۔ کیا کہوں کیسا عجیب کلام ہے۔ کچھ دیر تک تو میں حیران ہو کر سنتا رہا۔ جب انہوں نے فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (پھر اگر وہ روگردانی کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو ایسی آفت سے ڈراتا ہوں جیسی عاد وثمود پر آفت آئی تھی) پڑھا تو مجھے ایسے معلوم ہوا کہ گویا اب مجھ پر بجلی گر پڑے گی، چونکہ قرآن میں یہ اثر ہے کہ خالی الذہن کو اس کی طرف خواہ مخواہ کشش ہوتی ہے، اس لئے کفار قرآن سنتے ہی نہ تھے کہ کہیں ہدایت نہ ہو جائے، بلکہ جب قرآن پڑھا جاتا وہ لوگ شور وشغب کرنے لگتے یا کانوں میں انگلیاں دے لیتے۔ افسوس یہی حال آج کل بعض مسلمانوں کا ہے کہ وہ بھی وعظ میں اس لئے نہیں آتے کہ کہیں خود بخود اصلاح نہ ہو جائے۔ چنانچہ اہل باطل اپنے لوگوں کو ہماری جماعت کے اختلاط سے روکتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ان دیوبندیوں کے تو پاس جانے اور ان کی صورت دیکھنے سے بھی دوسرے پر اثر ہوتا ہے۔

دیوبندیوں کا رنگ پختہ ہوتا ہے:

مولانا احمد حسن صاحب کانپوری کے پاس دیوبند سے فارغ ہو کر بعض طلباء معقول پڑھنے جایا

کرتے تھے کیونکہ وہ معقول میں مشہور تھے۔ پھر درس کے اندر مولانا کبھی کبھی اپنے مسلک کی تائید و تقویت میں تقریر کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ دیوبندی بھی ہمارے مسلک کو تسلیم کرلیں، کیونکہ استاد طبعاً چاہا کرتا ہی ہے کہ شاگرد میرے مسلک پر ہو تو اچھا ہے مگر ایک دن مایوس ہوکر کہنے لگے کہ ارے دیوبندیوں کا رنگ ایسا پختہ ہوتا ہے کہ اس پر دوسرا رنگ چڑھتا نہیں ہے اور یہ ہر رنگ پر جلدی سے چڑھ جاتا ہے۔ اسی لئے اہل باطل اپنی جماعت کو دیوبندیوں سے روکتے ہیں اور بعض لوگ خود بھی اس خوف سے رُکتے ہیں کہیں ہم بھی ایسے نہ ہو جائیں۔ ایک مولوی صاحب الہ آبادی ہمارے دوست ہیں، انگریزی میں بی اے فیل ہیں (تبسم کرتے ہوئے فرمایا) یہ بھی ایک فخر ہے کہ ہمارے دوستوں میں بھی بی اے ہیں، گو فیل وہ اپنے کسی فعل سے ہوئے اب الہ آباد کے ایک سکول میں مدرس ہیں۔

حضرت حکیم الامت کے وعظ کا اثر:

جب میں الہ آباد ایک بار گیا تو وہ مولوی صاحب وعظ سننے آئے اور ان کے ساتھ سکول کے طلباء بھی آئے۔ پھر دوبارہ وعظ ہوا اور ان مولوی صاحب نے سکول کے طلباء سے کہا کہ وعظ میں چلتے ہو؟ کہنے لگے کہ نہیں صاحب! ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں ہم بھی تم جیسے نہ ہو جائیں۔ پہلے ہی وعظ میں ہم کو اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں ہمارے خیالات ترقی بدل نہ جائیں اور صاحب ہمیں تو ابھی بہت کام کرنا ہیں، ملازمت وغیرہ کی اُمیدیں ہیں، ہم ابھی سے تارک وزاہد کیونکر بن سکتے ہیں۔ ان لوگوں کی ایسی مثال ہے جیسے مریض یوں کہے کہ ہمیں تو صحت مرغوب نہیں بلکہ مرض ہی محبوب ہے، کیونکہ اس وقت خمیرہ گاؤزبان تو کھانے کو ملتا ہے اس کمبخت کو یہ معلوم نہیں کہ صحت میں وہ لذت ہے کہ تندرست آدمی کو روکھی روٹی بھی خمیرہ گاؤزبان سے زیادہ لذیذ معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اشتہا صادق ہوتی ہے۔ اسی طرح لوگ طاعات میں لگ جانے سے ڈرتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ معاصی کی لذت ہم سے چھوٹ جائے گی، حالانکہ بخدا طاعات میں وہ لذت ہے جو معاصی میں ہرگز نہیں، مگر میں ایسا طریقہ بتلاتا ہوں کہ معاصی کے ساتھ بھی آپ کو راحت باطنی حاصل ہو جائے گی۔ پھر رفتہ رفتہ معاصی بھی چھڑا دے گی، وہ طریقہ محبت ہے۔

راحت باطنی کی تحصیل کا طریق:

اس کی تحصیل کے لئے دو طریقے ہیں: یا تو اول طاعات میں مشغول ہو اس سے محبت پیدا ہو جائے گی یا اول محبت حاصل کرے اس سے معاصی چھوٹ کر طاعات کی توفیق ہو جائے گی یہ

بات حق تعالیٰ ہی کے دربار میں ہے کہ چاہے کہ پہلے بی اے پاس بھی ہوتا رہے گا سلاطین اگر یہاں تو یہ قاعدہ ہے کہ پہلے امتحان پاس کرو پھر ملازمت ملے گی اور جو شخص پہلے ملازمت لینا چاہے تو اول تو ایسے جاہل کو جس نے کوئی امتحان پاس نہ کیا ہو ملازمت ہی نہیں ملتی اور جو محنت ومزدوری کی قسم سے کچھ ملتی بھی ہو تو اس کے ساتھ تکمیل علم نہیں ہو سکتی ایسا دربار کہاں ہے کہ چاہے اول علم و عمل حاصل کرلو تب ملازمت مل جاتی ہے یا پہلے ملازمت کرلو تو تعلیم بھی کامل ہو جاتی ہے واقعی عجیب دربار ہے اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں **تعلمنا العلم لغیر اللہ فابی ان یکون الا اللہ** کہ ہم نے علم دین پڑھا تو تھا غیر خدا کے لئے (مگر علم غیر اللہ سے مانع ہو کر اللہ ہی کے لئے ہوا) مثلاً منصب وغیرہ حاصل کرنے کے لئے کیونکہ پہلے تو علماء بڑے بڑے منصب والے تھے قاضی، مفتی، منصف، صدر اعلیٰ اور وزیر اور متولی اوقاف وغیرہ) ان عہدوں پر یہی ہوتے تھے اور اسی کا یہ اثر ہے کہ اب بھی وکیل صاحب اور ڈپٹی کلکٹر صاحب مولوی کہلاتے ہیں کیونکہ اس منصب پر قدیم زمانہ میں علماء ہی ہوتے تھے اب ذات کی نوعیت تو تبدیل ہوگئی مگر عہدہ کے لئے مولوی صاحب کا لقب باقی رہ گیا کانپور میں ایک وکیل صاحب کے یہاں ناچ تھا تو لوگ بازار میں ایک دوسرے سے یوں کہتے تھے کہ میاں چلوں آج فلاں مولوی صاحب کے یہاں ناچ ہے کیونکہ وہ وکیل صاحب مولوی مشہور تھے مگر بس ایسے ہی مولوی تھے (یعنی خدائی مولوی نہ تھے سرکاری مولوی تھے) اور غدر سے پہلے تو عموماً انگریزی حکومت کے بھی بڑے بڑے عہدوں پر علماء ہی مقرر ہوا کرتے تھے مگر اب کچھ دنوں سے جبکہ انگریزی دانی کی شرط لگ گئی علماء ان سے علیحدہ ہو گئے۔

حکایت مولانا محمد فاروق صاحب چڑیا کوٹی:

مولانا محمد فاروق صاحب چڑیا کوٹی بڑے فاضل تھے خصوصاً ادب ومعقول میں بہت مشہور تھے ان کے پاس وکالت کا پاس موجود تھا کیونکہ ابتداء میں اس کے لئے انگریزی دانی کی ضرورت نہ تھی۔ مولوی صاحب معقولی تو بہت تھے مگر نظائر وغیرہ بہت کم دیکھتے تھے اور آج کل مقدمات زیادہ تر نظائر پر ہوتے ہیں اس لئے بحث میں مولوی صاحب کی وکالت زوردار نہ تھی مگر پھر بھی لوگ ان کے پاس مقدمات بہت زیادہ لاتے تھے کیونکہ اکثر حکام مولوی صاحب کے شاگرد تھے بس جس مقدمہ میں آپ کی بحث کمزور ہوتی شام کو حاکم کے بنگلہ پر پہنچ گئے اور فرمایا دیکھو جی! اس طرح فیصلہ کرنا پڑے گا۔ ایک ڈپٹی یا منصف کہتے تھے کہ مولوی صاحب تو زبردستی کی وکالت کرتے ہیں کہ ہماری گردنیں دباتے ہیں ہم ان کی بات کو رد نہیں کرتے کیونکہ استاد ہیں عوام کو یہ

رازمعلوم ہوگیا ہےاس لئے مقدمات ان کے پاس خاصے جمع ہو جاتے ہیں۔

ایک بھولے مولوی صاحب کی وکالت کی حکایت:

ایک اور مولوی صاحب وکالت کرتے تھے مگر بھولے بہت تھے ایک دفعہ آپ مدعی علیہ کے وکیل تھے مگر عدالت میں پہنچ کر برعکس یہ خیال رہا کہ مدعی کا وکیل ہوں اب آپ نے مدعی کا حق ثابت کرنے کے لئے تقریر شروع کی اوراس کی تائید میں چودہ پندرہ دلیلیں بیان کیں مدعی علیہ کا تو رنگ زرد ہوگیا کہ مولوی صاحب تو میرے وکیل تھے یہ مدعی کی تائید کیوں کرنے لگے پھر سمجھا کہ مولوی صاحب بھولے تو ہیں ہی شاید وہ بھول گئے کہ میں کس کا وکیل تھا آخراس نے مولوی صاحب کواشارہ کیا آپ سمجھ گئے کہ میں نے تو ساری تقریر اپنے موکل کے خلاف کی مگر ذہانت تو دیکھئے کہ مدعی کی اس قدر تائید کر کے آپ نے تقریر کا رخ کس خوبصورتی سے بدلا کہ چودہ پندرہ دلائل قائم کر کے آپ نے مدعی سے اوراس کے وکیل سے دریافت کیا کیوں صاحب آپ کے پاس یہی دلائل ہیں یا کچھ اور بھی ہیں، مدعی کے تو باپ کو بھی یہ دلائل نہ سوجھتے اس نے خوش ہو کر کہا ہاں حضور میرے یہی دلائل ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ یہ سب دلائل غلط اور لغو ہیں میں ان سب کا جواب دیتا ہوں پھر ایک ایک کر کے سب کو توڑ دیا تمام عدالت والے حیران تھے کہ بھولے پر بھی کس خوبصورتی سے مقدمہ کو سنبھالا ہے اور جن دلائل کو اول نہایت زور کے ساتھ خود قائم کیا تھا ان کو کس قوت کے ساتھ بعد میں توڑا ہے۔

مولانا شاہ سلامت اللہ صاحب کی بیباکی:

کانپور میں ایک مولوی صاحب سب جج تھے اس وقت مولانا شاہ سلامت اللہ صاحب بھی کانپور میں موجود تھے۔ یہ شاہ سلامت اللہ صاحب شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد تھے وعظ کے بعد کسی نے شاہ صاحب سے استفسار کیا وہ سب جج بھی حاضر تھے آپ نے جواب دیا اس نے کہا حضور میں نے سب جج صاحب سے بھی یہ مسئلہ دریافت کیا تھا وہ تو یوں کہتے ہیں پہلے زمانہ کے مولوی تو آزاد تھے اور اہل کمال مستغنی ہوا ہی کرتے ہیں شاہ صاحب نے بے ساختہ فرمایا کہ سب جج صاحب گوہ کھاتے ہیں۔ اس پر جج صاحب کی اہلیت دیکھئے کہ باوجود عالم ہونے کے برا نہیں مانا بلکہ ادب سے عرض کیا کہ حضرت نے سچ فرمایا واقعی میں تو دنیا کا کتا ہوں مجھے افتاء کا کام کرنا زیبا نہیں یہ کام تو آپ ہی حضرات کا ہے۔

آج کل ہر شخص آزادی کا طالب ہے:

آج کل اگر کوئی مولوی کسی کو ایسا سخت کلمہ کہہ دے تو اسے بے تہذیب وغیرہ کا خطاب مل

جائے کیوں صاحب آج کل تو ہر شخص آزادی کا طالب ہے پھر مولویوں کو بھی تو آزادی دو ورنہ ان کو مولوی نہ کہو کیونکہ مولوی کہنا گویا اپنے سے بڑا تسلیم کرنا ہے پھر ان کو پابند کرنا اور خود آزاد ہونا خلاف انسانیت ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ پہلے حکومت کے بڑے بڑے عہدے مولویوں کے ہاتھ میں تھے اور اس زمانہ میں بھی ریاستوں کے اندر قاضی وغیرہ علماء ہی ہوتے ہیں چنانچہ ہمارے ایک دوست ابھی حیدر آباد کے قاضی ہوئے تھے ایک ہزار روپے تنخواہ تھی ایک اور مولوی صاحب حیدر آباد میں ہیں جو مالی خدمت پر ہیں ان کی دو ہزار روپے تنخواہ ہے گو دل تو نہیں چاہتا کہ مولویوں کی تنخواہ پچاس ساٹھ سے بڑھے۔ پہلے تو دس بیس سے زیادہ کو جی نہ چاہتا تھا مگر اب ویسی برکت نہیں رہی تو اب پچاس ساٹھ سے زیادہ کو دل نہیں چاہتا کیونکہ زیادہ تو ہیضہ ہے مگر ظاہر میل اہل دنیا کے سامنے فخر کرنے کو ایسی حکایتیں بیان کر کے جی خوش ہو جاتا ہے کہ ہماری جماعت میں بھی ایسے ترقی یافتہ موجود ہیں جن کی تنخواہ ہزار دو ہزار ہے اور بدون انگریزی پڑھے ہوئے ان کی اس قدر تنخواہ ہو گئی گو اندر سے دل خوش نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کا حصہ بند کرنے کو ایسے واقعات اچھے ہیں جو یہ کہتے ہیں علم دین سے آدمی دنیا کے کام کا نہیں رہتا اور اس زمانہ سے پہلے زمانہ میں تو علماء ہی کے لئے یہ مناصب مخصوص تھے دوسروں کو ملتے ہی نہ تھے۔

علم دین کا اثر:

اسی طرف اشارہ کر کے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ گو ہم نے علم تو حاصل کیا تھا دوسری غرض سے کہ قاضی یا مفتی یا وزیر ہو جائیں مگر علم کسی کا ہو کر نہ رہا وہ خدا تعالیٰ ہی کا ہو کر رہا اور آخر کار ہم کو بھی خدا تعالیٰ کی طرف کھینچ کر پہنچا دیا۔ واقعی یہ علم دین ضرور اثر کرتا ہے کبھی نہ کبھی اپنا رنگ دکھاتا ہے۔

غیر اللہ کی خاطر علم دین حاصل کرنا کیسا ہے:

اسی واسطے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ گو وہ علم دین جو لغیر اللہ پڑھا جائے موجب ثواب اور سبب فضیلت نہیں مگر معقول وغیرہ سے پھر بھی اچھا ہے کیونکہ اس میں اخلاق حسنہ واعمال واجبہ کی تعلیم تو ہے اور ان کے ترک پر وعیدیں بھی مذکور ہیں جن سے کسی قدر خشیت ضرور پیدا ہوگی جو کبھی نہ کبھی اپنا اثر دکھاوے گی اور معقول میں یہ بات کہاں وہاں تو سوائے قیل وقال کے کچھ بھی نہیں۔ نہ کسی واجب کا امر نہ اس کے ترک پر وعید، تو جیسے علم لغیر اللہ بھی نافع ہو جاتا ہے اور ایک وقت میں وہ خدا تعالیٰ کا بنا دیتا ہے اسی طرح میں کہتا ہوں کہ تم محبت پیدا کر لو یہ خود ہی سب معاصی

کو چھڑا دے گی اور یہ بھی لازم نہیں کہ پہلے معاصی کو چھوڑ و تب محبت حاصل کرو بلکہ تم جس حال میں ہو اسی حال میں آ جاؤ اور طریقہ پر عمل کرو، ان شاء اللہ تعالیٰ اس حال میں بھی محبت پیدا ہو جائے گی۔ پھر یہ خود ہی معاصی کو بھی جلا پھونک دے گی۔

حرکت میں برکت:

ہمارے حاجی صاحب اور حافظ محمد ضامن صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ کی رائے میں بیعت کے متعلق اختلاف تھا۔ حافظ صاحب کی رائے یہ تھی کہ طالب طریق کو اصلاح اخلاق کا طریقہ اول بتلا دیا جاوے، جب اخلاق درست ہو جائیں تب داخل سلسلہ کیا جائے اور حاجی صاحب کی رائے یہ تھی کہ اول سلسلہ میں داخل کر لیتے پھر اصلاح فرماتے پھر اصلاح یا تو شیخ کی برکت سے ہو جائے یا کسی حرکت سے ہو جائے یعنی وہ حرکت یا مرید کی طرف سے ہو یا شیخ کو اجازت دو کہ وہ حرکت کر کے تمہاری مرمت کیا کرے تو صاحب حاجی صاحب میں تو برکت بہت زیادہ تھی اس لئے وہاں داخل سلسلہ کرتے ہی مرید کی اصلاح ہو جاتی تھی اور ہم لوگوں میں یہ برکت کہاں، یہاں تو حرکت سے کام چلے گا۔

سید الطائفہ حضرت حاجی صاحبؒ کی برکت:

حضرت حاجی صاحب کی تو برکت کی یہ کیفیت تھی کہ ایک رند صاحب مجھ سے خود اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ وہ حضرت کی خدمت میں بیعت ہونے آئے اور بیعت کے وقت کہنے لگے حضرت میں اس شرط سے بیعت ہوتا ہوں کہ ناچ دیکھنا نہ چھوڑوں گا اور نماز نہیں پڑھوں گا حضرت نے یہ شرط منظور فرما لی اور فرمایا بھائی! ایک شرط ہماری بھی ہے وہ یہ کہ ہم کچھ مختصر سا ذکر بتلا دیں گے تھوڑی دیر کا ہے تم روزانہ بلا ناغہ اسے کر لیا کرنا۔ اس نے یہ شرط منظور کر لی اور حضرت نے بیعت فرما لیا یہاں اہل ظاہر کو شبہ ہوگا کہ حضرت نے اس شخص کو ناچ دیکھنے اور نماز نہ پڑھنے کی اجازت دے دی۔ یہ غلط ہے بلکہ یہ محض ظاہر میں اجازت تھی اور باطناً اس کو اچھی طرح جکڑ دیا گیا تھا۔ یہ واقعہ اس واقعہ کی نظیر ہے جو حدیث میں آتا ہے کہ وفد بنی ثقیف نے اسلام لانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شرط کی تھی کہ ہم زکوٰۃ نہ دیں گے اور جہاد نہ کریں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کو منظور فرما لیا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اشکال پیش آیا اور انہوں نے آپ سے دریافت کیا تو فرمایا کہ ان کو اسلام تو لانے دو۔ اسلام کے بعد وہ سب کچھ کریں گے۔ چنانچہ واقعی اسلام لانے کے بعد ان لوگوں نے سب کچھ کیا۔ اسی طرح حاجی صاحب کو حق تعالیٰ کے بھروسہ پر یہ اعتماد تھا کہ خدا تعالیٰ کا

نام لینا جب یہ شروع کرے گا تو نماز بھی پڑھے گا اور ناچ بھی چھوڑ دے گا۔ چنانچہ حضرت کا خیال درست ہوا۔ حضرت کی برکت دعاء وتوجہ کا اس طرح حق تعالیٰ نے ظہور فرمایا کہ جب بیعت ہونے کے بعد پہلی ہی نماز کا وقت آیا تو اس شخص کے بدن میں خارج پیدا ہوئی، گویا ایک غیبی سپاہی مسلط ہوگیا، خارش اس قدر بڑی کہ ذرا سی دیر میں بے چین کر دیا اور جو جو تدبیریں کرتے ہیں زیادتی ہی ہوتی چلی جاتی ہے، پھر خیال آیا کہ لاؤ ذرا ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھولیں شاید اس سے کچھ گرمی کو سکون ہو ہاتھ پاؤں پر پانی ڈال کر یہ خیال ہوا کہ لاؤ وضو ہی کر لیں۔ وضو کا پورا ہونا تھا کہ آدھی خارش کم ہوگئی پھر خیال ہوا کہ لاؤ نماز بھی پڑھ لیں کوئی نماز پڑھنے سے قسم تو کھائی نہیں ہاں پیر سے یہ شرط کر لی ہے کہ نماز کی پابندی نہ کرنے پر مجھ کو ٹوکا نہ جائے چنانچہ نماز کو کھڑے ہوگئے۔ نماز کا شروع کرنا تھا کہ خارش کو بالکل سکون ہوگیا ایک وقت تو اس کو اتفاقی امر سمجھا گیا مگر جب دوسرے اور تیسرے وقت بھی یہی کیفیت ہوئی کہ نماز سے بالکل سکون ہوجاتا تو وہ شخص سمجھ گیا کہ یہ پیر کی کرامت ہے، مجھ سے تو کہہ دیا کہ شرط منظور ہے اور اندر ہی اندر ایک سپاہی مسلط کر دیا پھر وہ نماز کے پابند ہوگئے پھر یہ خیال ہوا کہ پانچ وقت دربار الٰہی میں حاضری دے کر پھر ناچ کیا دیکھیں سو ناچ سے بھی ان کو نفرت ہوگئی تو حضرت کی تو ایسی برکت تھی کہ دوسرا کچھ کرنا بھی نہ چاہے جب بھی وہ دوسرے طریقہ سے کام لے لیا کرتے تھے لیکن اب ایسی برکت کہاں۔ اب تو اس کی ضرورت ہے کہ طالب خود بھی کچھ کرے اور جو طریقہ بتلایا جائے اس پر عمل کرے خواہ کامل مجاہدہ نہ کرے اس سے تو ان شاء اللہ تعالیٰ چند روز میں محبت پیدا ہو جائے گی۔

محبت قائد ہے:

چونکہ میرے شیخ کا یہی طرز تھا کہ وہ اول طالب کے اندر محبت پیدا کرتے تھے پھر اعمال وغیرہ اصلاح کرتے تھے یہی طرز مجھے بھی پسند ہے تو محبت قائد ہے اس سے انسان خود بخود بہت جلد حق تعالیٰ تک کھنچا چلا جاتا ہے اور خوف سائق ہے، وہ پیچھے سے ہانکتا ہے کہ گو جی نہ چاہے مگر زبردستی چلنا پڑتا ہے۔ اسی واسطے کفار کے بارے میں فرماتے ہیں **وسیق الذین کفرو الی جھنم زمرا** (اور جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف گروہ گروہ بنا کر ہانکے جائیں گے) کہ وہ جہنم کی طرف باوجود کراہت کے پیچھے سے ہانک کر لیجائیں گے جیسے جانوروں کو لے جایا جاتا ہے، مگر شاید یہاں کسی کو اشکال ہو کہ اس کے بعد مسلمانوں کے واسطے بھی تو **وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا** (اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں وہ گروہ گروہ ہو کر جنت کی طرف روانہ

کئے جائیں گے) فرمایا گیا ہے تو کیا وہ بھی اسی طرح ہانک کر لے جائے جائیں گے اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ اس جگہ سوق کا اطلاق مشاکلت کے طور پر ہے جیسے جزاء سیئة سیئة مثلها (برائی کا بدلہ برائی ہے مثل اس کے) اور اگر مشاکلت نہ ہو تو پھر جواب یہ ہے کہ سوق کے اصل معنی تقاضا سے لیجانا ہے۔ پھر کبھی تو تقاضا کے ساتھ تذلیل بھی ہوتی ہے جب کہ دوسرا شخص جانا ہی نہ چاہے اور کبھی محض تقاضا ہوتا ہے تذلیل نہیں ہوتی جیسے آپ اپنے لڑکے کو ساتھ لیکر سفر میں جائیں اور وہ راستہ میں ہر شہر کی سیر کرنا اور ہر دوکان و بازار کو دیکھنا چاہے تو آپ تقاضا کرتے ہیں کہ میاں جلدی چلو یہاں کیا رکھا ہے منزل پر پہنچ کر ہر قسم کا سامان راحت مہیا ملے گا اس صورت میں بھی سوق کا اطلاق ہو سکتا ہے مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار میں تھانہ بھون سے دیوبند گھوڑے پر گیا تھا ایک مزدور یا ملازم ساتھ تھا اور کوئی بڑا ساتھ نہ تھا۔ جھڑ بیریوں کا موسم تھا تو میں راستہ میں جگہ جگہ اترتا اور بیر توڑ کر کھاتا رہا یہاں تک کہ بہت دیر ہو گئی اور دیوبند نا وقت پہنچا۔ اگر اس وقت کوئی شفیق اور خیر خواہ میرے ساتھ ہوتا تو وہ ضرور مجھے اس حرکت سے روکتا اور تقاضا کر کے منزل پر جلدی پہنچانے کی کوشش کرتا ان مقدمات کو سن کر اب سمجھئے کہ جنت میں جیسی لذت و راحت ہے وہ ظاہر ہے، مگر جنت کے اردگرد بھی پھول پھلواری اور زینت و آرائش اس قدر ہیں کہ دنیا میں کسی کے خواب میں بھی نہ آئی ہوگی تو جس وقت مسلمان جنت کی طرف چلیں گے اُس وقت وہ راستہ کی زینت اور آرائش کی سیر میں مشغول ہو جائیں گے اور اس کے دیکھنے کے لئے ٹھہر جائیں گے کہ بھائی یہ پھول پتی بڑی عجیب ہے ذرا اس کی بھی تو سیر کر لیں یہ باغ تو نہایت ہی بے نظیر ہے اس کو بھی تو دیکھیں اس وقت فرشتے تقاضا کریں گے کہ تم کاہے کی سیر میں لگ گئے ہو تم جلدی سے جنت میں پہنچو وہاں ان سب سے زیادہ عجیب وغریب پھول پھلواری اور میوہ جات ہیں اور وہاں حوریں ہیں غلمان ہیں ذرا تم قدم اٹھا کر وہاں تو پہنچ جاؤ پھر ان سب کو بھول جاؤ گے یہ سن کر مسلمان کچھ تیزی کریں گے کہ تھوڑی دور پر کوئی اور سیر گاہ نظر پڑے گی، اس کی سیر کرنے لگیں گے۔ فرشتے پھر جلدی چلنے کا تقاضا کریں گے کیونکہ وہ خیر خواہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ جنت کو دیکھ کر یہ خود افسوس کریں گے کہ ہم نے خواہ مخواہ راستے کی چیزوں میں دیر کی جنت کے سامنے تو سب گرد ہیں اس واسطے مسلمانوں کے لئے بھی دسیق فرمایا کیونکہ یہ بھی تقاضا کے ساتھ لیجائے جائیں گے گو ان کا تقاضا اور طرح کا ہے اور کفار کا تقاضا دوسری طرح کا ہے مگر معنی سوق کے دونوں جگہ متحقق ہیں یہ تو درمیان میں ایک نکتہ کا بیان تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ محبت سب سے بڑا قائد ہے اس وقت میں

اسی کو قائد بناتا ہوں اور اس پریشانی کا علاج اس سے کرنا چاہتا ہوں مگر اول آیت کا حاصل سن لیجئے۔

آیات متلوہ کا شانِ نزول:

حق تعالیٰ فرماتے ہیں الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم کیا تم نے ان لوگوں کی حالت نہیں سنی جو اپنے گھروں سے نکل گئے تھے یہ استفہام تعجیب کے لئے ہے کہ یہ قصہ بہت عجیب ہے چنانچہ ہمارے محاورات میں بھی ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ تمہیں خبر بھی ہے آج ایسا ہو گیا اس سوال واستفہام سے محض تعجب دلانا مقصود ہوتا ہے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ قصہ بنی اسرائیل کی ایک بستی کا ہے وہاں طاعون ہوا تھا جس سے گھبرا کر لوگ بھاگ گئے مگر حق تعالیٰ نے حذر الموت (موت سے ڈر کر) فرمایا ہے حذر الطاعون (طاعون سے ڈر کر) نہیں فرمایا کیونکہ خوف تو اصل موت ہی کا ہے اور طاعون کا خوف بھی اسی لئے ہے کہ وہ اسباب موت سے ہے فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا حق تعالیٰ نے ان سب کو کہا مر جاؤ سب مر گئے، موت ہی سے بھاگے تھے اور موت ہی نے پکڑ لیا۔ واقعی خدا تعالیٰ کے سوا کسی جگہ پناہ نہیں مل سکتی بھاگنے سے کیا ہوتا ہے بلکہ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ طاعون سے بھاگنے والے بہت کم بچتے ہیں وہ دوسری جگہ جا کر بھی مبتلائے طاعون ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ لوگ دوسروں کی نظروں میں ذلیل بھی ہوتے ہیں دوسری بستی والے ان سے ملنے ملانے میں پرہیز کرتے ہیں۔ پھر ذلت گوارا کرنے پر موت سے وہاں بچاؤ نہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گر گریزی بر امید راحتے   ہم ازاں جا پیش آید آفتے

(کوئی گوشہ بغیر دوڑ دھوپ کے نہیں ہے سوائے خلوت گاہ حق کے آرام نہیں ہے)

ثم احیاھم یعنی پھر حق تعالیٰ نے ان کو دفعۃً زندہ کر دیا بعض روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا سے زندہ ہوئے ایک تو ان سب کا دفعۃً مر جانا عجیب تھا پھر سب کا دفعۃً زندہ ہو جانا اس سے بڑھ کر عجیب ہوا کیونکہ موت کے لئے تو اہل طبیعات ظاہر میں کوئی سبب تراش بھی سکتے تھے مثلاً یہی کہ طاعون کی جگہ سے آ رہے تھے وہاں کی آب و ہوا اثر کر چکی تھی اس لئے مر گئے مگر زندہ ہونے کے لئے کوئی سبب نکالا جائے گا اور اگر اس کا بھی کوئی سبب ہوتا تو لوگ اس کو بھی اختیار کرتے اور کسی کو دعویٰ ہو کہ اس کا بھی کوئی طبعی سبب تھا تو میں ان سے کہتا ہوں کہ ذرا مہربانی کر کے آج کل بھی اس سے کام لیکر دکھا دیجئے اور حقیقت میں تو ان کی موت بھی بلا سبب ظاہری تھی کیونکہ تبدیل آب و ہوا کو اور طاعون کی جگہ سے چلے جانے کے اطبا یا ڈاکٹر تو سبب موت کہہ نہیں سکتے بلکہ

وہ تو اس کو سبب حیات بتلاتے ہیں رہا اثر سابق سو اول تو موثر سے بعد میں اس کا اثر کو ضعیف ہو جانا چاہئے نہ قوی۔ دوسرے اتنی بڑی جماعت میں ایک وقت میں اور ایک درجہ میں اثر ہونا یہ خود قانون طبعی کے خلاف ہے پس واقع میں سب کا دفعتہً مر جانا اور دفعتہً زندہ ہو جانا دونوں واقعے عجیب اور خلاف عادت ہی تھے جن سے حق تعالیٰ کو اس امر کا اظہار مقصود تھا کہ احیاء وامانت ہمارے قبضہ میں ہے کہ خلاف مقتضاء اسباب بھی واقع کر سکتے ہیں فرار سے کچھ نہیں اور پہلی امتوں میں ایسے عجائبات بہت ہوتے تھے آج کل ایسی کھلی کھلی نشانیاں ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ اب تو جو کچھ ہوتا ہے اسباب کی وجہ میں ہوتا ہے کیونکہ کھلم کھلا واقعات کے بعد انکار کرنے پر عذاب بھی بہت سخت ہوتا تھا اور اس امت پر رحمت زیادہ ہے اس لئے اب جو کچھ نشانات ظاہر ہوتے ہیں اسباب کے پردہ میں ہوتے ہیں ان سے عدم تذکیر پر عذاب بھی کم ہوتا ہے۔ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اس امت کے کفار پر بھی رحمت ہے کہ پہلی امتوں کے کفار کی طرح ان پر سخت عذاب نہیں آتا اس کے بعد فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (یقیناً اللہ تعالیٰ لوگوں پر بہت فضل فرماتے ہیں لیکن اکثر شکر نہیں کرتے) یہاں مفسرین نے الناس کو عام لیا ہے اور یہ مطلب بیان کیا ہے کہ حق تعالیٰ لوگوں پر بہت فضل کرنے والے ہیں کہ ایسے ایسے عجائبات و واقعات سے ان کو ہدایت فرماتے ہیں یا یہ کہ قہر کے بعد لطف بھی بے انتہا ہوتا ہے تو فضل سے مراد یہ لطف ہو جاوے گا مگر میرے ذوق میں الناس سے یہاں مراد اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

حق تعالیٰ شانہ کا امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فضل عظیم:

بنی اسرائیل کا واقعہ سنا کر یہ مضمون حق تعالیٰ نے ہم کو سنایا ہے کہ تم پر اے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ پہلے لوگوں کے قصے سنا کر تم کو عبرت دیتے ہیں یہ نہیں کیا کہ تم کو معذب کر کے دوسروں کو عبرت دیں جیسے ایک شاعر کے متعلق کسی قصور پر بادشاہ نے حکم قتل صادر فرمایا تو وہ بادشاہ سے لجاجت کے ساتھ معافی چاہنے لگا کہ مجھے قتل سے معاف کیا جائے۔ بادشاہ نے کہا ہرگز نہیں کیونکہ تمہارے قتل میں حکمت ہے کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ شاعر نے کہا حضور یہ حکمت تو اس طرح بھی حاصل ہو سکتی ہے کہ آپ کسی دوسرے کو مار دیجئے تاکہ مجھے عبرت ہو۔ یہ جواب سن کر بادشاہ کو ہنسی آ گئی ایشیائی بادشاہوں کی تو ہنسی ہی معافی ہے۔ اس کو چھوڑ دیا تو جیسے اس شاعر نے کہا تھا کہ دوسرے کو مار دیجئے تاکہ مجھے عبرت ہو حق تعالیٰ نے آپ کے واسطے ایسا ہی کیا کہ دوسروں کو تمہارے لئے نمونہ عبرت بنا دیا۔ تم کو ہلاک کر کے کسی کے لئے نمونہ عبرت نہیں بنایا۔

اعتقاد کی اصلاح:

چنانچہ اس قصہ میں ہمارے لئے چند سبق ہیں اس سے ہمارے اعتقاد کی بھی اصلاح کی گئی ہے اور اعمال کی بھی۔ اعتقاد کی اصلاح تو یہ ہوئی کہ اب اس واقعہ کو سن کر تم اسباب کو موثر نہ سمجھو گے جیسا کہ آج کل بعض ناواقف لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس بستی میں طاعون ہو وہاں رہنے سے طاعون ضرور ہی ہو جائے گا۔ پھر اس خیال سے دوسرا خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طاعون کی جگہ سے بھاگنا چاہئے چنانچہ بہت لوگ ہماری اس بستی میں سے بھی بھاگنے لگے کوئی میرٹھ جاتا ہے کوئی کیرانہ اور مظفر نگر جا رہا ہے۔

مقام طاعون سے بھاگنے کے حرام ہونے کا سبب:

حالانکہ احادیث میں تصریح ہے کہ فرار من الطاعون (طاعون سے بھاگنا) ایسا حرام ہے جیسے کفار کے مقابلہ سے بھاگنا۔ اس پر بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے تو صاحب شریعت نے احتیاط کو بھی حرام کر دیا چند سال ہوئے ایک پنشنر تحصیلدار صاحب نے مجھ سے ہی کہا تھا کہ طاعون کی جگہ سے بھاگنا طبعاً مفید ہے اور احتیاط اسی میں ہے کہ ایسی جگہ کو چھوڑ دیا جائے پھر شریعت نے اس احتیاط کو کیوں حرام کیا ہے میں نے کہا تحصیلدار صاحب آج کل جو گورنمنٹ کے حکم سے رنگروٹ بھرتی کر کے لام پر بھیجے جا رہے ہیں (اس وقت لڑائی کے لئے بہت آدمی بھرتی کئے جا رہے تھے) آپ کو خبر بھی ہے کہ گورنمنٹ سے بھاگنے کی اجازت نہیں حالانکہ وہ غریب بھی تو احتیاط ہی کرتا ہے آپ کو گورنمنٹ کے اس قاعدہ پر کبھی اعتراض نہ ہوا اور بھیجنے والے سے نہ کہا کہ کیسی جگہ خدا تعالیٰ کی مخلوق کو بھیج رہے ہو جہاں احتیاط کی بھی اجازت نہیں بس یہ جواب سن کر خاموش ہو گئے۔ کہنے لگے کہ ساری عمر کا جہل اب رفع ہوا۔ افسوس ہے کہ آج کل بدون انگریزی نظیر اور مثال کے خدا تعالیٰ کو بھی نہیں مانتے یہ حالت ہے ہمارے اعتقاد کی پھر عملی حالت کا تو کیا پوچھنا وہ تو اور بھی زیادہ گندی ہے اور آج کل جو طاعون سے زیادہ پریشانی ہے اس کا سبب بجز اس کے کیا ہے کہ لوگوں کے اعتقاد درست نہیں چنانچہ بڑی وجہ ظاہر میں یہ ہے کہ موت سے ڈر ہے اور موت سے ڈر کیوں ہے کچھ تو طبعی امر ہے۔

موت کی حقیقت:

مگر زیادہ تر اس خوف کا سبب یہ ہے کہ موت کے متعلق لوگوں کے عقائد صحیح نہیں اگر موت کے متعلق عقیدہ درست کر لیا جائے اور حقیقت موت کا بار بار مراقبہ کیا جائے تو یہ خوف بہت کم ہو

جائے گا۔ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ مر کر آدمی ایک گڑھے میں اکیلا جا پڑتا ہے اور تمام لذات سے محروم ہو جائے گا۔ سو یہ بالکل غلط ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو موت کی حقیقت بھی معلوم نہیں یاد رکھو کہ موت صرف جسم عنصری کو آتی ہے روح کو موت نہیں آتی بلکہ موت سے صرف اس کا تعلق جسم عنصری منقطع ہو جاتا ہے اب اس کے بعد یہ سمجھو کہ لذات سے منقطع ہونے والا کون ہے کیا آپ کے نزدیک یہ بدن ہے ہرگز نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ روح منتفع و متلذذ ہوتی ہے اور جسم کے لئے بمنزلہ آلہ و مرکب کے ہی اور یہ روح موت کے بعد بھی علیٰ حالہ باقی رہتی ہے بلکہ اب اس کی قوت پہلے سے زیادہ ہو جاتی ہے تو موت کے بعد وہ اس عالم کے لذات سے متلذذ ہوتی ہے اور اگر تم یہ سمجھو کہ میری حقیقت تو محض جسم ہی ہے تو اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے آپ کی حقیقت وہ ہے جس کو آپ میں سے تعبیر کرتے ہیں کہ میں نے یہ کیا میں نے وہ کیا۔ اب غور کیجئے کہ اس میں مصداق کیا چیز ہے کیا آنکھ، ناک یا منہ اور ہاتھ پیر کو میں کا مصداق کہہ سکتے ہو۔ ہرگز نہیں۔ ورنہ چاہئے کہ ان اعضاء کے جاتے رہنے سے انسان ہی جاتا رہے۔ اور یہ غلط ہے اور اعضاء شریفہ اور قویٰ شریفہ جیسے قلب اور عقل وغیرہ ممکن ہے کہ آپ ان کو میں کا مصداق کہیں مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اس کا مصداق نہیں ہیں کیونکہ آپ ان کو اپنی طرف سے مضاف کرتے ہیں کہ میرا دل کمزور ہو گیا یا میری عقل میں یوں آتا ہے وغیرہ وغیرہ اور اضافت علامت مغائرت ہے تو معلوم ہوا کہ یہ بھی آپ کی حقیقت نہیں۔

انسان کی حقیقت روح ہے:

بلکہ حقیقت آپ کی روح ہے اور گو وہاں بھی اضافت ہوتی ہے کہ میری روح مگر چونکہ مستقل دلائل سے ثابت ہے کہ یہی حقیقت ہے اس لئے یہ اضافت مجازیہ ہے اور دوسرے اعضاء و قویٰ میں ایسی کوئی دلیل نہیں بلکہ خلاف پر دلیل قائم ہے چنانچہ ایک زمانہ میں یعنی بالکل بچپن میں عقل نہیں ہوتی اور آپ ہوتے ہیں ایک وقت میں یعنی بعد موت قلب نہ رہے گا اور آپ ہوں گے صاف دلیل ہے کہ آپ کی حقیقت یہ چیزیں نہیں اس لئے یہ اضافت حقیقیہ ہے بہر حال آپ کی حقیقت روح ہے اور اس پر موت نہیں آتی بلکہ وہ بجنسہ موت کے بعد اپنے حال پر رہتی ہے اور اب بجائے اس جسم کے جو موت کے بعد فنا اور شکستہ ہو جاتا ہے روح کا مرکب دوسرا جسم بنتا ہے جس کو جسم مثالی کہتے ہیں اب روح اس جسم کے ذریعہ سے سارے انتفاعات و تلذذات حاصل

کرتی ہے اور یہ جسم مثالی وہ نسمہ ہے جس کو متکلمین اہل ظاہر روح کہتے ہیں یعنی موت کے وقت جو چیز جسم عنصری سے الگ ہوتی ہوئی معلوم ہوتا ہے وہ نسمہ ہے اور یہ بھی مادی چیز ہے مگر اس کا مادہ لطیف ہے اور اس کو اس جسم عنصری کے ساتھ ایسا حلولی تعلق ہے جیسا جسم تعلیمی کا تعلق جسم طبعی کے ساتھ حکماء نے بیان کیا ہے یعنی وہ نسمہ مقدار اور ہیئت وشکل میں بالکل جسم عنصری کے برابر ہے (اور وجہ تشبیہ یہی ہے ورنہ جسم تعلیمی تو عرض ہے اور یہ جوہر) اور یہ نسمہ اس وقت یعنی زندگی میں اس کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے اور موت کے وقت الگ ہوجاتا ہے۔

جسم مثالی:

یہی جسم مثالی ہے جو موت کے بعد روح حقیقی کا مرکب بنتا ہے اور جسم مثالی گو مادی ہے مگر اس جسم سے زیادہ لطیف قوی ہے اور روح حقیقی جو حقیقت میں انسان ہے وہ مادہ سے بالکل مجرد ہے۔ وہ نہ اس وقت جسم کے اندر ہے نہ موت کے وقت اس سے الگ ہو بلکہ وہ تو محض جسم کی مدبر ہے جواب بھی بدن سے الگ ہی ہے اور اس کی تدبیر کررہی ہے اور گو متکلمین نے روح کے تجرد کا انکار کیا ہے مگر اس بارے میں فلاسفہ کا قول راجح ہے دلائل سے قوت انہیں کے قول کو ہے اور صوفیہ کا کشف بھی اسی کے موافق ہے کہ روح حقیقی مادہ سے مجرد ہے۔ البتہ فلاسفہ کا اس کو قدیم کہنا جیسا قدماء کا قول ہے یا حادث بعد حدوث البدن کہنا جیسا مشائین کا قول ہے یہ بالکل غلط اور خلاف نصوص ہے اور متکلمین نے جس چیز کو روح سمجھ کر مادی کہا ہے وہ دراصل روح حقیقی نہیں بلکہ نسمہ ہے جو مرکب روح ہے۔ غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ انسان میں جو اصل چیز ہے اور حقیقت میں وہی انسان ہے موت کے بعد وہ اپنے حال پر رہتا ہے اس کی قوت وصفات میں کچھ کمی نہیں آتی بلکہ پہلے سے کچھ ترقی ہی ہوجاتی ہے اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ گو روح کو موت نہیں آتی مگر جسم سے تو تعلق منقطع ہوجاتا ہے تو جو انتفاعات روح سے تنہا نہیں ہوسکتے وہ تو اب نہ ہوسکیں گے۔

جسم مثالی سب لذات سے منتفع ہوتا ہے:

اس کا جواب بھی معلوم ہوگیا کہ موت کے بعد جسم مثالی مرکب بنتا ہے جو اس جسم عنصری سے لطیف اور قوی تر ہے وہ سب لذات سے منتفع ہوتا ہے جس کے مقابلہ میں یہاں کی لذات ہیچ ہیں، میں نے رسالہ ''شوق وطن'' میں ثابت کردیا ہے کہ یہاں کی سب نعمتیں اس عالم میں موجود ہیں اور روح ان سے مستلذ ہے، کھانا بھی پینا بھی سیر وتماشا بھی ملاقات احیا بھی مکانات اور

باغات بھی وغیرہ وغیرہ اس حقیقت کا مراقبہ کر کے موت کا دھیان کرو تو ان شاء اللہ تعالیٰ موت سے وحشت نہ ہوگی بلکہ اس کا شوق پیدا ہوگا اور یوں کہو گے

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم　　　راحت جاں طلبم وز پے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　　تا در میکد شادان و غزلخواں بروم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے راحت جان طلب کروں اور محبوب حقیقی کے پاس جاؤں۔ میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش وخرم اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں)

موت گھبرانے کی چیز نہیں:

بہر حال موت حقیقت میں ڈرنے کی چیز نہیں ہے، بلکہ وہ تو تحفۃ المومن ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسکو مومن کا تحفہ فرمارہے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ موت دراصل رغبت کی چیز ہے گھبرانے کی چیز نہیں اور جو گھبراہٹ ہے اس کا زیادہ سبب موت کی حقیقت ہے جہل وغفلت ہے اگر موت دراصل خوف وگھبراہٹ کی چیز ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تحفہ نہ فرماتے پھر کوئی تو بات ہے جو آپ اس کو تحفہ فرمارہے ہیں۔ یہ تحفہ تو وہ حالت ہے جو عین موت کے وقت ظاہر ہوگی۔ پھر موت کے بعد جو عیش ہوگا وہ اس کے علاوہ ہے اور درمیان میں عالم برزخ میں جو راحت ہوگی کہ مومنین کی ارواح جو اصل طیر خضر ہے ادھر ادھر کھاتی پھریں گی وہ الگ ہے ان سب باتوں کو سوچو تو ان شاء اللہ تعالیٰ موت سے وحشت وگھبراہٹ نہ رہے گی ہاں البتہ ایک بات رہ گئی جس کی وجہ سے عارفین اہل اللہ کو بھی موت و پریشانی ہوتی ہے وہ یہ کہ اپنے گناہوں سے اندیشہ ہوتا ہے کہ مرتے ہی کہیں ان پر گرفت اور مواخذہ نہ ہونے لگے اور گناہ بھی ایک دو نہیں بلکہ ایک بڑا انبار ہے جس کی یہ حالت ہے کہ:

یک تن وخیل آرزو دل بچہ مدعا دہم　　　تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(ایک جسم ہے اور دل کی بہت آرزوئیں ہیں کس کس مدعا دوں تن ہمہ داغ داغ کہاں کہاں پھاپہ رکھوں) یہ فکر البتہ بہت سخت ہے اور فکر اچھی بھی ہے یہ ضرور ہونا چاہئے مگر میں کہتا ہوں کہ اس فکر کو طاعون ہی کے ساتھ کیا خصوصیت ہے یہ تو ہر مرض میں ہونا چاہئے پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ گناہوں کے ترک سے دوسرے امراض میں اس قدر وحشت نہیں ہوتی جتنی طاعون میں ہوتی ہے حالانکہ طاعون میں اگر سچ پوچھو تو طبعاً بھی وحشت کم ہونا چاہئے کیونکہ مثل مشہور ہے اور امر طبعی بھی ہے کہ مرگ انبوہ جشنے دارد (مرگ انبوہ جشن رکھتی ہے) اور عربی مثل ہے **البلیة اذا عمت** طابت کہ بلا جب عام ہو جاتی ہے خوشگوار ہو جاتی ہے اسی طرح میں کہتا ہوں کہ موت جماعت

موت وحدت سے اہون ہونا چاہئے مگر نہ معلوم یہاں یہ طبعی امر برعکس کیوں ہے کہ موت وحدت سے گھبراہٹ نہیں ہوتی ہے اور مرگ انبوہ سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اگر کہا جاوے وحشت اس لئے ہے کہ اس میں مہلت نہیں ہوتی تو اور بھی بعض اسباب موت ایسے ہیں جیسے ہدم وغرق مگر ان میں اس درجہ وحشت نہیں۔ بہر حال اس کی حقیقت میری سمجھ میں نہیں آئی اور ایسی بہت باتیں ہیں جن کی حقیقت کا علم ہم کو نہیں مگر وقوع مشاہد ہے۔

گدگدی کا سبب:

جیسا کہ چند روز سے میرے دل میں سوال آرہا ہے کہ گدگدی کا سبب کیا ہے ذرا سہارے رفار مرجع ہو کر مجھے اس کا سبب بتلائیں اگر معقول سبب کسی نے بتلا دیا تو میں اس کی شاگردی قبول کر لوں گا۔ رقم تو میرے پاس نہیں ہے جو کچھ انعام دوں اگر گدگدی کا سبب حرکت غریبہ کو بتلایا جائے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ ویسی ہی حرکت غریبہ اپنے ہاتھ سے کی جائے تو گدگدی کیوں نہیں اٹھتی دوسرے ہی کے ہاتھ سے کیوں اٹھتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی اب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ طاعون میں مرگ انبوہ سے وحشت کیوں ہوتی ہے خیر یہ تو ایک امر طبعی ہے کہ طاعون سے گھبراہٹ ہوتی ہے مگر امور طبعیہ بھی علاج وتدبیر سے اور عقل سے کام لینے سے مغلوب ہو جاتے ہیں جیسے کڑوی دوا طبعاً ناگوار ہوتی ہے مگر عقلی مقدمات کے سوچنے سے ناگواری کم ہو جاتی ہے نشتر لگوانے میں کتنی سخت تکلیف ہوتی ہے مگر عقل سے کام لیکر نشتر کو گوارا کرتے ہیں اور بعض دفعہ بدون کلوروفارم سونگھے ہوئے بھی نشتر لگوا لیتے ہیں کیونکہ کلوروفارم سونگھنے سے دماغ کمزور ہو جاتا ہے ایسے ہی اس معاملہ میں عقل سے کام لیکر اس وحشت وگھبراہٹ کو کم کرنا چاہئے جو آج کل اس بیماری کی وجہ سے ہو رہی ہے آخر خدا تعالیٰ نے عقل کس واسطہ دی ہے جیسے ایک بیرسٹر کا کہ اس وقت وزیر تھے قصہ میں نے سنا ہے کہ ان کے والد صاحب کے انتقال کی خبر آئی آپ نے وقت پر باورچی سے کہا کہ کھانا لاؤ اس نے کہا حضور آج تو میں نے کھانا نہیں پکایا پوچھا کیوں؟ کہا کہ آج جناب کے قبلہ وکعبہ کے انتقال کا تار آیا تھا میں نے سوچا کہ صدمہ کی وجہ سے آج کھانا نہیں کھائیں گے تھوڑا ہی تو فضول کیوں پکاؤں۔ بیرسٹر صاحب نے کہا سبحان اللہ وہ تو اپنی موت سے مرے اور ہم اپنے ہاتھوں ہلاک ہوں کہ بھوکے مریں۔ جاؤ کھانا پکاؤ اور پانچ روپیہ جرمانہ کیا کہ بدون دریافت کئے تم نے اپنی رائے سے کھانے میں دیر کی۔ اس کے بعد آپ نے تعزیت کی ایک مثل تیار کرائی ان کے یہاں ہر کام کی باضابطہ مثل تیار ہوتی تھی۔ تعزیت کے لئے بھی تیار کی گئی جس میں لکھا یہ جاتا تھا کہ آج فلاں شخص آیا اس نے والد صاحب مرحوم کی تعزیت اس

طرح کی ہم نے اس کا یہ جواب دیا پھر اس مثل کے لئے آپ نے ایک میعاد مقرر کر رکھی تھی جب یہ میعاد ختم ہوگئی تو مثل داخل دفتر کر دی گئی۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص آتا اور تعزیت کے لئے کچھ کہنا چاہتا تو آپ پہلے ہی اس کو یہ کہہ کر روک دیتے کہ شاید آپ والد صاحب کی تعزیت میں کچھ کہنا چاہتے ہیں سو اس کی مثل داخل دفتر ہوگئی اب میں اس کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتا گو اس شخص کو انتظام میں غلو ہو گیا تھا مگر منشا اس فعل کا اچھا تھا اور اس منشا ہی کی قدر کرتا ہوں۔

استقلال وصف محمود ہے:

جیسے حضرت جنیدؒ نے ایک چور کے جو پھانسی پر لٹکا ہوا تھا پیر چومے تھے لوگوں نے اعتراض کیا فرمایا میں نے چور کے پیر نہیں چومے بلکہ اس کے استقلال کے پیر چومے ہیں کہ وہ کس طرح اپنے مطلوب پر مرتے دم تک جما رہا حتیٰ کہ اس پر جان دیدی اور یہ حال ہوا کہ ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید   یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

(طلب سے ہاتھ نہ روکوں گا جب تک میرا مقصد پورا نہ ہو جائے یا تو محبوب کے پاس تن پہنچ جائے یا جان سے تن نکل جائے)

اور یہ استقلال وصف محمود ہے جس کو اس شخص نے محل مذموم میں صرف کیا اس لئے نشانہ ملامت ہوا اگر ہم لوگ محبوب حقیقی کی طلب میں ایسا استقلال حاصل کرلیں جیسا اس چور کو چوری میں حاصل تھا تو ہمارا کام بن جائے۔ اسی طرح میں اس مسٹر کے ان سب افعال کی مدح نہیں کرتا بلکہ ان افعال کے منشاء کی قدر کرتا ہوں گو ان افعال کی ذات اچھی نہ تھی مگر ان کا منشاء اچھا تھا کہ انہوں نے عقل کو طبع پر غالب کرلیا تھا اس لئے نہ تو والد کے انتقال کے دن کھانا چھوڑا نہ مہینوں تک تعزیت کا سلسلہ جاری رکھا کہ اس سے خواہ مخواہ عرصہ تک زخم تازہ رہتا ہے بلکہ ایک میعاد مقرر کر کے اس سلسلہ کو ختم کر دیا۔

امور طبیعہ کو مغلوب کرنے والی دو چیزیں:

غرض امور طبیعہ کو مغلوب کرنے والی چیز ایک تو عقل ہے اس سے کام لو اور دوسری چیز دین ہے اس کو غالب کرو۔ اگر دینداری حاصل ہو تو پھر موت سے بجائے وحشت کے محبت ہو جائے کیونکہ دین کی ترقی سے اللہ تعالیٰ کے لقاء کا اشتیاق غالب ہوتا ہے اور اشتیاق لقاء سے موت کا اشتیاق ہوتا ہے کیونکہ وہ ذریعہ لقاء اللہ ہے اور سب کا میزان الکل محبت ہے اگر حق تعالیٰ سے محبت ہو جائے تو پھر موت سے یا طاعون اور بیماری سے کبھی وحشت نہ ہو اور یہ میزان الکل اس لئے ہے

کہ عقل اور دین دونوں اس کی تعلیم دیتے ہیں دین تو محبت الٰہی کا امر کرتا ہے مگر عقل بھی اس کا امر کرتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ شانہ، منعم و محسن ہیں اور محسن کی محبت عقل کا مقتضی ہے اور میں سچ کہتا ہوں کہ محبت حق سے زیادہ کوئی چیز پریشانی کم کرنے والی نہیں ہم کو ساحران موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے سبق لینا چاہئے کہ نومسلموں کی تو یہ کیفیت کہ اسلام لاتے ہی موت کے مشتاق اور لقاء حق کے متمنی ہو گئے اور موت سے ایسے نڈر ہوئے کہ فرعون کی دھمکیوں کی ذرا بھی پروا نہیں کی اور ہم پرانے مسلمان جو صدیوں سے مسلمان چلے آتے ہیں۔

آباء و اجداد کا بڑا اثر ہوتا ہے:

کیونکہ ہمارے آباء و اجداد صدیوں سے مسلمان ہیں اور اس کا بڑا اثر ہوتا ہے کہ جو صفت نسل میں چلی آتی ہو اس میں فطرۃً خاص ملکہ ہوتا ہے چنانچہ عالم کے بیٹے کو عالم بننا آسان ہوتا ہے اور طبیب کے بیٹے کو طبیب بننا سہل ہے اور معمار کے بیٹھے کو معمار بننا اور نجار کے بیٹے کو نجار بننا غرض جو کام خاندان میں عرصہ سے ہوتا آ رہا ہے اس سے خاندان والوں کو خاص مناسبت ہو جاتی ہے اسی طرح ہمارے آباء و اجداد میں صدیوں سے جب اسلام چلا آ رہا ہے تو ہم کو حق تعالیٰ کے ساتھ نومسلموں سے زیادہ تعلق ہونا چاہئے تھا۔ یہی تو وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو قرآن میں بہت لتاڑا ہے کیونکہ ان کے خاندان میں نبوت و علم و معرفت صدیوں سے چلی آ رہی تھی حالانکہ بعض معاملات خود مخاطبین کے ساتھ نہیں ہوئے بلکہ ان سے پہلے ان کے آباء و اجداد کے ساتھ ہوئے ہیں مگر ان کے ذکر سے ایک مطلب یہ ہے کہ تم میں اثر طاعات کا زیادہ ہونا چاہئے اور دوسرا تم پرانے نمک خوار ہو، ہم نے تمہارے آباء و اجداد پر ایسے ایسے انعامات کئے، تم پر دوسروں سے زیادہ ہماری محبت کا اثر ہونا چاہئے تھا۔ اسی قاعدہ کے مطابق ہم پر بھی ساحرانِ موسیٰ سے زیادہ محبت کا اثر ہونا چاہئے تھا۔ مگر مگر افسوس کہ ہم ان نومسلموں سے بھی گئے گزرے ہو گئے۔

ساحران موسیٰ علیہ السلام کا ایمان کامل:

ان نومسلموں کو کہ فرعون نے جب ان کو یہ دھمکی دی ہے لَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ وَ اَرۡجُلَكُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمۡ فِىۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ وَ لَتَعۡلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبۡقٰى (میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں اور تم سب کو کھجوروں کے درختوں پر ٹنگواؤں گا اور یہ بھی تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم دونوں میں کس کا عذاب سخت ہے اور

دیا ہے) تو انہوں نے نہایت دلیری سے جواب دیا قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَکَ عَلٰی مَا جَآءَ نَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَلَنَا خَطٰیٰنَا وَ مَآ اَکْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ وَ اللّٰهُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی اِنَّهٗ مَنْ یَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰی وَ مَنْ یَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِکَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰی یعنی ہم کو سولی یا پھانسی کا ڈر نہیں، ہم تجھے خدا تعالیٰ پر اور اس کے احکام پر ہرگز ترجیح نہ دیں گے تجھ سے جو ہو سکے کر لے اور تو کر ہی کیا سکتا ہے صرف اس دنیوی زندگی کو ختم کر سکتا ہے اور ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے ہیں تا کہ ہمارے گناہ معاف فرماویں خصوصاً گناہ سحر جس پر تو نے ہم کو مجبور کیا تھا (اور اس ایمان و مغفرت سے حیات جاوید ہم کو حاصل ہوگی) اور اللہ تعالیٰ بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے (اس کی عطا بے زوال ہے) جو شخص مجرم ہو کر اپنے رب کے پاس حاضر ہوگا سو اس کے لئے دوزخ ہے اس میں نہ مرے گا نہ ہی جئے گا اور جو شخص اس کے پاس مومن ہو کر حاضر ہوگا جس نے نیک کام بھی کئے ہوں تو ایسوں کے لئے بڑے اونچے درجے ہیں اور دوسری جگہ ساحران موسیٰ کا یہ جواب بھی مذکور ہے قَالُوْا لَا ضَیْرَ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ (انہوں نے جواب دیا کہ کچھ حرج نہیں ہم اپنے مالک کے پاس جا پہنچیں گے) اس میں اہل لطائف نے کہا کہ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ (ہم اپنے رب کے پاس پہنچ جائیں گے) علت ہے لَا ضَیْرَ کی، مطلب یہ ہے کہ ہم کو سولی وغیرہ سے کچھ ضرر نہیں کیونکہ ہم (اس کے بعد) اپنے پروردگار کے پاس پہنچ جائیں گے جس کے پاس جانے کے ہم مشتاق ہیں مگر خودکشی حرام ہے اس لئے ہم خود تو جلدی سے خدا تعالیٰ کے پاس نہیں پہنچ سکتے اچھا ہے تو ہی قتل کر کے ہمیں جلدی پہنچا دے۔ سبحان اللہ ان لوگوں کو کیسا کامل ایمان تھا کہ مسلمان ہوتے ہی لقاء حق کے ایسے مشتاق ہو گئے اور حیاتِ دنیا کی قدر ان کی نگاہ سے فوراً اُتر ہوگئی۔ صاحبو! یہ محبت اور شوق پیدا کرو اس سے ساری پریشانیاں دفع ہو جائیں گی۔ اس وقت میں اسی کا طریقہ بتلاتا ہوں اور اس سے زیادہ میں آپ سے کچھ نہیں کہتا نہ میں طاعات کو کہوں نہ ترک معاصی کو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ ایک دن میں جنید بغدادی نہیں ہو سکتے۔

دو دن میں حصول محبت الٰہی کا طریق:

لیکن خدا تعالیٰ کے بھروسہ پر کہتا ہوں کہ آپ میرے بتلائے ہو طریقہ پر عمل کریں تو ان شاء اللہ تعالیٰ دو ہی دن میں خدا تعالیٰ کے عاشق تو ضرور ہو جائیں گے پھر طاعات اور ترک معاصی کا

کام آپ خود کریں گے میں تو اس وقت جڑ لگاتا ہوں پھول اس پر خود بخود پیدا ہو جائیں گے اور وہ جڑ محبت ہے اس کو حاصل کرلو پھر طاعات خود بخود ہونے لگیں گی اور اس وقت آپ کو طاعات سے وحشت نہ ہوگی بلکہ ان کا خود شوق ہوگا اور ایسی لذت آئے گی کہ بعض دفعہ اس لذت کے آثار سے استغفار کرنا پڑے گا شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہ کیسے ہوگا کہ لذت طاعات سے استغفار کرنا پڑے گا تو بات یہ ہے کہ بعض دفعہ طاعات میں لذت آ کر عجب ہونے لگتا ہے اور دوسروں کی جو طاعات سے محروم ہیں تحقیر قلب میں آنے لگتی ہے اس سے اہل اللہ استغفار کرتے ہیں گو اس پر یہ آثار مرتب بھی نہ ہوں کیونکہ لذت طاعات بھی مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالغیر ہے۔

سحر کا وقت اجابت دعا کا ہے:

عارف کو بعض دفعہ شبہ ہو جاتا ہے کہ کہیں میں تہجد اور ذکر اس لذت ہی کے واسطے نہ کرتا ہوں اس لئے وہ اس لذت پر التفات کرنے سے بھی استغفار کرتے ہیں اب سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ کا ربط كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ سے، ظاہر میں یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ رات کو تہجد پڑھنے سے استغفار بالاسحار کو کیا تعلق ہے۔ بعض مفسرین نے تو یہ کہا کہ وہ معاصی سے استغفار کرتے ہیں اور اسحار کی تخصیص اس لئے ہے کہ وہ وقت اجابت دعا کا ہے اور تہجد سے استغفار کا تعلق یہ ہے کہ وہ جلب منفعت ہے اور یہ دفع مضرب ہے اور بعض نے کہا کہ وہ تہجد پڑھ کر اس طاعت ہی سے استغفار کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ طاعات بھی معاصی ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ زیادہ سہل اور ظاہر یہ ہے کہ وہ رات کو اٹھ کر تہجد پڑھتے ہیں اور اخیر شب میں لذت طاعات سے یا اس لذت کے آثار سے استغفار کرتے ہیں کیونکہ اس وقت یہ حال ہوتا ہے۔

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے — کہ یارے برخورد از وصل یارے

(وہ کیا اچھا وقت اور اچھا زمانہ ہے کہ کوئی محبت اپنے محبوب کے وصل سے متمتع ہو)

اور وصل کی لذت جیسی ہوتی ہے معلوم ہے اس لذت میں کبھی انہماک ہو کر اس کی مقصودیت کا شبہ ہو جانا بعید نہیں اس لئے اس سے استغفار کرتے ہیں۔ شاید یہاں کوئی صاحب یہ شبہ کریں کہ جب طاعات کے آثار لذت سے بھی استغفار کرنا پڑتا ہے تو ہم ہی اچھے رہے کہ طاعات ہی نہیں کرتے۔ جو عجب وغیرہ پیدا ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ شبہ جہالت کا ہے کیونکہ شریعت کا قاعدہ ہے کہ مقاصد کے ساتھ اگر معاصی اور مفاسد کا انضمام ہو جائے تو مقاصد کو باقی رکھ کر مفاسد کا علاج کیا جاتا ہے اور اگر امور زائدہ غیر مقصودہ کے ساتھ مفاسد کا انضمام ہو جاتا ہے تو زوائد ہی

کوحذف کردیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ طاعات مقاصد میں ہیں اس لئے ان کو حذف نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کو باقی رکھ کر مفاسد کا علاج کیا جائے گا۔ بات دور پہنچ گئی میں یہ کہہ رہا تھا کہ محبت حاصل ہونے کے بعد طاعات اور ترک معاصی کو آپ خود اختیار کریں گے اور شوق کے ساتھ اختیار کریں گے اس سے کسی قسم کی گرانی طبیعت میں نہ ہوگی یہ تو دین کا نفع ہوا اور دنیا کا نفع یہ ہوگا کہ محبت سے تمام پریشانیاں دفع ہو جائیں گی میں یہ نہیں کہتا کہ محبت کے بعد آپ کو بیماری نہ ہوگی یا کوئی تکلیف پیش نہ آئے گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس وقت حوادث کا رنگ دوسرا ہوگا اس وقت آپ کو ان کلفتوں میں بھی حظ آئے گا کیونکہ ''از محبت تلخہا شیریں شود'' (محبت سے تلخیاں بھی گوارا ہو جاتی ہیں)

محبت اور معرفت کا اثر:

دوسرے محبت کے ساتھ جب معرفت حاصل ہوگی تو کلفت اور مصیبت کے اندر بھی نعمتوں کا انکشاف ہوگا اور ان میں اسرار و حکم معلوم ہوں گے اور ظاہر ہے کہ جب کلفت کے ساتھ کوئی عظیم الشان نعمت بھی حاصل ہو جائے تو کلفت کلفت نہیں رہتی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک بزرگ سخت مرض میں مبتلا تھے اور ساتھ میں زخمی بھی تھے کوئی جگہ زخم سے خالی نہ تھی وہ زمین پر بیہوش پڑے ہوئے تھے۔ زخموں پر مکھیاں بھن بھن کر رہی تھیں۔ ایک دوسرے بزرگ وہاں سے گزرے تو انہوں نے پہچانا کہ یہ صاحب نسبت اور عالی مقام ہیں وہ خدمت کے لئے ان کے پاس آ گئے اور پنکھا جھلنے لگے ان کو افاقہ ہوا تو گھبرائے اور فرمایا یہ کون شخص ہے جو مجھ میں اور میرے محبوب میں حائل ہو گیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میں خدمت کے لئے حاضر ہوا ہوں، فرمایا نہیں مجھے اس کی ضرورت نہیں تم اپنے کام میں لگو اور مجھے اور میرے محبوب کو چھوڑ دو۔ بتلایئے اس شخص کو اس تکلیف میں کچھ تو لذت تھی جو دوسرے کی خدمت اور راحت رسانی گوارا نہ ہوئی بلکہ تکلیف میں پڑا رہنا ہی پسند ہوا۔ تو بات یہ ہے کہ مصیبت میں بھی اسرار و حکم ہوتے ہیں جن کی وجہ سے مصیبت مصیبت نہیں رہتی بلکہ لذیذ ہو جاتی ہے۔

جسمانی کلفت کے ساتھ لذت:

اس کی چھوٹی سی نظیر اپنا ہی واقعہ بیان کرتا ہوں اور گو مجھے بزرگوں سے کیا نسبت مگر ان کی جوتیاں سیدھی کرنے سے اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کو تحدیث بالنعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس سال آنت کے درد کی سخت تکلیف ہوئی۔ کلفت تو بعض وقت ایسی ہوتی

تھی جیسی نزع میں سنی جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے قلب کو اپنے ساتھ متعلق کر کے اس کلفت کو آسان کر دیا پھر اس میں جو حکمت معلوم ہوئی تو اس نے تو کلفت کو عقلاً لذیذ کر دیا پھر جب جسمانی کلفت جاتی رہی اور صرف عذر رہ گیا تو وہ عقلی لذت طبعی فرحت بن گئی وہ حکمت یہ ہے کہ مجھے سفر سے بہت کلفت تھی کچھ تو طبعاً مجھے سفر سے انقباض ہے اور کچھ اس لئے انقباض بڑھ گیا کہ سفر میں بد مذاق لوگوں سے پالا پڑتا ہے اس کے لئے دوستوں سے مشورے کرتا تھا کہ ایسی تدبیر کی جائے جس سے لوگ مجھے سفر سے معافی دیں کیونکہ اب مجھے سفر کا تحمل نہیں ہے مگر کوئی صورت ایسی نہ نکلتی تھی۔ طبعی انقباض کو کون عذر سمجھتا ہے ویسے ظاہر میں بوجہ صحت وسلامت اسباب کے کوئی عذر تھا ہی نہیں اس لئے احباب سفر پر مجبور کرتے ہی تھے اب حق تعالیٰ نے غیب سے یہ عذر پیدا کر دیا۔ اب جہاں کوئی مجھے بلاتا ہے میں عذر کر دیتا ہوں کہ حرکت سے شدید جیسے کھانسی یا چھینک یا باآواز بلند بات کرنا یا ناک صاف کرنا اس سے کمانی اونچی ہو کر آنت باہر آ جاتی ہے جس سے مجھ کو نا قابل برداشت تکلیف ہوتی ہے جب تک فوراً درست نہ کیا جائے جس کے لئے خلوت کا موقع درکار رہتا ہے اور سفر میں یہ سب امور اختیار سے باہر ہیں اس لئے میں سفر سے معذور ہوں اس سے مخاطب فوراً لاجواب ہو جاتا ہے بس جہاں آنت کا نام لیا کہ دانت کھٹے ہوئے پھر وہ سفر پر اصرار کر ہی نہیں سکتے تو اس کلفت میں حکمت حق معلوم ہو کر مجھے اس قدر راحت ہے جسے میں بیان نہیں کر سکتا اب اگر کوئی اس قسم کا خط آتا ہے کہ ہم نے فلاں شخص سے سنا ہے آپ کو تکلیف ہے تو میں جواب لکھ دیتا ہوں صدق و کذب یعنی عذر کے بیان میں تو راوی سچا ہے لیکن تکلیف کی روایت میں غلط کار ہے کیونکہ مجھے اس عذر سے الم و پریشانی نہیں ہوئی بلکہ حظ حاصل ہوتا ہے۔ بہر حال محبت وہ چیز ہے کہ اس سے بڑھ کر پریشانی کو دفع کرنے والی کوئی چیز نہیں۔

نسخہ کا کمال:

اب میں محبت حاصل کرنے کا طریقہ بتلاتا ہوں جس کے صرف دو جزو ہیں حکیم محمود خان کے نسخہ میں دو ہی جزو ہوتے تھے اور یہی کمال ہے۔ نسخہ کے اجزا قلیل ہوں اور نفع زائد ہو۔ یہ نہیں کہ قرابادین کی برابر نسخہ لکھ دیا جیسا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ جب سکندر آباد پہنچے تو سفر کی وجہ سے طبیعت ناساز ہو گئی۔ آپ نے لوگوں سے دریافت فرمایا کہ یہاں کوئی طبیب بھی ہے لوگوں نے ایک معمولی طبیب کا نام بتلایا شاہ صاحب نے ان کو بلایا۔ وہ بڑے خوش ہوئے کہ مجھے اتنے بڑے شخص نے یاد کیا اور میں ان کا معالج ہو کر بہت مشہور ہو جاؤں گا چنانچہ آئے اور نبض

دیکھ کر نسخہ اتنا بڑا لکھا کہ پورا قرابا دین ہوگئی۔ مولوی حیدر علی صاحب جو حکیم بھی تھے اور شاہ صاحب کے شاگرد بھی اور رفیق سفر بھی تھے نسخہ دیکھ کر ہنسنے لگے اور شاہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت یہ تو کوئی جاہل معلوم ہوتا ہے آپ اس کا نسخہ استعمال نہ فرمائیں فرمایا نہیں بھائی شفا تو حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور یہ تو محض سبب ظاہری ہے تم اسی نسخہ کو منگواؤ چنانچہ منگوایا گیا ایک بڑا دیگچہ دواؤں ہی میں بھر گیا اور شاہ صاحب نے اس کو نوش فرمایا مگر یہ ہمت پہلے بزرگوں کی تھی آج کل ایسی ہمت کہاں اس لئے آج کل نسخہ میں تھوڑے اجزاء ہونے چاہئیں۔

اللہ کی محبت حاصل کرنے کا طریق:

چنانچہ میں بھی اس وقت دو باتیں بتلاتا ہوں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد کیا کرو اس سے محبت پیدا ہوگی کیونکہ نعمت میں خاصہ ہے جذب کا۔ منعم کے احسانات کو یاد کر کے خواہ مخواہ اس کی طرف کشش ہوتی ہے دوسری بات یہ کہ اہل محبت کی صحبت اختیار کرو اس کو دخل عظیم ہے محبت پیدا ہونے میں اس کے بعد پھر ان شاء اللہ تعالیٰ طاعون یا وبا کا خوف دل میں اصلاً نہ رہے گا بلکہ موت کے مشتاق ہو کر یوں کہو گے

اقتلونی یا ثقات ان فی قتلی حیاتاً فی حیاتٍ

(مجھ کو اے ثقات قتل کرو قتل کرو کیونکہ قتل میں مجھ کو حیات در حیات ہے)

یہ شعر اصل میں منصور کا ہے جب وہ سولی پر چڑھانے کے لئے بڑھائے گئے تو یوں کہتے جارہے تھے

اقتلونی یا ثقات ان فی قتلی حیاتی

(اے ثقہ لوگوں مجھ کو قتل کر دو میرے قتل میں مجھ کو زندگی ہے)

غلبہ محبت کے بعد موت کا اشتیاق بھی غالب ہو جاتا ہے۔

حضرت مرزا جانِ جاناں مظہرؒ کی تیاریٔ شہادت:

حضرت مرزا مظہر جان جاں رحمتہ اللہ تعالیٰ جس دن صبح کو شہید ہونے والے تھے اس کی رات میں آپ کو مکشوف ہوگیا تھا کہ کل کو شہادت کا دن ہے تو رات کو آپ کی یہ حالت تھی کہ غسل کر کے عمدہ کپڑے پہنے، خوشبو لگائی اور وصال حق تعالیٰ کے لئے تیار ہو گئے اور جب باہر تشریف لاتے ہیں تو بار بار یہ شعر پڑھتے ہیں

سر جدا کرد از تنم یارے کہ باما یار بود قصہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود

(سر جدا کیا میرے جسم سے اس یار نے جو ہمارے ساتھ یار تھا قصہ مختصر کیا ورنہ دردسر بہت تھا)

پھر یہ واقعہ ہوا اور انہوں نے شیخین کے بارے میں سوالات کئے آپ نے جواب دیئے وہ جواب رافضیوں کے خلاف تھے کم بختوں نے آپ کو قرابین سے شہید کر دیا۔ آپ کی تیاری سے آپ کا اشتیاق ظاہر ہے (اس محبت میں یہ حالت ہوا کرتی ہے کہ موت کے لئے اس طرح تیاری کا شوق ہوتا ہے جیسے دُلہا شبِ زفاف کے لئے تیاری کرتا ہے) ہاں شاید عقلاء کو اس کے ساتھ یہ خوف بھی ہوگا کہ دیکھئے کہیں گناہوں کی وجہ سے عتاب میں نہ پکڑے جائیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ عاشق کے گناہوں کی بھی دوسری شان ہوتی ہے عاشق کا جرم دوسروں کے جرم کی طرح نہیں ہوتا۔

عاشق کے گناہوں کی مثال:

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک بخاری غلام صدر جہاں کا ملازم تھا اور صدر جہاں کا عاشق بھی۔ ایک دن کچھ خطا ہوگئی تو خوف سے بھاگ گیا صدر جہاں کو بڑا غصہ آیا آدمی تلاش کے لئے بھیجے، کہیں پتہ نہ لگا چندروز کے بعد وہ خود ہی آیا لوگوں نے صدر جہاں کے غصہ سے بہت ڈرایا اور سامنے آتے ہی بیہوش ہو کر قدموں پر گر پڑا صدر جہاں کو یا تو غصہ آرہا تھا یا اس حالت کو دیکھ کر رحم آگیا آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور فوراً غلام کا سر قدموں سے اٹھا کر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا اور لخلخہ سنگھانے اور پنکھا جھلنے لگا آخر یہ کس بات کا اثر تھا بات صرف یہ تھی کہ وہ غلام مجرم ہونے کے ساتھ آقا کا عاشق بھی تھا عشق کی وجہ سے آقا کی صورت دیکھ کر اور اپنے جرم کو یاد کر کے بیہوش ہو گیا بس یہی حالت محبت کے بعد تمہاری ہو جائے گی کہ تمہاری خطاؤں کا اور ہی رنگ ہو جائے گا دوسرے مان بھی لو کہ کچھ دنوں کے لئے جہنم ہی میں جانا پڑے گا تو پھر بھی عقلی قاعدہ یہ ہے کہ جو تکلیف منقطع ہونے والی ہوتی ہے وہ ہلکی ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کا عذاب یقیناً ایک نہ ایک دن منقطع ہوگا اس لئے بعد کی حالت کو یاد کر کے اور جنت میں جانے کی امید سے یہ کلفت سہل ہو جائے گی تیسری بات اور ہے میں اس کو کیوں چھپاؤں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں چھپائی وہ یہ کہ مسلم کی صحیح حدیث میں ہے کہ جو مسلمان جہنم میں داخل کئے جائیں گے حق تعالیٰ ان کو ایک قسم کی موت دے دیں گے اماتھم الله اماتة (اللہ تعالیٰ ان کو ایک قسم کی موت دیں گے) یہ الفاظ ہیں حدیث کے۔ اس کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی موت تو نہ آئے گی مگر کوئی حالت مشابہ موت کے ہوگی مثلاً یہ کہ جسم کو بے حس ایسا کر دیا جائے جیسا موت سے بے حس ہو جاتا ہے یا کم

حس کر دیا جائے سواب اس کو عذاب وغیرہ کا احساس ہی نہ ہو یا کم ہو بہر حال مسلمانوں کا عذاب بھی دوسروں کے عذاب کی طرح نہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مسلمان پل صراط سے گزریں گے جسکا راستہ جہنم کی پشت پر سے ہوگا تو جہنم مسلمانوں سے کہے گی **جزیا مومن فان نورک اطفا ناری** اے مسلمان جلدی سے پار ہوجا تیرے نور کی ٹھنڈک نے تو میری آگ ہی کو بجھا دیا۔ جب پشت پر سے گزرنے کا یہ اثر ہے تو جب مسلمان جہنم کے اندر ہوگا اس وقت تو بھلا کیا حال ہوگا کچھ عجب نہیں کہ برد ایمان کی وجہ سے نار جہنم اس پر اثر ہی نہ کرے یا اثر کرے اور اسکو احساس نہ ہو یا احساس ہو اور کم ہو گو وہ کم بھی خدا تعالیٰ کی پناہ بہت کچھ ہے میں ان باتوں سے معاصی پر جرات نہیں دلاتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ موت سے جو آپ کو ایسی وحشت ہے کہ اس کے تصور سے بھی ڈرتے ہو اس کو دور کرو۔

حکایت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمہ اللہ:

مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اپنے خدام سے تفریح وتفریع کے لئے دریافت کیا کہ کیوں بھائی آخرت میں بھی وہی خدا ہے جو یہاں دنیا میں ہے سب نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا پھر تو ان شاء اللہ تعالیٰ کچھ اندیشہ نہیں کیونکہ یہاں تو وہ بڑے مہربان ہیں بس وہاں بھی ایسے ہی مہربان ہوں گے۔ میں کہتا ہوں بلکہ وہاں یہاں سے زیادہ مہربان ہوں گے کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رحمت کے سو حصوں میں سے ایک حصہ ظاہر کیا ہے اور آخرت میں پورے سو حصوں کے ساتھ مسلمانوں سے برتاؤ کریں گے۔ دیکھئے کیسی اچھی بات ہے کہ جب آخرت میں بھی وہی خدا ہے جو دنیا میں ہے تو پھر ڈرنا کاہے کا اور یہ اثر محبت کا تھا مولانا کو حق تعالیٰ سے محبت تھی اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ تم محبت کی پڑیا کھالو پھر سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ محبت کے بعد تم پٹو گے نہیں بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اگر پٹو گے بھی تو اس طرح پٹو گے جس طرح عشاق پٹا کرتے ہیں عشاق کو غیروں کی طرح نہیں پٹوایا کرتے بلکہ یوں ہی برائے نام کچھ سزا دے دیتے ہیں۔ محبوب کو ان کی محبت وعشق کی یہی لاج ہوتی ہے دوسری ایک اور بات ہے گو کہنے کی نہیں مگر جب زبان پر آگئی تو کیوں چھپاؤں وہ یہ کہ عاشق کو محبوب کے ہاتھ سے پٹنے میں بھی مزا آتا ہے **ضرب الحبیب زبیب** (محبوب کی مار منقی یعنی لذیذ ہے) بلکہ محبوب کے سامنے پٹنے میں بھی مزا آتا ہے اسی کو ایک عاشق کہتا ہے ؎

بجرم عشق تو ام می کشند وغوغائیست　　تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

(تیری محبت کے جرم میں قتل کرتے ہیں اور اسی کا شوروغل ہے تو بھی بام پر آجا کہ اچھا تماشائی تو ہی ہے)

عشق حقیقی اور عشق مجازی کے بعد آثار متحد ہیں:

والعشاق یفسر بعضہم بعضا (اور عشاق میں بعض بعض کا بیان کرتا ہے)

اس کی شرح میں ابن عطاء نے ایک عاشق کا قصہ لکھا ہے کہ اس کو کسی سے محبت تھی اس کی اطلاع محبوب کے اقارب ولواحق کو ہوئی تو انہوں نے اس کے سو درے لگائے ننانوے دروں تک تو اس نے ایک بھی آہ نہ کی اس کے بعد جو ایک درہ لگا تو اس نے آہ کی کسی نے ملامت کی کہ تو نے ناوے دروں تک تو تحمل کرلیا اخیر میں ایک درہ کا تحمل نہ ہوسکا کہنے لگا تجھ کو اس کا سبب معلوم نہیں۔ بات یہ ہے کہ ننانوے دروں تک تو محبوب مجھے اور میری اس حالت کو دیکھ رہا تھا تو اس وقت مجھے یہ حظ آرہا تھا کہ ہاں محبوب دیکھ رہا ہے کہ اس کی محبت میں میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جارہا ہے اس حظ نے الم ضرب کو محسوس نہ ہونے دیا جب ننانوے درے لگ چکے تو چلا گیا اس وقت مجھے ضرب کا احساس ہوا اس لئے اخیر درہ پر آہ کی اور گو یہ وقعہ عاشق مجازی کا ہے مگر عشق حقیقی اور مجازی کے بعض آثار متحد ہیں کیونکہ عشق تو دونوں جگہ مشترک ہے اس لئے ایک سے دوسرے کی تفسیر ہوسکتی ہے اور یہی توجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مراقبہ تعلیم فرمایا ہے وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا اپنے رب کے فیصلہ پر صبر کئے رہو (اور استقلال سے جمے رہو) کیونکہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں فانک باعیننا (آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں) اسی واسطے بڑھایا ہے تاکہ آپ پر کفار کی ایذائیں آسان ہوجائیں اور ان سے بجائے کلفت کے لذت حاصل ہو بتلا دیا کہ جو کچھ آپ کے ساتھ برتاؤ ہو رہا ہے ہم سب دیکھ رہے ہیں اس مراقبہ کا یہ اثر لازمی ہے کہ کلفت مبدل بہ لذت و راحت ہوجائے گی یہاں تک کہ سب سے بڑھ کر مکروہ اور ناگوار چیز موت ہے مگر عشاق کو وہ بھی لذیذ ہوجاتی ہے عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم — راحت جاں طلبم و زپے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے — تادر میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے راحت جان طلب کروں اور محبوب حقیقی کے پاس جاؤں۔ میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہوجائے تو خوش وخرم اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں)

ایک اہل محبت بزرگ کی موت کے وقت حالت:

ایک دوسرے بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مرنے لگے تو خوش ہو کر یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم　　　جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(اب وہ وقت آگیا کہ میں عریاں ہو کر جسم کو چھوڑ کر سراسر جان بن جاؤں)

رہا یہ کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا اس کے متعلق قطعی دلیل تو سوائے حدیث وقرآن کے اور کیا ہو سکتی ہے اور حدیث وقرآن میں عام مسلمانوں کے لئے اور خصوصاً اہل محبت کے لئے جو کچھ بشارتیں وارد ہیں وہ ظاہر ہیں لیکن وہ عام ہیں کسی خاص شخص کے متعلق حدیث وقرآن میں تفصیل وارد نہیں کہ کس کے ساتھ کیا برتاؤ ہوا (بجز چند صحابہ کے جن کے متعلق احادیث میں تعیین کے ساتھ بھی کچھ وارد ہے) ہاں خاص طور پر بزرگوں کے واقعات بہت منقول ہیں جو قطعی تو نہیں ہیں ظنی ہیں مگر حسن ظن اور پھر تواتر معنوی یہ کہتا ہے کہ وہ واقعات صحیح ہیں اور ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل محبت مرنے کے بعد بھی ایسے مطمئن ہوئے اور کس درجہ چین میں ہوتے ہیں چنانچہ ایک بزرگ نے مرتے وقت یہ وصیت کی کہ میرے جنازہ کے ساتھ ایک شخص خوش الحانی سے یہ شعر پڑھتا ہوا جائے:

مفلسا نیم آمدہ در کوئے تو　　　شیئاً للہ از جمالِ روئے تو

دست بکشا جانب زنبیل ما　　　آفریں بردست و بر بازوئے تو

(آپ کے دربار میں مفلس ہو کر آئے ہیں، اپنے جمال کے صدقہ میں کچھ عنایت کیجئے ہماری زنبیل کی طرف ہاتھ بڑھایئے آپ کے دست وبازو پر آفریں ہے)

آخر یہ بزرگ پاگل اور بے وقوف تو نہ تھے جو بلا وجہ ایسے وصیت کردی آخر کوئی بات تو تھی ان کو کچھ تو اطمینان تھا اور مرنے کے بعد ان اشعار سے کچھ تو حظ حاصل ہونے کی توقع تھی جو ایسی وصیت کی۔

حضرت سلطان الاولیاء کے جنازہ پر کسی مرید کے اشعار پڑھنے کی حکایت:

اسی طرح حضرت سلطان الاولیاء سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے جنازہ کے ساتھ کسی مرید نے غلبہ محبت میں بار بار یہ شعر پڑھا:

سرو سیمینا بصحرا میروی　　　سخت بے مہری کہ بے ما میروی

اے تماشا گاہ عالم روئے تو　　　تو کجا بہر تماشا می روی

(اے محبوب آپ صحرا میں جارہے ہیں سخت بے مہری کہ بغیر ہمارے جارہے ہیں اے محبوب! آپ کا رخ انور جہان کا تماشا گاہ ہے آپ تماشہ کے لئے کہاں جارہے ہیں)

اس کا یہ اشعار پڑھنا تھا کہ سلطان جی کی نعش کو وجد ہوا اور ہاتھ کفن سے باہر اونچا ہوگیا اس پر لوگوں نے اس مرید کو خاموش کیا کہ یہ کیا غضب کرتے ہو قیامت برپا ہوجائے گی جنازہ کے

ساتھ خاموشی سے چلوغرض تھوڑی دیر میں سکون ہوااور ہاتھ بدستور کفن کے اندر ہوگیا۔ دیکھئے اہلِ محبت کوموت کے بعد بھی کیسی بے فکری حاصل ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی وجد وحال باقی رہا۔

سیدالطائفہ حضرت حاجی صاحبؒ کے جنازہ کا حال:

ہمارے حاجی صاحب نے بھی وصیت کرنا چاہی تھی کہ میرے جنازہ کے ساتھ ذکر جہر ہوتا چلے مگر مولوی اسماعیل صاحب نے اختلاف کیا اور کہا حضرت یہ ایک نئی بات ہے کہیں رفتہ رفتہ بدعت کا دروازہ مفتوح نہ ہوجائے حضرت نے فرمایا بہت اچھا جیسی رائے ہو جب جنازہ لیکر چلے تو سب لوگ خاموش چل رہے تھے کہ ایک عرب نے کہا مالکم ساکتین اذکروا اللہ خاموش کیوں چلے رہے ہو خدا تعالیٰ کو یاد کرو۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ بے اختیار مجمع ذکر جہر کرنے لگا۔ مولوی اسماعیل صاحب کہنے لگے کہ میں نے تو حضرت کواس امر کی وصیت سے روک دیا تھا مگر اس کو کون روک دیتا۔ حق تعالیٰ نے حضرت کی مراد خود پوری فرمادی۔ یہ تو مرتے ہوئے اہل محبت کی حالت تھی اب مرنے کے بعد قبر میں ان کی حالت سنئے۔

حضرت حافظ محمد ضامن شہید کی قبر پرفاتحہ پڑھنے والے کی حکایت:

ہمارے ہی یہاں ایک بزرگ موجود ہیں حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے مزار پر ایک صاحب کشف فاتحہ پڑھنے لگے جو صاحب مزار کو جانتے نہ تھے جب فاتحہ پڑھ چکے تو کہنے لگے بھائی یہ کون بزرگ ہیں یہ تو بڑے دل لگی باز ہیں میں نے جو فاتحہ پڑھنے کا قصد کیا تو فرمایا میاں جاؤ کسی مردہ پر پڑھو یہاں زندوں پر فاتحہ پڑھنے آئے۔ لوگوں نے کہا یہ بزرگ شہید ہیں کہا ہاں جبھی تو اپنے کو زندہ کہتے ہیں کیونکہ شہداء قبر میں زندہ ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ زندہ دل بھی ہیں بعضے اولیاء نے غلبۂ عشق میں فاتحہ وایصال ثواب سے استغناء بھی ظاہر کیا ہے ان کو اسکی پروانہیں ہوئی کہ ہمیں کوئی کچھ پڑھ کر ثواب بخشے جیسے مولانا نیاز فرماتے ہیں:

طمع فاتحہ از خلق نداریم نیاز　　　　عشق من از پس من فاتحہ خوانم باقیست

(نیاز مخلوق سے ہم کو فاتحہ کی طمع نہیں ہے میرا عشق میرے بعد فاتحہ خواں ہے)

یہ نیاز ہوکر بھی ایسے بے نیاز بنتے ہیں (اس وقت نیاز محمد خان حضرت کے خادم سامنے تھے وہ اپنا نام سن کر ہنس رہے تھے اور حضرت نے بھی ان کی طرف اشارہ کر کے کچھ فرمایا جو مجھے یاد نہیں نہ نوٹ ہوسکا) مگر یہ غلبہ حال ہے اور جن پر کمال عبدیت غالب ہے وہ یوں کہتے ہیں جیسے عارف

شیرازی فرماتے ہیں ۔

ایکہ از مامی روی دامن کشاں از سر اخلاص الحمدے بخواں

(اے شخص جو ہم پر دامن بچا کر گزر رہا ہے اخلاص سے ایک مرتبہ فاتحہ پڑھ)

ایک بزرگ کا اپنی والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنا:

ایک دوسرے بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ اپنی والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جایا کرتے تھے تو ایک دن ان کی والدہ نے قبر میں سے ان کے ساتھ کلام کیا اور کہا بیٹا تم یہاں آتے ہی فوراً تلاوت قرآن نہ شروع کیا کرو کیونکہ قرآن کے انوار تم کو اس طرح گھیر لیتے ہیں کہ میں تمہاری صورت نہیں دیکھ سکتی بلکہ تھوڑی دیر ٹھہر کر پھر تلاوت شروع کیا کرو تا کہ میں تم کو جی بھر کر دیکھ لیا کروں۔ دیکھئے ان بزرگ کی والدہ کو وہاں برزخ میں کچھ تو اطمینان و راحت تھی جو ایسی بات کہی اب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بس مردہ یوں ہی مٹی کا ڈھیر ہو کر قبر میں پڑا رہتا ہے یہ غلط ہے بلکہ عالم برزخ میں مومن صالح کی روح کو دنیا سے بھی زیادہ راحت واطمینان نصیب ہوتا ہے ابن الفارض رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت کتابوں میں لکھی ہے کہ جب ان کے مرنے کا وقت آیا تو آٹھوں جنتیں ان کے سامنے کر دی گئیں (تجلت له الجنان الثمانية) آٹھوں جنتیں ان کے سامنے کر دی گئیں) ان کو دیکھ کر آپ نے منہ پھیر لیا اور کہا ۔

ان کا منزلتی وی الحب عندکم ما قد ذات فقد ضیعت ایامی

(یعنی اگر یہی میری محنت کی قدر ہوئی میری ساری محبت برباد ہوگئی)

اگر میری محبت کی آپ کے یہاں یہی قدر ہے تو میں نے اپنے دن ہی ضائع کئے جو اہل کشف اس وقت موجود تھے وہ کہتے ہیں کہ جنتیں فوراً محجوب ہو گئیں اور ایک خاص تجلی ہوئی جس کے ساتھ ابن الفارضؒ کی روح بھی پرواز کر گئی۔

اہل محبت کی موت:

صاحبو! اہل محبت کی موت اس طرح ہوتی ہے بے فکری اور اطمینان کے ساتھ پھر وہ موت سے ڈریں گے یا اس کے مشتاق ہوں گے ابن الفارضؒ کے اس قصہ پر شیخ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے اعتراض کیا اور کہا ہے کہ یہ جنتوں کی مکشوف ہونے پر ان کا اعراض کرنا اور یہ شعر پڑھنا بتلاتا ہے کہ یہ کسی جہل میں مبتلا تھے جس میں مرتے دم تک مبتلا رہے نہ معلوم وصال حق کی حقیقت انہوں نے کیا سمجھی جو جنتوں سے

اعراض کیا اوران کے انکشاف کوتضییع اوقات کہا اگر میرے دل میں شیخ ابن القیم کی عظمت نہ ہوتی تو میں اس اعتراض کا جواب نہایت سخت دیتا لیکن میں ان کو بھی عاشق سمجھتا ہوں اور زاہدان خشک میں سے نہیں سمجھتا اس لئے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہتا کہ ابن القیم بھی عاشق ہیں اور ابن الفارض بھی عاشق ہیں ہم کو دونوں کا ادب کرنا چاہئے نہ ان پر اعتراض کرنا چاہئے نہ ان پر۔

اہل محبت کا مقام اور حال:

ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ اہل محبت کا مقام اور حال الگ الگ ہوتا ہے ایک عاشق دوسرے کے مقام کو بعض دفعہ نہیں سمجھتا اس لئے اعتراض کر دیتا ہے میرے خیال میں شیخ ابن القیم نے ابن الفارض کے مقام نہیں سمجھا ہے کہ وہ ابن الفارض کی حالت اس سے ارفع ہے کہ وہ مرتے دم تک کسی جہل میں مبتلا رہیں ہاں یہ ممکن ہے کہ ان کا یہ قول غلبہ حال اور غلبہ سکر میں بطور ادلال کے صادر ہوا ہو بہر حال ہم دونوں کا ادب کرتے ہیں اور ان سے بھی یہی کہتے ہیں کہ آپ بھی باہم ایک دوسرے کا ادب کیجئے۔

حکایت حضرت قاضی محمد یحییٰ ابن اکثمؒ:

اور سنئے قاضی یحییٰ بن اکثم رحمتہ اللہ علیہ جو بخاری کے شیوخ میں سے ہیں جب ان کا وصال ہو گیا تو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا کہئے آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا کہا مجھے حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا اور وہاں سے سوال ہوا یا شیخ السوء عمل کذا یوم کذا و عملت کذا یوم کذا. ارے برے بڈھے بتلا تو نے فلانے دن یہ عمل کیا اور فلانے دن یہ کیا جواب دے۔ میں اس سوال پر حیران ہو کر خاموش کھڑا رہا تو سوال ہوا ارے بڈھے بولتا کیوں نہیں، خاموش کیوں کھڑا ہے؟ میں نے عرض کیا الٰہی! میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔ ارشاد ہوا وہ کیا میں نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ معلوم ہوا تھا آج میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے ساتھ اسکے خلاف برتاؤ ہو رہا ہے ارشاد ہوا تجھ کو کیا معلوم ہوا ہے میں نے عرض کیا حدثنا فلان عن فلان عن فلان قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یستحیی من ذی الشیبۃ المسلم (کنز العمال: ۴۲۶۴۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان سے شرماتے ہیں مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت میرے ساتھ برعکس معاملہ ہو رہا ہے ارشاد ہوا کہ تمہارے راوی بھی سچے اور ہمارا رسول بھی سچا۔ جاؤ آج ہم تم کو محض بڑھاپے ہی کی بدولت بخشتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا رحمت ہے اور قاضی یحییٰ بن اکثم نے بھی کیسی ہمت کی کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی حدثنا فلان عن

فلان با قاعدہ سند کے ساتھ حدیث بیان کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عالم برزخ ہوا نہیں ہے کہ وہاں جا کر ہوش وحواس گم ہو جائیں گے بلکہ جس طرح یہاں بے تکلف باتیں کرتے ہیں ایسے ہی وہاں بھی کریں گے خصوصاً اہل محبت تو بہت ہی آزاد ہوں گے۔ یہ حدیث **ان الله یستحی عن ذی الشیبة المسلم** (اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان سے شرماتے ہیں) سن کر ایک شخص نے ایک مسخرہ پن بھی کیا تھا مگر اس سے پہلے میں اور ایک مسخرہ کی حکایت بیان کرتا ہوں۔

ایک عاشق مجذوب کی سفر حج کی حکایت:

مجھ سے سرائے میران میں ایک وکیل صاحب نے بیان کیا کہ سفر حج میں ایک شخص اس وضع سے چلا کہ اس کے ہاتھ میں ایک ڈھپلی تھی۔ اسے بجاتا اور ناچتا کودتا تھا لوگوں نے کہا میاں سفر حج میں یہ حرکت۔ کہا تمہیں کیا ہم جانیں اور ہمارا اللہ۔ لوگ یہ سمجھے کہ یہ کوئی مسخرہ ہے اسی حال سے وہ مکہ تک پہنچا۔ جب مطوف کے ساتھ طواف بیت کے لئے چلے اور دروازہ حرم کے قریب پہنچے تو مطوف نے کہا دیکھو وہ ہے بیت اللہ کیونکہ وہ دروازہ کے باہر ہی سے نظر آنے لگتا ہے بس یہی سن کا اس شخص پر ایک حالت طاری ہوئی اور اس نے وجد کی حالت میں یہ شعر پڑھا:

چوں رسی بکوئے دلبر بسپار جاں مضطر   کہ مباد بار دیگر نرسی بدیں تمنا

(اب تو محبوب کے در پر پہنچ گئے ہو اب اپنی جان فدا کردو شاید پھر اس تمنا کے حصول کا موقع نہ ملے)

اور شعر پڑھتے ہی دھڑام سے گرا اور جان دیدی اس وقت معلوم ہوا کہ یہ مسخرہ نہ تھا بلکہ خدا تعالیٰ کا عاشق مجذوب تھا۔ صاحبو! اللہ کے بندے بہت سے چھپے ہیں کسی کو ظاہری حالت کی وجہ سے حقیر نہ سمجھو۔

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر   تو چہ دانی کہ دریں گرد سواری باشد

(خاکسار لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے مت دیکھو ممکن ہے کہ ان میں کوئی اہل دل صاحب جاں ہو)

بعض اولیاء اللہ کا اعلیٰ مقام:

بعض اولیاء اللہ کو حضرت خضر علیہ السلام بھی نہیں پہچانتے غالباً تذکرۃ الاولیاء میں ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ حطیم کعبہ میں ایک دفعہ محدثین کا مجمع تھا حدیث کا درس ہو رہا تھا یہ بزرگ الگ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت خضر نے ان سے فرمایا بھائی تم الگ کیوں بیٹھے ہو آؤ حدیث سن لو۔ فرمایا **عمن یحدثون** یہ کس سے حدیث بیان کر رہے ہیں کہا عن سفیان الثوری وفلاں یہ سفیان ثوری وغیرہ سے روایت کر رہے ہیں قال **فما بال من یحدث عن الله تعالیٰ**. فرمایا

جو شخص خود اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتا ہو اس کو سفیان ثوری سے روایت کرنے کی کیا ضرورت ہے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا سبحان اللہ کیا آپ اس مقام پر ہیں بھلا اس کی دلیل کیا ہے فرمایا اس کی دلیل یہ ہے کہ میں آپ کو پہچانتا ہوں کہ تم خضر ہو اور تم مجھ کو نہیں پہچانتے۔

حضرت سید صاحب کا مقام:

اسی طرح مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ نانوتہ میں ایک شخص جب مسجد میں آتے تھے ان کے آنے کے ساتھ ہی مسجد منور ہو جاتی تھی حالانکہ وہ کوئی شیخ یا عالم یا بڑے ممتاز شخص نہ تھے معمولی دنیا دار وضع کے آدمی تھے۔ مولانا نے اس نورانیت کا سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک دفعہ سید صاحب سے ملاقات وزیارت نصیب ہوئی تھی۔ ایک جلسہ کی ملاقات سے یہ کیفیت حاصل ہوگئی کہ ان کے آنے سے مسجد منور ہو جاتی تھی واقعی سید صاحب کی تو وہی کیفیت تھی جو حضرت سلطان نظام الدین اولیاء نے ایک بزرگ کی نسبت بیان فرمائی ہے۔

ہر کہ مرید سید گیسو دراز شد — واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

(جو شخص سید گیسو دراز کا مرید ہوگیا واللہ خلاف نہیں کہ وہ عشق باز ہوگیا)

اور مولانا فرماتے ہیں

گر تو سنگ خارہ مرمر شوی — چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

(اگر تو سخت پتھر مرمر بھی ہو جب کسی اہل دل کے پاس پہنچے گوہر ہو جائے)

اور کسی کا شعر ہے

آہن کہ بپارس آشنا سد — فی الحال بصورت طلا شد

(جو لوہا پارس کی پتھری سے ملا فوراً ہی سونا بن گیا)

غرض دیکھئے وہ شخص ظاہر میں دنیا دار معلوم ہوتا تھا مگر سید صاحب کی ایک بار زیارت کرنے سے خدا تعالیٰ نے اس کو یہ بزرگی عطا فرمائی اور کسی کو پتہ نہ تھا۔

حضرت سلطان جی کے سفر کی ایک حکایت:

اسی طرح حضرت سلطان جی ایک بار سفر میں تھے۔ نماز کا وقت آ گیا۔ آپ اس فکر میں تھے کہ کوئی دوسرا آدمی آ جائے تو جماعت ہو جائے کہ اتنے میں سامنے سے ایک گھسیارا گھاس کا گٹھڑ سر پر رکھے ہوئے آیا۔ سلطان جی نے اس سے کہا بھائی نماز پڑھو گے؟ کہا ہاں، اسی واسطے

آیا ہوں۔ فرمایا پھر جلدی وضو کر لو۔ کہا نظام الدین مسلمان کہیں بے وضو بھی رہا کرتا ہے۔ اب جو سلطان جی نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بڑے مقام کا شخص ہے، معمولی بزرگ نہ تھا۔ تو ظاہری صورت سے کسی کو حقیر نہ سمجھو۔

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست ۔ شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

(ہر جنگل میں گمان مت لے جاؤ کہ خالی ہے، ممکن ہے کہ چیتا سویا ہوا ہو)

ایک مسخرہ کی مغفرت کی حکایت:

میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ حدیث ان اللّٰہ یستحیی عن ذی الشیبۃ المسلم (کنز العمال: ۴۲۶۴۴) (اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان سے شرماتے ہیں) کو سن کر ایک شخص نے مسخرہ پن کیا کہ مرتے ہوئے ایک دوست سے وصیت کی کہ جب مجھ کو دفن کر چکو تو میرے سر اور ڈاڑھی میں تھوڑا آٹا چھڑک دینا۔ دوست نے کہا اللہ کے بندے زندگی میں تو دل لگی کیا ہی کرتا تھا کیا مرتے ہوئے بھی دل لگی کرتا ہے۔ بھلا اس حرکت سے کیا نفع؟ کہا تم کو کیا۔ اگر تم کو ہماری دوستی کا پاس ہے تو ہماری وصیت کو پورا کر دینا۔ خیر وہ ہنس کر اس پر راضی ہو گیا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ بڑا ہی دل لگی باز ہے کہ مرتے مرتے بھی ظرافت سے باز نہ آیا۔ چنانچہ دفن کے بعد اس نے وصیت پر عمل کیا۔ پھر ایک دن اسے خواب میں دیکھا۔ پوچھا کہو کیا حال ہے؟ کہنے لگا کہ مجھے حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں سے سوال ہوا کہ آپ نے وصیت کیوں کی تھی؟ میں نے عرض کیا کہ الٰہی! میں نے سنا تھا کہ آپ بوڑھے مسلمان سے شرماتے ہیں۔ سو بوڑھا ہونا تو میرے اختیار میں نہ تھا، کیونکہ بوڑھاپے سے پہلے آپ نے بلا لیا۔ تو میں نے چاہا کہ بوڑھوں کی سی صورت ہی بنا لوں۔ اس لئے آٹا ملنے کی وصیت کی تھی۔ ارشاد ہوا جاؤ تمہیں بخش دیا۔

قیامت میں اہل محبت کا حال:

یہ تو برزخ کے واقعات تھے اور قیامت میں یہ حالت ہوگی: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر انہوں نے استقامت حاصل کی ان پر فرشتے اترتے رہتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ تم خوف نہ کرو اور غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت حاصل کرو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے)

فرشتے قبروں سے نکلتے ہی بشارت دیں گے کہ دنیا کے فوت کا رنج نہ کرو اور آئندہ کسی

مصیبت کا خوف نہ کرو اور جنت کی بشارت حاصل کرو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا اور ہر چند کہ قیامت کا دن بہت ہولناک اور سخت ہے مگر مسلمان کے لئے خصوص اہل محبت کے لئے وہ نہایت آسان ہوگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کے برابر ہے، مگر مؤمن کے لئے ایسا معلوم ہوگا جیسا نماز کا وقت اور عشاق کے لئے تو قیامت کا دن تماشا گاہ ہے۔ میں نے مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے ایک شعر سنا تھا، اس وقت وہ یاد آتا ہے:

عاشقاں را روز محشر با قیامت کا نیست　　　عاشقاں را جز تماشائے جمالِ یار نیست

(عاشقوں کو محشر کے دن قیامت سے کام نہیں ہے۔ عاشقوں کو سوائے دیدار محبوب کے کوئی تماشہ نہیں ہے)

اہل محبت کو وحشت نہیں ہوتی:

شاید یہاں کسی کو یہ خیال ہو کہ مسلمانوں میں بعضے گنہگار بھی ہیں اور اہل محبت تو اپنے کو سب سے زیادہ گنہگار سمجھتے ہیں۔ تو قیامت میں گناہوں پر سزا بھی تو ہوگی۔ میں تو کہتا ہوں کہ واللہ مجھے تو یقین ہے کہ مسلمانوں کو بہت کم سزا ہوگی۔ حضرت حق ان کو تو کسی بہانہ سے معاف ہی کر دیتے ہیں (سبحان اللہ! کیسی رجاء اور کیسی محبت ٹپکتی ہے) میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ سمجھ کر تم حق تعالیٰ سے ڈرو اور دل میں ہیبت رکھو، مگر ویسی ہی ہیبت رکھو جیسی محبوب سے ہوا کرتی ہے۔ محبوب سے اس کے جمال وجلال کی وجہ سے ہیبت ہوتی ہے۔ ہوا سمجھ کر وحشت اور خوف نہیں ہوتی۔ اس ہیبت کو ایک شاعر نے خوب بیان کیا ہے:

سامنے سے جب وہ شوخِ دلربا آ جائے ہے　　　تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

خلاصہ یہ کہ محبوب سے ہیبت تو ہوتی ہے مگر وحشت نہیں ہوتی۔ اسی طرح حق تعالیٰ سے اور ان کی لقاء سے وحشت نہیں ہونی چاہئے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ محبت پیدا کرو، محبت کے بعد تم گنہگار ہو کر بھی حق تعالیٰ سے متوحش اور موت سے متنفر نہ ہوگے اور محبت کا وہی طریقہ ہے جو اوپر بتلایا ہے کہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کو اور ان کے احسانات کو یاد کرو۔ دوسری بات یہ کہ اہلِ محبت کی صحبت اختیار کرو اور تیسری بات اور بھی ہے کہ تھوڑی دیر ذکر کر لیا کرو، گو خلوص سے نہ ہو مگر فلوس کے لئے بھی نہ ہو۔ یعنی دنیا کے لئے نہ ہو۔

دُنیوی معاملات بزرگوں کے ذمہ لگانا ان کی بے ادبی ہے:

جیسے آج کل لوگ گیارھویں کرتے ہیں جس میں عموماً محض دنیا کی نیت ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ سے سال بھر تک برکت وعافیت رہے گی اور نہ کریں گے تو وبال آئے گا۔ میں نے ایک شخص سے کہا تھا کہ تم لوگ ہم کو تو وہابی کہتے ہو اور یوں بدنام کرتے ہو کہ ان کو بزرگوں کا ادب نہیں اور خود

تمہارے ادب کی یہ حالت ہے کہ دنیوی معاملات کے واسطے گیارھویں کرتے ہو کہ بڑے پیر صاحب ہمارے کھیت کی نگہبانی کریں گے یا دکان کی حفاظت کریں گے۔ کیا بزرگوں کا یہی ادب ہے؟ اس کا ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا۔ غرض ذکر میں اس قسم کی نیت تو نہ ہو۔ اس کے بعد چاہے خلوص ہو یا کم از کم خلوئے ذہن ہی ہو۔ پھر اس میں خواہ قلب کو سکون ہو یا کہ وساوس بھی آتے ہوں، اس کی کچھ پرواہ نہیں۔

ذکر مع الوسواس کا اثر:

ذکر گو خلوص سے نہ ہو اور گو وساوس ہی کے ساتھ ہو اثر سے خالی نہیں رہ سکتا۔ ذکر غیر خالص کا اثر ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ خلوص پیدا ہو جاتا ہے اور ذکر معہ الوساوس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ چند روز کے بعد وساوس اسی ذکر سے دفع ہو جاتے ہیں۔

نان وحلوا کا مصنف سنی نہیں ہے:

اب یہاں سے میں جواب دیتا ہوں کہ ایک شعر کا جو مثنوی کا نہیں ہے بلکہ نان وحلوا کا ہے، جس کا مصنف شیعی ہے بہاء الدین عاملی، مگر واعظوں نے اس شعر کو مثنوی کی طرف منسوب کر کے عوام کا ناس کر دیا۔ وہ عام طور پر اپنے مواعظ میں اس پر زور دیتے ہیں کہ آج کل کے لوگوں کا نماز روزہ کچھ نہیں ہے۔ محض بیکار ہے، کیونکہ نماز کی حالت میں وسوسے ان کو گھیرے رہتے ہیں۔ ذکر میں خیال منتشر ہوتا ہے اور اس پر یہ شعر پڑھ دیتے ہیں:

بر زباں تسبیح و در دل گاؤخر　　　ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

(زبان پر تسبیح دل میں گاؤخر یعنی دنیاوی خیالات، ایسی تسبیح کب اثر رکھے)

مگر میں تجربہ کی بناء پر کہتا ہوں:

"ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر" (کہ ایسی تسبیح بھی اثر رکھتی ہے)

اور واللہ اگر مجھے اور بہاؤالدین کو ایک جگہ جمع کر کے قسم دی جاتی کہ جو کچھ تم کہتے ہو اگر صحیح ہو تو قسم کھالو، میں تو قسم کھالیتا اور وہ ان شاء اللہ تعالیٰ ہرگز قسم نہ کھا سکتے۔ بہرحال اس کا انتظار نہ کرو کہ یکسوئی واطمینان نصیب ہو تو ذکر اللہ میں مشغول ہوں۔

فوراً فکرِ آخرت کی ضرورت:

بہت لوگوں کی عمریں اسی میں ختم ہوگئیں کہ پنشن مل جائے تو دینداری اختیار کریں اور

گورنمنٹ سے پنشن سے پہلے ان کو دنیا ہی سے پنشن مل گئی اور آخرت میں جا پہنچے۔صاحبو! حق تعالیٰ کی طرف سے تو ہر وقت آپ کو یہ ندا ہے:

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ   گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

(واپس آ، واپس آ، جو کچھ بھی تو ہے اگر چہ کافر آتش پرست بت پرست ہے واپس آ)

یعنی تم جیسے بھی ہو اسی حالت میں متوجہ ہو جاؤ، چاہے کیسے ہی گوہ در گوہ ہو، کیونکہ دور رہ کر تم پاک ہو ہی نہیں سکتے۔اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص ناپاک ہو اور دریا میں اس لئے نہ جاتا ہو کہ وہ پاک شفاف اور میں ناپاک، اس حال میں کیونکر جاؤں بلکہ پاک ہو جاؤں گا تو دریا اس سے یہی کہے گا کہ تو جیسا بھی ہے اسی حال میں میرے پاس چلا آ، کیونکہ مجھ سے دور رہ کر تو پاک نہیں ہو سکتا۔پس اس کا ہرگز خیال نہ کرو کہ ہم تو گنہگار ہیں، دنیا دار ہیں، دنیا کے علائق میں پھنسے ہوئے ہیں، اس حال میں کیونکر ذکر اللہ شروع کریں۔صاحبو! تم اسی حال سے کام شروع کردو، پھر تمہارے علائق اور گناہوں کو وہی کم کردے گا۔اسی طرح اس سے بھی پریشان نہ ہونا چاہئے کہ پابندی نہیں ہوتی، ناغہ ہو جاتا ہے۔

دوام کی ایک صورت:

میرے ایک دوست کا خط مثنوی کے وزن میں منظوم آیا تھا جس میں اس کی شکایت تھی کہ پابندی نہیں ہوتی، ناغہ ہو جاتا ہے، اس سے پریشان ہوں۔جی چاہا کہ جواب بھی منظوم ہو، مگر اتنی کسے فرصت کہ نظم تصنیف کرے، دوسرے مجھے تکلفات سے وحشت بھی ہوتی ہے۔نیز مجھے نظم میں ملکہ بھی نہیں ہے۔لیکن دل چاہتا تھا کہ جواب بھی نظم میں ہو۔حق تعالیٰ نے مثنوی کا ایک شعر یاد دلا دیا جس میں سارے خط کا جواب تھا۔میں نے وہی لکھ دیا۔وہ شعر یہ ہے:

دوست دارد دوست ایں آشفتگی   کوشش بیہودہ بہ از خفتگی

(محبوب حقیقی اس آشفتگی یعنی طلب کو پسند فرماتے ہیں کہ اگرچہ بے ثمر ہو مگر تعطل سے بہتر ہے)

سبحان اللہ! کیا عمدہ دلیل بیان کی ہے کہ ایسے بے انتظامی کی سعی سونے سے اور کچھ نہ کرنے سے تو بہتر ہی ہے۔تو اس کو بھی فضول نہ سمجھو، یہ بھی مفید ہے۔ہمارے مولانا کا ارشاد ہے کہ دوام کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اسی حالت پر دوام ہو جائے کہ کبھی کام کرلیا اور کبھی ناغہ ہو گیا، لستم پستم ہی کام کئے جاؤ۔

حق تعالیٰ شانہ' کا بے انتہا رحم وکرم:

ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن تم پر ضرور رحم ہوگا اور تم پر کیوں نہ رحم کریں گے جبکہ وہ اپنے

دشمنوں پر بھی ایسے مہربان ہیں کہ ایک بت پرست صنم صنم کا ورد کررہا تھا۔ ایک دن بھولے سے صمد منہ سے نکل گیا۔ فوراً آواز آئی: **لبیک یا عبدی لبیک** (حاضر ہوں اے میرے بندے! حاضر ہوں) یہ آواز سن کر بت پرست پر حال طاری ہوگیا اور اس نے بت کو زور سے ایک لات ماری کہ کم بخت سالہا سال میں تجھے کو پکار رہا ہوں، تیرے پھوٹے منہ سے کبھی ایک حرف بھی نہ نکلا۔ قربان جاؤں اپنے پروردگار کے، ایک بار بھولے سے اس کا نام زبان پر آ گیا تو فوراً سن لیا اور جواب دیا۔ اس کے بعد وہ اسلام لے آیا۔ تو حق تعالیٰ تو ایسے مہربان ہیں، وہ آپ پر کیسے رحم نہ کریں گے۔ حالانکہ آپ تو خدا تعالیٰ کی خاص جماعت میں داخل ہیں۔

دوستاں را کجا کنی محروم   تو کہ با دشمناں نظر داری

(دوستوں کو کب محروم کرسکتا ہے جبکہ تو دشمنوں کے ساتھ بھی نظر رکھتا ہے)

حضرت غوث اعظم کی ایک حکایت:

اور سنیے حضرت غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ ہے جو غالباً شیخ عبدالحق دہلوی نے کسی رسالہ میں لکھا ہے کہ ایک بار آپ رات کو اٹھے اور خانقاہ کے دروازہ کی طرف چلے۔ خادم نے دیکھا کہ حضرت خانقاہ کے دروازہ کی طرف جارہے ہیں تو وہ بھی ساتھ ساتھ ہولیا، مگر اس طرح کہ حضرت کو خبر نہ ہو۔ یہ ادب ہے مشائخ کا کہ ان کے خاص اوقات میں مثلاً تہجد کے وقت ان کے پاس جا کر نہ بیٹھے نہ سامنے جا کر کھڑا ہو، بلکہ دور رہ کر دیکھتا رہے۔ اگر ان کو کسی کام کی ضرورت قرینہ سے معلوم ہو تو وہ کام کردے ورنہ الگ رہے اور ان کے اوقات میں خلل نہ ڈالے، کیونکہ بزرگوں کو تہجد یا خلوت کے وقت کسی کا پاس ہونا گوارا نہیں ہوتا اور مجھے بھی گو میں کچھ نہیں ہوں صبح کی نماز کے بعد باتیں کرنے والے پر غصہ آتا ہے کہ یہ کیسا بے قدر ہے کہ ایسے نورانی وقت کو ضائع کرتا ہے۔ صبح کی نماز کے بعد سے طلوع شمس تک یہ وقت ذکر اللہ کے لئے عجیب ہے، اس کو ضائع نہ کرنا چاہئے۔ غرض حضرت غوث اعظم خانقاہ سے باہر تشریف لے چلے اور خادم ساتھ ساتھ رہا اور اس کی کوشش کرتا رہا کہ حضرت کو اطلاع نہ ہو، یہاں تک کہ دروازہ شہر پناہ پر پہنچے جو مقفل تھا مگر حضرت کی برکت سے قفل کھل گیا اور دونوں صاحب یکے بعد دیگرے شہر سے باہر نکلے۔ تھوڑی دیر میں ایک نیا شہر نظر پڑا۔ خادم کو بڑی حیرت ہوئی کہ بغداد کے متصل تو کوئی بھی شہر نہیں۔ یہ شہر کہاں سے آ گیا مگر وہ اصل میں متصل نہ تھا، بہت دور تھا۔ حق تعالیٰ نے غوث اعظم کی کرامت کے لئے زمین کی طنابیں کھینچ دیں، اس سے قریب ہوگیا، چنانچہ دونوں

صاحب ایک مکان میں پہنچے جہاں اولیاء اللہ کا ایک مجمع تھا اور اس مکان کے ایک سمت میں ایک درجہ تھا جہاں سے کسی بیمار کے کراہنے کی آواز آرہی تھی، پھر وہ آواز منقطع ہوگئی اور پانی کے گرانے کی آواز آنے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہاں سے ایک جنازہ برآمد ہوا اور چند آدمی ساتھ تھے جن میں ایک بوڑھے بزرگ گویا اس مجمع کے سردار معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے کہا جنازہ تیار ہے۔ سب حضرات نے جنازہ کی نماز پڑھی۔ حضرت غوث اعظم امام بنے۔ نماز کے بعد جنازہ کو لے گئے اور جو پہلے سے حضرت کے پاس جمع تھے وہ بدستور حاضر رہے اور انہوں نے حضرت غوث اعظم سے کچھ عرض کیا اور تھوڑی دیر میں ایک شخص عیسائی حاضر ہوا۔ آپ نے اس کو زنار توڑ کر الگ کیا اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی اس کو تلقین کی۔ مسلمان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ شخص اس کے قائم مقام ہے، اس کے بعد آپ وہاں سے رخصت ہوئے اور تھوڑی دیر میں بغداد میں داخل ہوگئے۔ خادم بھی الگ الگ ساتھ رہا۔ جب صبح کی نماز سے فارغ ہوئے تو اس وقت کسی کتاب کا درس ہوا کرتا تھا۔ آپ نے خادم سے فرمایا کہ آؤ سبق پڑھ لو۔ وہ کتاب لے کر حاضر ہوا اور کہنے لگا حضرت! رات کے واقعہ کی حقیقت سمجھ میں نہیں آئی۔ اس لئے طبیعت کو بہت تشویش ہے، پڑھنے کو بھی دل حاضر نہیں۔ پہلے اس کی حقیقت بتلا دیجئے، تب کچھ پڑھوں گا۔ فرمایا کیا تم رات ہمارے ساتھ تھے؟ کہا ہاں۔ فرمایا یہ مجمع ابدال کا تھا اور وہ شہر موصل تھا۔ ان میں سے ایک شخص قریب مرگ تھے۔ حق تعالیٰ نے مجھے مطلع فرمایا۔ میں گیا، وہ جنازہ ان ہی بزرگ کا تھا، ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ بوڑھا حضرت خضر تھے جو ان کے جنازہ کے مامور تھے اور چونکہ ابدال کا محکمہ میرے تحت میں ہے اس لئے مجھ سے پوچھا گیا کہ اس کے قائم مقام اب کون ہوگا۔ میں نے حق تعالیٰ سے دعا کی۔ وہاں سے الہام ہوا کہ قسطنطنیہ کے فلاں عیسائی کو ان کی جگہ دے دی جائے۔ چنانچہ وہ خرق عادت کے طور پر حاضر ہوا۔ میں نے اس کو مسلمان کیا اور مسلمان ہوتے ہی وہ مقام ابدال پر پہنچ گیا۔ نہ معلوم حق تعالیٰ شانہٗ کو اس شخص کا کونسا عمل پسند آ گیا ہوگا جو اس کو اسلام کی توفیق دی اور بہت جلد اس مقام عالی پر پہنچ گیا۔

بعض کفار کے توفیق اسلام کا سبب صلہ رحمی ہوتا ہے:

کیونکہ بعضے کافر بھی اپنے زعم میں اعمالِ حسنہ کرتے ہیں، جیسے صلہ رحمی، ہمدردی، اعانت مظلوم وغیرہ۔ ان اعمال پر کفر کی حالت میں تو کچھ ثواب نہیں ملتا، مگر حق تعالیٰ بعضوں کو ان اعمال کی برکت سے اسلام کی توفیق دے دیتے ہیں جس سے گزشتہ اعمال سیئہ پر بھی ثواب ملتا ہے اور

آئندہ اعمال پر تو ثواب ملے ہی گا۔ اسلمت علی ما اسلفت من خیر (مسند احمد ۳:۴۰۲) (میں اسلام اس نیک عمل کی وجہ سے جو اس سے پہلے کیا تھا) حدیث ہے تو پھر آپ کیوں مایوس ہوتے ہیں۔ کیا آپ سے مسلمان ہو کر بھی ساری عمر میں ان دونوں کافروں کے برابر کوئی عمل نہ ہوا ہوگا جس سے آپ نظرِ عنایت کے مستحق ہو جائیں۔

کسی کو حقیر نہ سمجھنا چاہئے:

ان دونوں حکایتوں سے دو باتیں حاصل ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ انسان کو تکبر و عجب نہ کرنا چاہئے، نہ کسی کو حقیر سمجھنا چاہئے۔ کیا خبر ہے حق تعالیٰ نے کس کے واسطے کیا مقدر کر رکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ معصیت سے مایوس نہ ہو اور دل شکستہ نہ کرے۔ حق تعالیٰ بڑے رحیم و کریم ہیں۔ وہ تو کافروں پر بھی اگر وہ ذرا سی توجہ کریں بہت جلد رحم فرماتے ہیں، پھر مسلمان پر کیوں نہ رحم فرمائیں گے۔

مراقبہ، انعامات واحسانات خداوندی کیلئے ایک چلہ کی ضرورت:

بس تم خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت پیدا کرلو۔ جس کے طریقہ کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ ان کے انعامات و احسانات کو یاد کرو۔ مراقبہ الاء اللہ میں مشغول ہو جاؤ۔ واللہ مصیبت کے اندر بھی تم کو نعمتیں نظر آئیں گی۔ نیز ذکر اللہ کے لئے ایک وقت خاص کرلو۔ پھر چند روز میں ان شاء اللہ تعالیٰ چند ہی روز جس کی مقدار میں خود نہیں مقرر کرتا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ مقدار خود ارشاد فرمائی: من اخلص اللّٰہ اربعین یومًا ظھرت ینابیع الحکمۃ من قلبہ علی لسانہ (رواہ ابونعیم فی الحلیۃ ۵:۱۸۹ عن ابی ایوب کذا قال العراقی) (جو شخص اللہ تعالیٰ کی چالیس دن خالص عبادت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے ظاہر کر دیتے ہیں۔ اس کو ابونعیم نے حلیہ میں ایوب سے روایت کیا ہے) اور عارف شیرازی اسی ہدایت کی خاصیت فرماتے ہیں:

شنیدم رہروے در سرزمینے — ہمی گفت ایں معما با قرینے
کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف — کہ در شیشہ بماند اربعینے

(یعنی کوئی سالک اپنے ہم نشین سے یہ معمہ کہہ رہا تھا کہ شراب تو اس وقت صاف ہوگی جبکہ چالیس دن شیشے میں رہے)

یعنی چالیس روز میں ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کو خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت پیدا ہو جائے گی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ چالیس دن میں تم جنید بغدادی ہو جاؤ گے مگر عاشق اور محبّ ضرور ہو جاؤ گے۔ اگر تم کو اس بات پر دل سے اعتقاد نہیں ہوتا تو تم آزمائش ہی کے طور پر کر کے دیکھ لو، ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلد رستہ کھلے گا اور گو آزمائش کے لئے عمل کرنا خلوص سے نہ ہوگا مگر میں مولانا کے تجربہ کے اعتماد کے طور پر کہتا ہوں کہ آپ آزمائش ہی کے لئے عمل کر کے دیکھ لیجئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اثر ظاہر ہوگا اور راستہ کھلتا ہوا نظر آئے گا۔ جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش　　　آزموں یک زمانے خاک باش

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ　　　خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

(برسوں تک تو تم دلخراش پتھر بنے رہے۔ آزمائش کے طرف ایک زمانہ خاک بن کر دیکھو، بہار کے موسم میں پتھر کب سرسبز ہوتے ہیں خاک ہوتا کہ رنگ برنگ کے پھول اُگیں)

راہ چلنے سے حجابات اُٹھتے جائیں گے:

یہ شبہ نہ کرو کہ رستہ کیسے کھلے گا۔ ہمارے درمیان میں تو گناہوں کے حجابات بہت ہیں، میں کہتا ہوں کہ آپ چلنا تو شروع کریں، سب حجابات خود بخود اُلٹے چلے جاتے ہیں۔ میں اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں، وہ یہ کہ آپ یہاں سے دہلی جانا چاہیں تو دہلی تک راستہ کھلا ہوا معلوم نہیں ہوتا بلکہ بظاہر دیکھنے میں دور سے سڑک کے دوطرفہ درختوں کے ملے ہوئے نظر آنے سے راستہ بند معلوم ہوتا ہے۔ پھر آسمان چونکہ کروی ہے وہ بھی حد نظر پر زمین سے ملا ہوا نظر آتا ہے اور راستہ طے کرنے سے مانع معلوم ہوتا ہے۔ اس حالت میں آپ نے رفیق سے کہا کہ دہلی چلو۔ وہ کہتا ہے کہ راستہ تو سامنے سے بند نظر آتا ہے، کیونکر چلیں۔ آپ اس سے کہتے ہیں کہ نہیں تو چلو تو سہی، راستہ تو کھلا ہوا ہے، مگر اس انفتاح کا علم سیر ہی سے ہوگا بدون سیر کے نہ ہوگا۔ اب اگر رفیق نے آپ پر اعتماد کیا اور چلنا شروع کر دیا تو وہ دعا دے گا کہ واقعی جوں جوں چلتے ہیں راستہ نکلتا ہی چلا آتا ہے اور اگر اس نے اعتماد نہ کیا تو جب آپ نے دہلی پہنچ جانے کی اسے اطلاع دی اس وقت وہ افسوس کرے گا۔

سچی طلب کا اثر:

مولانا رومی بڑی قوت سے اسی کے متعلق فرماتے ہیں اور واقعی محقق کے کلام میں ایک قوت ہوتی ہے۔ شاعروں کے کلام میں وہ قوت نہیں ہوتی۔ چنانچہ ارشاد ہے ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

(اگر چہ عالم میں کوئی راستہ معلوم نہیں ہوتا مگر یوسف علیہ السلام کی طرح طالب بن کر دوڑنا تو چاہئے)

یہ ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس نکیر میں منقول ہے گو حجت تو نہیں ہے مگر تائید و تمثیل کے لئے کافی ہے۔ منقول ہے کہ زلیخا نے جس وقت یوسف علیہ السلام کو اپنے دام میں پھنسانا چاہا تو اس نے آپ کو ایسے مکان میں بلایا جس کے یکے بعد دیگرے سات دروازے تھے اور ہر دروازہ پر قفل ڈال دیا تھا تاکہ یوسف علیہ السلام بھاگ نہ جائیں، پھر جب اس نے یوسف علیہ السلام سے اظہار مدعا کیا اور آپ نے اس سے صاف انکار کیا تو آپ کو فکر ہوئی کہ اس عورت کے پنجہ سے کس طرح نکلوں۔ اس نے تو بری طرح مجھے مقید کیا ہے۔ بس معاً آپ کو یہ خیال ہوا کہ جتنا میری قدرت میں ہے مجھ کو تو وہ کرنا چاہئے۔ آگے جو کام خدا تعالیٰ کی قدرت کا ہے وہ خود کر دیں گے۔ چنانچہ آپ نے وہاں سے بھاگنا شروع کیا۔ اب رحمتِ حق کو دیکھئے کہ جس دروازہ پر آپ پہنچتے وہ باذن اللہ خود بخود کھل جاتا اور قفل ٹوٹ کر گر پڑتا۔ اسی طرح ہر دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں: ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید   خیرہ یوسف واری باید دوید

یعنی اگر چہ عالم میں کوئی راستہ کھلا ہوا نظر نہیں آتا مگر ہم کو یوسف علیہ السلام کی طرح طالب بن کر دوڑنا تو چاہئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ خود بخود راستہ نظر آئے گا۔ صاحبو! اس واقعہ سے ہم کو سبق لینا چاہئے۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ جہاں آڑ بھی نہیں وہاں کھڑے کھڑے پاؤں ملتے ہیں اور خواہ مخواہ اپنے سامنے ایک آڑ سمجھتے ہیں۔ اور ان کی حالت یہ ہے کہ جہاں واقعی آڑ تھی وہاں بھی مایوس نہیں ہوئے، ہمارا شیطان نے راہ مار رکھا ہے۔ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (اور روکتا ہے تم کو اللہ کے ذکر سے اور نماز سے پس کیا تم رکو گے) یہ تم کو مایوس کر رہا ہے اور خواہ مخواہ تمہارے سامنے ایک آڑ بنا کر کھڑی کر دیتا ہے اور یہ اس کم بخت کی ہمت ہے کہ جس کام کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء تشریف لائے کما ورد فی بعض الروایات وان کان الصحیح عدم تعیین عددھم ولکنہ ذکر تمثیلاً (جیسا کہ بعض روایتوں میں آیا ہے اگر چہ صحیح ان کی شمار کی تعیین نہیں ہے) یہ کم بخت اکیلا سب کے مقابلہ کے لئے تیار ہے اور انبیاء کے کام میں روڑے اٹکاتا ہے اور گو انبیاء و عارفین ہمیشہ اس کی تدابیر کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیتے ہیں مگر یہ پھر بھی ہمت نہیں ہارتا۔

شیطان کی چالیں کمزور ہوتی ہیں:

اس کی ہمت تو دیکھئے، اور ایک آپ ہیں کہ شیطان سے ڈر گئے اور اس کے دھوکہ میں آگئے۔

شاید تم یہ کہو کہ اس کی تو بڑی قوت ہے کہ انسان کے اندر اس طرح چلتا ہے جس طرح خون چلتا ہے۔ میں کہتا ہوں چلنا تو صحیح مگر قوت بالکل غلط، اس میں خاک بھی قوت نہیں۔ حق تعالیٰ صاف فرماتے ہیں: اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا کہ شیطان کی چالیں بہت کمزور ہوتی ہیں اور فرماتے ہیں: اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ کہ مسلمانوں پر اس کا کچھ بھی اختیار نہیں جو اپنے خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ان کی زیارت کو کوئی شخص گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کے قریب جا کر دیکھا کہ وہ تلاوتِ قرآن کے لئے بیٹھے ہیں۔ تو یہ باہر ہی رک گئے۔ مگر قریب سے سنا کہ اول اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم (میں شیطان راندہ درگاہ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں) کہا، پھر فرمایا اے شیطان! خوش مت ہونا کہ میں تجھے اتنا بڑا سمجھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کی پناہ تجھ سے بچنے کے لئے طلب کرتا ہوں۔ یاد رکھ میں تجھے کچھ نہیں سمجھتا رہا۔ اعوذ باللّٰہ پڑھنا یہ محض اپنے محبوب کے حکم کی تعمیل کے لئے ہے۔ واقعی عارف شیطان کو کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ وہ اس کی چالوں کو دم بھر میں توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ایک دفعہ وضو سے فارغ ہو کر مسجد میں جا کر مصلے پر پہنچ کر یہ شبہ ہوا کہ شاید میں نے خفین کا مسح نہیں کیا، اس لئے وضو کی جگہ لوٹ کر مسح کر لیا۔ بس اب شیطان نے پیچھا لیا۔ اس کے بعد کبھی مصلے پر پہنچ کر بھی اس کے قبل یہی شبہ ہوتا کہ مسح نہیں کیا۔ کچھ دنوں تو احتیاط پر عمل کر کے دوبارہ مسح کر لیا۔ پھر سمجھ لیا کہ یہ تو شیطان کا وسوسہ ہے۔ ایک بار جو مصلے پر پہنچ کر یہی شبہ ہوا تو آپ نے اس کی پروا نہ کی اور ہمت کر کے نماز شروع کر دی۔ اب شیطان نے کہنا شروع کیا کہ بدون مسح کے وضو صحیح نہیں اور بدون وضو کے نماز صحیح نہیں۔ یہ نماز اکارت جائے گی۔ آپ نے فرمایا تیری بلا سے تو ایسا ہے۔ تو میری نماز کا خیر خواہ ہے؟ شیطان نے کہا عمداً بدون وضو کے نماز پڑھنا کفر ہے۔ فرمایا تیری بلا سے تجھے اگر ایمان سے خیر خواہی ہوتی تو مخلوق کو کافر کیوں بناتا تو جو چاہے کہہ یہ نماز تو میں بدون مسح ہی کے پڑھوں گا (یہ مجارات خصم کے طور پر تھا، ورنہ ایسا شبہ شرعاً خود معتبر نہیں) مولانا فرماتے تھے کہ اس نماز کے بعد پھر شیطان نے کبھی وضو میں وسوسہ نہیں ڈالا۔ دیکھا آپ نے کہ عارفین اس کی تدبیروں کو کس طرح باطل کرتے ہیں۔ اسی واسطے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: فقیه واحد اشد علی الشیطان من الف عابد (سنن الترمذی: ۱۶۸۱) (ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے بھاری ہوتا ہے) پس شیطان سے ڈرو مت۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ کسی محقق کے ساتھ تعلق پیدا کر لو تا کہ وہ تم کو شیطان کی تدابیر کا توڑ

بتلاتا رہے، کیونکہ یہ راستہ بہت نازک ہے اور اس میں وساوس وخطرات بھی بہت نازک پیش آتے ہیں۔ بعض دفعہ شیطان اس طرح وسوسہ ڈالتا ہے کہ اس کو محقق عارف کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ نیز اس راستہ کے علوم واحوال ومقامات بھی بہت نازک ہیں۔

شیخ کامل کی ضرورت:

چنانچہ اس تقریر میں آپ نے بہت سے نازک علوم سنے ہوں گے۔ اس لئے بدون محقق کے اتباع کے چارہ نہیں اور جو لوگ خود تنہا بدون تعلق کسی محقق کے اس راہ میں کامیاب ہوگئے ہیں ان کے واقعات سے شبہ نہ کیجئے۔ مولانا اس کے جواب میں فرماتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا نادر ایں راہ برید   ہم بعون ہمت مرداں رسید

(اگر کسی نے شاذ و نادر اس راہ سلوک کو تنہا بے صحبت پیر قطع کر بھی لیا ہے وہ بھی پیروں ہی کی امداد ہمت اور توجہ سے پہنچا)

اس میں مولانا نے اس شبہ کے دو جواب دیئے ہیں کہ ایک تو یہ کہ ایسا نادر واقعہ ہے والنادر کالمعدوم (نادر مثل معدوم کے ہوتا ہے) امور نادرہ کی وجہ سے قواعد پر نقض وارد نہیں ہوسکتا، دوسرے یہ کہ گو ظاہر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنہا پہنچے مگر درحقیقت وہ بھی کسی کامل کی ہمت ہی سے پہنچے ہیں۔

اہل اللہ کا فیض عام:

کیونکہ بعض اہل اللہ سب مسلمانوں کے واسطے دعا کرتے ہیں اور ان کی دعا سے بہت لوگ کامیاب ہوجاتے ہیں اور ان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم کس کی دعا سے کامیاب ہوئے۔ اس کا امتحان یہ ہے کہ بعض اہل اللہ کے مرنے پر غیر مریدوں کو بھی اپنے قلب میں تغیر معلوم ہوتا ہے بشرطیکہ وہ منکر ومعاند نہ ہوں، کیونکہ اب تک اس شخص کی غائبانہ دعا وتوجہ سے فیض ہو رہا تھا جو اس کی موت سے بند ہوگئی۔ اس لئے مریدین کے علاوہ دوسروں کو بھی اپنی حالت میں وہ تغیر محسوس ہوتا ہے جس کے باب میں حدیث شریف میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا ارشاد وارد ہے: ما نفضنا الا یدی عن دفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی انکرنا قلوبنا (نہیں جھاڑا ہم نے ہاتھوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن سے اور ہم نے اپنے دلوں سے انکار کیا) وہاں تو وجہ ظاہر تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب مسلمانوں سے تعلق تھا مگر آپ کے خلفاء میں بھی بعض ایسے ہوتے ہیں جس کا احساس ان کے مرنے پر سب کو ہوتا ہے۔ میں یہ کہہ رہا

تھا کہ ذکر خواہ خلوص سے ہو یا وساوس کے ساتھ، بہرحال نافع ہوتا ہے، پس تم اس پر عمل کرو اور اپنے اندر محبت پیدا کرو اور اللہ کو یاد کرو تو تم بہت جلد عشاق میں داخل ہو جاؤ گے وان کنتم عصاۃ عتاۃ (اگرچہ تم سخت گنہگار ہو) اس عشق سے یہ اثر بھی ہو جاوے گا کہ موت کو حیات پر ترجیح ہوگی اور یہ ترجیح عقلی تو ضرور ہوگی اور چونکہ یہ شخص مجذوب نہیں ہے اس لئے طبعی کراہت کا بھی کچھ اثر باقی رہے گا مگر وہ اثر مضر نہ ہوگا اور اس اثر سے قلب میں وحشت پیدا نہ ہوگی، کیونکہ اس کے ساتھ موت کی محبت عقلی بھی جمع ہے بلکہ اس کراہت سے ایک نفع ہوگا، وہ یہ کہ اس شخص کو مجاہدہ کا ثواب ملے گا کہ طبعاً تو موت ناگوار ہے مگر محبت عقلی کی وجہ سے یہ اپنے آپ کو موت کے لئے مہیا اور تیار کر رہا ہے اور اگر یہ شخص مجذوب ہوگا تو اس کو موت سے طبعی کراہت بھی نہ ہوگی۔ یہ ترتیب ہوگی تاثیر عشق میں اب میں ختم کے قریب آ گیا ہوں۔

تفسیر آیات متلوہ:

اور اگلی آیت کا ترجمہ کرتا ہوں، کیونکہ ان کو بھی مناسبت ہے اس مضمون سے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ کہ اللہ کے راستہ میں قتل کرو (بے شک اللہ سننے والے جاننے والے ہیں) اس کو اس مضمون سے یہ مناسبت ہے کہ طاعون میں بھی شان قتال ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ شانِ قتل ہے، کیونکہ قتال طرفین سے ہوتا ہے اور یہاں صرف ایک طرف سے ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے: **الطاعون من وخز اعدائکم الجن** (المستدرک للحاکم ۱:۵۰) (طاعون تمہارے دشمن جنوں کی ایذا اور طعن سے ہے) مگر قتال میں مدافعت بالمثل ممکن ہے اور اس کی اجازت بھی ہے، بلکہ امر ہے اور یہاں اس مدافعت کی کوئی صورت نہیں، کیونکہ وخز اور واخز کا ہم کو ادراک ہی نہیں ہوتا۔ ہاں مدافعت بالعلاج کی اجازت ہے کہ دوا دارو کرو۔ طبی تدابیر استعمال کرو، یہ تو مشابہت حقیقت میں ہے، دوسری مشابہت طاعون کو قتل سے کہ فرع ہے پہلی مشابہت کی۔ وہ مشابہت حکم میں ہے اور وہ یہ ہے کہ جس طرح فرار من الزحف (میدان جنگ سے بھاگنا) حرام ہے، اسی طرح طاعون سے بھاگنا بھی حرام ہے۔ اور حدیث شریف فرار من الطاعون کو فرار من الزحف (میدان جنگ سے بھاگنا) کے مثل قرار دیا گیا ہے اور یہ تو فرار میں قبیح نقلی ہے۔ پھر طاعون سے بھاگنا عقلاً بھی قبیح ہے، کیونکہ مفید تو ہے نہیں، کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بھاگنے والوں کی موت بھی طاعون

ہی میں ہوتی ہے اور اس کے علاوہ اس میں ذلت بھی ہے۔ جہاں یہ لوگ جاتے ہیں وہاں کے باشندے ان سے پرہیز بلکہ نفرت و وحشت کرتے ہیں اور کہتے ہیں ان سے دور رہو۔ یہ طاعون کی جگہ سے آئے ہیں اور مان بھی لو کہ بھاگنا مفید ہے لیکن اخیر بات یہ ہے کہ جان حق تعالیٰ کی ہے، جہاں جس طرح حکم ہو ہم کو اس کی تعمیل ضروری ہے۔ کہیں حق تعالیٰ نے احتیاط کی اجازت دی ہے اور یہاں یہی حکم ہے کہ اس طریقہ سے احتیاط نہ کرو جیسے فوج میں تم خود کہتے ہو کہ بھاگنا قانوناً جرم ہے حالانکہ وہ بھی احتیاط ہی سے ہے۔ یہ اہل فلسفہ کا منہ بند کرنے کے لئے جواب ہے کہ وہ اس حکم عدم فرار پر عقلی اعتراض کیا کرتے ہیں، البتہ چونکہ مسئلہ فرعی ہے اعتقادی اور اصولی نہیں، اس لئے اس میں محل فرار کی تعیین میں اجتہاد سے اختلاف کی گنجائش ہوگئی ہے۔ اکثر علماء اس حکم کو علت خاصہ کے ساتھ معلل کرتے ہیں۔ پھر ان میں سے بعض نے تو یہ کہا ہے فرار فی نفسہ حرام نہیں بلکہ خلل فی الاعتقاد کی وجہ سے حرام ہے، یعنی جس کا یہ اعتقاد ہو کہ یہاں سے بھاگ کر طاعون سے بچ جاؤں گا اور عدم فرار سے ہلاک ہو جاؤں گا اس کو بھاگنا جائز نہیں اور جس کا یہ اعتقاد ہو اس کو چلا نا جائز ہے۔ مگر اول تو حدیث شریف میں جو اس فرار کو فرار من الزحف سے تشبیہ دی گئی ہے وہ اس تعلیل سے آبی ہے، ورنہ لازم آتا ہے کہ فرار من الزحف میں بھی یہی تفصیل ہو۔ دوسرے یہ کہ اس اعتقاد سے تو ہر مرض اور ہر بلا سے فرار حرام ہے۔ طاعون ہی کیا تخصیص ہے، حالانکہ حدیث سے صریح تخصیص مفہوم ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ جس کا اعتقاد درست ہوگا وہ بھاگے ہی کیوں۔ بھاگے گا تو وہی جس کا اعتقاد کمزور ہوگا۔ تو تفصیل بھی بے معنی ٹھہرتی ہے اور بعض نے اس ممانعت کی علت یہ بتلائی ہے کہ بھاگنے کی صورت میں پیچھے رہنے والوں کو تکلیف ہوگی اور اس علت کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ اگر سب کے سب بھاگ جائیں تو جائز ہے اور انفراداً بھاگنا حرام ہے اور ان لوگوں نے ایک واقعہ سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لشکر ایک مقام میں فروکش تھا۔ وہاں طاعون شروع ہوگیا اور حضرت عمرؓ نے لشکر کو وہاں سے منتقل ہونے کا امر فرمایا مگر علت بھی اسی تشبیہ سے مخدوش ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ جہاد میں بھی یہی تفصیل کر کے سب کا بھاگ جانا جائز ہو بعض کا نا جائز ہو۔ اسی طرح یہ استدلال بھی تام نہیں، کیونکہ وہ مقام لشکر کا مسکن نہ تھا۔ عارضی قیام گاہ تھی اور فرار مسکن سے حرام ہے نہ کہ عارضی قیام گاہ سے۔ مثلاً کوئی شخص مسافر ہو کر کسی مقام پر جائے اور طاعون شروع ہو جائے تو وہاں رفع طاعون تک قیام کرنا اس پر واجب نہیں۔ دوسرے یہ کیا معلوم ہے کہ حضرت عمر نے طاعون کی وجہ سے ان کو انتقال کا حکم دیا۔ ممکن

ہے کہ کسی دوسری وجہ سے حکم دیا ہو، کیونکہ لشکر تو ہوتا ہی ہے تبدل وتفرج کے لئے۔ اس لئے استدلال تام نہیں، راجح اور صحیح یہی ہے کہ ان علل کے حکم میں کوئی اثر نہیں بلکہ اقرب العلل وہ ہے جس کی طرف حدیث میں اشارہ ہے کہ چونکہ اس میں کفار جن سے مقابلہ ہے اس لئے فرار ناجائز ہے، البتہ اتنی گنجائش ہے کہ جس شہر میں طاعون ہو وہاں بستی سے نکل کر فناء شہر میں آ پڑیں۔ ہمارے اکابر نے بھی اتنی اجازت دی ہے۔ گو یہ اجازت بھی اجتہادی ہے، اس میں بھی اختلاف رائے کی گنجائش ہے مگر ظاہراً اس کی ممانعت کی کوئی وجہ نہیں اور اس کی نظیر یہ ہے کہ جیسے لشکر اسلام کا خرگاہ اس میدان جنگ میں بدل دیا جاوے تو یہ فرار نہیں ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ بلا مع فناء بعقعہ واحدہ ہے۔ اس کے ہر جزو میں رہنا اس بقعہ میں رہنا ہے۔

مال وجان کی قربانی کی ضرورت:

آگے فرماتے ہیں: مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا کون شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دے۔ یہاں قرض حسن سے وہ معنی مراد نہیں جو عوام میں مشہور ہیں۔ عوام بے سودی قرض کو قرض حسن کہتے ہیں جس میں اتنا ہی ملتا ہے جتنا دیا تھا، بلکہ قرض حسن سے مراد وہ ہے کہ خلوص محبت کے ساتھ طوع ورغبت سے دے۔ پھر اس کا معاوضہ مساوی نہ ملے گا بلکہ بہت زیادہ ملے گا۔ جیسا کہ ابھی آگے آتا ہے۔ تو مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے میں تو قرض حسن قرض بلا زیادت ہے اور خالق کے ساتھ معاملہ کرنے میں قرض حسن قرض مع الزیادت ہے۔ یہاں ایک بات طالب علموں کے کام کی ہے۔ وہ یہ کہ اس آیت کے ربط میں لوگوں کو اشکال پیش آیا ہے کہ ماقبل سے اس کا کیا ربط ہے۔ مشہور یہ ہے کہ اوپر بذل نفس کا ذکر تھا۔ یہاں بذل مال کا ذکر ہے اور قتال میں دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیز تہیو للقتال میں اصلاح ہے نفس کی اور اس اصلاح نفس میں بذل مال کو بھی بڑا دخل ہے، بلکہ بعض لوگ بذل نفس کے لئے تو تیار ہوتے ہیں مگر بذل مال ان پر گراں ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی مذاق کے ایک شخص کا قول ہے

گر جاں طلبی مضائقہ نیست   در زر طلبی سخن دریں ست

(اگر جان مانگو مضائقہ نہیں اور اگر مال مانگو اس میں کلام ہے)

ممکن ہے شاعر کا خود یہ مذاق نہ ہو۔ اس نے دوسروں کا مذاق بیان کیا ہو تو بہت لوگ اس مذاق کے بھی ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے مجاہدہ ببذل النفس کے ساتھ ہر جگہ تقریباً ببذل المال کا بھی ذکر فرمایا ہے تاکہ اصلاح کامل ہو جائے اور نسخہ مکمل ہو جائے۔ یہ ربط بہت عمدہ ہے۔ مگر اس کی

ضرورت اسی وقت ہے جبکہ قرض کا استعمال بذل نفس میں نہ ہوسکتا، نہ حقیقتاً نہ مجازاً اور نہ اس کو بذل مال کے ساتھ خاص کرنے کی ضرورت ہے، میں اس کو عام کہوں گا اور اس صورت میں بذل نفس سے بے تکلف ربط ہو جائے گا، کیونکہ قرض میں بذل نفس بھی داخل رہے گا۔ خواہ حقیقتاً خواہ مجازاً، مطلب یہ ہوگا کہ اوپر بذل نفس کی ترغیب بصورت امر تھی۔ یہاں دوسرے عنوان سے اسی کی ترغیب ہے کہ تم اپنی جان اللہ تعالیٰ کو ادھار ہی دے دو۔ پھر تم کو ہی معہ الزیادت واپس دے دی جائے گی مگر میں اس تفسیر پر اس لئے جرأت نہیں کرتا بلکہ صرف احتمالاً اس توجیہ کو بیان کر رہا ہوں کہ مجھے لغت یا محاورہ کی تحقیق نہیں کہ قرض کا استعمال بذل نفس میں ہوسکتا ہے یا نہیں۔ **فیضاعفه له اضعافًا کثیرہ** کیسے پھر اللہ تعالیٰ اس قرض کو بڑھا کر ادا کریں گے، دو گنے چوگنے کر دیں گے۔

سات سو سے زائد تضاعف کا ذکر:

دوسری آیت سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ سات سو تک بڑھائیں گے مگر اس آیت میں بقرینہ سبب نزول **اضعافًا کثیرہ** (بڑھا چڑھا) سے سات سو سے بھی زیادہ مراد ہے، کیونکہ لباب النقول میں اس آیت کے تحت میں ایک حدیث لکھی ہے کہ جب آیت **مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ** (جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت ایسی ہے جیسے اک دانہ کی حالت جس سے سات بالیں جمیں اور بالی کے اندر سو دانہ ہو) نازل ہوئی۔ جس آیت میں سات سو تک تضاعف کا ذکر ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **رب زدنی**. اے اللہ! ہمیں اس سے بھی زیادہ دیجئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: **مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً** (اور کون شخص ہے کہ اللہ کو قرض دے اچھے طور پر قرض دینا اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر بہت حصے کر دیوے) معلوم ہوا اس آیت میں سات سے زائد تضاعف کا ذکر ہے۔ اس بناء پر کم از کم سات سو سے دو گنا تو ہوگا اور اگر اضعاف کی جمعیت اور اس کے اتصاف بالکثرت پر نظر کی جاوے تو پھر کچھ حد ہی نہیں رہتی۔

تضاعف فوق المتعارف:

اور ایک حدیث سے تو صریح معلوم ہوتا ہے کہ تضاعف فوق المتعارف ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کی راہ میں ایک چھوارہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ

اس کو اپنے یمین میں لے کر اس کو پرورش فرماتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جبل احد سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ تو اب خیال کیجئے جبل احد میں اگر تمر کے مساوی حصے فرض کئے جاویں تو کتنے اجزاء نکل سکتے ہیں اور ان کا کیا عدد ہوگا، پھر اگر وہ حصے تمر کے مساوی فی الوزن فرض کئے جاویں تو اور بھی زیادہ عدد بڑھ جاوے گا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں احد سے بھی زیادہ ہوگا۔ تو معلوم ہوا کہ تضاعف کی کوئی حد نہیں بلکہ لا الی النہایۃ ہے۔ مگر یہ لاتناہی نفی تناہی متعارف ہے، لاتناہی عقلی نہیں۔ پھر اگر قرض کو بذل مال کے ساتھ خاص رکھا جائے تب تو تضاعف میں کوئی اشکال نہیں اور اگر بذل نفس کے لئے بھی عام کہا جائے تو وہاں تضاعف کی کیا صورت۔ کیا ایک جان کی ہزار جانیں ہو جائیں گی۔ سو اول تو قدرت حق سے یہ بھی بعید نہیں۔ اس پر مجھے مولانا کا شعر یاد آتا ہے۔

نیم جان بستاند وصد جاں دہد　　　انچہ دردِ ہمت نیاید آں دہد

(ضعیف و حقیر اور فانی جان لیتے ہیں باقی دیتے ہیں جو تمہارے وہم و گمان میں نہیں آ سکتا وہ دیتے ہیں)

صد جان دہد (سو جانیں دیتے ہیں) کے کیا معنی ہیں؟ بعض نے تو کہا ہے کہ جان تو ایک ہی ہوگی مگر قوت سو کے برابر ہوگی مگر صوفیہ اس سے آگے بڑھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر حقیقتاً ایک جان سو جان ہو جائیں تو یہ بھی بعید نہیں، کیونکہ وہ دنیا میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ پھر آخر میں اس کا وقوع مستبعد کیوں ہے۔ حضرت قضیب البان کے ستر قضیب البان قاضی کے سامنے آ گئے اور کہا ان میں سے ایک کو پکڑ لو جو تمہارا مجرم ہو۔ قاضی صاحب یہ کرامت دیکھ کر معتقد ہو گئے تو وہاں سچ مچ ایک جان کی سو جان اور ایک جسم کے سو جسم ہو گئے تھے۔ اسی طرح صوفی سوندھا ایک بزرگ ہندوستان میں ہوئے ہیں، ان کے سامنے کسی نے کہا کہ ہندو یوں کہتے ہیں کرشن اوتار کی سو بیبیاں تھیں اور وہ ایک وقت میں سب کے پاس ہوتا تھا اور ہر جسم سے جدا کام کرتا تھا۔ گویا ایک کرشن سو کرشن بن جاتے تھے۔ صوفی سوندھا نے کہا نامعلوم کیسی روایت ہے، صحیح ہے یا غلط، اور صحیح بھی ہو تو یہ کچھ کمال نہیں۔ پھر فرمایا ذرا اس املی کو تو دیکھو۔ مخاطب نے جو املی پر نظر کی تو ہر پتے پر صوفی سوندھا نظر آئے۔ اس کے سامنے بھی بیٹھے اور درخت کے ہر پتا پر بھی ان کا جسم مع روح نظر آ رہا تھا۔ تو جب حق تعالیٰ نے تضاعف نفس کی کرامت اپنے بندوں کو دنیا میں بھی عطا کی ہے اگر آخرت میں بھی اس کا وقوع ہو تو کیا عجب ہے اور اگر اس کو مان لیا جائے تو پھر ایک حدیث کی شرح بے تکلف ہو جائے گی، وہ یہ کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کے مختلف دروازے ہیں، کسی دروازہ کا نام باب الصلوٰۃ ہے، کسی کا باب الزکوٰۃ، کسی کا باب الریان

وغیرہ وغیرہ، جس شخص میں جو اعمال غالب ہوں گے وہ اسی دروازے سے بلایا جائے گا۔

تضاعف نفس پر دلیل:

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) گو اس کی ضرورت تو نہیں مگر کیا کوئی ایسا بھی ہوگا جو ہر دروازے سے بلایا جائے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، بعضے ایسے بھی ہوں گے وارجوا ان تکون منھم مجھے اُمید ہے کہ تم بھی ان ہی میں سے ہوگے۔ اب تضاعف نفس کی تقدیر پر یہ حدیث بے غبار ہو جائے گی اور یوں کہا جائے گا کہ حق تعالیٰ بعض بندوں کو جسم و روح متعدد عطا فرمائیں گے۔ حقیقت میں وہ ایک شخص ہوگا مگر تعدد جسد سے وہ متعدد ہوگا۔ اس لئے وہ ہر دروازہ سے بلایا جائے گا اور ہر دروازہ سے الگ الگ جائے گا بھی اور صاحبو! جب حق تعالیٰ کے یہاں بذل مال میں تضاعف ہوتا ہے جو نفس کے اعتبار سے اخس و ارذل ہے تو بذل نفس میں تضاعف کیوں نہ ہو جو اشرف و اعلیٰ ہے۔ اسی کو ایک بزرگ کہتے ہیں:

کشتگان خنجر تسلیم را　　　ہر زمان از غیب جان دیگر ست

(تسلیم و رضا کے خنجر لگے ہوؤں کو ہر آن غیب سے نئی زندگی ملتی ہے)

اور اس تعدد و جسد کے احتمال پر ایک مضمون سہل ہو جاوے گا، وہ یہ کہ حدیث شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ایک جنتی کے پاس اس قدر حور و قصور ہوں گے جو حد بصر سے بھی زیادہ، تو ظاہراً اس کا انتفاع بھی ان سب سے مدتوں کے بعد ہوا کرے گا، لیکن اگر اجساد میں تعدد ہو تو ایک ہی وقت میں ہر نعمت و لذت سے متمتع ہو سکنا سہل ہو جاوے گا **واللہ اعلم بحقیقتہ الحال** (حقیقت حال کو اللہ ہی زیادہ جانتے ہیں) آگے ارشاد ہے: **وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ** (اللہ ہی کمی کرتے ہیں اور فراخی کرتے ہیں) اس میں ایک اشکال کا جواب ہے کہ تم تضاعف کو مستبعد نہ سمجھو کیونکہ قبض و بسط اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ جس کی چاہے روزی کم کر دیتے ہیں اور جس کی چاہیں روزی فراخ کر دیتے ہیں۔ پس وہ اس تضاعف **لا الی النھایۃ** پر بھی قادر ہیں۔ اگر قرض کو عام لیا جائے تو یہ قبض و بسط نفس کو بھی عام ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہی تمہاری جان کو سمیٹتے ہیں اور وہی اس کو پھیلا بھی سکتے ہیں کہ بجائے ایک کے ہزار جانیں کر دیں اور یا اس میں تجمیع ہے بذل نفس و مال پر کہ بخل اور خوف بے کار ہے، کیونکہ مال کا قبض و بسط اسی طرح جان کا قبض و بسط خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اگر تم نے مال یا جان کو بچانا چاہا اور انہوں نے قبض کرنا چاہا تو تمہاری تدبیر ہرگز نہ چلے گی، پھر غیر مشروع بخل و جبن فضول ہے۔ آگے ارشاد ہے: **الیہ ترجعون**. اور اسی کی طرف لے جائے

جاؤ گے۔اس میں بذل مال ونفس کی ترغیب بھی ہے کہ تم کو وہاں جانا ہے تو اس کی جزاء پاؤ گے اور بخل وجبن پر ترہیب بھی ہے کہ اگر ایسا کرو گے تو وہاں جا کر سزا پاؤ گے اور نیز اس میں اس قرض سے جو ایک مانع پیش آتا ہے اس میں اس مانع کو رفع کیا گیا ہے مثلاً مال خرچ کرنے سے یہ امر مانع ہوتا ہے کہ انسان سوچتا ہے کہ یہ مال میرے پاس رہتا تو اس سے بہت کام نکلتے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم ہی یہاں رہنے والے نہیں ہو بلکہ ایک دن خدا کے پاس جانے والے ہو تو مال تمہارے پاس کیوں کر رہ سکتا ہے ایک نہ ایک دن اس کو چھوڑ کر جاؤ گے اس لئے بہتر ہے کہ اس کو خزانہ عامرہ میں داخل کردو جہاں سے اضعافا مضاعفه ہو کر تم کو واپس مل جائے گا اور اگر لفظ قرض کو بذل نفس کے لئے بھی عام مانا جاوے تو اس جملہ میں بذل نفس کی بھی ترغیب ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جان دینے سے بخل نہ کرو کیونکہ ایک دن تم کو جانا ہی ہے تو بہتر یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جان چلی جائے اور تم کو شہادت نصیب ہو جائے جس کا صلہ یہ ہے کہ نفس میں بھی تضاعف ہوگا ایک جان کے بدلے تم کو ہزار جانیں ملیں گی اور نیز یہ مضمون الیه ترجعون (اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے) کا ایسا ہے کہ اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو طاعون سے وحشت بالکل نہ ہو دل کو یوں سمجھالیا جائے کہ ایک دن موت ضرور آئے گی بھاگنے سے بھی جان بچ نہیں سکتی اور یہاں رہ کر موت آئی تو شہادتِ نصیب ہوگی اور جہاد کے برابر ثواب ملے گا پھر بھاگنا فضول ہے اور واقعی موت ایسی چیز ہے کہ تدابیر سے ٹل نہیں سکتی حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں: قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَ اِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا کہہ دیجئے کہ بھاگنا تم کو ہرگز نفع نہ دے گا اگر تم موت یا قتل سے بھاگو گے اور بھاگ کر چندروز کو بچ بھی گئے تو بجز قلیل مدت کے تم زندگی کے (زیادہ) متمتع نہیں ہو سکتے اس کے مناسب بعض واقعات ذکر کرتا ہوں۔

موت سے فرار ناممکن ہے:

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک بستی میں بھیڑیا آتا تھا لوگ اس سے بہت خائف تھے ایک عورت کی مارے خوف کے یہ حالت ہوئی کہ باوجود سخت گرمی کے اپنے بچہ کو کوٹھڑی کے اندر لیجا کر سوئی اتفاق سے رات کو چوروں نے اس کوٹھری میں نقب دیا مگر آدمی کے سانس کی آواز سن کر بھاگ گئے اور اسی نقب میں سے بھیڑیا آکر بچہ کو لے گیا اور اس عورت کی وہی تدبیر جو بھیڑیے سے بچنے کے لئے کی گئی تھی بچہ کی ہلاکت کا سبب ہوگئی ایک جگہ ایسا قصہ ہوا کہ سات آدمی سفر کو جارہے تھے راستہ میں بارش ہونے لگی تو ان لوگوں نے ایک بستی میں پناہ لی۔

بارش کے ساتھ بجلی اور کڑک بھی تھی اور بجلی بار بار اسی بستی پر آتی تھی اور ہٹ جاتی تھی ان سات آدمیوں کو جہل سے یہ خیال ہوا کہ شاید ہم میں سے کسی کی موت آ گئی ہے جس پر بجلی گرنا چاہتی ہے مگر چونکہ سب کی موت مقدر نہیں اس لئے ہٹ جاتی ہے تا کہ ایک کے ساتھ سب ہلاک نہ ہوں یہ سوچ کر سب نے مشورہ کیا کہ ایک ایک کر کے سب کو اس بستی سے نکلنا چاہئے تا کہ جس کی موت آئی ہو بجلی اسی پر گر پڑے سب تو ہلاک نہ ہوں گے چنانچہ ایک آدمی نکلا جب چھ نکل آئے اور ان میں سے کوئی ہلاک نہ ہوا تو اب ساتواں نکلنے سے رک گیا وہ سمجھا کہ بس میرے ہی واسطے موت مقدر ہے ہر چند سب نے اصرار کیا مگر وہ انکار ہی کرتا رہا آخر کار یہ چھ آدمی بستی میں گھسے اور اس کو جبراً باہر نکال دیا وہ باہر آیا اور یہ چھ آدمی اندر رہے کہ دفعتاً بجلی بستی کے اوپر گری اور وہ چھ کے چھ آدمی ہلاک ہو گئے اور ساتواں بچ گیا بتلایئے انہوں نے تو اپنے بچنے اور ساتویں کے مارنے کی تدبیر کی تھی مگر یہ خبر نہ تھی کہ ہم اپنے آپ کو ہی ہلاک کرنے کی تدبیر کر رہے ہیں اور ساتویں کو بچانے کے لئے بستی سے نکال رہے ہیں یہ ساتواں شخص ان سب کا وقایہ تھا اسی کی وجہ سے وہ سب بچے ہوئے تھے جب یہ الگ ہو گیا سب ہلاک ہو گئے ایسا ہی ایک واقعہ سنا تھا کہ مکان میں بہت سے چور گھسے گھر میں جا کر دیکھا کہ ایک میاں اور ایک بیوی اندر پڑے سو رہے ہیں انہوں نے آہستہ آہستہ ان دونوں کا پلنگ باہر نکال دیا تا کہ اطمینان سے چوری کریں ان دونوں کا پلنگ باہر کر کے چور لوگ اندر گھسے تو دفعتاً مکان کی چھت گر پڑی اور سب وہیں دب کر مر گئے۔ وہ مرد و عورت جو جاگے تو دیکھا کہ ہمارا پلنگ اندر سے باہر ہے اور مکان کی چھت گری پڑی ہے۔ بڑی حیرت ہوئی کہ ہمارا پلنگ اندر سے باہر کیسے آ گیا جب تختہ کڑی ہٹایا گیا تو چوروں کی لاشیں برآمد ہوئیں۔ اب وہ ان چوروں کے آنے پر خدا تعالیٰ کا شکر کرنے لگے حالانکہ چوروں سے تو پناہ مانگا کرتے ہیں۔ غرض ایسے بہت واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ موت سے بچنا ممکن نہیں اور جو اسباب موت سے بچنے کے لئے ہم اختیار کرتے ہیں وہ فی نفسہ مؤثر نہیں بلکہ بعض دفعہ وہی ہلاکت کا سبب ہو جاتے ہیں تو بھاگنے ہی سے کیا ہوگا بس جو کچھ ہوتا ہے حکم سے ہوتا ہے پھر فکر کیوں ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ طاعون سے بچنے کی اگر تدبیر ہی کرنا چاہتے ہو تو بڑی تدبیر یہ ہے کہ فکر نہ کرو جس کا لازمی نتیجہ عدم فرار ہوگا کیونکہ اطباء کا اس پر اتفاق ہے کہ اصل فاعل اور دافع مرض طبیعت ہے اور اصل علاج طبیعت کا بڑا سبب خوف اور فکر ہے پہلے زمانہ میں جو امراض کم ہوتے تھے اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ اس وقت عام طور پر بے فکری تھی گو اسباب تنعم کم تھے بے فکری کے سبب

ان لوگوں کے طبائع اور دل قوی تھے اس لئے امراض پاس بھی نہ آتے تھے اور آج کل گو اسباب تنعم زیادہ ہیں مگر اسکے ساتھ افکار بھی زیادہ ہیں اسلیئے امراض کی بھی کثرت ہے تو بیماری سے بچنے کی بڑی دوا بے فکری ہے کیونکہ اصل دافع مرض طبیعت ہی ہے اور اس کو بے فکری سے قوت ہوتی ہے اور اس مسئلہ طبیبہ کی صحت اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طرق علاج معالجین میں مختلف ہیں اور سب ہی سے نفع بھی ہوتا ہے یعنی علاج تین قسم کے ہیں ایک تو انگھڑ جس کا کوئی اصول ہی نہیں وہ تو ڈاکٹری ہے اسکا مدار کسی قاعدہ پر نہیں کہ علاج بالضد ہو یا بالمثل بلکہ تجربہ پر مدار ہے بس تجربہ ہو گیا کہ کنین دوائے امراض کونین ہے تو لگے ہر بخار میں کونین استعمال کرنے پھر غضب یہ کہ ان کی دوائیں سب بنی بنائی ولایت سے آتی ہیں اور قاعدہ ہے کہ مرکب دوا کی شناخت نہیں ہو سکتی کہ اس میں کیا ہے کیا نہیں بس ولایت سے چٹ لگ کر آ گئی اور یہ ایمان بالغیب یا ایمان بالعیب سے علاج کرنے لگے اور اگر کبھی چٹ لگانے میں غلطی ہو گئی یا ڈاکٹر کی چٹ کے پڑھنے میں خطا ہو گئی چنانچہ ایسا بھی ہو جاتا ہے تو ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ ہم سے غلطی ہو گیا معافی مانگتا ہے۔

"کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری"

علاج کی دو قسمیں:

اور ایک علاج گھڑت کا ہے جس کے اصول وضوابط منضبط ہیں پھر اس کی دو قسمیں ہیں ایک علاج بالضد جیسا کہ یونانی میں ہے یہ گرمی کا علاج سردی اور سردی کا گرمی سے کرتے ہیں اور رطوبت کا یبس سے یبس کا رطوبت سے کرتے ہیں دوسرا علاج بالمثل ہے یہ لوگ گرمی کا گرمی سے اور سردی کا سردی سے علاج کرتے ہیں اور ان دونوں میں سخت اختلاف ہے۔ ہر ایک دوسرے کے علاج کو غلط بتلاتا ہے۔ اب اگر دوا فاعل ہوتی ہے اور اس سے مرض دفع ہوا کرتا تو ان طریق میں سے ہر اک نافع نہ ہوتا بلکہ جس کے اصول صحیح ہوتے اس سے نفع ہوتا اور جس کے اصول غلط ہوتے اس سے ضرر ہوتا اور چونکہ اصول میں تخالف و تبائن ہے اس لئے دونوں یقیناً صحیح نہیں بلکہ ان میں ضرور ایک غلط ہے مگر مشاہدہ ہے کہ دونوں سے نفع ہوتا ہے اور ڈاکٹری سے بھی نفع ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہی بات صحیح ہے کہ اصل دافع مرض طبیعت ہے، دوا فاعل صحت یا دافع مرض نہیں، سو جس شخص کو جس طریق علاج سے اعتقاد ہوتا ہے اس علاج کے شروع ہو جانے سے اس کی طبیعت کو قوت شروع ہو جاتی ہے اور یہ اعتقاد پیدا ہو جاتا ہے کہ اب میں اچھا ہو جاؤں گا۔ اس اعتقاد سے طبیعت کو قوت ہوئی اور مرض زائل ہونا شروع ہوا اور ظاہر ہے کہ بے

فکری سے طبیعت کو بہت قوت ہوتی ہے۔ پس طاعون کا بڑا علاج یہ ہے کہ فکر نہ کرو، تم کو اپنی قوت قلب کی تاثیر کا اندازہ نہیں ہے، ورنہ یہ قوت قلب وہ چیز ہے کہ اس سے امراض بھی ڈرتے ہیں اور جن وشیاطین بھی ڈرتے ہیں۔ دیکھو انگریزوں پر آسیب اور بھوت کا اثر نہیں ہوتا کیونکہ وہ ان کے منکر ہیں، ان کے وجود کے قائل نہیں ہیں اور ہندوؤں پر زیادہ اثر ہوتا ہے، کیونکہ وہ سب سے زیادہ ان کی تاثیر کے قائل ہیں، اس لئے ان سے ڈرتے بھی ہیں اور ہندوؤں سے کم جاہل مسلمان پر اثر ہوتا ہے، کیونکہ وہ ہندوؤں کے برابر تو ان کے قائل نہیں مگر اختلاط کی وجہ سے جہلا کا کچھ کچھ اعتقاد ہے۔ بس جتنا جو شخص ان سے ڈرتا ہے اتنا ہی اس پر اثر ہوتا ہے اور جو بے فکر ہے اس پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ مگر بے فکری کی تحصیل کے لئے حقائق کا انکار جائز نہیں، جیسے اہل یورپ کہ وجود جن ہی کے منکر ہیں، بلکہ بے فکری اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ جن بدون اذن الٰہی کے کچھ نہیں کرسکتے، البتہ جس حقیقت ہی کا ثبوت شروع سے نہ ہو وہاں انکار حقیقت اعلیٰ طریق ہے بے فکری کا جیسا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، **لا عدوی** (**مجمع الزوائد۵:۱۰۲**) کہ کوئی بیماری (طاعون وغیرہ) دوسرے کو نہیں لگتی۔ تو جس شخص کا یہ اعتقاد ہوگا طاعون سے کس قدر بے خوف ہوگا۔ کوئی طبیب اس سے اچھا نہیں بتلاسکتا۔ بہرحال اگر تدبیر ہی کرنے کا شوق ہے تو وہ عدم فکر ہی بڑی تدبیر ہے مگر اس تدبیر میں یہ وہم نہ کرنا کہ شاید شیاطین وجن بھی بے فکری کا سبق سیکھ لیں تو پھر ان کو بھی قوت ہوجائے گی۔

ایک ذہین بچہ کی حکایت:

جیسے مثنوی میں ایک قصہ ہے کہ ایک لڑکے سے اس کی ماں نے کہا کہ بیٹا جنگل میں بھوت پریت دیکھو تو ان سے ڈرنا نہیں، خوف نہ کرنے سے وہ بھاگ جائیں گے۔ بچہ نے کہا کہ اگر اس کی ماں نے بھی اس کو یہی سکھا دیا ہو کہ انسان سے ڈرنا نہیں تو بھلا پھر وہ کیوں بھاگے گا۔ لڑکا بڑا ہوشیار تھا تو خدا کے لئے آپ اس وہم سے کام نہ لیں اور بے فکر رہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ چین سے رہو گے۔ شیاطین میں اتنی قوت نہیں کہ وہ آپ سے یہ سبق سیکھ کر بے خوف ہوکر رہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شریعت نے جو طاعون سے فرار کو منع فرمایا ہے یہ تدبیر کی ممانعت نہیں ہے، بلکہ یہ سب سے بڑی تدبیر ہے اس سے محفوظ رہنے کی۔ چنانچہ دوسری تدابیر کو بھی منع فرمایا۔ چنانچہ حفظ ماتقدم کے لئے گولیاں کھانا اور گندھک کی دھونی دینا جائز ہے بلکہ ایسا کرنا چاہئے، اسی طرح مکان کی صفائی رکھنی چاہئے، پاخانہ میں فنائل بھی چھڑک دیا کرو، کوئی بیمار ہوجائے اس کی دوا دارو

بھی کرواور سب سے بڑی تدبیر یہ بھی کرو کہ فکر نہ کرو، اس سے طبیعت اور قلب میں قوت ہوگی جس سے مرض دفع ہوگا اور یہاں سے معلوم ہوا کہ اطباء وڈاکٹر جو مقام طاعون سے بھاگنے کی اور اس کے مریض سے الگ رہنے کی رائے دیتے ہیں وہ دراصل انسان کو مرض کا قابل بناتے ہیں، کیونکہ بھاگنے والے کا دل کمزور ہوجاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص طاعونی مریض سے پرہیز کرے گا وہ بھی ضعیف القلب ہوگا۔ تو یہ لوگ طبیعت کے ضعیف کرنے کا سامان کررہے ہیں۔

طبائع کو دافع مرض بنانا:

ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا عدوی (مجمع الزوائد ۵:۱۰۲)(کوئی بیماری دوسرے کو نہیں لگتی) فرما کر مسلمانوں کی طبائع کو قوی بنا کر ان طبائع کو فاعل صحت اور دافع مرض بنا رہے ہیں بشرطیکہ وہ اس پر پورا اعتقاد کرلیں، کیونکہ واقعی اس سے بڑھ کر تقویت قلب کی کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی کہ لوگوں کے دلوں میں یہ مضمون جما دیا جائے کہ بیماری لگتی نہیں ہے جس کا اعتقاد یہ ہوگا وہ نہایت قوی القلب ہوگا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرار کی ممانعت کرکے بھی مسلمانوں کو قوی القلب بنانا چاہا ہے کہ طاعون سے ڈرو نہیں، بے فکر ہوکر وہیں رہو اور یہ سمجھ لو کہ جو کچھ ہوگا حکم سے ہوگا جس کی موت آچکی ہے وہی مرے گا، جس کی نہیں وہ ہرگز نہیں مرسکتا۔ پھر طاعون کے فضائل بیان فرما کر اس کو اور مؤکد کردیا کہ بجائے خائف ہونے کے مسلمانوں کو طاعون کا مشتاق بنادیا۔ اسی تدبیر تقویت طبیعت کا تتمہ ایک یہ تدبیر ہے کہ باہم بیماری کا تذکرہ نہ کرو کہ آج اتنے بیمار ہوئے اور اتنے مرے۔ اس سے طبیعت کمزور ہوتی ہے۔ خصوصاً عورتوں کو چاہئے کہ اپنے گھروں میں اس تذکرہ کو بند کریں، ان کے یہاں راوی اس کثرت سے ہیں کہ مردوں کو تو باہر کے واقعات کی خبر کم ہوتی ہے مگر اس خفیہ پولیس کو ساری خبریں ملتی رہتی ہیں۔ نہ معلوم ان سے کون کہہ جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اول تو تفویض وتسلیم کی نیت سے ہم کو بے فکر ہونا چاہئے اور اگر کسی کو تفویض وتسلیم حاصل نہیں تو وہ تدبیر ہی کی نیت سے بے فکری کو اختیار کرے۔ اس سے مادہ طبائع میں سے نکل جائے گا تو طاعون خود ہی جاتا رہے گا۔ پھر اس میں دنیا کی بھی راحت ہے کہ سارے کام اپنے اپنے موقع پر ادا ہوتے رہتے ہیں اور پریشانی سے سارے کام خراب ہوتے ہیں اور دین کا بھی نفع ہے، کیونکہ جو شخص بے فکر ہوگا اگر اسے موت بھی آئے گی تو اطمینان سے توبہ واستغفار کرکے مرے گا اور فکرمند کے تو مرض ہی سے حواس باختہ ہوجائیں گے۔ موت کو دیکھ کر تو نہ معلوم کیا حال ہوگا۔

حکایت مفتی عنایت احمد صاحب مرحوم:

مفتی عنایت احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ علم الصیغہ کے مصنف حج کو تشریف لے گئے تھے۔ شاید واپسی کے وقت جہاز طوفان میں آ گیا، بعض مسافر جو اس جہاز سے بچ کر نکل آئے تھے وہ کہتے تھے کہ جس وقت جہاز غرق ہونے لگا تو تمام مسافروں میں کہرام مچا ہوا تھا مگر مفتی عنایت احمد صاحب بڑی بے فکری سے بیٹھے ہوئے یہ آیت پڑھ رہے تھے: قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آپ فرما دیجئے ہم پر کوئی حادثہ نہیں پڑ سکتا مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مقدر فرما دیا، وہ ہمارا مالک ہے اور اللہ تعالیٰ کے تو سب مسلمانوں کو اپنے کام سپرد رکھنے چاہئیں) بتلایئے طوفان کے وقت جبکہ معلوم ہے کہ جہاز غرق ہونے والا ہے ایسا استقلال کس چیز کی بدولت تھا، اسی بے فکری کی بدولت، مگر انہوں نے یہ بے فکری تدبیر کے طور پر اختیار نہ کی تھی بلکہ رضا و تسلیم کا اثر تھا، لیکن کوئی تدبیر کے طور پر بھی بے فکری اختیار کرے تو راحت تو اس کو بھی میسر ہو جائے گی۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں اور خلاصہ بیان کا اعادہ کرتا ہوں۔ حاصل سارے بیان کا یہ ہے کہ عام لوگوں کو جو اس وقت پریشانی اور بدحواسی میں مبتلا ہیں اس کا سبب حق تعالیٰ سے بے تعلقی ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے تعلق محبت پیدا کیا جائے۔

طریق حصولِ محبت الٰہی:

جس کا طریقہ میں نے یہ بتلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات و انعامات کو کثرت سے یاد کیا جائے اور ایک وقت ذکر اللہ کے لئے مقرر کیا جائے اور اہل اللہ کی صحبت اختیار کی جاوے۔ اس طرح سے ان شاء اللہ تعالیٰ چند روز میں محبت پیدا ہو جائے گی چاہے آپ متقی پرہیزگار بھی نہ بنیں مگر عاشق و محب ضرور ہو جائیں گے۔ بس اب مجھے یہ کہنا تھا اور اس مضمون کو میں نے اس لئے اختیار کیا تھا کہ مجھے قوی اُمید ہے کہ لوگ اس کو تو ضرور قبول کر لیں گے کیونکہ میں یہ نہیں کہتا کہ تم آج ہی سارے گناہوں کو چھوڑ دو، نہ میں یہ کہتا ہوں کہ آج سے ہی سب کے سب پکے نمازی بن جاؤ، بلکہ صرف یہ کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو روزانہ یاد کر لیا کرو اور کسی وقت تھوڑی دیر اللہ اللہ کر لیا کرو اور تھوڑی دیر اللہ والوں کے پاس جا بیٹھا کرو، چاہے اس کے ساتھ شرارت بھی کر لیا کرو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ شرارتوں کے ساتھ بھی تم عاشق بن جاؤ گے اور عشق کی یہ خاصیت ہے کہ۔

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت　　　ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے سوائے محبوب کے سب کو فنا کر دیتا ہے)

وہ تمام پریشانیوں کو جلا پھونک کر رکھ دے گا اور آپ ایسا کر کے تو دیکھیں ان شاء اللہ تعالیٰ ایک ہفتہ میں طاعون ہی نہ رہے گا۔ کانپور میں ایک دفعہ میرے سامنے جب طاعونی انتظام کا حکم آیا تو لوگ بہت پریشان ہوئے اور عمائد شہر نے ارادہ کیا کہ کلکٹر صاحب کے پاس ایک وفد جائے اور جا کر عرض کرے کہ ان انتظامات کو اٹھا لیا جائے۔ اس وفد میں لوگوں نے مجھے بھی لے جانا چاہا۔ میں نے انکار کیا۔ لوگوں نے اصرار کیا۔ میں نے کہا اچھا میں اپنے بزرگوں سے مشورہ کرلوں۔ اس وقت میرے پاس دیوان حافظ تھا اور میں اکثر تفریح طبع کے طور پر اس سے فال لے لیا کرتا ہوں جس میں میرا یہ اعتقاد نہیں کہ نعوذ باللہ حافظ صاحب آ کر کچھ کہہ جاتے ہیں بلکہ یہ خیال ہے کہ یہ کلام ایک مقبول بندہ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں ہماری تسلی کے لئے کوئی بات موقع کی مناسب نکال دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بسم اللہ کر کے دیوان کو کھولا تو شروع ہی صفحہ پر یہ شعر تھا ۔

گدائے گوشہ نشینی تو حافظ مخروش　　　رموز مملک خویش خسرواں دانند

(حافظ تو گوشہ نشین ہے، شور و غل مت کر، اپنی سلطنت کے رموز کو بادشاہ ہی جانتے ہیں)

کیسا موقع کا شعر نکلا۔ میں نے کہا صاحبو! مجھے تو اس شور و شغب میں شرکت سے منع کیا گیا ہے کہ فقیری کو امور سلطنت میں دخل نہ دینا چاہئے۔ لوگوں نے کہا پھر ہمارے واسطے کیا رائے ہے۔

ازالہ بلا کا ایک ورد:

میں نے کہا تم بھی حکام سے کچھ نہ کہو، خدا تعالیٰ سے کہو اور تم روزانہ پانچ سو مرتبہ **لا حول ولا قوۃ الا باللہ** کا وظیفہ پڑھ لیا کرو۔ خواہ دو تین آدمی پڑھ لیں یا بہت سے مجتمع ہو کر پڑھ لیں۔ اس کے بعد حق تعالیٰ سے دعا کریں۔ اس وقت میری زبان سے یہ بھی نکل گیا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ایک ہفتہ میں بلا ٹل جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ایک ہی ہفتہ کے اندر خود کلکٹر نے لکھا دیا کہ یہاں طاعون وغیرہ کا کوئی اثر نہیں، اس لئے جدید انتظام کا حکم موقوف کیا جائے۔ اسی طرح میں خدا تعالیٰ کے بھروسہ پر یہاں بھی کہتا ہوں کہ آپ اس طریقہ پر عمل کر کے دیکھیں، ان شاء اللہ ایک ہفتہ میں سکون ہو جائے گا۔ اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی محبت عطا فرمائیں اور پریشانیوں کو دور فرمائیں۔

وصلی اللہ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین.

الملفوظ المسمّٰی بہ

الطاحون لمن فرمن الطلعون

مورخہ ۱۱ رمضان المبارک ۱۳۴۴ھ بعد نماز جمعہ بسلسلہ ذکر طاعون فرمایا

علاج کے تین طریقے:

طبی تحقیق میں اصل فاعل صحت طبیعت ہے اور علاج اس کا مؤید ہے۔ چنانچہ علاج کے تین طریقے متعارف ہیں۔ علاج الضد تو یونانی کرتے ہیں اور علاج بالمثل ہندی کرتے ہیں اور علاج بالخاصہ ڈاکٹر کرتے ہیں اور اس کا مدار نہ مثل پر ہے نہ ضد پر بلکہ تجربہ پر ہے خواہ بالمثل ہو یا خواہ بالضد، اس کا کچھ لحاظ نہیں، وہ یہ جانتے ہیں کہ کونین بخار کو مفید ہے بس، لیکن یہ طریق مہمل ہے۔ بہرحال عقلاً سب طریق صحیح نہیں ہو سکتے کہ باہم متنافی ہیں، پھر بھی سب نافع ہوتے ہیں۔

اصل دافع مرض طبیعت ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ اصل دافع مرض طبیعت ہے، چونکہ ہر طریق کا نافع سمجھنے والا اس کا معتقد ہے، اس سے اس کی طبیعت میں قوت ہوتی ہے، اس سے مرض دفع ہو جاتا ہے اور اصل فاعل طبیعت ہے تو جس قدر طبیعت قوی ہوگی اسی قدر مرض کو دفع کرے گی، تو صاحب شریعت نے طبیعت کے قوی بنانے کا کیا عجیب انتظام فرمایا، کیونکہ ارشاد فرمایا: **لا عدوی** (مجمع الزوائد ۵:۱۰۲) (کوئی بیماری دوسرے کو نہیں لگتی) اور ظاہر ہے جس شخص کا یہ عقیدہ ہوگا اس کی طبیعت نہایت قوی ہوگی اور وہ مرض کی کچھ پرواہ نہ کرے گا بخلاف اس کے ضعف میں اتنا ہی مرض سے متاثر ہوگا۔ چنانچہ مکہ معظمہ میں قاری عبداللہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ کسی مقام کے ایک نواب صاحب کی بیوی بیمار تھیں، ان کا انتقال ہو گیا ہوگا، بعد میں معلوم ہوا کہ نہیں نواب صاحب خود انتقال کر گئے اور ان کی بیوی بعد میں اچھی ہو گئیں۔ یہ نواب صاحب کی پریشانی اور کمزوری طبیعت کی وجہ ہوئی۔ ہمارے ایک مولوی صاحب جنہوں نے بہشتی زیور تالیف کرنا شروع کرایا تھا، ان کی بیوی بیمار ہوئیں طاعون میں۔ مولوی صاحب چونکہ نہایت ضعیف القلب تھے، بہت پریشان ہو گئے، بیوی کو تو صحت ہو گئی مگر مولوی صاحب اس مرض میں مبتلا ہو کر انتقال فرما گئے۔

قوت قلب کا اثر:

قوت قلب کا یہ اثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ بیمار سے چمٹے رہے اور کچھ نہیں ہوا۔ ایک حکیم صاحب تھے امیر احمد نانوتوی، ان کے یہاں بستی میں طاعون ہوا۔ برابر مریضوں کو دیکھنے جاتے اور دوا بنا کر دیتے اور مریضوں کا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ کر دوا پلاتے۔ فرماتے تھے دس فیصدی فوت ہوئے اور نوے فیصدی اچھے ہوگئے اور حکیم صاحب کو کچھ نہ ہوا۔ اچھے خاصے رہے۔ تو عقلاً بھی اس سے فرار مضر ہے کہ مورث ضعف ہے اور شرعاً تو منہی عنہ ہی ہے۔ چنانچہ **فارمن الطاعون** کو (طاعون سے بھاگنے) **فارمن الزحف** (میدانِ جنگ سے بھاگنے) سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس میں جو طاعون کو جہاد سے تشبیہ دی گئی ہے اس کی وجہ دو چار دن ہوئے سمجھ میں آئی ہے (ممکن ہے کہ کسی کو اور وجہ معلوم ہو) تشبیہ تو ان حدیثوں سے معلوم ہوتی ہے۔ ایک حدیث تو یہ ہے: **الفار من الطاعون کالفارمن الزحف** (مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۵۷) (طاعون سے بھاگنے والا میدانِ جنگ سے بھاگنے والے کی مثل ہے) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طاعون جہاد کی طرح ہے اور طاعون سے بھاگنے میں ویسا ہی گناہ ہے جیسا کہ جہاد سے بھاگنے میں۔ دوسری حدیث یہ ہے کہ قیامت کے دن جو لوگ طاعون سے مرے ہیں ان کے بارہ میں نزاع ہوگا۔ جو لوگ جہاد میں شہید ہوئے ہیں وہ لوگ تو یہ کہیں گے کہ طاعون والے ہمارے بھائی ہیں، ہمارے ساتھ رہیں، دوسرے لوگ جو اور بیماریوں میں اپنے فرش پر مرے ہیں وہ کہیں گے کہ طاعون والے ہمارے بھائی ہیں، ہمارے ساتھ رہیں، کیونکہ ہماری طرح فرش پر بیمار پڑ کر مرے ہیں۔ اس کے بعد حکم ہوگا کہ ان کے زخموں کو ملاحظہ کیا جائے۔ تو ان کے زخم شہیدوں کے زخموں کی طرح ہوں گے، ویسے ہی خوشبودار ہوں گے اور ان کے زخموں سے خون بہتا ہوگا۔ تو پھر وہ شہداء کے ساتھ ملا دیئے جائیں گے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ طاعون والے شہداء کی طرح ہیں اور طاعون جہاد کے مشابہ ہے۔

اہل طاعون مثل شہداء:

اسی واسطے طاعون کے علاوہ اور کسی بیماری سے فرار کو نہیں منع فرمایا۔ اب وجہ تشبیہ کی بیان کرتا ہوں۔ وجہ تشبیہ کی سمجھنے سے پہلے یہ غور کیا جائے کہ جہاد میں جو فرار سے منع فرمایا ہے اس کی وجہ کیا ہے۔ یعنی جب مسلمان اور کافر تعداد میں مساوی ہوں یا کافر مسلمان سے دو چند ہوں اور سامان وغیرہ بھی موجود ہو تو اس صورت میں فرار سے منع فرمایا ہے۔ گو کسی کو قرائن سے یہ بھی یقین ہو کہ

کافر غالب ہو جائیں گے تو بھی شریعت نے بھاگنے کی اجازت نہیں دی۔ گو عقل کا مقتضا یہ تھا کہ اس صورت میں جان کی حفاظت کرنا چاہئے اور پھر دوسرے وقت موقع پا کر جنگ کی جاوے۔ مگر شریعت نے علی الاطلاق فرار سے منع فرمایا۔ گو ایک مسلمان بھی اس میدان میں نہ بچے اور سب لوگ شہید ہو جائیں مگر فرار کی اجازت نہیں۔ تو وجہ عدم اجازت کی یہ ہے کہ فرار میں کفار کو حوصلہ ہو جائے گا اور وہ سمجھیں گے کہ یہ لوگ کسی لائق نہیں، کچھ نہیں، بے ہمت ہیں۔ اس سے کفار کا دل بڑھ جائے گا، پھر مسلمانوں کو ایذا دینے کا ان کو حوصلہ ہو جائے گا اور اگر مسلمان نہ بھاگے خواہ غالب آ گئے یا سب مارے گئے تو دونوں صورتوں میں کفار کی ہمت ٹوٹ جائے گی اور ان کا حوصلہ پست ہو جائے گا اور یہ سمجھیں گے کہ بڑی سخت قوم ہے، جان دینا تو ان کو آسان ہے مگر ان کا بھاگنا مشکل ہے۔ تو غلبہ کی صورت میں بھی مغلوب ہو جانے کی صورت میں بھی۔ غرض دونوں صورتوں میں مسلمانوں کی ہیبت کفار کے دلوں پر بیٹھ جائے گی اور آئندہ جنگ کرنے کا حوصلہ نہ کریں گے۔ اس واسطے فرار کو منع فرمایا ہے۔ جب جہاد سے فرار کے منع ہونے کی وجہ معلوم ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ طاعون جہاد کی طرح ہے تو اب طاعون سے فرار کے منع ہونے کی وجہ سنیے۔ وہ یہ کہ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ طاعون شیاطین کے طعن اور ایذا سے ہوتا ہے اور حق تعالیٰ نے شیاطین کو کچھ قدرت دے رکھی ہے کہ مسلمانوں کو ایذا دے سکیں۔ جیسا قرآن میں ہے: رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ (میرے پروردگار! شیطان نے مجھ کو رنج اور آزار پہنچایا ہے) باقی اور نصوص سے بھی معلوم ہوتا ہے تو گویا طاعون بھی کفار و شیاطین سے ایک قسم کی جنگ ہے اور طاعون سے بھاگنے میں شیاطین کو حوصلہ ہو جائے گا کہ مسلمان ہم سے ڈر گئے اور آئندہ سے ایذا دینے اور اغوا کرنے کا حوصلہ ان کا بڑھ جائے گا۔ اسی واسطے وہیں رہنا چاہئے جہاں طاعون ہے۔ بھاگنا نہ چاہئے، تاکہ شیاطین کا حوصلہ نہ بڑھے۔ پس بعض علماء نے (مثلاً درمختار میں) جو یہ لکھا ہے کہ اگر اعتقاد فاسد نہ ہو تو بغرض علاج وہاں سے چلا جانا جائز ہے۔ جب کہ یہ نیت ہو کہ یہ جانا بطور علاج ہے اور موت و حیات اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے، البتہ جبکہ یہ نیت نہ ہو کہ جب جائیں گے تب بچ جائیں گے اور رہ جائیں گے تو مر جائیں گے۔ تو اس صورت میں جانا جائز نہیں۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ورنہ صاحب مذہب سے یہ منقول ہے، یہ متاخرین کا استنباط ہے، کیونکہ اس تقریر سے تو ہر بیماری سے جانا منع ہونا چاہئے، کیونکہ فساد اعتقاد ہر حال میں ممنوع ہے اور میری اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ طاعون میں علاج کرنا جائز ہے،

کیونکہ جب طاعون جہاد کی طرح ہے تو جہاد میں فرار کے سوا باقی سب تدابیر جائز ہیں، جیسے اسلحہ گولہ بارود ہر قسم کا انتظام۔ اسی طرح طاعون میں بھی علاج اور ہر طرح کا انتظام کیا جائے۔ مگر یہاں بھی بھاگنا جائز نہیں تاکہ شیاطین کو حوصلہ اور ہمت نہ ہو اور شیاطین کے مقابلہ میں قوت کے مطلوبیت کی طرف قرآن میں بھی اشارہ ہے۔ مگر لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے حصر کے الفاظ سے فرمایا ہے: اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ (اس کا قابو تو ان ہی لوگوں پر ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں) اور عجیب بات ہے کہ اور لوگوں کا غلبہ تو اپنے دشمنوں پر ہوتا ہے مگر شیطان کا غلبہ اپنے ہی دوستوں پر ہوتا ہے۔

شیطان سے بچنے کی صورت:

بس شیطان سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ اس سے دشمنی رکھے اور اس سے نہ ڈرے (اسی سلسلہ میں ابن عطا سکندری کا نقل کیا ہوا ایک واقعہ ذکر فرمایا) کوئی بزرگ ایک پاڑی میں رہتے تھے۔ ایک شخص ان کی زیارت کو گیا۔ اس نے غار کے باہر سے سنا کہ انہوں نے اعوذ پڑھی اور پڑھ کر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد فرمانے لگے کہ اے شیطان تو خوش ہوا ہوگا اور یہ سمجھتا ہوگا کہ میں تجھ سے ڈرتا ہوں اور تجھ سے ڈر کر ایسی بڑی ذات کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں، ہرگز نہیں۔ تو میرا کیا کر سکتا ہے اور تو ہے ہی کیا۔ میں نے اعوذ صرف اس واسطے پڑھی ہے کہ میرے مالک کا حکم ہے۔

وساوس کا علاج:

اس کے بعد فرمایا وساوس کا علاج یہی ہے کہ شیطان کو کہہ دے کہ جا تو جو چاہے کر۔ جب وسوسہ میں گناہ نہیں تو میں ان کی کچھ پروا نہیں کرتا ؎

آں خداونداں کہ رہ طے کردہ اند ... گوش بابانگ سگاں کے کردہ اند

(وہ لوگ جو راستہ طے کر رہے ہیں کتوں کی آواز پر کان نہیں لگاتے)

شاہجہان پور میں ایک وعظ میں میں نے یہی کہا تھا، تو ایک آدمی دوسرے دن آیا، بہت دعا دینے لگا اور بہت خوش ہوا۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا میں ہر روز ہزار بار درود شریف پڑھتا تھا مگر رات کو گوہ، موت، کتے، خنزیر اور بری بری چیزیں نظر آتی تھیں اور جس دن نہیں پڑھتا تھا اس دن خیر ہوتی تھی۔ اس وجہ سے میں نہایت پریشان تھا اور خیال ہوتا تھا کہ درود چھوڑ دوں۔ آپ کے وعظ سننے کے بعد میں نے شیطان سے کہہ دیا کہ تو خواہ کچھ بھی کر، خواہ گوہ میرے منہ میں ڈال دے تب بھی میں درود نہ چھوڑوں گا۔ اس کے بعد میں نے خوب درود شریف

پڑھا، کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس واسطے جی نہایت خوش ہے (اور فرمایا) طاعون چونکہ من وخزالجن ہے اور جن وبھوت وغیرہ اذان سے بھاگ جاتے ہیں، کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے: **اذا تغولت الغیلان ناوی بالاذان** (مجمع الزوائد ۱۰:۱۳۴) (جب دیو پریت کا غل غپارہ ہو تو اذان پکارو) ان دونوں حدیثوں کو ملا کر بعض نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ طاعون کے موقع پر اذان کہی جائے۔ میں ان لوگوں سے دریافت کرتا ہوں کہ اگر اذان پنجگانہ کافی ہے تو دوسری اذان کیوں کہتے ہو۔ اگر وہ کافی نہیں اس لئے کہ اس کے ختم پر پھر جن چلے جاویں گے تو دوسری بھی کافی نہ ہوگی، کیونکہ جب اذان کہوگے جن چلے جائیں گے، جب ختم کروگے پھر واپس آجائیں گے۔ پھر فائدہ ہی کیا۔ نیز حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جب غول متشکل ہوں اور تم کو نظر آئیں تو اس وقت اذان کہو اور طاعون میں چونکہ معلوم نہیں ہوتے اور نظر نہیں آتے تو اذان بھی اس حدیث کا مدلول نہ ہوگی۔

مقام طاعون میں جانے سے مفسدہ:

(اس جگہ ایک مولوی صاحب نے عرض کیا) کہ جب طاعون جہاد کی طرح ہے تو طاعون میں جانا بھی جائز ہوتا، بلکہ ثواب ملتا جیسے جہاد میں جانا۔ تو پھر طاعون کے موقع پر جانا کیوں جائز نہیں (جواب عنایت فرمایا) کہ یہ سوال کام کا ہے، جواب یہ ہے کہ جہاد کے موقع پر جانا اس واسطے جائز بلکہ اولیٰ ہے کہ کفار کے دفع میں مفید ہے اور طاعون کے موقع پر کچھ مفید نہیں۔ اس واسطے جانا جائز نہیں ہے کہ عبث ہے (ایک اہل علم نے عرض کیا) کہ مقام طاعون میں جانے کا بھی ایک فائدہ ہے، وہ یہ کہ شیطان کا حوصلہ پست ہوگا کہ یہ ایسے نڈر ہیں کہ ایسی جگہ آگئے (فرمایا) اس کا جواب پہلی تقریر میں نہیں دیا تھا، اب دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ مقام طاعون میں جانے کی صورت میں مفسدہ بھی ہے اور مصلحت بھی اور مفسدہ ومصلحت جب دونوں جمع ہوں تو مصلحت کی رعایت نہیں کی جاتی، بلکہ مفسدہ کا لحاظ رکھا جاتا ہے (اگر مطلق مصلحت کا لحاظ کیا جاوے تو ہر معصیت جائز ہونا چاہئے، کیونکہ اس میں کچھ نہ کچھ مصلحت ضرور ہے) اور وہ مفسدہ یہ ہے کہ ایسی جگہ جانا صورتاً جرأت علی اللہ اور جہاد میں اسباب موجود نہ ہوں اور ہلاکت کا خطرہ غالب ہو تو فقہاء نے جانا منع لکھا ہے، کیونکہ اگر کوئی فائدہ بھی ہو مگر مضرت کا گمان غالب ہے اور اعتبار مفسدہ کا ہوتا ہے اور اسی سبب سے فقہاء نے لکھا ہے سلطان جائر اگر مسلمان ہو تو اس کو تو خوف قتل میں بھی تبلیغ جائز ہے اور اگر کافر ہو تو اس کو جائز نہیں، کیونکہ اول صورت میں فائدہ ہے۔ چونکہ سلطان جائر مسلم ہے اس لئے اس کے دل پر بعد میں اس کا اثر ضرور ہوگا اور کافر کے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا۔ تو کافر کی تبلیغ میں فائدہ نہ ہوا مسلم کی تبلیغ میں فائدہ ہوا۔

طاعون میں دو حیثیتیں:

اس ارشاد سے احقر کا ذہن اس طرف گیا کہ طاعون میں دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جہاد کے مشابہ ہے، کیونکہ شیاطین کا اثر ہے اور **وخز من الجن (المستدرک للحاکم ۱:۵۰)** (جن کا طعن) ہے، اس لحاظ سے جہاں پر طاعون ہو وہاں سے فرار حرام ہے اور دوسری حیثیت یہ کہ کفار اور عصاۃ کے لئے ایک گونہ عذاب ہے، جیسا کہ ابتداء میں بنی اسرائیل کے لئے طاعون عذاب ہو کر آیا تھا۔

خلاصہ کلام:

تو اس دوسری حیثیت پر لحاظ کرتے ہوئے جس مقام پر طاعون ہو وہاں جانا صورۃً جرأت علی اللہ ہے کہ حق تعالیٰ کے عذاب کی کچھ پروا نہیں کرتا، حالانکہ موقع عذاب سے دور رہنا اور بچنا مطلوب شرعی ہے۔ چنانچہ عاد و ثمود کے مواقع عذاب میں جانے سے ممانعت ہے اور اگر بضرورت جانا پڑے تو وہاں سے جلدی روتے ہوئے نکل جانا چاہئے۔ **وکذا ورد فی بطن محسر انہ صلی اللہ علیہ وسلم اسرع المرور فیہا واللہ اعلم** (ایسے بطن محسر کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیزی سے گزر گئے، واللہ اعلم) تو اس سے معلوم ہوا کہ طاعون کے مقام پر نہ جانا جائز نہ وہاں سے بھاگنا جائز (از جامع)

انتھی الملفوظ

تمت

(قارئین سے استدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا فرماویں کہ ناشر کی مساعی دینیہ کو قبول فرماویں اور مقبولانِ حق کے ساتھ محشور فرماویں، آمین بحرمتہ سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم)

دَوَاءُ الْعُیُوبُ

المعروف بہ

شامِ خورشید

یہ وعظ ۴ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ بمقام صدر مقام حاجی وجیہ الدین صاحب میرٹھ حضرت والا نے ارشاد فرمایا جس کو حضرت مولانا حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوریؒ نے قلم بند فرمایا۔ سامعین کی تعداد بالقصد مجمع زنانہ مردانہ تقریباً ۵۰ تھی۔

اصلاح کے لئے ایک مراقبے کی تعلیم وہ یہ کہ عمر کے جلد جلد گزرنے اور ختم کو ہر وقت پیش نظر رکھے اور ہر وقت کو آخری وقت سمجھے۔

خطبہ ماثورہ

اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم.

اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ (سورۃ فاطر: ۳۷)

ترجمہ: کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہ دی جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کرے اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی آ چکا تھا۔

اعادۂ عمر سے امیدِ اصلاح:

یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے۔ مجھے صرف اتنے ہی جزو کو بیان کرنا ہے۔ اسی واسطے پوری آیت نہیں پڑھی۔ اس میں حق تعالیٰ کی طرف سے ایک خطاب ہے جو قیامت میں ان لوگوں سے ہوگا جو تمنا کریں گے کہ اگر ہم کو دنیا میں دوبارہ بھیج دیا جاوے تو اب کے ہم ایسے عمل نہ کریں گے جیسے اس مرتبہ کئے، جواب ملے گا: اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ کیا ہم نے اتنی عمر تمہیں نہیں دی تھی جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کرلے۔ چنانچہ جن لوگوں نے دنیا میں ہدایت پائی ہے ان کو بھی اتنی ہی عمر ملی تھی۔ ثابت ہوا کہ عمر کے اعادہ سے یہ اُمید رکھنا کہ اعمال دوسرے ہوسکیں گے غلط ہے۔ جس نے اعمال دوسرے کرلئے تھے اس نے اسی ایک عمر میں کرلئے اور تم نے غفلت میں عمر کھودی۔ پس جو سبب معصیت کا اس عمر میں موجود تھا اور جو مانع ہوا اعمال صالحہ اور ہدایت سے یعنی غفلت وہ اگر دوبارہ بھی قائم رہا تو جتنی بھی عمریں ملتی جاویں گی اس سبب کا اثر بھی ساتھ ساتھ رہے گا یعنی ہدایت نہ ہوگی۔ اس لئے یہ درخواست مسموع نہ ہوگی۔ اس کے بعد ارشاد ہوا وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ (یعنی ڈرنے والا بھی تمہارے پاس آ چکا جو تم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے والا تھا۔

نذیر کی تفسیر:

نذیر کی تفسیر میں گفتگو ہوئی۔ ایک قول یہ ہے کہ نذیر سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور نائبین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن سے تبلیغ احکام الٰہی ہوتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے جو ایک حدیث کے موافق ہے۔ گویا وہ حدیث اس کی تفسیر کرتی ہے کہ نذیر بڑھاپا ہے خواہ اس حدیث کے یہ معنی ہوں کہ آیت میں نذیر سے مراد یہی ہے خواہ حدیث میں تمثیلاً بڑھاپے کو بھی نذیر فرما دیا گیا۔ بہرحال تمثیلاً ہو یا تعیناً، یہ ضرور ثابت ہوا کہ بڑھاپا بھی ڈرانے والا ہے۔ تو آیت کے یہ معنی ہوئے کہ جوانی تو کھوئی ہی تھی، بڑھاپے میں بھی تمہاری غفلت نہ گئی اور آنکھ نہ کھلی کہ کچھ سامان آخرت کر لیتے۔ یہ خطاب عبارۃ النص سے خواہ کفار ہی کے لئے ہو مگر بدلالۃ النص خواہ بالقیاس باختلاف مراتب تمام ان اشخاص کے لئے بھی ہوسکتا ہے جو بناء خطاب یعنی غفلت میں شریک ہیں۔

ملامت ذرا خوف کی چیز ہے:

یہ مانا کہ اتنا فرق ضرور ہوگا کہ اعمالِ صالحہ میں کوتاہی کرنے والے کی غفلت مع سلامتی ایمان کے اس درجہ مضر نتائج کا موجب نہ ہوگی جتنی کافر کی غفلت ہوگی۔ اس کے لئے خلود فی النار نہ ہوگا لیکن ملامت تو ذرا سی بھی بہت ہے اور ملامت تو بڑی چیز ہے۔ لوگ تو نیک نامی نہ ہونے سے متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی نیک نامی اور نام آوری کے لئے کتنی کتنی کوششیں کرتے ہیں۔ ایک خان بہادری کے خطاب کے لئے ہزاروں روپیہ خرچ کرتے ہیں، سفارش اُٹھاتے ہیں۔ برسوں کارگزاریاں دکھاتے ہیں، حالانکہ خطاب حاصل ہونا کوئی ضرورت کی چیز نہیں اور اس کے عکس یعنی بدنامی سے بچنے کے لئے تو کس درجہ اہتمام کرتے ہیں، حتیٰ کہ بعض دفعہ بدنامی پر مرجانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بڑے بڑے عہدہ دار تمام عمر خائف و ہراساں رہتے ہیں۔ دعائیں مانگتے ہیں کہ خدا تعالیٰ آبرو سے مدت ملازمت گزار دے، کوئی دھبہ نہ لگ جاوے، جب خیریت سے پنشن مل جاوے تب اطمینان ہوتا ہے۔ یہ ملامت ہی کا خوف تو ہے، حالانکہ ہر بدنامی میں جیل خانہ یا کسی جسمانی سزا کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا، حالانکہ دنیا کی ملامت چیز ہی کیا ہے۔ چار دن سے زیادہ رہنے والی چیز نہیں۔ جب مر گئے تو بعد چندے کوئی یہ بھی جاننے والا نہیں رہتا کہ کون تھا اور کہاں گیا، لاکھوں ہوئے اور گزر گئے، نام تک بھی جاننے والا کوئی نہیں رہتا۔ نیک نامی اور بدنامی کیسی؟ مگر پھر بھی لوگ اس ذرا سی بدنامی سے بچنے کے لئے کتنی کوششیں کرتے ہیں۔ پس حقیقت

یہ ہے کہ ملامت ایسی ہی چیز ہے کہ تھوڑی ہو یا بہت اور موجب سزائے جسمانی ہو یا نہ ہو اس سے ڈرنا اور بچنا ہی چاہئے۔ تو مومن کو کافر کی سی ملامت نہ سہی مگر ادنیٰ سی ملامت بھی ملامت ہی ہے اور آخرت کا تو اھون بھی خدا بچائے اشد ہی ہے۔ ایک وقت کی نماز بھی اگر قضا ہو گئی ہے تو ہزاروں برس دوزخ میں رہنا ہوگا۔ تین پیسہ قرض کے رہ گئے ہیں تو سات سو مقبول نمازیں چھین لی جاویں گی۔ غرض مومن کی ملامت خواہ کافر کی ملامت کے پاسنگ بھی نہ ہو مگر بڑے خوف کی چیز ہے۔

ہر شخص غفلت کا شکار ہے:

تو اس بناء پر خطاب اولم نعمرکم علیٰ قدر مراتب ہر اس شخص کے لئے ہے جو مرض غفلت میں مبتلا ہے۔ یہاں کفار سے تو مجھے بحث کرنا نہیں، میری مخاطب اس وقت مؤمنین ہیں اور جو جس درجہ غفلت میں مبتلا ہے اسی قدر خطاب بھی اس کی طرف متوجہ ہے جو عقائد کی غلطی میں مبتلا ہے۔ اس سے اس کے مرتبہ کے موافق اور جو اعمال کی غلطی میں مبتلا ہے اس سے اس کے مرتبہ کے موافق علیٰ ہذا معاشرت، معاملات، اخلاق جس قسم کی بھی کوئی غلطی کر رہا ہے اسی قدر خطاب میں شدت وخفت ہوگی۔ ہم لوگ جس قدر غلطیوں میں مبتلا ہیں بیان کی احتیاج نہیں۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کسی غلطی یا کوتاہی میں مبتلا نہیں ہوں۔ خود حدیث میں آ چکا ہے: کلکم خطاؤن (سنن الترمذی: ۲۴۹۹) یعنی تم سب کے سب خطاوار ہو، تو پھر کس کا منہ ہے کہ خطا سے براءت کا مدعی ہو تو یہ خطاب بھی سب ہی کی طرف متوجہ ہوگا اور مؤمنین کے سامنے اس قیامت کے واقعہ کو نقل کرنے سے حق تعالیٰ کا مقصود بھی ہے کہ مؤمنین چونک جاویں اور کفار کے اس واقعہ کو سن کر نصیحت پکڑ لیں اور یہ سنانا تمہیں قانون کا اور سلطنت کے جبروت کا علم نہ تھا کہ یہ فعل جرم ہے اور سلطنت کے قبضہ سے تم بھاگ نہیں سکتے ہو جو اس کا ارتکاب کیا، اب سزائے موت چکھو۔ اس جملہ سے اس مجرم کی نصیحت مقصود نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا تو اب خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کی نصیحت سے کیا نفع، بلکہ دوسروں کو متنبہ کرنا ہوتا ہے کہ جرم ایسی چیز ہے تاکہ وہ اس سے بچے اور یہ عامہ رعایا کے لئے باعث رحمت ہے، کیونکہ آئندہ کے لئے انسداد جرائم کا موجب ہے۔ حق تعالیٰ نے وہ خطاب جو کفار سے قیامت میں ہوگا قیامت سے پہلے ہی مؤمنین کو سنا دیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کر لیں اور ان کی طرح عذاب و ملامت میں نہ پڑیں۔ تو یہ بڑی رحمت ہوئی مؤمنین کے لئے بشرطیکہ اس سے کام لیں۔

اصلاح کے لئے ایک مراقبہ:

اس میں حق تعالیٰ نے اصلاح کے لئے ایک مراقبہ کی تعلیم فرما دی، وہ یہ ہے کہ عمر کے جلد جلد

گزرنے اور ختم ہونے کو ہر وقت پیش نظر رکھے اور ہر وقت کو آخری وقت سمجھے۔ یہ ہے خلاصہ تمام میری تقریر کا اور اجمال ساری تفصیل کا۔ اب سمجھئے بڑھاپا نذیر یعنی ڈرانے والا کیونکر ہے۔ یہ نذیر اس طرح ہے کہ سفید بالوں سے موت کی خبر آتی ہے، کیونکہ عمر کے حصے کبھی کبھی تین ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی کا لفظ اس واسطے کہا ہے کہ دواماً تین نہیں ہوتے۔ خصوصاً اس زمانہ میں کہ جوان موتیں بکثرت ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب جوان موت سے بھی ہم لوگوں کو تنبیہ نہیں ہوتا۔ ورنہ پہلے کہیں جوان موت ہو جاتی تھی تو تمام بستی میں غل مچ جاتا تھا اور کم وبیش سب متاثر ہوتے تھے اور اب عادت سی ہوگئی، تاہم عرفاً جو حصے مانے جاتے ہیں تین ہیں۔ ایک تو لڑکپن کا اور ایک جوانی کا اور ایک بڑھاپے کا۔ پہلے دو حصوں میں یعنی لڑکپن اور جوانی میں تو کسی درجہ میں توقع ہوتی ہے کہ بہت عمر پڑی ہے۔

ندامت ہونا غیر اختیاری ہے:

توبہ وطاعات کے لئے ابھی کیا جلدی ہے اور آدمی لیت ولعل کرتا رہتا ہے اس امید پر کہ آئندہ توبہ کرلوں گا، گو یہ توقع مہمل ہے کیونکہ عمر کا طویل ہونا اختیاری بات نہیں صرف ایک ضعیف سا احتمام ہے کہ عمر ممتد ہوگی جب اپنے قبضہ کی بات نہیں اور دوسرے کے قبضے کی بات ہے تو اس پر مہالک کی بناء کرنا یعنی گناہ کرنا مستحق جہنم بننے کو گوارا کر لینا صرف اس خیالی بات پر کہ آئندہ اس کا تدارک کر لوں گا کس قدر بے عقلی کی بات ہے۔ گویا پھانسی کو گلے میں ڈال لینا ہے اس خیال پر کہ میرے زور کرنے سے رسی ٹوٹ جائے گی۔ مزید برآں یہ ہے کہ دنیا میں یہی تو نہیں ہے کہ اوسط کے حساب سے زیادہ آدمی بڑھاپے کی عمر کو پہنچتے ہوں بلکہ بڑھاپے کو نہ پہنچنا کثیر الوقوع ہے تو یہ شاذ ونادر کے حکم میں ہوا اور مثل مشہور ہے **النادر کالمعدوم** امر نادر پر کسی امر کی بنا نہیں کی جایا کرتی تو جب عمر کے امتداد بڑھاپے تک اپنے اختیار سے خارج اور محتمل محض بہر حال تجربہ اس کے خلاف کا ثبوت دیتا ہے یعنی اوسط بڑھاپے تک اکثر نہیں پہنچتا تو یہ توقع کس قدر مہمل ہوئی عاقل کو تو اس میں قدرت خدا نظر آتی ہے کہ قدرت نے کیسا آفتاب پر پردہ ڈالا ہے کہ جو بات دلیل سے محض موہوم اور تجربہ سے اس کا عکس متحقق ہو اس کے وجود پر مہالک کی بنا کی جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر عادت سے بھی اس کا وقوع ثابت ہو جائے کہ بڑھاپا بھی ایک لازمی حصہ عمر کا ہے اور اکثر انسان بڑھاپے کی عمر پا کر ہی مرتے ہوں تب بھی اس پر کسی کام کی بنا کرنا عجیب بات ہے کیونکہ یہ خواہ وقوعاً اکثر ہو مگر اسباب طبیعہ سے یہ مظنون نہیں ہے صرف ضعیف احتمال کے درجہ میں ہے تو یہ توقع محض نادانی ہوئی۔

انسان کی حیات اور بقاء قابل تعجب ہے:

بیان اس کا یہ ہے کہ انسان کے بدن کی ترکیب اضداد سے ہوئی ہے یعنی اربع عناصر سے اور یہ سب آگ اور پانی اور ہوا اور مٹی آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور بالطبع ایک دوسرے سے بعد اور علیحدگی کو چاہتے ہیں۔ دیکھئے پانی میں مٹی ڈال دیجئے، نیچے بیٹھ جائے گی یہ نہ ہوگا کہ مل جاوے ہوا میں پانی گراؤ، ہوا اوپر اور پانی نیچے ہو جاوے گا اور آگ تو سب سے اوپر ہونا چاہتی ہے۔ قدرت خدا ہے کہ بدن میں چاروں چیزیں یکجا موجود ہیں اور تعجب کی بات ہے کہ اضداد سے ایک چیز مرکب ہے اس کو قسر قاسر کہتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ ایسے مرکب کا اصل اقتضاء ہلاک اور تحلل ترکیب ہی ہے تعجب اگر ہو سکتا ہے تو اس کے بقاء سے ہو سکتا ہے نہ کہ فنا سے، فنا تو ہر وقت اس کے سر پر کھڑی ہے تو اگر عمر کا بڑھاپے تک امتداد اکثری درجہ تک بھی مان لیا جاوے تب بھی اس وجہ سے کہ یہ امتداد خلاف قاعدہ ہے اور خطرہ کی حالت میں ہے اس لئے اس قابل نہیں کہ اس پر کسی امر کی بناء کی جائے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بہت سے علاج عوام میں ایسے رائج ہیں کہ ان سے دن رات کا کام لیا جاتا ہے اور مفید ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ قواعد طبعی کے خلاف ہیں تو اس وجہ سے کہ ایک کثیر تعداد انسانوں کی اس کو استعمال کرتی اور فائدہ اٹھاتی ہے۔ عامی آدمی اس پر اعتماد کر لیتا ہے لیکن جب وہ علاج اہل عقل اور ماہرین فن کے سامنے پیش کیا جاتا ہے وہ اس کو رد کر دیتے ہیں اور کبھی جرأت اس کے استعمال کی نہیں کرتے، وجہ کیا؟ صرف یہ کہ وہ قواعد کے خلاف ہے تو باوجودیکہ تجربہ کی شہادت کے محض مخالف قواعد کی وجہ سے اس کا نافع ہونا درجہ ظن سے گر گیا۔ ایسے ہی اگر یہ بات ثابت ہو جاوے کہ بڑھاپا بھی باعتبار عادت کے وقوعاً اکثر ہی ہے تب بھی قواعد پر نظر کرنے سے ظنی نہ رہے گا بلکہ صرف مشکوک بلکہ موہوم رہ جاوے گا اور اس پر بھروسہ کر لینا اور اعمال اُخروی کو اس پر محمول کرنا عقل کا کام نہ ہوگا یہ گفتگو تو محض ترکیب جسمانی کے اعتبار سے ہے کہ تعجب ہے کہ اس کا وجود ہی کیونکر ہوا جبکہ تمام اجزاء اس کے باہم متنافر ہیں اور جب اس کی بقا کی طرف نظر ڈالیں تو اور تعجب در تعجب ہوتا ہے۔ مان لینا کہ ایک دفعہ آپ کا وجود خواہ کسی طرح سے بھی ہو موجود ہو گیا لیکن تعجب اس کے بقاء میں ہے کہ جس کی ایک وجہ تو ترکیب من الاضداد ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان دونوں وقت بدن کے باقی رکھنے کے لئے جو کام کرتا ہے وہ سب بقا کے خلاف ہیں۔ مثلاً کھانا ہی کھاتا ہے تو ذرا اس میں غور کر کے دیکھئے عادت ہو جانے سے ذہول ہو گیا ہے ورنہ کھانا

کھانے کے جتنے اجزاء ہیں سب درحقیقت بقاء کے سامان نہیں فنا کے سامان ہیں کیونکہ کھانا کھانے کی حقیقت یہ ہے کہ غذا کو تھوڑا تھوڑا منہ میں رکھے اور پیٹ میں جانے دے، اس کے لئے سب سے اول اس کی ضرورت ہے کہ لقمہ گلے سے اتر جائے اور سب سے پہلا ہی فعل غیر اختیاری ہے کیونکہ ان حضرات کو یہ بھی خبر نہیں کہ لقمہ گلے سے کیسے اتر جاتا ہے۔ حلق میں دو سوراخ ہیں۔ ایک مجرائے نفس یعنی سانس کی نالی اور ایک مجرائے طعام یعنی کھانا پانی اترنے کا راستہ، ہمیں یہ بھی خبر نہیں کہ کھانا کیونکر اترا، کس طرف کو گیا؟ مگر سانس برابر اپنے راستہ سے آتا ہے اور کھانا پانی اپنے راستہ سے جاتا ہے۔ کھانے والا تو اپنے ارادہ سے لقمہ کو نیچے لے جاتا ہے اور یہ فضل خداوندی ہے کہ وہ مجرائے نفس میں نہیں جاتا، بالاضطرار اپنے مجرا کو چلا جاتا ہے۔ انسان اپنے ہاتھوں تو مرنے کا سامان کرتا ہے کیونکہ اس نے اپنے ارادہ سے حلق کی طرف سے نیچے کو لقمہ سرکا دیا۔ اب یہ بات کہ لقمہ سانس کے مجرا کو نہ جاوے اس میں اس کے فعل کو کچھ بھی دخل نہیں۔ اگر ادھر کو چلا جاوے تو کچھ بعید نہیں، تعجب کیا ہے اور ادھر کو چلا جانا موت ہے۔ حق یہ ہے کہ اگر کرم خداوندی نہ ہو تو ایک لقمہ بھی پیٹ میں نہیں جا سکتا بلکہ مارنے کے لئے بہت کافی ہے۔

کھانا کھانے میں دو احتمال:

غرض کھانا کھانے میں دونوں احتمال برابر ہیں کہ یا تو ہلاکت کا سامان ہے یا بقاء حیات کا اور محتمل الضرر کام کا اختیار کرنا ہلاکت کا اختیار کرنا کہلاتا ہے۔ دیکھو ڈاکو ڈاکہ ڈالتے ہیں اس میں دونوں احتمال ہوتے ہیں کہ یا تو کامیابی رہی اور اپنی مرضی کے موافق مال ہاتھ آیا اور یا پکڑے گئے تو مارے گئے تو دیکھ لیجئے کہ کوئی عقلمند آدمی ایسے فعل کو اچھا نہیں کہتا بلکہ جب ڈاکو پکڑا جاتا ہے تو سرزنش کرتے ہیں کہ اپنے ہاتھوں میں برباد ہوا حالانکہ اس نے اپنی بربادی کبھی نہیں چاہی صرف ایک فعل محتمل الضرر کیا ہے جب محتمل الضرر کا کرنا اپنے کو ہلاک کرنا ہے اور کھانا کھانے میں بھی ہلاکت کا اہتمام ہے تو ثابت ہوا کہ انسان تو دونوں وقت اپنی ہلاکت کا سامان کرتا ہے لیکن حق تعالیٰ اپنی عنایت سے اس کو بقا کا سامان کر دیتے ہیں۔ حیرت ہے کہ جو شخص روزانہ دو دفعہ موت کے منہ میں خود جاتا ہو وہ بڑھاپے کا خواب دیکھے، اگر کوئی کہے کہ لقمہ اُتارنا اور نگلنا تو ہمارے اختیار میں ہے اضطراری ہونا کیا معنی تو اس کی تکذیب اس طرح کی جائے گی کہ صدور بالاختیار ہمیشہ مسبوق بالعلم ہوتا ہے یعنی جب ہم کسی فعل کو اختیاری کہیں تو اس کے صدور کے قبل لازم ہے کہ اس

کا اور اس کے ذرائع کا اول علم بھی ہو مثلاً ہم کہیں کہ ہم بازار گئے تھے تو بازار جانا اختیاری جب کہا جاوے گا کہ ہم کو بازار کے راستہ اور بازار کا علم پہلے سے ہے اور اگر کوئی ہم کو اٹھا کر ایسے بازار میں پھرا لایا جس کو ہم نے کبھی دیکھا بھی نہیں تو اس کو اختیاری فعل نہ کہیں گے بلکہ اضطراری کہیں گے اور یہ نہ کہیں گے کہ ہم بازار گئے تھے بلکہ یوں کہیں گے کہ فلانا ہم کو لے گیا تھا۔

حق سبحانہ وتعالیٰ کی بے انتہا شفقت:

اب ہم پوچھتے ہیں کہ اگر غذا کو پیٹ میں پہنچا لینا امر اختیاری ہے تو مدعی یہ ہی بتا دے کہ وہ سوراخ جس میں سے ہو کر کھانا اترتا ہے کون سا ہے۔ بجز علم طب جاننے والے کے کوئی بھی نہیں بتا سکتا اور طبیب کہتے ہیں و العبرۃ للاکثر مسلم قاعدہ ہو تو جبکہ مجرائے طعام کا ہم کو علم بھی ہے کہ مجرائے عظام کون سا ہے ان کے قبضہ میں بھی یہ بات نہیں کہ کھانا دوسرے مجرا میں نہ جانے پاوے۔ غرض غذا کو نگلنا قصد و اختیار سے ہرگز نہیں بلکہ اضطرار محض، پس انسان اپنے اختیار سے ایسا کام کرتا ہے جس میں اہتمام ہلاک موجود ہے یہ تو اپنے ہاتھوں دن میں دو وقت دونالی بندوق سے اپنے اوپر فائر کرتا ہے مگر حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس کو اس سے بچا لیتے ہیں ورنہ فی نفسہٖ یہ طریقہ ایسا خطرناک ہے کہ اگر پیٹ میں غذا پہنچانے کی کوئی اور ترکیب بھی عادۃً ہوتی اور اس کے بعد امتحان کے لئے کسی خاص ایک انسان میں یہ طریقہ بتلایا جاتا کہ دیکھو یہ منہ ہے اور اس کے منتہا پر دو سوراخ ہیں ایک سوراخ ہوا کی آمد و رفت کا ہے اور دوسرا کھانے کے اترنے کا اور اس دوسرے سوراخ میں کھانے کا اتر جانا ایسا خطرناک ہے کہ فوراً موت ہے پھر اس کے بعد اس سے نگلنے کی فرمائش کی جاتی اور اس کا اعلان بھی ہو جاتا تو باللہ العظیم یہ ایسا عجیب واقعہ ہوتا کہ دور دور سے لوگ دیکھنے کو اور تماشہ کو جمع ہوتے اور بالیقین کہا جاتا ہے کہ جس انسان کے لئے یہ صورت تجویز ہوتی جس وقت اس سے کہا جاتا کہ منہ میں لقمہ رکھ کر پیچھے کو سرکا اور اس کو یقین دلایا جاتا کہ لقمہ پہلے سوراخ کے مجرا پر صرف گزر جائے گا دوسرے سوراخ میں ہرگز نہ جاوے گا تو اس کا اطمینان کرتے اس کی مارے خوف سے وہ حالت ہوتی جیسے ایک شخص سے کہیں کہ تختہ پر کھڑا ہو کر پھانسی گلے میں ڈال لے اور یہ اطمینان رکھ کہ پھانسی گلے کو دبائے گی نہیں، تو وہ کانپے گا اور واللہ باللہ اپنے اختیار سے تو کبھی بھی اس فعل کو نہ کرے گا ایسی ہی حالت لقمہ نگلنے والے کی ہوتی ہے مگر حق تعالیٰ کی نعمتوں اور فضل و کرم کا کیا ٹھکانا ہے کہ ایسے نازک کام کو کس خوبی سے انجام دیا ہے اور ایک دفعہ نہیں تمام عمر کے لئے نگلنے کا طریقہ ہر وقت کے لئے بھی قرار دے دیا جو عیب تماشہ کے قابل

بات تھی حتیٰ کہ اس عادت مستمرہ سے انسان یہ سمجھنے لگا کہ نگلنا تو کچھ بھی خطرناک بات نہیں اور ہمارا اختیاری فعل ہے باعث حیات ہے نہ کہ باعث ہلاک، دونوں وقت کھانا کھاتا ہواور کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ میں نے کیا کیا تھااور ہو کیا گیا۔ صاحبو! ہم اپنے ہاتھوں سے یہ ہلاکت کا کام کرتے ہیں مگرحق تعالیٰ اس کو باعث حیات کر دیتے ہیں۔ دیکھئے اس کی قدر جب معلوم ہوتی ہے جب کبھی پھندا لگ جاتا ہے۔ کیا مصیبت ہوتی ہے آنکھیں باہر نکل آتی ہیں دموں پر بن جاتی ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اپنے اختیار سے انسان ایسی تکلیف مول لیتا ہے اگر اختیاری بات ہوتی تو پھندا کیوں لگنے دیتااس شخص کو تھانہ بھون میں ایک تقریب میں ایسا پھندا لگا کہ دم کے دم میں مر ہی گئے۔ تمام مجلس دعوت کی مکدر ہوگئی اور سب خوشی ملیامیٹ ہوگئی۔ کیا یہ فعل اختیاری تھا؟

بندہ کا فعل صرف ارادہ ہے:

صاحبو! بندہ کا فعل صرف ارادہ ہے، آگے ہر فعل کا فاعل اور ہی ہے ان حالات کو دیکھ کر موٹی سی عقل والا بھی کہہ اٹھتا ہے کہ انسان بڑا مجبور اور ضعیف ہے جس زندگی پر ہم پھولے ہوئے ہیں وہ دو وقت ہمارے اختیار سے اس خطرہ میں ڈالی جاتی ہے۔ ہم دن میں دو وقت پھانسی لگاتے ہیں مگر حق تعالیٰ کا فضل وکرم مستمر ہے کہ تمام عمر وہ پھانسی اپنا کام نہیں کرتی۔

عادت مستمرہ کے اختیاری نہ ہونے کی مثال:

صاحبو! دیکھا ہوگا کہ ہم ڈاک میں خط ڈالتے ہیں اور وہ برابر پہنچتا ہے اور سینکڑوں ہزاروں دفعہ میں بھی شاید ایسا نہ ہوتا ہوگا کہ نہ پہنچے مگر کیا کبھی آپ کے دل میں یہ خطرہ بھی گزرا کہ ڈاک ہمارے اختیار میں ہے۔ ہرگز نہیں، تمہارا کام تو صرف خط ڈالنا تھا پہنچانا کسی اور کا کام ہے۔ بس ایسے ہی ان افعال کو سمجھ لیجئے کہ ارادہ اور کسب کے مرتبہ تک تو اختیاری ہیں اور اس کے بعد ثمرہ کے درجہ میں غیر اختیاری ہیں۔ پس عادت مستمرہ کو دیکھ کر سمجھ لینا کہ ہمارا فعل سبب حقیقی ہے نتیجہ کے وجود کا شخص غلطی ہے گو اس میں ایک دنیا مبتلا ہو مگر غلطی غلطی ہی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ تمام عمر یہ دیکھنے کے بعد بھی کہ خط لیٹر بکس میں ڈالنے سے پہنچ جاتا ہے یہ کبھی خیال نہیں ہوتا کہ لیٹر بکس میں یہ اثر ہے یا خط میں یہ اثر ہے یا ڈاک پہنچانا ہمارا اختیاری فعل ہے حالانکہ عادۃ مستمرہ کے رو سے خط لیٹر بکس میں ڈالنے پر ہمیشہ یہ نتیجہ متفرع ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دلیل مخالف کے ہوتے ہوئے عادت پر نظر کر کے کسی کو فاعل مختار قرار دے دینا ہرگز صحیح نہیں۔ یہ تو نگلنے کی حالت ہے کہ موت کا سامان ہے مگر حق تعالیٰ کی حفاظت سے حیات کا سامان بن جاتا ہے۔ اب اس کے بعد دیکھئے کہ غذا معدہ میں پہنچی سب جانتے ہیں کہ غذا معدہ میں کیوں پہنچائی جاتی ہے اس سے غرض بدل

ما تحلل کا پہنچنا یعنی بدن میں ہر وقت تحلیل واقع ہوتی رہتی ہے اگر اس کے بعد دوسرے اجزاء بدن میں شامل نہ ہوتے جاویں تو بہت ہی تھوڑے وقت میں بدن ختم ہو جائے تو غذا سے غرض یہ ہے کہ جزو بدن بانده اور یہ اس پر موقوف ہے کہ غذا بدن کے مجانس اور مشاکل ہو، جوتی میں اگر پیوند لگانا ہو تو کسی نے نہ دیکھا ہوگا کہ ایک لکڑی کا ٹکڑا اس میں باندھ دیا ہو اور جوتی درست ہوگئی بلکہ چمڑہ ہی سے اس کی مرمت ہو سکتی ہے تو بدن میں جن اجزاء سے پیوند لگانا ہے ان کا بدن کے مشابہ ہونا ضروری ہے تو آدمی اگر خون پیتا تب تو کسی درجہ میں یہ خیال ہو سکتا تھا کہ تحلیل شدہ خون مادہ بدن تھا اس کے مشاکل کو معدہ میں پہنچایا ہے یہ جزو بدن بن سکتا ہے گو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ اگر انسان خون بھی پیے تب بھی اس میں فعل طبیعت سے استحالہ ہو کر قابلیت جزو بدن بننے کی پیدا ہوتی ہے کما برهن علیه فی موضعه مگر خیر پھر بھی خون کو کچھ صورت مشاکلت تو بدن کے ساتھ ہے لیکن خون انسان کی غذا نہیں ہے بلکہ انسان ایسی چیز کو کھاتا ہے جس کو ذرا بھی مجانست بدن کیساتھ نہیں ہو سکتی۔ مثلاً روٹی دال چاول وغیرہ اور اسی کا خون بن جاتا ہے۔ اب بتلائیے یہ خون کون بناتا ہے؟ اگر خدا تعالیٰ نے معدہ میں قوت مستحیل کرنے کی اور جگر میں اخلاط بنا لینے کی نہ رکھی ہوتی تو یہ لقمے سب ویسے ہی رکے رہتے اور عجب نہیں کہ معدہ اور جگر کو پھاڑ ڈالتے۔ چنانچہ کبھی کبھی اس کو دکھلا بھی دیتے ہیں۔ بعض دفعہ معدہ اور جگر کی اس قوت کو کم کر دیتے ہیں تو کیا کیا مصیبتیں ہوتی ہیں۔ پیٹ میں درد ہوتا ہے، بند لگ جاتا ہے، ورم ہو جاتا ہے، پھوڑا بن جاتا ہے۔ وہ ایک لقمہ جو ہر روز غذا بنتا تھا آج بڑے بڑے ماہر طبیبوں اور ڈاکٹروں کے قابو میں نہیں آتا جزو بدن تو کیا کوئی بناتا اس کے نکال دینے اور بند کھول دینے پر بھی بعض وقت قدرت نہیں ہوتی اور تڑپ تڑپ کر آدمی مر جاتا ہے۔

قدرت خداوندی:

قدرت خداوندی ہے کہ ایسی چیز جو اس قدر پریشان کرنے والی اور غیر جنس ہے ہر روز دو وقت ہمارے پیٹ میں جاتی ہے اور بدل ما تحلل بنتی ہے اور ہم کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس وقت کیا استحالہ ہوا اور اس کے بعد کیا ہوا۔ کس قدر عجیب بات ہے۔ اب انصاف سے فرمائیے کہ ان اسباب کے ہوتے بقاء عجیب ہے یا ہلاک۔ ہلاکت تو ذرا بھی عجیب نہیں کیونکہ دو وقت روزانہ اپنے ہاتھوں اس کی تدبیر کی جاتی ہے۔ ہاں ان اسباب ہلاک کا الٹا اثر ہونا عجیب ہے تو انسان کا مرجانا تو عجیب نہ ہوا زندہ رہنا اور عمر کا امتداد بے شک عجیب ہوا تو اب یہ توقع کہ میری عمر زیادہ ہونے والی ہے اور یہ کہنا کہ وقت بہت ہے پھر عمل کر لیں گے جلدی کیا ہے یہ کہنا جوانی میں بھی لڑکپن میں بھی غلطی ہے مگر خیر بچپن اور جوانی میں تو کسی درجہ میں کچھ گنجائش بھی ہے اس وجہ سے کہ کبھی تو ایسا ہوتا

ہے کہ آدمی بڑھاپے کو پہنچ جاتا ہے اس لئے بچہ اور جوان کو کسی قدر احتمال ہوسکتا ہے کہ میری عمر کا ایک حصہ اور باقی ہے لیکن بڑھاپے کے بعد کون سی حالت آنے والی ہے جس کی توقع کی جائے کہ ابھی تو بوڑھاپا ہی آیا ہے اس کے بعد فلاں زمانہ آوے گا جو کچھ کرنا ہے آئندہ اس میں کرلیں۔ صاحبو! بڑھاپے کے بعد تو موت ہی ہے جو قاطع اعمال ہے اس لئے اگر بڑھاپے میں بھی وہی حالت رہی جو شباب میں تھی تو سخت افسوس کے قابل ہے۔ عارف شیرازی نے فرمایا:

شکست رنگ شباب وہنوز رعنائی　　　　درآں دیار کہ بودی ہنوز آں جائی

وہ رعنائی کیا ہے یہ خیالات ہیں امتداد عمر کی توقع اور اعمال میں کوتاہی کیا صاحبو اس نیند سے جاگنے اور اس نشہ کے دور ہونے کے لئے اسی وقت کا انتظار ہے جو حدیث میں وارد ہے **الناس نیام فاذا ماتوا انتبھوا** کہ لوگ سور ہے ہیں مر کر جاگیں گے۔ صاحبو! یادرکھو اس وقت کا جاگنا محض بے سود ہوگا اس سے پہلے ہی جاگ جاؤ سوا خیر وقت جاگنے کا بڑھاپا ہے اگر خداع نفس سے لڑکپن اور جوانی میں توقع امتداد عمر کا نشہ رہا تو بڑھاپے میں تو اس خداع کے چلنے کی بھی کچھ گنجائش نہیں کیونکہ اس خداع کی بنا اس پر تھی کہ ابھی عمر کے حصوں میں سے ایک یا دو حصہ باقی ہیں مگر اب تو یہ اخیر دور ہے اب یہ خداع کس بنا پر چل سکتا ہے ہم لوگوں کو کچھ تو ہوش سنبھالنا چاہئے۔ عمر برابر گزرتی چلی جارہی ہے اور جو وقت گزر جاتا ہے وہ اختیار سے خارج اور اتنا بعید ہو جاتا ہے کہ اس سے زیادہ کوئی چیز بعید نہیں **ما بعد مافات وما اقرب ماھوات** جس عمر کی توقع میں ہم لوگ بیٹھے ہیں وہ ایسی تیز رفتار ہے کہ اس کے اجزاء ہم پر برابر گزرتے چلے جاتے ہیں اور نظر بھی نہیں آتے۔ پس جو کام آئندہ کرنا ہے اس کی خبر اسی وقت سے لینا چاہئے کیونکہ زمانہ کے آئندہ اجزاء بہت جلد آنے والے ہیں اور جب آکر زمانہ حال میں شمار ہونے لگیں گے تو یک طرفۃ العین میں حال سے ماضی بن جاویں گے اور اتنے دور ہوجاویں گے کہ دنیا بھر بھی چاہے کہ ایک جزو کو اس میں سے جو ابھی ایک منٹ بلکہ ایک سیکنڈ پہلے موجود تھا پکڑ لے تو ممکن نہیں۔

مدت عمر قلیل ہے:

غرض عمر کے تینوں حصوں میں یعنی لڑکپن اور جوانی اور بڑھاپے میں سے بوڑھاپے کو یہ خاص امتیاز ہے کہ لڑکپن میں تو چنداں ہوش ہی نہیں ہوتا اور جوانی میں باوجود ہوش ہونے کے طبعاً آدمی کو یہ خیال ضرور رہتا ہے کہ عمر ایک ممتد شے ہے جس کا ایک حصہ ابھی باقی ہے لیکن بوڑھاپا آجانے کے بعد کون سے حصہ کا انتظار کیا جاسکتا ہے مگر آدمی میں طبعاً یہ غفلت رکھی ہوئی ہے کہ آئندہ زمانہ کو ممتد

اور طویل سمجھتا ہے حالانکہ یہ ایسی غلطی ہے کہ خود ہی اس کا غلط ہونا محسوس ہو جاتا ہے کیونکہ یہ بھی طبعی بات ہے کہ زمانہ ماضی کو ہیچ اور غیر ممتد سمجھتا ہے۔ گنوار سے گنوار...... سے بھی...... پوچھا جاوے کہ تمہاری عمر تو بہت ہوگی اور بڑا زمانہ تم نے دیکھا تو کہے گا اجی کیا دیکھا سب باتیں خواب و خیال ہوگئیں کل کی بات ہے کہ ہم بچے تھے اور جوان ہوئے اور یہ ہوا اور وہ ہوا ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ دوسرا مقدمہ یہ کہ اگر زمانہ کی حقیقت پر نظر کی جاوے تو ماضی و مستقبل میں کچھ فرق نہیں پس جب ماضی کو حقیر سمجھتے ہو تو مستقبل کو بھی حقیر سمجھو اور واقعہ بھی یہی ہے کہ زمانہ بہت ہی قلیل ہے اور نا قابل اعتبار چیز ہے اور اس میں ماضی و مستقبل میں کچھ تفاوت نہیں مگر کوئی مانع خارجی ہے جس کی وجہ سے مستقبل ہم کو بڑا اور ممتد دکھائی دیتا ہے جب اس خداع سے نفس نے اعمال سے انسان کو روک دیا پھر وہ مستقبل ماضی بن گیا تو اب اپنی واقعیت پر نظر آنے لگا اب اس کو طویل و ممتد دکھانے میں نفس کا کوئی نفع نہیں اس لئے اب سب باتیں خواب و خیال نظر آنے لگیں اور گزشتہ عمر ایک لمحہ جیسی معلوم ہونے لگی پس عاقل وہ ہے جو ماضی پر مستقبل کو قیاس کرے اور سمجھ لے کہ جیسے وہ خواب و خیال ہوگیا ایسے ہی آئندہ زمانہ بھی خواب و خیال سے زیادہ نہیں۔ غرض بوڑھاپا ایسا وقت ہے جو ختم عمر کی خبر لاتا ہے اور عمر کو واقعی حالت میں دکھاتا ہے کہ ساری عمر ایک لمحہ سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی اس واسطے آیت میں بوڑھاپے کا ذکر فرمایا کہ آج تم دنیا کی طرف تمنائے عود کرتے ہو حالانکہ تمہیں موت۔ سے پہلے یاددہانی بھی کرادی گئی تھی اور بڑھاپے میں عمر کی اصلی حالت دکھلا دی گئی تھی مگر تمہیں عقل نہ آئی اور اخیر عمر میں اعمال صالحہ نہ کیے اب اس تمنا سے کیا ہوتا ہے اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ بڈھوں ہی سے یہ خطاب ہے کیونکہ یہاں دو جملے مذکور ہیں۔

چھوٹی عمر بھی تذکر کیلئے کافی ہے:

ایک اولم نعمر کم ما یتذکر فیه من تذکر (اور کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کرتے) اور دوسرا جاء کم النذیر (اور تمہارے پاس ڈرانے والا بن کر آچکا تھا) اور دونوں میں عطف من قبیل **عطف الخاص علی العام** ہے، معنی یہ ہوئے کہ ہم نے تم کو اتنی عمر دی تھی جس میں تذکر ممکن تھا اور اتنی عمر ملنا جوانوں کو بھی عام ہے پھر اس میں بعض پر تو بوڑھاپا بھی آگیا پس مدار فائدہ نعمر کم ما یتذکر (کیا ہم نے تم کو ان کی عمر نہ دی) ہے نہ کہ جاء کم النذیر (اور تمہارے پاس ڈرانے والا بن کر آیا تھا) اس سے اس خیال کا رد ہوگیا کہ آیت کے مخاطب بوڑھے ہی ہیں جوان نہیں ہیں خوب سمجھ لینا چاہئے کہ ہر وہ شخص اس کا مخاطب ہے جسکو اتنی عمر دی

گئی ہو جو تذکر کے لئے کافی ہواور اس عمر کا بیان بھی اسی ما یتذ کر فیه من تذ کر کے ساتھ ساتھ ہو گیا کہ وہ تذکر کی کتنی عمر ہے سو یہ دیکھ لیا جائے کہ کس عمر کے لوگوں کو شرع نے مومن و متذکر ہونے کا مکلّف بنایا ہے سو بچہ کا ایمان تو معتبر نہیں اس کے یہ معنے نہیں کہ بچہ مومن ہو تو اس کو مومن نہ کہیں گے بلکہ یہ معنے ہیں کہ ابھی وہ غیر مکلّف ہے پس شرعاً بلوغ سے انسان احکام شرعیہ کا مخاطب ہوتا ہے تو معنے یہ ہوئے کہ ہم نے تم کو بلوغ کی عمر دی تھی جس میں سمجھنے والے بات کو سمجھ سکتے تھے، پھر تم کیوں نہیں سمجھے تم نے غفلت کیوں کی معلوم ہوا کہ سن بلوغ کو پہنچنا اولم نعمر کم کے خطاب کو کافی ہے اور بھی اصل فائدہ ہے ہاں خاص کر بوڑھوں کی حالت زیادہ افسوس کے قابل ضرور ہے کیونکہ وہ اولم نعمر کم کے خطاب کے ساتھ جاء کم النذیر (اور تمہارے پاس ڈرانے والا بن کر آ چکا تھا) کے خطاب کے بھی مخاطب ہو گئے اس لئے ان کی حالت خاصہ کو اس حالت عامہ کے بعد بیان فرما دیا یہ ایسا ہے کہ جیسے ایک چور تو وہ ہو کہ ضرورت وافلاس کی وجہ سے چوری کرے اور ایک مالدار ہے جو بے ضرورت محض شرارت وخباثت نفس سے چوری کرے تو کوئی اس سے کہے بھلے آدمی برے کام کا انجام نہ سوچا اور کچھ نہوت بھی تو تھی جو خواہ مخواہ اپنے پیر میں آپ کلہاڑی ماری اس جملہ کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ جس کو نہوت ہو اس پر چوری کرنے میں کچھ الزام نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ چوری تو ہر حال میں موجب الزام ہے خواہ ہوت ہو یا نہ ہوت ہو مگر ہوت کی صورت میں زیادہ الزام ہے اس سے خوب اچھی طرح سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ اولم نعمر کم (اور کیا تم کو اتنی عمر نہ دی) کے ساتھ جاء کم النذیر (اور تمہارے پاس ڈرانے والا بن کر آیا تھا) کو کیا تعلق ہے مواخذہ تو صرف بلوغ تک پہنچنے سے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ سمجھ آنے کے لئے بلوغ کا زمانہ یہی کافی ہے لیکن اگر بڑھاپے کی عمر کو بھی پہنچ جاوے تو مزید الزام کا مستوجب ہے، پس جوان بھی بحالت عدم تذکر اس خطاب سے بچ نہیں سکتے۔

جوانی اور بڑھاپے میں فرق:

اب اس مضمون کو ایک دوسرے عنوان سے سمجھئے وہ یہ کہ جوانی اور بڑھاپے میں فرق کرنے کی کیا وجہ جبکہ ہر جزو عمر میں یہ احتمال ہے کہ اخیر ہو، اگر ہو سکتا ہے تو صرف اتنا فرق کہ اور عمروں میں جیسے یہ احتمال ہے کہ یہ اخیر ہو ایسے ہی یہ بھی احتمال ہے کہ اخیر نہ ہو بلکہ اس حصہ کے ختم ہونے کے بعد دوسرا یا تیسرا حصہ بھی مل جائے اور بڑھاپے میں وہ دوسرا احتمال ہی نہیں کہ شاید یہ اخیر نہ ہو یہ توقع نہیں کیونکہ وہ یقیناً اخیر ہے۔ بس یہ فرق ہو سکتا ہے اور یہ فرق کسی درجہ میں ہے ضرور لیکن یہ فرق قابل اعتبار نہیں کیونکہ جب یہ احتمال تسلیم کر لیا گیا کہ شاید یہ اخیر ہو اور یہ احتمال مضرت کا

احتمال ہے اور عقلی قاعدہ ہے کہ مضرات میں بچنے کے لئے احتمال بھی کافی ہوتا ہے۔تمام دنیا کے کام اسی قاعدہ پر مبنی ہیں اپنے تمام افعال و اعمال کو دیکھ لیجئے ان کی بناء اسی پر ہوگی کہ ضرر محتمل کے دفع کا انتظام پہلے سے کیا جاتا ہے۔ دیکھئے بچہ جب تک ماں باپ کے پاس پرورش پاتا ہے اور خود اپنا گھر الگ نہیں کرتا ماں باپ اسی وقت سے اس کو کسب معاش کے لئے پڑھانا لکھانا شروع کرتے ہیں حالانکہ اس وقت اس کو روپیہ کمانے کی ضرورت بھی نہیں ہے مگر اس احتمال ضرر کی وجہ سے پڑھاتے لکھاتے ہیں کہ خود گھر کرنے کے وقت اگر اس کو ضرورت پڑی تو کام کیسے چلے گا اور یہ نقصان اور تکلیف اٹھائے گا۔ دیکھئے ضرر محتمل کے لئے کتنے پہلے سے انتظام ہوتا ہے اور ایک بہت ہی موٹی سی نظیر کیواڑ اور قفل اور پہرہ دار ہیں کہ حفاظت کے لئے ان چیزوں کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے کیواڑ اسی وقت سے لگائے جاتے ہیں جب سے کہ مکان بنتا ہے چاہے ابھی برسوں رہنے کا بھی ارادہ نہ ہو اور پہرہ دار خزانہ کے پاس اسی وقت سے مقرر کردیئے جاتے ہیں جس وقت سے خزانہ رکھنے کا ارادہ ہوتا ہے گو ابھی رکھا نہ ہو رکھنے سے پہلے اس کا انتظام کرلیا جاتا ہے اور بعد میں خزانہ رکھا جاتا ہے حالانکہ یقینی بات ہے کہ اس وقت ضرر یقینی نہیں محض درجہ احتمال میں ہے کہ شاید وقت پر انتظام نہ ہوسکے مگر اس ضرر محتمل کو یقینی کی جگہ سمجھ کر حفاظت کا سامان کیا جاتا ہے۔ کسی کو یہ نہ دیکھا سنا ہوگا کہ کیواڑ مکان میں چوری ہونے کے وقت لگائے ہوں جب چور گھر میں گھس آئے تو کواڑ کیا کام دیں گے بیوقوف سے بیوقوف بھی جب مکان بناتا ہے تو چاہے برسوں رہنے کا بھی ارادہ نہ ہو تب بھی کواڑ تعمیر کے ساتھ ہی لگا دیتا ہے گویا کواڑ مکان کی تعمیر کا جزو ہے۔ دیکھ لیجئے یہ سب ضرر محتمل کے انتظام ہیں تو اگر مان بھی لیا جائے کہ بڑھاپے اور دیگر حصہ عمر میں یہ فرق ہے کہ بڑھاپے میں مرجانا یقینی ہے اور دیگر حصص میں محتمل تب بھی اس فرق سے دونوں کے احتمال میں تو کچھ فرق نہیں ہوسکتا۔ ضرر محتمل ہی حکم لگا دینے اور اس کے مقتضیات پر عمل کرنے کے لئے کافی ہے ورنہ اس شخص کی سی مثال ہوگی کہ جب چوروں کا آجانا یقینی ہوگیا تو کواڑ چڑھانے کو کھڑا ہوا اور جب خزانہ لٹنے لگے اور ڈاکو آ چڑھیں تب پہرہ دار کو ڈھونڈتا پھرے۔

فنا کے وقوع میں جوان:

جوانی اور بڑھاپے میں یہ فرق کچھ قابل اعتبار نہ ہوا کہ جوانی میں فنا محتمل ہے اور یہ بھی جب ہے کہ جوانی میں فنا ضعیف درجہ میں محتمل ہو اور آج کل تو فنا کے وقوع میں جوان اور بوڑھا دونوں قریب برابر کے ہو رہے ہیں جیسا کہ مشاہدہ ہے، مگر خیر ہم مان لیتے ہیں کہ جوانی اور بڑھاپے میں

احتمال کی قوت وضعف کا کچھ فرق ہے مگر خود یہ فرق غیر معتد بہ ہے اور اس فرق پر ہرگز کوئی حکم نہیں کیا جا سکتا تو عقلمندی کی بات یہ ہے کہ ہر جز وعمر کو بھی سمجھے کہ بس یہ اخیر حصہ ہے۔

شاید ہمیں نفس نفس واپسین بود ''شاید یہی سانس آخری سانس ہے۔''

ہر شخص خواہ کسی عمر کا ہو موت کا منتظر رہے اور اس کے مقتضا پر عمل کرے۔ ہر وقت ایسی حالت میں رہنا چاہئے کہ اگر بڑھاپے سے بھی زیادہ قرب موت کی یقین دلانے والی کوئی اور دلیل موجود ہو جاوے تو جو حالت اس وقت ہو وہ حالت ہر شخص کی ہر وقت ہونی چاہئے۔ مثلاً کسی کو بذریعہ کشف معلوم ہو جائے کہ دو دن زندگی کے اور ہیں، یا کوئی بڑا حاذق طبیب کہہ دے کہ اب زندگی نہیں ہو سکتی، صرف دو چار دن کی حیات اور ہے تو اس وقت دیکھنا چاہئے کہ اس کی کیا حالت ہو کیونکہ کشف اور طبی تحقیق دونوں غلطی کے احتمال سے خالی نہیں مگر پھر بھی اس وقت اس کی حالت یہ ہوگی کہ اگر وہ شخص دنیا دار ہے تو جو کچھ لکھنا پڑھنا وصیت کرنا دینا لینا ہے فوراً شروع کر دے گا اور جلد سے جلد ان کاموں کو ختم کرے گا اور اگر دیندار ہے تو سب کاموں کو چھوڑ کر آخرت کی اصلاح کرے گا حقوق ادا کرے گا نمازوں کی قضا یا فدیہ دینا شروع کر دے گا روزے قضا کرے گا خصوصاً معاصی کو تو بالکل ہی ترک کر دے گا بلکہ معصیت کا تو خیال بھی نہیں آئے گا بس ایک گوشہ میں بیٹھ کر ذکر میں مشغول ہو جاوے گا سو احتمال کا بھی اثر ایسا ہونا چاہئے خصوص جبکہ وہ احتمال کسی مصیبت عظیمہ کا ہو جسے آخرت کی عقوبت سے سو آخرت کے عذابوں اور مصیبتوں سے اعتقاد کا مقتضا یہ ہے کہ اگر اس کا ذرا بھی احتمال ہو تو اس کا انتظام بہت پورا اور بہت پہلے سے کیا جائے کیونکہ ضرر محتمل کے افراد میں شدت وضعف کے فرق کے اعتبار سے بھی احتیاط کے درجات میں فرق ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی کام میں آدمی کو مل کے ضائع ہونے کا احتمال ہو تو اس سے اتنا ہراس نہ ہو گا جتنا کہ اس کام سے ہوگا جس میں احتمال پھانسی پانے کا ہو اور اسی ہراس کے فرق کے موافق دونوں کے انتظاموں میں فرق ہوگا۔ تو جبکہ معلوم ہے کہ آخرت کی ادنیٰ مصیبت بھی دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت سے زیادہ ہے جس کی ایک دن کی بھی اگر سزا کا حکم ہو گیا تو وہاں کا دن دنیا کے ہزار سال کے برابر ہے۔ وان یوما عند ربک کالف سنة مما تعدون (یہ تحقیق تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک دن مثل ایک ہزار سال کے ہے جن کو تم دنیا میں شمار کرتے ہو) تو آخرت کے محتمل ضرر سے بچنے کے لئے بھی کس قدر اہتمام اور بچنے کی تدابیر کرنے کی ضرورت ہو گی کہ دنیا کے کسی یقینی ضرر کے لئے بھی نہ ہوگی اس تقریر سے اچھی طرح یہ بات ذہن نشین ہو گئی ہو

گی کہ جوانی اور بڑھاپے میں ایسا فرق کرنا غلطی ہے جس سے جوانی کا زمانہ غفلت ہی میں گزارا جائے لیکن افسوس ہے کہ ہم لوگوں کی حالت بالکل اس کے خلاف ہے۔ جوانی کو تو کیا کہا جاوے بڑھاپے میں بھی کچھ فکر نہیں بلکہ حالت تو یہ بتا رہی ہے کہ بڑھاپے میں جوانی سے بھی زیادہ بے فکری ہے۔ بوڑھوں کے آج کل وہ منصوبے ہیں کہ جوانوں کے بھی نہیں۔ عقل سے تو کوئی وجہ بڑھاپے میں بے فکری کی ثابت نہیں ہوتی ہاں ایک مہمل وجہ یہ ہے کہ بڑھاپے کو بھی تو کچھ امتداد ہوتا ہے یعنی یہ نہیں ہوتا کہ ایک بال میں سفیدی آئی اور آدمی مر گیا بلکہ برس چھ مہینہ سال دو سال چار سال زندہ رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ زمانہ ذوامتداد ہے۔ صاحبو! اگر اس کا یہی نام امتداد ہے تو مرنے سے ایک دو دن پہلے کا زمانہ یہی بلکہ ایک دو منٹ پہلے کا زمانہ بھی ممتد ہے کیونکہ کچھ تو اجزاء اس کے بھی نکل سکتے ہیں۔ صاحبو! یہ صرف نفس کا خداع ہے اور امتداد اس کو کہنا چاہئے کہ کام پورا کر کے وقت بچ رہے یعنی کام تھوڑا ہو اور وقت بہت ہو مثلاً کسی کو ریل پر جانا اور دو دن پہلے سے ارادہ ہے اور کام صرف یہ ہے کہ بستر اباندھے اور اسٹیشن پر پہنچ جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ابھی وقت بہت ہے جلدی کیا ہے اس دو دن کو ممتد زمانہ کہہ سکتے ہیں، برخلاف اس کے کہ ایک شخص اپنی اولاد کو مختلف علوم کی تعلیم دلانا چاہتا ہے جس میں فرض کیجئے کم از کم دس برس درکار ہیں، پس ہر چند کہ دس برس کا زمانہ ظاہر میں بہت ممتد ہے لیکن ان کاموں کو دیکھ کر اطمینان کر لے کہ زمانہ بہت ہے اور کام نہ کرے تو جو کچھ انجام اس کا ہوگا ظاہر ہے صاحبو! کیا فرق ہے اس شخص کی حالت میں اور ہماری حالت میں۔ اگر ہم کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ہماری عمر کے پچاس برس باقی ہیں تب بھی اس زمانہ کو ممتد سمجھنا غلطی ہے کیونکہ جو کام اس وقت میں کرنے ہیں وہ بہت زیادہ ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ جو شخص تعلیم سے امتداد وقت کے بھروسہ پر بیٹھ رہے اس کو تو بیوقوف کہا جائے اور احمق اپنے آپ کو عقلمند سمجھیں۔ یہ صرف غفلت اور خداع نفس ہے کہ وہ عمر کے ہر جزو میں بھی کہہ دیتا ہے کہ یہ جزو آخر نہیں ہوش کی بات یہ تھی کہ ہم ہر اس جزو کو بھی جس کے آگے دوسرے جزو کا آنا عادۃً معلوم ہے اخیر ہی سمجھتے تا کہ اپنا کام تیار ہو جائے اگر کام تیار ہو گیا اور یہ جزو اخیر نہ نکلا تو آئندہ جو اجزاء آویں گے ان میں بے فکری رہے گی پریشانی نہ ہوگی اور جو شخص آج کا کام کل پر ٹالتا ہے اس کو کبھی راحت نہیں ہو سکتی کیونکہ کل کے لئے دوسرا کام ہے۔ اس میں آج اور کل دونوں کا کام نہیں ہو سکتا اور خیر محنت کر کے ایک دن میں دو دن کا کام بھی ہو سکتا ہے لیکن اگر اس نے کل بھی کچھ نہ کیا اور پرسوں پر ٹالا اور اسی طرح ٹالتا رہا تو بتلایئے اس سے کس طرح کام پورا ہو سکتا

ہے؟ کسی طرح بھی نہیں۔ بس جوانوں کو بھی غفلت ہرگز جائز نہیں۔ اولم نعمر کم مایتذ کر فیه میں (اور کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ جس میں نصیحت حاصل کرنیوالا نصیحت حاصل کرے) تذکر کے مخاطب وہ بھی ہیں بیان یہ تھا کہ گو اولم نعمر کم میں خطاب کفار کو ہے لیکن وجہ خطاب میں جو بھی کوئی شریک ہو سب اس میں شامل ہیں۔ پس سعادت کی بات تو یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے خطاب سے بھی فائدہ اٹھاوے اور اگر خود ہی پٹ کر عقل آئی تو کیا آئی۔ دیکھئے عدالت میں مجرم کو سزا دی جاتی ہے اور اس کا اعلان کیا جاتا ہے اس اعلان کی غرض یہ ہے کہ وہ لوگ جو مجرم نہیں ہیں متاثر ہوں۔

عقل کی بات:

عقل کی بات یہی ہے کہ مجرم کی مخاطبت سن کر غیر مجرم اپنے کان کھول لے نہ یہ کہ اس خیال میں رہے مجھ کو تو سزا کا مخاطب نہیں بنایا گیا کیونکہ اس صورت میں اعلان کی منفعت باطل ہو جاتی ہے۔ غرض یہ تو معلوم ہے کہ ہمارے اندر غفلت موجود ہے اور تنبیہ کی ضرورت بھی سب کو مسلم ہے اور تنبیہ کا طریقہ موثر تجربہ سے بھی ہے کہ ہر جزو عمر کو اخیر سمجھا جائے اور یہ عقلی مسئلہ ہے کہ مقدمة الواجب واجب تو یہ خیال رکھنا من وجہ واجب ہوا اور یہ بات قرآن میں تو استدلال سے ثابت ہوئی ہے مگر حدیث میں اس کا حکم مصرح ہے۔

ازالۂ غفلت کی تدبیر:

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اذا قمت فی صلوتک فصل صلوة مودع (مشکوٰۃ المصابیح: ۵۲۲٦) یعنی جب نماز کو کھڑے ہو تو اس طرح نماز پڑھو جیسے دنیا کو رخصت کر رہے ہو یعنی یہ سمجھو کہ یہ عمر کا جزو اخیر ہے۔ اس حدیث میں اگرچہ صلوٰۃ کا ذکر فرمایا گیا ہے لیکن علت پر نظر کر کے تمام اعمال کو عام ہے، نماز کا ذکر بوجہ اس کی فضیلت کے فرمایا ہے ورنہ ہر عمل میں اس مضمون کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ غفلت بدون اس کے زائل نہیں ہو سکتی اور ازالہ غفلت کی ہر عمل میں ضرورت ہے۔ پس آدمی جو عمل بھی کرے یہ سمجھ کر کرے کہ شاید اس کے بعد اس عمل کی نوبت نہ آوے جب یہ خیال ہوگا تو دیکھئے نماز کیسے پڑھے گا جس شخص کو عصر کے بعد مغرب کی امید نہ ہو تو وہ عصر کو ایسا پڑھے گا کہ رکوع اور خشوع اور جملہ ارکان کا پورا حق ادا کردے گا۔ یہ طبعی بات ہے کہ انسان اخیر عمل کو بہت ہی اچھی طرح کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جب کسی شخص کی پنشن کا وقت آتا ہے تو وہ آخری زمانہ ملازمت میں کس خوبی اور محنت سے کام کرتا ہے

تا کہ حکام اخیر عمل کو دیکھ کر پنشن کے ساتھ کچھ انعام بھی دے دیں۔اسی طرح مسلمان کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ بس اب میرا اخیر وقت ہے تو وہ آخری نماز کو بہت ہی عمدگی سے ادا کرتا ہے اس لئے بعد تعدیہ حکم گویا حضور یہ فرماتے ہیں کہ تم ہر عمل کو آخری ہی سمجھ کر کیا کرو۔اس سے خوبی نکلتی ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی کہ ہم کو ایسا گر بتلا دیا جس سے کوئی بھی عمل عمل ناقص نہ رہے مگر افسوس ہمارا عمل اس پر بالکل نہیں حتی کہ اگر بیمار بھی ہوں گے تو بجائے اس کے کہ عمر کا خاتمہ سمجھیں ہر نماز میں یہ سمجھتے ہیں کہ دوسری نماز بھی تو آئے گی اس کو اچھا کر کے پڑھ لیں گے اسی طرح عمر ختم ہو جاتی ہے اور کوئی بھی نماز درست نہیں ہوتی کاش بجائے اس کے اس کا عکس ہوتا کہ تندرستی میں بھی ہر عمل کو اخیر سمجھ کر کرتے، گو واقع میں وہ اخیر نہ ہوتا اس سے حرج کیا ہوتا بلکہ فائدہ ہوتا کہ ہر عمل کی اصلاح ہو جاتی۔غالباً آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ بعض باتیں فرضی اور غیر واقعی کسی ایسی مصلحت سے جس کا حاصل ہونا بلا ان فرضیات کے ممکن نہیں ہے، مان لی جاتی ہیں۔ دیکھئے صرف ونحو میں کس قدر فرضیات ہیں۔ کہتے ہیں قال اصل میں قول تھا اور زید قائم میں وہ پوشیدہ ہے کوئی پوچھے کہ کون سے نحو کے امام نے اس ہو کو دیکھا تھا اور انہوں نے کس طرح دیکھا اور ہم سے کیا اسے پردہ تھا کہ پوشیدہ ہو گیا اور قال کون سے بادشاہ کے زمانہ میں قول تھا۔علی ہذا صدہا قواعد صرف ونحو کے ایسے ہی ہیں بلکہ زیادہ حصہ ان علوم کا ایسی ہی باتیں ہیں مگر ان کو اس مصلحت سے مان لیا گیا ہے کہ غیر عربی کو عربی زبان آ جائے۔چنانچہ واقعی آ جاتی ہے ایسے ہی علم طب کو دیکھئے، کہتے ہیں کہ غذا معدہ میں جاتی ہے اور وہاں سے جگر میں جاتی ہے اور وہاں سے رگوں میں اور تمام اعضاء کے فعل بیان کرتے ہیں۔کوئی جب جذب کرتا ہے کوئی دفع کرتا ہے کوئی تقسیم کرتا ہے۔گو میں ان باتوں کو غلط نہ کہوں مگر کسی کی دیکھی ہوئی بھی نہیں ہیں۔علم تشریح سے اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ انسان میں اتنے اعضاء ہیں اتنی رگیں ہیں۔باقی یہ کہ اس کا عمل کیا ہے اور اس کا عمل کیا۔یہ باتیں ظن وتخمین سے کسی حالت میں نہیں بڑھ سکتیں لیکن ان کو بڑے بڑے عقل مند مانتے ہیں بلکہ اطباء کی رسائی فہم کی داد دیتے ہیں اور کوئی فقیہ بھی یہ فتویٰ نہیں لگاتا کہ یہ جھوٹ ہے اور جھوٹ بولنا ناجائز ہے بلکہ مسجدوں میں بیٹھ بیٹھ کر یہ جھوٹ پڑھایا جاتا ہے۔وجہ کیا ہے کہ اس سے بہت سے کارآمد اور ضروری علوم حاصل ہوتے ہیں اور بہت سے مصالح معالجہ کے اس پر مرتب ہوتے ہیں۔پس ثابت ہوا کہ اگر کسی ضرورت سے ایک فرضی بات بھی تسلیم کر لی جائے تو

مضائقہ نہیں تو اگر یہ خیال کہ ہر جز وعمر کو آدمی اخیر سمجھا کرے واقع کے مطابق بھی نہ ہو تب بھی اس ضرورت سے کہ موجب اصلاح اعمال ہے مان لینے کے قابل ہے چہ جائیکہ یہ صرف فرضی بات بھی نہیں ہے کیونکہ ایسے واقعات دن رات ہوتے ہیں کہ آدمی عمر کو ممتد سمجھ کر کوئی کام شروع کرتا ہے اور عمر کے خاتمہ کا وقت آ جاتا ہے اور سب کام ناتمام رہ جاتا ہے۔ حق تعالیٰ نے کسی کو یہ یقینی علم نہیں دیا کہ میری عمر کا کتنا حصہ باقی ہے جب یہ علم نہیں ہے تو احتمال ہر جز و میں ہو گیا تو یہ خیال صرف فرضی خیال نہ رہا بلکہ ایک درجہ میں گو وہ درجہ احتمال ہی کا ہو واقعیت بھی رکھتا ہے تو اس کی حقیقت غیر واقعی کو واقعی فرض کرنا نہیں بلکہ واقعی مستقبل کو درجہ احتمال میں حال تجویز کر لینا ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم واقعی بات کی ہوئی نہ یہ کہ ایک بات کو زبردستی منوالیا گیا بلکہ آپ نے اس بات کو یاد دلایا ہے جس کو ہماری عقل خود بھی مانتی ہے کیونکہ ابھی اوپر بیان ہوا ہے کہ عقلاً مضرت کا احتمال بھی لزوم احتیاط وحفاظت میں تیقن کے برابر ہے تو جب ہر جز وعمر میں اخیر ہونے کا احتمال ہے تو یہ احتمال عقلاً تیقن کے حکم میں ہے۔ اب فرمایئے کیا گنجائش ہے عمر کو ممتد سمجھنے کی اور اگر ایسا کیا جائے گا تو اس پر غفلت کا حکم کیوں نہ لگے گا۔

نفس کو عمل پر آمادہ کرنے کا ایک حیلہ:

یہاں سے صوفیہ نے ایک مراقبہ ایجاد کیا اور وہ درحقیقت سنت مذکورہ سے ثابت ہے جیسے احکام اجتہادیہ کے استنباط کی نسبت مجتہدین کی طرف کی جاتی ہے مگر واقع میں وہ نصوص ہی کے مدلول ہیں اسی لئے کہا گیا ہے کہ **القیاس مظهر لا مثبت** وہ مراقبہ یہ ہے کہ صوفیہ نے نفس سے کام لینے کے لئے ایک حیلہ تجویز کیا ہے کہ نفس سے اولاً ہی یہ نہ کہو کہ دو گھنٹہ کام کرنا ہوگا بلکہ اول سے یہ کہو کہ پاؤ گھنٹہ ذکر کر لے جب پاؤ گھنٹہ ہو گیا پھر کہو کہ پاؤ گھنٹہ اور کر لے۔ اسی طرح جتنا وقت درکار ہوتا ہے اتنے وقت تک نفس کو کام میں لگا لیتے ہیں اور نفس پر گران نہیں ہوتا اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک آدمی کے سامنے پچاس روٹیاں رکھ دی جائیں تو وہ دو چار سے زیادہ نہ کھا سکے گا اور اگر آدھی آدھی روٹی لائی جائے تو وہ سیروں آٹا کھا جائے گا۔ تجربہ کر لیا جائے اسی طرح ذکر میں بھی سارا وقت نفس کے سامنے ایک دم سے پیش نہ کرو بلکہ پاؤ پاؤ گھنٹہ پیش کرتے رہو اس طرح وہ گھنٹوں میں بھی نہ تھکے گا۔ اسی طرح سفر میں جاؤ تو نفس سے کہو کہ اس گاؤں تک ذکر کر لے جب وہاں پہنچے تو پھر کہو کہ اس اگلے گاؤں تک اور کر لے، اسی طرح سارا سفر ختم کر دیا ویسے تو

نفس کام نہ کرتا اگر تم یہ کہتے کہ سارے سفر میں ذکر کرنا ہوگا مگر اس حیلہ سے کام کر لیا اور کچھ بار بھی نہ ہوا، سب اجزاء کو ملا کر دیکھا جائے تو گھنٹے تو بہت سے ہو گئے مگر نفس آمادہ اس واسطے ہو گیا کہ تم نے ہر جزو میں اس کو تھوڑا کام دیا اور جزو کو اس نے کام کا اخیر سمجھا تو اگر نماز بموجب تعلیم حدیث کے پڑھو گے تو نماز کامل بھی ہوگی اور نفس پر بار بھی نہ ہوگا معلوم ہوا کہ ہر جزو کو اخیر سمجھنا موجب سہولت بھی ہے۔ یہی اصل ہے اس مراقبہ کی اور یہ فصل صلوٰۃ مودع (رخصت ہونے والی کی نماز) سے ثابت ہو گیا اور اوپر میں بیان کر آیا ہوں کہ بطور استدلال کے قرآن سے بھی یہ مضمون ثابت ہے تو یہ مراقبہ قرآن وحدیث دونوں کے موافق ہوا۔ اب یہ بات اور قابل غور ہے کہ فصل صلوٰۃ مودع پر عمل جب ہی ہوگا کہ باقی عمر کو طویل نہ سمجھے جیسا کہ ظاہر ہے اور میں نے یہ بیان اس وقت اس واسطے بھی اختیار کیا ہے تا کہ کام کی ضرورت کے ساتھ کام کرنے میں سہولت کا طریقہ بھی معلوم ہو۔

قرآن وحدیث کو غور سے دیکھنے کی ضرورت:

یہ مضمون قرآن وحدیث میں بہت جگہ موجود ہے لیکن ہم غور نہیں کرتے، پس قرآن وحدیث کو بھی غفلت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ تذکر کی نظر سے نہیں دیکھتے کیونکہ وہ محتاج استحضار ہے اور اس غفلت سے بجز عقائد کے باقی ہمارے حالات سب کے سب ہی بگڑے ہوئے ہیں، عقائد تو بحمد اللہ صحیح ہے۔

وقت ٹالنے کی عادت:

لیکن عبادات، اخلاق، معاملات، معاشرات جن میں استحضار کی حاجت ہے کوئی بھی درست نہیں۔ ان سب کے درست نہ ہونے کی وجہ اکثر یہی ہے کہ ہم کو وقت کے ٹالنے کی عادت ہے جو کوئی کسی گناہ میں مبتلا ہے وہ اس کے چھوڑنے کو آئندہ پر محمول کرتا ہے۔

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم   باز چوں فردا شود امروز افسردا کنم

''میں ہر رات میں کہتا ہوں کہ کل کو یہ کام ترک کر دوں گا، پھر جب کل آتی ہے تو کہتا ہوں آج نہیں بلکہ کل۔'' اور جو کسی اطاعت میں قاصر ہے وہ کہتا ہے کہ ایک ہفتہ کے بعد شروع کروں گا۔ بعض جاہلوں سے نماز کے لئے کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں کپڑے دھلنے گئے ہیں۔ جمعہ کو آویں گے تب سے نماز شروع کریں گے۔ بعض اس سے بھی بڑھ کر ہیں، کہتے ہیں کہ اب کی عید سے شروع کریں گے۔ شاید ان کے پاس کوئی پروانہ آ گیا ہے کہ اب کی عید تک یہ زندہ بھی رہیں گے جو شخص اللہ و رسول کو مانتا ہو اس کے ٹالنے کے کیا معنی جبکہ اللہ و رسول سے ان وعدوں کے پورے کرنے کی تمنا

ہے جو اعمال پر وارد ہیں اور ان وعیدوں کے ترتب کا بھی قوی اندیشہ ہے جو معاصی کے متعلق ہیں تو اب یہ محض نفس کی بے حیائی اور شرارت ہے کہ ایک بات کو تسلیم کر کے پھر اس کے خلاف کی طرف چلتا ہے بعض لوگ حج کا ارادہ رکھتے ہیں اور حج کو اپنے اوپر فرض بھی جان چکے ہیں لیکن اپنے کسی دوست سے کہتے ہیں کہ ہم تم دونوں ساتھ چلیں گے، میں کہتا ہوں کہ اس دوست کو چاہئے کہ ان سے لکھوا لے کہ میں اور تم دونوں اس وقت تک زندہ بھی رہیں گے۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں وہ اس مضمون کو کیونکر لکھتے ہیں اور اپنی اور اس کی زندگی کا یقین کس طرح دلاتے ہیں۔

تمام غلطی کی جڑ:

غرض تمام غلطی کی جڑ یہ ہے کہ ہم اپنی عمر کو طویل اور ممتد سمجھتے ہیں، لہٰذا جی چاہا کہ اس کی اصلاح کر دی جائے اس کی اصلاح بھی ہے کہ ہر جزو عمر کو اخیر سمجھنا چاہئے۔ یہ اجمالی اصلاح ہے اس کی تفصیل آپ خود کر سکتے ہیں۔ ایک دفعہ غور کر کے دیکھئے کہ اگر کسی طرح آپ کو کسی صاحب کشف یا نجومی یا طبیب کے کہنے سے ضعیف سا شبہ بھی پڑ جائے کہ آج شام تک زندگی ختم ہے تو اس وقت آپ کی کیا حالت ہوگی۔ سوائے ضروریات کے کسی طرف خیال بھی نہ جائے گا لیکن اب جو ہم لمبے چوڑے قصے لئے بیٹھے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ غفلت کی عادت ڈال لی ہے ذہن کبھی اس طرف جاتا ہی نہیں کہ ایک دن عمر ختم بھی ہوگی حالانکہ ہر شخص کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ عمر ختم ہوگی بلکہ یہ معلوم ہے کہ اس کے لئے کوئی قاعدہ بھی مقرر نہیں کہ کب ختم ہوگی۔ اچھے خاصے ہٹے کٹے آدمی جن کے قویٰ ایسے تھے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ سو برس سے پہلے مریں گے، ذرا سی دیر میں مر جاتے ہیں۔ بالخصوص طاعون اور ہیضہ کے زمانہ میں یہ تماشے ہر شخص کے دیکھے ہوئے ہیں کہ اچھے اچھے شہ زور نوجوان صبح کو اچھے خاصے ملے اور شام کو دنیا سے رخصت ہو گئے کسی محقق اور تجربہ کار کو اب تک کوئی ایسا قاعدہ نہیں جس سے عمر کا اندازہ کر سکیں باوجود ان باتوں کے مسلم ہونے کے عمر کے امتداد کا خیال غفلت کے سوا کس بات پر مبنی ہو سکتا ہے جو ایسی ظاہر چیز کو چھپا دیتی ہے۔

تذکرہ موت پر ایک شبہ کا جواب:

ایک شبہ لوگوں کو یہ پڑا ہوا ہے کہ اگر ہر وقت موت کا خیال رکھے تو سب کاموں سے جاتا رہے۔ بس اکیلا جنگل میں پڑا موت کو سوچتا رہے، اس صورت میں تمدن کا نام ونشان بھی نہ رہے گا کیونکہ ہر چیز قابل ترک نظر آوے گی۔ اس کا حل یہ ہے کہ شریعت نے صرف موت کے تذکر کی

تعلیم دے کر نہیں چھوڑ دیا بلکہ ان امور کی تفصیل کماحقہ کردی ہے جن سے بچنے کی ضرورت ہے اور اس بچنے کے لئے تذکر موت کو ذریعہ تجویز کیا ہے۔

امور دنیا کے اقسام واحکام:

سمجھ لیجئے کہ امور دنیا کئی قسم کے ہیں۔ایک ضروریات،ایک سامان آسائش وآرائش اور ایک فضولیات۔سو ضروریات کا بہم پہنچانا تو آدمی کے لئے واجب اور ضروری ہے صرف یہی نہیں کہ شریعت ان کی اجازت دیتی ہے بلکہ ان کا امر کرتی ہے اور واجب قرار دیتی ہے۔مثلاً کوئی شخص بیوی بچے رکھتا ہے تو اس کو اجازت نہیں دیتی کہ ان کی خدمت چھوڑ کر جنگل میں جا بیٹھے اور اگر کوئی ایسا کرے تو اسے معذور بھی قرار نہیں دیتی بلکہ گنہگار کہتی ہے اور سامان آسائش اور آرائش کا حکم یہ ہے کہ ان کو جائز کہتی ہے لیکن ان میں انہماک یعنی زیادت اشتغال کو پسند نہیں کرتی ہے اس وجہ سے کہ نفس ہر شخص کے ساتھ لگا ہوا ہے۔وہ انہماک کی صورت میں انہیں تک بس نہیں کرے گا بلکہ اس حد تک پہنچائے گا جو ممنوع ہے یعنی فضولیات اور ممنوعات تو انہماک مذکور سے نہی لغیرہ ہوئی اور فی نفسہ رخصت ہے۔ذرا غور سے کام لیجئے تو فوراً معلوم ہوگا کہ شریعت میں کماحقہ سہولت ہے جبکہ ضروریات اور آسائش اور آرائش سب کی اجازت ہے تو بجز فضولیات کے اور کون سی چیز باقی ہے جس کے اعتبار سے شریعت میں تنگی کہی جائے،فضولیات سے روکنا کسی عاقل کے نزدیک بھی تنگی نہیں ہوسکتی۔

شریعت بہت وسیع قانون ہے:

میں تو کہتا ہوں ایسا کوئی قانون نہیں جیسی شریعت ہے،ممنوعات صرف وہ امور رہ گئے ہیں جو آدمی کو ہلاک کرتے ہیں تو کیا مہلکات سے منع کرنا بھی تنگی ہے۔شریعت نے سب باتوں کی ایسی تفصیل بتلادی ہے کہ آپ کو کچھ زیادہ سوچنا ہی نہیں پڑتا،آنکھ بند کرکے ایک راستہ پر چلے جائیں کہیں بھی دھوکا نہیں ہے اسی پر تو شکایت ہے کہ باوجود اتنی وسعت کے بھی حدود سے تجاوز کیا جارہا ہے۔ہم لوگ اتنا ہی نہیں کرتے کہ کسی کام کے کرنے سے پہلے اتنا سوچ لیا کریں کہ یہ ضرورت میں داخل ہے یا آسائش میں یا آرائش میں یا ممنوعات میں۔اگر اتنا بھی کریں کہ ممنوعات کو چھوڑ دیا کریں تو کوئی شکایت کا موقع نہ رہے لیکن صبح سے شام تک صرف دو ہی چار دن محاسبہ کرکے دیکھئے تو معلوم ہوجائے گا کہ کوئی دن ممنوعات سے خالی نہیں رہتا۔آخر سوچئے یہ ممنوعات کیوں صادر ہوئے؟ ہر فعل کا ایک منشا ہوتا ہے اس کا منشا سوا اس بات کے اور کیا ہے جس

پر دیر سے تقریر ہو رہی ہے کہ ہم کو موت کا خیال نہیں اور ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھی ہوئی ہے کہ ابھی عمر بہت ہے۔ غرض قانون شرعی تو خاطر خواہ وسیع ہے یہ الزام اس پر نہیں آتا کہ اگر موت کو یاد کر کے شریعت کو دستور العمل بنالیں تو دنیاوی زندگی صحیح نہ ہو سکے گی شریعت تو اکثر چیزوں سے روکے گی میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ شریعت پر چلنے سے کوئی ضروری اور مفید کام بند نہیں ہوسکتا۔

فضولیات وممنوعات کی بنا غفلت ہے:

اس لئے بھی گمان غلط ہے کہ سب چیزیں چھوٹ جائیں گی البتہ جن چیزوں کے چھوڑنے کے لئے تذکر موت کو ذریعہ بنایا ہے یعنی فضولیات وممنوعات جس کی بناء غفلت ہے زوال غفلت سے ایسی چیزیں بے شک چھوٹ جاویں گی سو اس سے دنیا تو نہ چھوٹی اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ موت کی یاد اگر غالب ہوگئی تو اس کے غلبہ کی ضروریات بھی چھوٹ جاویں گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس غلبہ سے طاعات کا زیادہ اہتمام ہوگا اور ضروری دنیا کا کسب طاعت ہے تو اس کا تو زیادہ اہتمام ہوگا نہ کہ وہ متروک ہو جاوے۔ البتہ دلچسپی بے شک نہ رہے گی۔ سو دلچسپی خود مطلوب نہیں نہ ضروری دنیا کا موقوف علیہ ہے بہرحال موت کی یاد سے ضروری تمدن نہیں مٹ سکتا نہ ضروری تمدن سے روکا جا سکتا ہے مگر یہ سو برس کے منصوبے کیسے تراشے جاتے ہیں۔ بس اس کو روکا جاتا ہے۔ ذرا اپنے حالات میں غور کر کے دیکھئے کہ سینکڑوں برس کی تیاریاں کی جاتی ہیں اور اس بے تمیزی کے ساتھ کہ اس میں حلال وحرام کچھ بھی نہیں دیکھا جاتا۔ باقی ضروری تمدن، سو میں نے اوپر بیان کر دیا کہ ضروریات کے لئے سامان کرنا مضائقہ نہیں بلکہ آسائش و آرائش تک بھی مضائقہ نہیں لیکن کوئی حد تو ہونی چاہئے، کوئی کام ایسا نہیں ہوسکتا جس کے لئے کوئی حد نہ ہو۔ دیکھئے کھانا کھانا کتنا ضروری ہے کہ موقوف علیہ حیات کا ہے اس کی بھی حد مقرر ہے اگر کوئی چاہے کہ مطلق العنان ہو کر کھائے اور جو کوئی اسے ٹوکے تو جواب میں یہ کہے تم کھانے جیسی ضروری چیز سے منع کرتے ہو تو بتلایئے آپ اس کا کیا جواب دیں گے۔ یہی نا کہ ہم قدر ضرورت سے منع نہیں کرتے بلکہ حد سے آگے بڑھنے کو منع کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم مبتلائے ہیضہ ہو کر مر جاؤ گے۔ میں کہتا ہوں کہ شریعت کو بھی ہم سے اسی بات کی شکایت ہے کہ ہم لوگ دنیا کے سامان میں قدر ضرورت وقدر راحت پر بس نہیں کرتے بلکہ ہم کو دنیا کا ہیضہ ہوگیا ہے جس سے ہلاکت کا اندیشہ ہے۔

ہمارے بعض آریوں سے بدتر حالات:

ہم لوگوں نے اپنے منصوبوں کے لئے ایسی آزادی کیوں اختیار کر لی کہ اس کے لئے کوئی

معیار اور طریقہ ہی نہیں رہا کوئی انداز تو ہونا چاہئے۔ دیکھئے میں اس شکایت کے لئے ایک نظیر دیتا ہوں جس سے بہت افسوس ہوگا بیمہ کمپنی جس کی بنا ہی طول امل پر ہے اور جس کو ہم لوگ جوا کہتے ہیں۔ آپ خود دیکھ لیجئے کہ جب کوئی بیمہ کراتا ہے تو کمپنی والے کیسی کیسی شرطیں کراتے ہیں۔ قویٰ کو دیکھتے ہیں ڈاکٹروں کو دکھلاتے ہیں بہت سے اصول ہیں جن کی پابندی کے بعد بیمہ کرتے ہیں۔ دوسرے لفظ میں اس کا ترجمہ یہ ہے کہ بہت سی شرطوں اور قاعدوں کے ساتھ امتداد عمر کو تسلیم کرتے ہیں تو جس جماعت کے تمام افعال کی بناء امتداد عمر پر ہو ان کے واسطے تو کچھ قواعد ہوں اور تعجب کی بات ہے کہ وہ مسلمان جو امتداد عمر کے قائل بھی نہیں اور ان کو خیال باطل سمجھتے ہیں ان کے لئے کوئی بھی قاعدہ نہ ہو، ان کے افعال ایسے ممتد ہوں کہ قائلین امتداد کے افعال بھی اس کے برابر نہ ہوسکیں۔ حیرت کی بات ہے۔

میں کہتا ہوں اگر آپ ہر وقت کو وقت آخر بھی نہ سمجھیں تب بھی کسی قاعدے پر تو آپ کو چلنا چاہئے۔ طبیب یا ڈاکٹر سے اپنی عمر کا اندازہ کرایئے یا قویٰ سے اندازہ کر کے کام کیجئے پھر دنیا کو اتنا ہی پھیلایئے کہ طبیب یا ڈاکٹر کے بتلائے ہوئے وقت تک کے لئے کافی ہو اور دین کی یہی ذمہ داریاں اسی میں پوری کیجئے۔ شکایت تو اس کی ہے کہ اس طرف مطلق خیال ہی نہیں کسی نے اتنا ہی کر کے دکھایا ہوتا تب بھی ہم معذور سمجھتے۔ بیمہ کمپنی والے کو تو ایک طریقہ اور انداز کی ضرورت ہو اور دین دار کو ضرورت نہ ہو، تعجب کی بات ہے غفلت اسی کو کہتے ہیں کہ ایک بات مسلم ہے لیکن اس کے مقتضا پر عمل نہیں جیسے کسی کو خبر مل جائے کہ صبح کو میرے یہاں ڈاکہ پڑے گا اور مخبر اعتماد کے قابل بھی ہو جس سے یقین ہو جائے کہ ضرور ایسا ہوگا لیکن اس خبر کے مقتضاد پر عمل نہ ہو یعنی کوئی طریقہ اس کے انسداد کا نہ کیا جائے اور پیر پھیلائے سوتے رہیں تو اس کو کیا کہتے ہیں، اس کا نام وہی غفلت ہے۔ بیمہ کمپنی کو ہم جواریوں کا مجمع کہتے ہیں لیکن ان میں قواعد کا انضباط اور اپنے تمام افعال کو دیکھ بھال اور تحدید کرنا کوئی کام بے سوچے سمجھے نہ کرنا جو قواعد مقرر کر لینا اس کا ذمہ دار رہنا بلفظ دیگر عہد کو پورا کرنا یہ لاکھ روپیہ کی بات ہے اور جو اپنے آپ کو دیندار کہیں ان میں کسی بات کی بھی پابندی نہیں نہ ان کے قول کا اعتبار نہ فعل کا کیونکہ جو بات تمام عیبوں کی اصل ہے وہ ان میں موجود ہے یعنی آزادی اور غفلت اور اس جواری میں ایک عیب ضرور ہے مگر تمام ہنروں کی اصل بھی موجود ہے یعنی پابندی اور اپنے افعال کی نگہداشت اور ثقہ لوگوں میں غفلت ہے اور اس جواری میں تیقظ یہ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔ افسوس کہ ہم ایک جواری کے برابر بھی نہیں۔ اس صفت

میں وہ ہم سے اچھا ہے اسی مضمون میں عراق کا شعر ہے:

بقمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم   چو بہ صومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی

''یعنی میں جب شراب خانہ میں گیا تو سب کو پاک باز یعنی شراب خانہ کے اصول کا پابند پایا اور جب عبادت خانہ میں گیا تو تب سب کو اصول کا غیر پابند پایا۔''

یہ شعر تھا تو اور مقام کا مگر یہاں خوب کھپ گیا۔ یعنی ایک خاص صفت پاکبازی کی یعنی وفائے عہد قمار خانہ والوں میں ایسی پائی جو صومعہ والوں میں نہیں تھی۔ اب اس شعر پر کوئی اشکال نہیں رہا کیونکہ وہ ہر جہت سے ان کو پاکباز نہیں کہتے بلکہ صرف ایک صفت کے لحاظ سے پاکباز کہہ دیا ہے۔

تارکِ نماز میں ایک فعل کفار کا موجود ہے:

اور اس حدیث ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر (کنز العمال:۲۰۰۸ ۵) (جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی اس نے کفر کیا) پر سے بھی اشکال رفع ہو گیا۔ معنی یہ ہوئے کہ تارک صلوٰۃ میں ایک فعل کفار کا موجود ہے یعنی ترک صلوٰۃ کیونکہ یہ کام کفار ہی کا ہے اس وجہ سے اس پر کفر کا اطلاق فرما دیا اس سے تارک صلوٰۃ کا کافر ہونا لازم نہیں آیا جیسے جواریوں میں ایک صفت پاک بازوں کی ہو جیسے اس کا پاکباز ہونا لازم نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہم لوگ باوجود دیندار کہلانے کے غفلت میں مبتلا ہیں جو ام الامراض ہے۔ نماز، روزہ سب کچھ کرتے ہیں مگر یہ غفلت ضرور ساتھ رہتی ہے۔ نماز میں ہیں مگر اس کا تصور کبھی بھی نہیں آتا کہ ایک دن تو مریں گے لاؤ نماز کو ٹھیک طور سے پڑھ لیں۔ ایمان سے کہئے اور دلوں کو ٹٹول کر دیکھ لیجئے کہ کبھی بھی یہ خیال آتا ہے۔ آخر جب ایک بات یقینی ہے تو تمام عمر میں کبھی تو اس کا واہمہ گزرنا چاہئے تھا۔ بچپن میں تو اتنا بھی تھا کہ جنازہ کو دیکھ کر ڈرتے تھے اب جنازہ کو دیکھ کر بھی خوف نہیں ہوتا۔ ہماری حالت بتاتی ہے کہ ہمارے دل میں یہ خیال اچھی طرح سے مرکوز ہے کہ یہ چارپائی اور گڑھا اور یہ کفن اس طرح مرنے والے کے لئے تھا، ہم اس سے مستثنیٰ ہیں۔

جنازہ کی موجودگی میں غفلت:

جنازہ سامنے ہے اور دنیا کے بکھیڑے زبان پر ہیں اور جو اس سے قرابت رکھتے ہیں ان کو تو سب سے بڑی فکر یہ ہے کہ میراث لے لیں۔ گو معلوم ہے کہ میراث فرائض کے موافق بٹے گی مگر دل نہیں مانتا اور یہ فکر ہے کہ جتنا ہاتھ لگے دبا لو، اس کی حق تعالیٰ نے بھی شکایت فرمائی ہے۔

وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (تم میراث کا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے تم لوگ بہت ہی محبت رکھتے ہو) اور جن کو کوئی قرابت نہیں ان کو اگر اور کچھ شغل نہ ہو تو کچہری ہی کے مقدمے لے بیٹھتے ہیں جن کو مقدمہ سے بھی مس نہیں وہ تیری میری شکایت غیبت ہی شروع کر دیتے ہیں کوئی پوچھے کہ ایک بڑا سنگین مقدمہ تو سامنے موجود ہے اس کو دیکھ کر کچھ اپنی حالت تو سنبھالی ہوتی دیکھئے جب کسی کو پھانسی ہوتی ہے تو دیکھنے والے کانپتے ہیں حالانکہ یہ یقینی بات ہے کہ ان پر کوئی آفت آنے والی نہیں۔

جنازہ سے دُنیوی و دینی حصول عبرت کی ضرورت:

اسی طرح جب مردہ سامنے رکھا ہو تو کیا باعتبار دنیا کے اور کیا باعتبار آخرت کے سب طرح سے عبرت پکڑنی چاہئے۔ دنیا کے اعتبار سے تو اس طرح کہ یہ ایک ہمارا ہم جنس ہی ہے دنیا میں اس کے یہ تعلقات تھے بیوی رکھتا تھا بچے رکھتا تھا دوست احباب سے محبت کا تعلق تھا بہت سے لمبے چوڑے کام اس نے شروع کر رکھے تھے۔ مگر ایک موت نے سب تعلقات اور سب کاموں کا اور ہزاروں آرزوؤں کا خون کر دیا جس عورت کو اس نے بیوہ چھوڑا اور جن بچوں کو یتیم چھوڑا اور جن احباب کا ہمیشہ منغص (مکدر) کیا وہ سب اسے یاد کریں گے اور دھاڑیں مار مار کر روئیں گے مگر اس کو جواب دینے کی بھی بلکہ ایک نظر دیکھ لینے کی بھی اجازت نہیں رہی تو ایسی چیزوں پر کیا نظر ڈالنا جو اس طرح سے چھوڑ دی جائیں گی۔ یہ وہ خیال ہے کہ بعض ایسے لوگوں نے جن کو دین سے مس بھی نہ تھا اس خیال سے دنیا کو چھوڑ دیا اور جنگل اور پہاڑ اختیار کر لیا اور آخرت کے اعتبار سے اس طرح کہ یہ بھی ایک ہمارا ہم جنس ہے جس کے عمل آج ختم ہو گئے۔ حق تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا تھا اور اتنی عمر دی تھی جن اوامر و نواہی سے اس کو مخاطب کیا تھا۔ معلوم نہیں کتنوں کی تکمیل کی اور کتنوں سے قاصر رہا۔ ظاہر یہ ہے کہ بہت سے کاموں میں قاصر رہا۔ اب نہ معلوم حق تعلق کا معاملہ اس کے ساتھ کیا ہو گا، یہ مسلم ہے کہ شانِ رحمت غالب ہے لیکن اگر محاسبہ کے وقت جواب طلب فرماویں تو یہ کیا کہے گا۔ یہی بات ہم کو بھی پیش آنی ہے بلکہ اتنا اور اندیشہ ہے کہ یہ تو اپنی بری بھلی عمر کاٹ کر ظاہراً ایمان کے ساتھ رخصت ہو لیا ہم کو یہی معلوم نہیں کہ کیا کیا باتیں پیش آئیں اور خاتمہ کے وقت کیا حالت ہو۔ صاحبو یہ خیال ایسا ہے کہ اگر مومن کے دل میں جھوٹ موٹ بھی گزر جائے تو سلگ اٹھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قبر پر رونے کا سبب:

دیکھئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ صحابی ہیں اور جلیل القدر صحابی ہیں اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دامادی کا دوہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ذوالنورین مشہور ہیں جب آپ کسی قبر پر تشریف لے جاتے تو اس قدر روتے کہ ریش مبارک تر ہو جاتی۔ جب یہ قصہ حدیث میں آتا ہے تو طالب علم پوچھا کرتے ہیں کہ اس قدر رونے کی اور خوف کی کیا وجہ تھی بلکہ بعض بے ہودہ اور فلسفی مذاق رکھنے والے طالب علم تو یہاں تک کہہ بیٹھتے ہیں کہ اس سے تو نعوذ باللہ حضرت عثمانؓ کے ایمان اور تصدیق میں شبہ ہوتا ہے کیونکہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اپنے ناجی اور جنتی ہونے کی بشارت سن چکے تھے پھر اس قدر رونا کیوں سوائے اس کے کہ اس خبر میں کچھ احتمال ہے۔ ایسے احمقوں کا جواب زبان سے نہیں دینا چاہئے بلکہ انکو پھانسی گھر میں کھڑا کر دینا چاہئے اور بقسم پوچھنا چاہئے کہ پھانسی والے کو دیکھ کر تمہارا قلب اپنی حالت پر ہے یا نہیں؟ بس اس وقت اس کو اس شبہ کا جواب کافی مل جائے گا کہ باوجود اپنے اوپر یہ خطرہ نہ ہونے کے دل کانپتا ہے کیونکہ وہ صورت اور موقع ہی ایسا ہے تو اگر حضرت عثمانؓ کا دل باوجود نجات کے یقین ہونے کے قبر کے احوال دیکھ کر کانپتا ہو تو کیا تعجب ہے۔ یہ ان کی غایت خوف اور تصدیق بالا خبار الواردہ کی دلیل ہے۔ نہ معلوم ہم لوگوں کو جنازہ دیکھ کر کیوں ہیبت نہیں ہوتی جبکہ نجات کی خبر تو کیا اُمید بھی ہونا مشکل ہے۔

قلب کے بے حس ہونے کا سبب:

بات یہ ہے کہ یہ خیال نہیں آتا بلکہ وہی خیال جوش مارتے ہیں جن کا ہر وقت مشغلہ ہے حالانکہ ان سے کہا جا سکتا ہے کہ اپنے نفع کا خیال نہ سہی اس بے چارے میت کی ہمدردی کے واسطے سہی اتنی دیر جو خالی بیٹھے رہو گے جس میں وقت کاٹنے کے لئے تم مقدمے اور غیبتیں شروع کرتے ہو اس میں کچھ کلمہ کلام کوئی سپارہ یا سورت یا اللہ کا نام ہی پڑھ کر اسے بخش دو تو اس کا کچھ زادِراہ ہو جائے جس کا وہ اس وقت حد درجہ محتاج ہے کیونکہ حدیث میں ہے الميت كالغريق یعنی مردہ ڈوبنے والے کی طرح ہے کہ تنکے کا سہارا دیکھتا ہے، زبان تمہارے قبضہ میں ہے اور اس کے قبضہ سے نکل چکی اس کی قدر کوئی میت سے پوچھے وہ بے چارہ تمنا کرتا ہوگا کہ اتنی دیر کے لئے حیات مجھ کو پھر دے دی جائے کہ ایک دفعہ اللہ کہہ لوں آپ جو اتنا وقت ان فضولیات میں کھو رہے ہیں اس کی حسرت کوئی مردہ سے پوچھے کہ اس کی روح کیا کہتی ہوگی کہ زبان ان کے قبضہ میں ہے مگر باوجود تعلقات، نسب اور محبت وغیرہ کے ان کی زبان نہیں کہتی کہ کچھ دیر اللہ اللہ کر لیں اور اس کی یہ حالت ہے کہ سامان تذکر موجود ہے اور پھر بھی تذکر نہیں ہوتا تو اسکی تو کیا امید ہے کہ بلا سامان موجود ہوئے یہ تصور کریں گے کہ ایک دن ہم بھی مریں گے اور یہ بات ہمارے سب آحاد میں مشترک ہے۔ بچوں کو تو حس ہی نہیں جوانوں کے دماغ

میں یہ سمایا ہوا ہے کہ ابھی ایک درجہ عمر کا اور باقی ہے بوڑھوں کو گو یہ بات حاصل نہیں مگر غفلت ان کی بھی جوانوں سے کم نہیں مردوں کی بھی یہی حالت ہے اور عورتوں کی بھی یہی حالت ہے۔

عورتوں کا کوسنا بے صبری کی دلیل ہے:

ہاں تکلیف کے وقت موت کو یاد کرتے ہیں کہ اللہ اس تکلیف سے تو اُٹھا لے، بعض پڑھے لکھوں کو اس میں شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ تمنائے موت ہے اور تمنائے موت میں کیا حرج ہے؟ چنانچہ بعض اہل اللہ سے منقول ہے جیسا ایک صاحب کہتے ہیں:

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم   جان بجاناں وہم وخرم وشاداں بردم

''جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے جان محبوبِ حقیقی قربان کروں اور خوش وخرم کوچ کروں۔''

اور حدیث میں آیا ہے من احب لقاء اللّٰہ احب اللّٰہ لقاء ہ۔(الصحیح للبخاری ۸: ۱۳۳) (جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے ملاقات کو پسند فرماتے ہیں) اس سے صاف ظاہر ہے کہ موت کی تمنا کوئی چیز نہیں بلکہ مستحسن ہے اس شبہ کا حل یہ ہے کہ یہ تمنائے موت نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کی معصیت کی ناگواری ہے۔ ضعیف طبیعتوں کی بلکہ عام طور سے انسانی طبیعت کی خاصیت ہے کہ نفع عاجل کے سامنے آجل کا خیال نہیں کرتا اسی طرح ضرر عاجل کا دفعیہ جلد چاہتا ہے خواہ ضرر آجل اس سے بھی زیادہ لازم آجائے۔ دیکھئے تکلیف کے وقت آدمی خودکشی کر لیتا ہے حالانکہ موت و مابعد الموت ایسی چیز ہے کہ اس تکلیف سے بدر جہا زیادہ ہو لیکن اس خیال سے کہ یہ موجودہ کلفت رفع ہو جائے اس کا ارتکاب بھی کر بیٹھتا ہے۔ ایسے ہی یہ کہنا کہ اللہ اٹھا لے اس وجہ سے نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کے سامنے جانے کی ان کو تمنا ہے بلکہ یہ بھی جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے یہاں جا کر جوتیاں ہی پڑیں گی کیونکہ عملی حالت اچھی نہیں مگر ان جوتیوں کا خیال نہیں کرتے اور موجودہ مصیبت سے اخلاص چاہتے ہیں۔ یہ ہے حقیقت اس تمنائے موت کی جو بعض لوگ مصیبت کے وقت کیا کرتے ہیں نہ تمنائے موت ہے نہ کچھ ہے بلکہ کراہت، مصیبت اور بے صبری ہے جو شرعاً مذموم ہے ورنہ میں تو کہتا ہوں کہ حیات ایسی پیاری اور موت ایسی ناگوار چیز ہے کہ اگر ان کو کوئی چیز ایسی مل جاوے جس کو کوئی جھوٹ موٹ کہہ دے کہ یہ اکسیر ہے جس کے کھانے کے بعد موت نہیں آئے گی تو یہ تمنا چھوڑ کر اس کو فوراً کھا لیں گے باوجود یکہ دل اندر سے اس کی تکذیب بھی کرتا ہوگا کہ موت کی بھی کوئی دوا ہو سکتی ہے لیکن احتیاطاً ہی کھا لیں گے۔

ایک بڑی بی بی:

ہمارے یہاں ایک بڑھیا کی ایک لڑکی سے تکرار ہوئی۔ لڑکی نے کہا اللہ کرے تو مرجا۔ تو بڑھیا کو بڑا ناگوار ہوا، رونے لگی اور گھر والوں سے شکایت کی کہ یہ لڑکی مجھ کو کہتی ہے تو یوں ہو جا (مرنے کا نام نہیں لیا) اے اللہ! سنیو مت حالانکہ وہ اتنی بوڑھی تھی کہ کمر تک جھک گئی تھی۔ مگر پھر بھی اسے زندگی کی تمنا اور اُمید اور موت سے نفرت و کراہت تھی۔ خدا تعالیٰ نے خود فرمایا ہے: یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ یعنی مشرکین میں سے بعض لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہزار برس کی عمر ہو۔ حق تعالیٰ نے تو حالت کفار کی نقل فرمائی ہے مگر افسوس یہ ہم لوگوں میں بھی موجود ہے۔ دیکھئے جب کسی کو دعا دیتے ہیں تو یہ کہ ہزار برس جیئے۔ اس جملہ میں ہزار کا لفظ بھی تحدید کے لئے نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ عمر طبعی میں بھی نہ مرنا، چونکہ اس سے زیادہ بلکہ اتنی بھی کہیں عمر طبعی نہیں ہے۔ اس واسطے ہزار کے لفظ کو اختیار کیا ہے۔ اگر اس سے بھی زیادہ زمانہ عمر طبعی کا ہو تو اور آگے کی دعا دیتے۔ حالت یہ ہے کہ مرنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ خیر تمنائے موت تو اولیاء اللہ کا کام ہے۔ ہم لوگ تمنا نہ کرتے مگر بھی سوچتے تو کہ ہمیں موت آئے گی، بلکہ ہماری یہ حالت ہے کہ اگر موت کا خیال بھی آ جاوے تو ڈرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی ڈاکٹر کہہ دے کہ تم دس برس میں مرجاؤ گے۔ اس سے پہلے نہ مرو گے تو ابھی ہول سوار ہو جائے۔ یہ غفلت ہے کہ میعاد موت کا تصور بھی نہیں کرتے۔ اب غور کر لیجئے کہ آپ کی اس حالت سے ان لوگوں کی حالت جن کو آپ جواری کہتے ہیں یعنی بیمہ کمپنی والے اچھی ہے یا نہیں۔ وہ ہر کام سوچ کر کرتے ہیں اور ان کے سارے کام موت ہی کے متعلق ہیں۔ مگر اس کی مدت کا اندازہ کر کے معاملہ کرتے ہیں اور ہم لوگ باوجود اس بات کے جاننے کے کہ ہمارے کام بھی سارے موت ہی تک ہیں اندازہ کر کے بھی کام نہیں کرتے، بلکہ ابدالآباد کا انتظام کرتے ہیں۔ اس فضیلت کے لحاظ سے تو ان کے پیر چومنے چاہئیں۔

جنید بغدادی رحمہ اللہ کا چور کے پاؤں چومنے کا سبب:

حضرت جنید بغدادیؒ کا قصہ ہے (جو عارف ہوتا ہے اس کو بری بات میں بھی اچھی بات مل جاتی ہے) کہ انہوں نے ایک چور کو دیکھا کہ سولی پر چڑھا ہوا ہے۔ آپ نے پوچھا کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے کہا یہ وہ شخص ہے جس نے ایک دفعہ چوری کی، اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا، دوبارہ کی تو پیر کاٹ دیا گیا، تیسری اور چوتھی مرتبہ میں دوسرا ہاتھ اور پیر بھی کاٹ دیئے گئے مگر کم بخت پھر بھی باز نہ آیا۔ پانچویں مرتبہ بھی چوری کی۔ بادشاہ نے تنگ آ کر سولی کا حکم دے دیا۔ آپؒ نے اس کے پیر چوم لئے۔ لوگوں نے کہا حضرت ایسے فاسق کے ساتھ یہ برتاؤ؟ آپ نے فرمایا میں اس کے پیر

نہیں چومتا بلکہ اس کی استقامت کے پیر چومتا ہوں، کیونکہ اس نے وہ عمل کیا ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید

(ہاتھ طلب سے نہ روکوں گا جب تک میرا کام پورا نہ ہو جائے)

اس نے جان دی مگر آن نہ دی، کاش ہم طریقِ حق پر ایسے ہی مستقیم ہو جائیں۔ دیکھئے جس کو حق تعالیٰ نے نظر دی ہے وہ برائی کے اندر سے بھی بھلائی نکال لیتا ہے۔ ہم لوگوں کو نظر نہیں ہے، اس واسطے دوسروں کے تو عیب چھانٹتے پھرتے ہیں، کسی کو جواری کہتے ہیں کسی کو شہ باز اور اگر نظر ہو تو پہلے اپنے عیب کو دیکھیں۔ اس وقت معلوم ہو کہ ہماری حالت ان جواریوں سے بھی زیادہ گری ہوئی ہے اور ان جواریوں کو اس بات میں اپنا امام بنالیں اور پیر چوم لیں کہ ان میں غفلت نہیں۔

بڈھوں کا یہ لفظ کہ ہم چراغ سحری ہیں صرف زبان ہی پر ہے:

غرض ہم لوگ موت سے بالکل غافل ہیں۔ کیا بچے اور کیا جواں اور کیا بوڑھے، البتہ بوڑھے کا بطور محاورہ کے کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو چراغ سحری ہیں مگر یہ صرف لفظ ہی لفظ ہے جو زبان پر ہے اور قلب اس سے خالی ہے۔ غور کر کے دیکھئے تو بڈھوں کو جوانوں سے زیادہ دنیا کی ہوس ہے۔ اس لفظ کو سن کر جوانوں پر ایک عجیب بے فکری کا اثر ہوتا ہے کہ خیر ہم تو چراغ سحری نہیں ہیں، سحر تک روشن رہیں گے مگر ایک جوان بزرگ نے اس لفظ کے جواب میں خوب کہا۔ کسی بڈھے نے ان کے سامنے کہا تھا کہ ہم تو چراغ سحری ہیں۔ کہاں حضرت! آپ ساری رات جل تو لئے۔ ہم تو چراغ شام ہیں، ایک جھونکے میں ختم کہ ایک رات بھی جلنے نہ پائے۔ یہ لطیفہ مجھے بہت پسند آیا۔ بہر حال بڈھوں کا یہ کہنا صرف ایک مہذب لفظ ہے جو بلا عملی ثبوت کے کچھ کارآمد نہیں۔

تفکر موت کسی کام کا مانع نہیں:

وہ یہ لفظ بھی غفلت کے ساتھ کہتے ہیں، ورنہ اگر ان کے دل میں یہ آ جاوے کہ ہم چراغ سحری ہیں تو بے چینی ہو جائے اور اس کی عملی حالت بتادے کہ یہ شخص بے چین ہے اور اپنے کو چراغِ سحری سمجھ رہا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ کھانا پینا، دکانداری سب چھوڑ دو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غفلت اور خواب خرگوش کو دماغ سے نکالے اور بے چین ہو۔ اس پر لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر دل میں اطمینان نہ ہو تو دنیا کے کام کیسے چلیں۔ اس کا ایک بہت موٹا سا جواب یہ ہے کہ جو لوگ اس خیال کو رکھتے ہیں اور بے چین رہتے ہیں ان کا کونسا کام بند ہے۔ ایک زندہ مثال بہت اچھی یاد آئی جس سے اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ دلی بے چینی اور دل برداشتگی اور موت کی یاد کسی ضروری کام کو مانع نہیں۔ وہ زندہ مثال یہ ہے کہ طاعون اور ہیضہ کے زمانے سب لوگوں نے دیکھ لئے ہیں، جس زمانہ میں طاعون ہیضہ ہوتا ہے تو

کون سا کام بند ہو جاتا ہے۔ انصاف سے کہیے کہ کونسا کام بند ہو گیا تھا؟ کیا کھانا پینا پہننا بیوی بچے چھوٹ گئے تھے۔ کوئی چیز بھی نہیں چھوٹی تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ دل کسی وقت کسی چیز میں نہیں لگتا تھا۔ دنیا کے سب کام برابر ہوتے تھے مگر دل پر ہر وقت موت سوار تھی۔ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: **اذا اصبحت فلا تحدث نفسک بالمساء واذا امسیت فلا تحدث نفسک بالصباح.** (اتحاف السادة المتقین ۱۰:۲۳۶) یعنی جب صبح ہو تو شام کے منصوبے موت لگاؤ اور جب شام ہو تو صبح کے منصوبے مت سوچو۔ یہ تعلیم اہل ظاہر کے دل میں نہیں بیٹھتی اور طرح طرح کے اشکال پیش کرتے ہیں مگر خدا بھلا کرے طاعون کا (مگر لاوے نہیں جہاں ہو وہیں خوش رہے) اس سے سب اشکال رفع کر دیئے۔ طاعون سے سب میں یہ حالت پیدا ہو گئی تھی کہ صبح کو ملتے تو شام کی امید نہیں، شام کو ملتے تو صبح کی امید نہیں۔ ہر کس و ناکس کی طبیعت پر ہراس چھایا ہوا، نہ کھانے میں مزہ نہ پینے میں مزہ۔ لمبے چوڑے منصوبے بلکہ معاملات میں تخفیف، سود لینے والوں نے قرض دینا بند کر دیا خدا جانے اصل بھی وصول ہو یا نہیں۔ میں اس کو زیادہ طول نہیں دیتا ایک زندہ نظیر پیش کر کے بتلاتا ہوں کہ بس زمانہ طاعون کے برابر ہراس پیدا کر لو، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں اس مادہ طاعون میں سارے اشکالات کا دفعیہ عملی طور پر دیکھ لیا اب تذکر موت کے مضمون پر بھی کوئی اشکال رہا اپنی ذات میں تجربہ ہو گیا کہ امور متضاد اکٹھے تھے جس تضاد کے اجتماع سے اشکال کیا جاتا تھا۔

قطع عن الدنیا اور تحصیل معاش متضاد نہیں:

وہ خود اپنی آنکھوں سے مجتمع دیکھ لیا معاملات اور دنیا سے یکسوئی بھی تھی اور دنیا داری بھی تھی۔ فرمایئے کون سا کام آپ نے چھوڑ دیا تھا بلکہ کون سا کام کر دیا تھا یا گاڑھا گزی پہننا شروع کر دیا یا برف پینا چھوڑ دیا تھا یا شادی بیاہ بند ہو گئے تھے یا تجارتیں روک دی گئی تھیں یا پکے مکانوں کو چھوڑ کر جھونپڑے اختیار کر لئے تھے۔ یہ کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ سب کام بدستور سابق تھے مگر ساتھ ہی اس کے بے چینی اور یاس بھی تھی عملی اور وقوعی طور پر معلوم ہو گیا کہ قطع عن الدنیا اور تحصیل معاش دونوں چیزیں متضاد نہیں ورنہ جمع کیسے ہوتے ہیں۔ یہی رائے دیتا ہوں کہ ایسی حالت پیدا کر لی جائے اور یہ نہ سمجھئے کہ اس سے دنیا کے کام بند ہو جائیں گے بلکہ اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اس سے خود دنیا بھی زیادہ اور اچھی صورت سے حاصل ہو گی کیونکہ آفات کم آئیں گی اس واسطے کہ جملہ آفات کا اصل الاصول حب دنیا اور حسب مال ہے اگر یہ حالت ایک بہت بڑے مجمع کے سب آحاد میں پیدا ہو جائے اور کسی میں جب دنیا نہ رہے یا کم ہو جائے تو بے کھٹکے زندگی بسر کریں چوری، ڈاکہ، بے ایمانی، حق تلفی کچھ بھی نہ رہے تو بتلایئے ان دنیا داروں کے ہر کام کو کتنی ترقی ہوئی۔ یہ ایسا گر ہے کہ گو

اہل دنیا اس کو نہ مانیں مگر عقل سلیم تسلیم کرتی ہے اور تسلیم کیسے نہ کرے واقعات اس کے مؤید ہیں۔ حضرات صحابہ کو ہمیشہ موت پیش نظر تھی، پھر تاریخ سے ان کی دنیوی ترقی کا حاصل معلوم کر لیجئے۔

فکر موت کا اثر:

فکر پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور یاس و ہراس طاعون کے زمانہ کا سامنا ہونا چاہئے۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ گناہ چھوٹ جاویں گے اور قلب میں سلامتی پیدا ہو جائے گی جتنا یاس و ہراس اور جتنی سلامتی ہوا تنے ہی گناہ چھوٹ جائیں گے اگر کامل ہو تو کل گناہ ورنہ بقدر اس کے اندازہ کر دیکھئے طاعون کے زمانہ میں عوام پر بھی یہ اثر ہوتا ہے کہ کم سے کم نماز پڑھنے لگتے ہیں اخلاق میں نرمی آ جاتی ہے، کوئی چار باتیں بھی کہہ لے تو خاموش ہو جاتے ہیں۔

قطع عن الدنیا کی مثال:

دوسری مثال لیجئے، کسی کا بیٹا مر گیا ہو تو اس کا کوئی کام بند نہیں ہوتا مگر ایسا مضمحل ہو جاتا ہے کہ کسی کام کو دل نہیں چاہتا گویا بالکل ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ کھاتا پیتا بھی ہے، بولتا ہے، ہنستا بھی ہے مگر سب تلخ، پہلے کی حالت میں اور اس حالت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کھل کر بات نہیں کرتا زیادہ بولتا نہیں بلکہ اگر کوئی زیادہ بات کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے ارے بھائی کیوں دق کیا چھوٹوں بڑوں سب کو بابا اور بھائی بتاتا ہے۔ دیکھئے سب کام دنیا کے ہوتے ہیں مگر کس طرح جب اور کام دنیا کے کم ہو جاتے ہیں تو گناہ بھی کم و بیش کم ہو جاتے ہیں اور آخرت کی فکر ہونے لگتی ہے اگر کبھی کسی اہل علم کی صحبت پائی ہے اور احکام شرعیہ کان پڑے ہوئے ہیں تو سب گناہ چھوٹ جاتے ہیں۔ دیکھئے نظیر دے کر بتلا دیا گیا کہ ترک دنیا اور معیشت دنیا دونوں جمع ہو سکتی ہیں۔ پس جیسے کہ دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے ایسے ہی قطع التفات الی الدنیا اور فکر آخرت تمام نیکیوں کی اصل ہے، فکر موت کا اثر ہے کہ آدمی گناہ چھوڑ دے گا اگر کچھ روزہ نماز ذمہ ہے تو اس کی قضا یا عدم قدرت کی حالت میں فدیہ کی فکر ہوگی اور قرض ہے تو اس کے ادا کی فکر ہوگی اور عفو تقصیرات کی کرائے گا۔

تفکر موت کا نتیجہ:

امر مشترک یہ ہے کہ گناہوں کی تقلیل ہو جائے گی یا بالکل ترک ہو جائیں گے اور دوسرا اثر یہ ہوگا کہ مباحات میں تقلیل کرے گا۔ مثلاً کسی کو یقین ہو جائے کہ میں دو مہینے میں مر جاؤں گا تو تفاخر اور دھوم دھام کے کام ہرگز نہ کرے گا کیونکہ یہ کام دل کی تازگی کے ہیں۔ لذیذ کھانوں کو اگر چہ چھوڑے گا

نہیں مگر ان سے دلچسپی بھی نہ ہوگی صرف دفع الوقتی کرے گا صرف ضرورت پر نظر رہے گی۔ آپ کو اتنی تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں بالکل ترک دنیا کو نہیں کہتا بلکہ اس میں انہماک کو منع کرتا ہوں دنیا کی عمر کو پورا کرلو اور اس میں بھی یہ نہیں کہ تکلیف اٹھاؤ، ہاں تقلیل ضرور کرو اور دنیا سے دلچسپی نہ رکھو۔ دیکھئے طاعون کے زمانہ میں یا اس دوسری مثال میں جس کا لڑکا مر گیا ہو کون سا ضروری کام نہ رہا تھا کیا سردی گرمی کی حس باقی نہیں رہی تھی یا کھانے پینے کی حاجت کا احساس نہ رہا تھا مگر یہ ضرور ہوا کہ یہ پروانہ رہی تھی کہ کون سا لحاف ہو اس کی کوٹ بدصورت ہے یا کسی قدر میلا ہے یا لحاف اوڑھنا خلاف شان ہے۔ شال ہاف چاہئے، کھانا کھاتے وقت یہ اہتمام نہیں رہا کہ چینی کے برتنوں میں ہو اور اقسام اقسام کے کھانے ہوں جیسے الٹا سیدھا مل جائے پیٹ بھرلیا۔ خلاصہ یہ کہ نخرے نہیں رہے باقی کام سب بدستور رہے پس اسی زمانہ کی سی زندگی ہونی چاہئے۔ لمبے چوڑے منصوبے سوچنا اور آرائش کے زیادہ سامان کرنا دھوم دھام کے کام کرنا تفاخر اور ریاء کرنا یہ سب بے فکری کے دلائل ہیں اور میں پورے اعتماد سے کہتا ہوں کہ دنیا کا کوئی کام بھی ان پر موقوف نہیں۔ یہ سب کام یقیناً ضرورت سے بہت زیادہ ہیں اور جب ہی ہو سکتے ہیں کہ جب آدمی موت کو بھول جائے۔ ان کو چھوڑ دینے میں کیا حرج ہے۔ خلاصہ تقریر یہ ہوا کہ ہر جزو عمر کو اخیر سمجھو نہ بایں معنی کہ کھانا، مکان، شادی بیاہ، ملنا جلنا چھوڑ دو، دنیا کے سارے کام کرو مگر مغموم اور مرجھائے ہوئے دل کے ساتھ، نہ کہ تازہ دل کی طرح اور یہ بھی مباحات میں ہے باقی معاصی کی تو کسی حال میں اجازت نہیں۔ نہ دل بستگی کے ساتھ نہ دل برداشتگی کے ساتھ اور شریعت مقدسہ نے اس سب کی پوری پوری تفصیل فرمادی ہے۔

انہماک فی المباح کا نتیجہ:

اچھے برے کام سب بتلا دیئے ہیں سو یہ تو دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کام گناہ تو نہیں ہے۔ جب گناہ نہ ہو تو اس کی اجازت ہے اور شرعی کوئی فتویٰ اس پر نہ لگے گا اگر ہم لوگ اتنا بھی کرلیں تو بڑی ہمت ہے۔ اسی طرح اگر مباح مفضی الی المعصیت ہو جاوے کہ مباحات میں بھی نفس کو زیادہ آزادی دینے سے آدمی گناہ میں ضرور پڑ جاتا ہے اس واسطے یہ خیال رکھنا چاہئے کہ جس کام کو گناہ کہا گیا ہو اس کے تو بالکل پاس نہ جائے اور جس کو شریعت میں مباح فرمایا گیا ہو اس میں مخل بالطبع نہ ہو جائے بلکہ تقلیل رکھے نہ اس وجہ سے کہ مباحات کوئی بری چیز ہیں بلکہ افضاء الی المعاصی کے خوف سے ان میں کمی کردے۔

تقلیل مباح کی عادت ڈالنی چاہئے:

الغرض مباحات میں تقلیل اور گناہوں میں ترک بس اس کی عادت کو لو اس کا طریقہ یہ ہے

کہ اپنے حالات موازنہ کرو اور صبح سے شام تک کے ایک ایک فعل میں غور کرو، پھر ان میں سے یہ دیکھو کہ کون سا فعل گناہ ہے اور کون سا مباح اور میں توسع کرتا ہوں کہ ان افعال میں بھی جو از قسم گناہ ہوں، غور کرو کہ کون سا بڑا گناہ ہے اور کون سا چھوٹا۔ بڑے گناہ تو ایک دم ترک کر دو وہ قلیل بھی ہیں اور میں یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ بڑا گناہ کوئی ایسا نہیں جس پر معیشت دنیا موقوف ہو یعنی ان کے چھوڑ دینے سے دنیا کا کوئی حرج ہرگز لازم نہیں آئے گا اور چھوٹے گناہ چونکہ بہت سے ہیں شاید ایک دم سے نہ چھوڑ سکو تو ان کو تھوڑے تھوڑے کر کے چھوڑ دو گو یہ بات میرے منہ سے نکلنے کی نہ تھی مگر خیر حق تعالیٰ معاف فرماویں بہ نیت اصلاح زبان پر آ گئی کیونکہ جو شخص ایک دم سے سارے کام نہ چھوڑ سکے اس کی اصلاح تدریجاً ہی کی جاتی ہے اور ہم میں بعض ضعیف القلب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر چھوٹے بڑے سب گناہوں کو ایک دم چھوڑ دیں تو بعض دفعہ اس سے کوئی تنگی پیش آتی ہے جس کا تحمل بوجہ ضعف قلب کے نہیں ہوتا اور اُکتا کر کہہ دیتے ہیں کہ ترک معاصی ہمارے بس کی نہیں جو کچھ ہو کرتے رہو۔ لیجئے پہلے تو تھوڑے ہی گناہ تھے اب سب ہی گناہوں میں پڑ گئے تو آپ خود ہی خیال کر سکتے ہیں کہ یہ چال اچھی ہے یا وہ چال۔

گناہوں کو بتدریج چھوڑنے کی مثال:

دیکھئے کپڑے پر نجاست لگ جاتی ہے اور خشک ہو جاتی ہے تو اس کو پہلے پانی سے نرم کرتے ہیں اور ملتے ہیں اس میں کچھ دیر لگتی ہے مگر نجاست چھوٹ جاتی ہے اور اگر ایک دم چھڑانا چاہیں تو ممکن ہے کہ کپڑا بھی اس کے ساتھ پھٹ جائے۔ ممکن کا لفظ اس واسطے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے پاس کوئی ایسی ترکیب بھی ہو کہ ایک دم کپڑے پر سے نجاست چھوٹ جائے اور کپڑے پر کچھ ازار نہ آئے۔ چنانچہ ایسی صنعتیں بہت ہیں۔ بعض چیزوں کے دھبے ایسے ہوتے ہیں کہ کپڑے پر سے کسی طرح نہیں چھوٹتے لیکن جو کوئی اس کا اُتار جانتا ہے وہ اس کو کسی لاگ سے چھڑا دیتا ہے ہے۔ علیٰ ہذا ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ کسی کامل کے تصرف سے یا اپنی ہمت سے کسی نے اک دم سب گناہ چھوڑ دیئے ہیں تو ایسا شخص ترک میں تدریج کیوں کرے۔ باقی ضعفاً اگر تمام عمر میں بھی گناہوں کو چھوڑ دیں تو بڑی کامیابی ہے۔ ایسوں کے لئے تدریجی چال بھی بساغنیمت ہے یہ اس واسطے بیان کر دیا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں چھوٹے گناہوں میں سے بعض کو منع کرتا ہوں اور بعض کی اجازت دیتا ہوں تو یہ گناہ کی اجازت نہ ہوئی بلکہ سب گناہوں کے چھوڑنے کی ایک تدبیر ہے اور نہایت مفید تدبیر ہے۔ ضعیف آدمی اس چال سے چلنے میں کبھی نہ کبھی کامیابی حاصل کر ہی لیتا ہے اور ایک دم بوجھ پڑنے سے بعض اوقات ہمت ٹوٹ

جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان پر بعض اوقات ایک حالت کا غلبہ ہوتا ہے کہ شوق میں آ کر بہت سی طاعات شروع کر دیں اور کل گناہوں سے یک دم تائب ہو گیا، پھر وہ شوق کی حالت رفع ہو جاتی ہے اور یہ شخص دنیا کے تعلقات میں پہلے سے پھنسا ہوا ہوتا ہے اس لئے سب گناہوں کو چھوڑنا اس وقت بہت بار معلوم ہوتا ہے اور وہ حالت اور وہ ذوق شوق کی حالت رفع ہو جاتی ہے اور یہ شخص دنیا کے تعلقات میں پہلے سے پھنسا ہوا ہوتا ہے، اس لئے سب گناہوں کو چھوڑنا اس وقت بہت بار معلوم ہوتا ہے اور وہ حالت اور وہ ذوق شوق اب رہا نہیں، تو جب یہ دیکھتا ہے کہ مجھ سے ترک تعلقات نہیں ہو سکتا پھر وہ دوبارہ ان تعلقات میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اب تقلیل بھی نہیں کرتا اور بلا لحاظ چھوٹے اور بڑے اور مکروہ اور حرام کے سب میں پڑ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ترک دنیا ہمارے بس کا کام نہیں جس طرح کام چل رہا تھا چلنے دو بلکہ بعض وقت اس توبہ پر پچھتاتا ہے کہ اس کی بدولت یہ تنگی پیش آ ئی۔

ترک گناہ پر پچھتانا نہایت منکر حالت ہے:

یہ حالت نہایت ہی منکر حالت ہے توبہ نہ کرنا اتنا بڑا جرم نہ تھا جتنا کہ توبہ کر کے پچھتانا جرم ہے۔ آپ ہی بتایئے کہ ایسے شخص کے لئے سب گناہوں کو ایک دم چھوڑنا اچھا ہے یا تھوڑا تھوڑا چھوڑنا اور ایسا ہم نے دیکھا ہے کہ تھوڑا تھوڑا چھوڑنے والا بالکل نیک اور صالح بن گیا ہے تو اگر چہ یہ میرے منہ سے نکلنے کی بات نہ تھی مگر کام کی بات ضرور ہے اور خدارا اس کے سمجھنے میں غلطی نہ کیجئے گا اور اس سے کسی گناہ کی اجازت اخذ نہ کیجئے گا اور میں ایک اور توسع کرتا ہوں وہ یہ کہ ایک گناہ تو وہ ہے جس کے ترک سے کوئی دُنیوی تکلیف ہوتی ہے جیسے ایک شخص جس کی آمدنی دس روپیہ ہے اور خرچ بیس روپیہ ہے اس سے کہا جائے کہ مال حرام سے بچو تو فاقہ کی تکلیف برداشت کرنا اس کو مشکل ہے۔ گو یہ عذر ارتکاب معصیت کے لئے کافی نہیں مگر خیر میں اخار للعسان اس کو عذر ہی قرار دیتا ہے۔

گناہ بے لذت فوراً چھوڑنے کی ضرورت:

لیکن وہ گناہ جس کے ترک میں تکلیف بھی نہیں ان کے نہ چھوڑنے کا کیا سبب اور وہ کون سی بات ہے جس کو ان کے لئے ایک دن کے واسطے بھی عذر کہا جائے جیسے داڑھی منڈانا، ٹخنوں سے نیچا پاجامہ پہننا، غیبت وغیرہ کرنا ان کے چھوڑنے میں کونسی تکلیف ہوتی ہے۔ بس یہ دوسری قسم کے گناہ ایک دم اور آج ہی چھوڑ دیجئے میں اس کو مخاطب بناتا ہوں جسکو اپنی اصلاح کی کچھ بھی فکر ہے مگر افسوس آج کل حس کی بھی کافی کمی ہے اور مجھ کو بڑی شکایت اس کی بھی ہے کہ ہم لوگوں کو غور کرنے کی عادت بالکل نہیں رہی حالانکہ جو کوئی اپنی اصلاح کا طالب ہے عورت ہو یا مرد اس کے

واسطے پہلی سیڑھی یہی ہے کہ تفکر کی عادت ڈالے۔

افعال کی دو قسمیں:

اپنے تمام افعال میں غور کرے کہ کون سے اچھے ہیں اور کون سے برے، پھر ان بروں کی فہرست بنائے تو یہ افعال دو ہی قسم کے نکلیں گے ایک وہ ہوں گے جن کے چھوڑنے میں تکلیف ہے اور دوسرے وہ جن کے چھوڑنے میں تکلیف نہیں۔ سو اس دوسری قسم کو ایک دم الگ کرے کیونکہ ان کے واسطے کسی قسم کا عذر ہی نہیں اور یہ بھی نہیں ہوسکتا تو پھر کوئی دوسرا تو منہ میں لقمہ دینے کے لئے آنے سے رہا۔ آخر مکلّف ہونا کیا معنی مثلاً میں کہتا ہوں کہ غیبت اور شیخی کے چھوڑنے میں کون سی تکلیف ہے مگر یہ بھی نہیں چھوڑا جاتا یامخصوص یہ شیخی کا مرض عورتوں میں تو بہت ہی ہے اور یہ عجیب فرقہ ہے جہاں مصالح کے سبب ضرورت ہے شیخی کی (یعنی شیخی کی صورت کی) وہاں تو بے حس پنجابی ہیں ایک بی بی تھیں جو خود پائنتی پر بیٹھی رہتیں اور ماما سرہانے بیٹھی رہتی حالانکہ عام طور پر نوکروں کے ساتھ ایسا برتاؤ ان کے دماغ کو تباہ کردیتا ہے۔ ایک دفعہ ایک مجمع میں میری مجلس میں ایک معمولی شخص صدر مقام پر بیٹھ گیا، میں نے اس کو اُٹھادیا، جس میں دو مصلحتیں تھیں۔ ایک یہ دوسرے اس جگہ مستحقین موجود تھے جو بمصلحت وہاں بٹھائے جاتے تھے۔ دوسرے یہ کہ جب وہ شخص اس کا عادی ہوگا تو کہیں مار کھائے گا یہ اس شخص کی آبرو بچانے کی تدبیر ہے ممکن ہے کہ میری یہ توجیہات بہانہ نفس ہوں، میں تنزیہہ نفس نہیں کرتا اور اپنے فعل کو خواہ مخواہ مستحسن نہیں کہتا۔ نفس کی شرارتیں ایسی پوشیدہ ہوئی ہیں کہ ہم جیسوں کو تو کیا بڑے بڑے مبصروں کو بھی بعض وقت دھوکہ ہوجاتا ہے اسی واسطے اکابر ہمیشہ اس سے ڈرتے رہے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام اپنی عصمت بیان کرنے کے بعد حالانکہ بالکل واقعی تھی یہ بھی فرمایا وما ابریٔ نفسی خیر نیت میری کچھ بھی ہو مگر ہر حال میں مصلحت اس میں ضرور ہے۔

شیخی عورتوں کی سرشت میں داخل ہے:

عورتوں کے بڑے اختیارات زبان پر ہوتے ہیں جب ذرا سی بات پر اسی ماما کو دے دوں چھوٹی خاک ملی چھاڑو ماری کہہ ڈالتی ہیں تو یہ تواضع کیسی؟ اصل یہ ہے کہ تواضع وغیرہ کچھ نہیں حقیقت اس کی بے حسی ہے کیونکہ تواضع اور شیخی ضدیں ہیں دونوں جمع نہیں ہوسکتیں، دیدوں پھوٹی کہنے کے وقت تو اس کو جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھتیں جو کہ یقیناً شیخی ہے اور باوجود اس کے اس کو سرہانے بٹھاتی ہیں جب شیخی موجود ہے تو اس کی ضد کیسے موجود ہوسکتی ہے تو ضرور اس سرہانے

بٹھانے کی وجہ تواضع کے سوا کچھ اور ہے اور وہ بجز بے حسی کے اور کیا ہے۔ کوئی کام بھی اپنے موقع پر نہیں۔ شیخی جس موقع پر کارآمد ہے یعنی حفظ مراتب میں وہاں اس کا ظہور نہیں ہوتا وہاں بے نفس بن جاتے ہیں۔ یہ بے نفسی نہیں بلکہ بے حسی اور بے تمیزی ہے اور جس موقع پر شیخی مذموم اور ممنوع ہے وہاں استعمال کیا جاتا ہے اور یہ ذمیمہ عورتوں کی تو گویا سرشت میں داخل ہے۔ اٹھنے میں بیٹھنے میں بولنے چالنے میں اور زیور میں تو ایسا اس شیخی کو نباہا ہے کہ اس کی بناوٹوں کی بناء اسی پر وہ زیور بلا باجہ کا نہ پہنیں گی۔ باجہ میں فائدہ یہ ہے کہ جب کہیں جائیں تو پہلے سے مردوں عورتوں سب کو آپ کی تشریف آوری کی اطلاع ہو جائے جب کہیں جائیں گی تو ڈولی سے اترتے ہی گھر میں اطلاع کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ بیگم صاحبہ آئی ہیں کوئی ان سے پوچھے کہ کون سے ملک کی بیگم ہیں یا یہ لفظ نواب بے ملک کا ترجمہ ہے وہاں پہنچ کر ایسی جگہ بیٹھیں گی کہ سب کی نظر ان پر پڑے۔ ہاتھ کان ضرور دکھلائیں گی۔ ہاتھ گو ڈھکے ہوئے ہوں مگر گرمی کے بہانہ یا کسی ضرورت کے بہانے کھول کر ضرور دکھلائیں گی کہ ہمارے پاس اتنا زیور ہے اور اگر کوئی بی بی بہت ہی مہذب ہوئیں اور قسمت سے بہشتی زیور پڑھی ہوئی ہیں اور دکھاوے اور شیخی کی مذمت ان کو یاد ہوئی تو خدا سلامت رکھے باریک کپڑوں کو وہ ان کے بلا ارادہ ہی سب بناؤ سنگار دکھلا دیتے ہیں اور اگر کسی کی نظر نہ بھی پڑی تو کھجلی اٹھا کر کان تو دکھا ہی دیں گی جس سے اندازہ کیا جاوے کہ جب اتنا زیور ان کے کانوں میں ہے تو گھر میں روپیہ تو نہ معلوم کتنا ہوگا۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا چاہے گھر میں خاک نہ ہو روپیہ کے بجائے چوہے ہی قلابازیاں کھاتے پھرتے ہوں۔ یہ گناہ تو ہاتھ پیر سے کئے پھر وہاں بیٹھتے ہی سوائے غیبت کے اور دوسرا مشغلہ ہی نہیں۔ ان عورتوں کو شیخی کے مواقع دو ملتے ہیں۔ خوشی کا اور ایک غمی کا، انہی دو موقعوں میں اجتماع ہوتا ہے۔

عورتوں کا اجماع ہی خالی از مفاسد نہیں:

اسی واسطے میں بلا ضرورت شرعی ان کا اجتماع ہی مناسب نہیں سمجھتا اور اگر اجتماع ہو بھی تو شیخی سے بچنے کے لئے ایک ترکیب میں نے مردوں کو سکھلائی ہے گو عورتیں اس سے بہت خفا ہوتی ہیں مگر وہ شیخی کا علاج ہے وہ ترکیب یہ ہے کہ عورتوں کو یہ تو مت کہو کہ جمع نہ ہوں یہ تو ہونا مشکل ہے اور اس میں وہ معذور بھی ہیں کیونکہ الجنس یمیل الی الجنس عورت کا دوسری بیبیوں سے ملنے کو کبھی تو جی چاہتا ہی ہے مگر یہ کرو کہ کہیں جاتے وقت کپڑے نہ بدلنے دیا کرو، اس کے لئے مردانہ حکومت سے کام لو اور جب کہیں جائیں تو سر پر کھڑے ہو کر مجبور کرو کہ کپڑے نہ بدلنے

پائیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ گھر میں تو بھنگنوں اور ماماؤں کی طرح رہیں اور ڈولی آتے ہی بن سنور کر بیگم صاحب بن جائیں ہر چیز کی کوئی غایت اور غرض ہوتی ہے ان سے کوئی پوچھے کہ اچھے کپڑے پہننے کی غایت اور غرض کیا صرف غیروں کو دکھانا ہی ہے۔ تعجب ہے کہ جس کے واسطے یہ کپڑا بنا اور جس کے دام لگے اس کے سامنے تو کبھی نہ پہنا جائے اور غیروں کے واسطے پہنا جائے یہ باتیں ذرا شرم کی سی ہیں مگر ضرورت اصلاح کے لئے کہی جاتی ہیں۔ حیرت ہے کہ خاوند سے کبھی سیدھی منہ نہ بولیں کبھی اچھا کپڑا اس کے سامنے نہ پہنیں اور دوسروں کے گھروں میں جائیں تو شیریں زبان بھی بن جائیں اور کپڑے بھی ایک دوسری سے بڑے اچھے پہن کر جائیں کام آویں غیروں کے اور دام لگیں خاوند کے، یہ کیا انصاف ہے اس تصنع کی یہاں تک نوبت پہنچی ہے۔

ایک حکایت:

ہمارے وطن میں ایک بی بی چرخہ کات رہی تھی اور اس زمانہ میں ان کی ساس مر گئی تھی تو کوئی عورت جو ان کے یہاں تعزیت کے لئے آئی آہٹ پاتے ہی چرخہ کو اٹھایا اور اندھے باؤلوں کی طرح ایک کوٹھری میں پھینک آئیں۔ کیواڑ بند کر دیئے تاکہ مہمان کو معلوم نہ ہو، کیونکہ بیبیوں اوّل تو کیا آپس میں تمہیں اوروں کے گھر کی اور اوروں کو تمہارے گھر کی یہ خبر نہیں کہ یہ چرخہ کاتتی ہے۔ دوسرے چرخہ کاتنا جو ایسا عیب کیا ہی ہے جسے چھپانے کی ضرورت ہو۔ جب سے بیبیوں نے اس قسم کی محنتیں چھوڑ دیں تندرستیاں خراب ہو گئیں ہمیں ہمیشہ دوا کا قدح منہ سے لگا رہتا ہے اور جن قوموں میں اب بھی ان کا رواج ہے دیکھو کیسی تندرست ہیں۔ خدا غارت کرے اس شیخی کو دین کا گناہ تو ہے ہی دنیاوی نتائج بھی اس کے ایسے ہیں کہ صحت جیسی چیز غارت ہو گئی۔ غرض مردوں سے میں کہتا ہوں کہ ان کی اس شیخی کو مٹانے کی یہ تدبیر کرو کہ کہیں جاتے وقت ان کو کپڑے نہ بدلنے دو، اور عورتیں بھی سن لیں کہ اگر کپڑے بالکل ہی میلے ہوں تو خیر بدل لو وہ بھی سادھے ورنہ ہرگز نہ بدلو۔ سیدھے سادھے کپڑوں میں مل آیا کرو، ملنے سے جو غرض ہے وہ اس صورت میں بھی حاصل ہوگی اور اخلاق کی درستی علاوہ برآں ذرا کر کے دیکھو تو اس کے فوائد معلوم ہوں گے اور اگر یہ خیال ہو کہ کہ اس میں ہماری حقارت ہوگی تو ایک جواب تو اس کا یہ ہے کہ نفس کی تو حقارت ہی ہونی چاہئے اور دوسرا جواب تسلی بخش یہ ہے کہ جب ایک بستی کی بستی میں یہ رواج ہو جائے گا کہ سیدھی سادھی طرح سے مل لیا کریں گے تو انگشت نمائی اور تحقیر بھی نہ رہے گی اور کیوں بیبیوں اگر ایک غریب عورت جو مزدور کی بی بی ہے وہ کہیں ٹھاٹ سامان سے بھی جاتی ہے حتیٰ کہ بیگم بھوپال

ہی کیوں نہ بن جائے مگر جن بیبیوں کو اس کے گھر کی حالت معلوم ہے وہ تو یہی کہیں گی کہ نگوڑی مانگے کا کپڑا اور زیور پہن آئی ہے اس پر اتراتی ہے مگر پھر بھی اس تصنع میں ایسا عورتوں کا غلو ہوا ہے کہ اس تصنع کے اہتمام میں خاوند کی اچھی سے اچھی آمدنی بھی ان کو کافی نہیں ہوتی اور سب آمدنی لیکر مرد کو بے وقوف بنانا چاہتی ہیں جو مرد اُن کی مرضی کے موافق چلے اور ان سے حساب کتاب نہ لے اور آنکھ بند کر کے خرچ کرنے دے وہ ان کے نزدیک بہت اچھا ہے۔ آپس میں بیٹھ کر فخر کرتی ہیں کہ میرے میاں تو ایسے ہیں کہ دے کر پوچھتے بھی نہیں کہ کہاں خرچ کیا۔ گویا جو مرد بالکل اُلو اور احمق ہو وہ ان کے نزدیک اچھا ہے اور جو منتظم ہو اور دیکھ بھال کر خرچ کرے تو اس کو کہتی ہیں کہ ہمارے میاں بڑے جلاد ہیں، بڑے ظالم ہیں۔ کیا مجال ہے کہ ہم کبھی پیٹ بھر کر کھا بھی لیں۔ ہم تو اس کے راج میں کھانے پینے کو بھی ترس گئے۔ غرض ان کو ریاء اور سمعہ اور تفاخر میں آزاد چھوڑ دو جب تو خیر ہے ورنہ پھر منہ بھی سیدھا نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ باتیں کس قدر معیوب ہیں جن کو دنیا کے عقلاء نے بھی عیب کہا ہے۔ کسی اخلاقی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے یہی لکھا ہوگا کہ ان عیبوں سے بچو، مگر یہ عیب ایسے مرکوز ہیں کہ کوئی بات بھی عورتوں کی ان سے خالی نہیں، ان کا دن رات تفاخر ہی میں گزرتا ہے۔

دین دار اور تعلیم یافتہ عورتوں میں بھی شیخی کا مرض ہے:

خاوند پر تفاخر، جائیداد پر تفاخر، مکان پر تفاخر، نسب پر تفاخر، اور یہ مرض جاہل عورتوں تک محدود نہیں، لکھی پڑھی عورتوں میں بھی موجود ہے۔ حتیٰ کہ جو اپنے کو دین دار اور عالم سمجھتی ہیں ان میں بھی موجود ہے مجمعوں میں بیٹھ کر کہتی ہیں میں نے مشکوٰۃ شریف پڑھی ہے۔ میں نے جلالین شریف پڑھی ہے۔ ایک جگہ کی عورتیں بہت تعلیم یافتہ اور دیندار ہیں اور باعمل بھی ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل عمل بالدین کے معنی صرف نماز، روزہ کے رہ گئے ہیں باقی رہے اخلاق سو ان کی طرف کسی کا یہ خیال بھی نہیں جاتا کہ ان کو بھی کچھ دین سے علاقہ ہے۔ خیر جو معنی بھی ہوں وہاں کی عورتیں بہت دیندار ہیں۔ ان عورتوں نے مجھ سے وعظ کی فرمائش کی تو مجھ کو بہت سوچنا پڑا کہ ان کو کس چیز کی اصلاح کی ضرورت ہے جس کا میں بیان کروں۔ بہت سوچ کر سمجھ میں آیا کہ اور ظاہری امراض ان میں نہ سہی مگر شیخی اور فضول خرچی ان میں ضرور ہے۔ میں نے اسی کا وعظ کہا اس کو سن کر ان مستورات نے میرے پاس کہلا بھیجا کہ ہماری آج آنکھیں کھلیں اور مجھے یہ عیب اس طرح معلوم ہوا تھا کہ ہمارے یہاں وہ عورتیں ایک روز صبح سے شام تک رہیں اور یہی مشغلہ رہا۔ ایک کہتی تھی کہ میں نے مشکوٰۃ شریف پڑھی ہے۔ دوسری کہتی تھی کہ میں نے شرح وقایہ پڑھا ہے۔

تیسری کہتی تھی میں نے جلالین شریف پڑھی ہے۔ میں نے دل میں دعا کی اے اللہ ان کے منہ سے وعظ کی فرمائش ہو۔ چنانچہ شام ہی کو وعظ کی فرمائش ہوئی۔ بیان ہوا، الحمدللہ بہت نفع ہوا، سب نے بہت دعائیں دیں۔ یہ ان کے قرآن وحدیث کے پڑھنے کی برکت تھی کہ ان کو نفع محسوس ہوا اور کہنا بھی دلسوزی سے تھا، اس کا بھی اثر ہوتا ہے جب پڑھی لکھی اور دیندار بیبیوں تک میں تفاخر اس طرح رچا ہوا ہے تو دنیا داروں میں کیوں نہ ہو۔ اسی تفاخر سے عورتوں کو بار بار کپڑے بدلنا گھنٹوں وقت اس میں صرف کرنا زیور بہت وزنی لادنا باجود وفی نفسہ شاق ہونے کے ان کو آسان ہے۔ غرض ہر کام میں شیخی اور تفاخر موجود ہے۔ عورتوں میں زیادہ اور مردوں میں بھی کافی درجہ میں ان شادی بیاہ کی رسموں کو اور تقریبات کو دیکھ لیجئے کہ ہر قسم کا مبنی تفاخر ہی پر ہے۔ جہیز دیں گے بیٹی کو لیکن دکھائیں گے تمام برادری کو ایک جگہ نیوتہ دیا گیا جس میں تین گنیاں تھیں اول گنیاں دیں لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ تین گنیوں کو کون دیکھے گا اس واسطے ان کے روپیہ بھنا کر سینی میں رکھ کر بھیجے گئے تاکہ اہل مجمع کی نظریں تو پڑیں۔ باجہ گاجہ اور جتنے سامان شادی بیاہ کے ہیں سب کی بناء اسی تفاخر اور نمود پر ہے اور یہ تفاخر گو مرد بھی کرتے ہیں مگر اصل جڑ اس میں عورتیں ہی ہیں۔ یہ اس فن کی امام ہیں اور ایسی مشتاق اور تجربہ کار ہیں کہ نہایت آسانی سے تعلیم دے سکتی ہیں جو آدمی جس فن کا ماہر ہوتا ہے اس کو اس فن کے کلیات خوب منکشف ہوتے ہیں۔ یہ ایک کلیہ میں سب کچھ سکھا دیتی ہیں جب ان سے پوچھا جائے کہ شادی بیاہ میں کیا کیا کرنا ہے تو ایک ذرا سا کلیہ چٹکلہ سا بتا دیتی ہیں کہ زیادہ نہیں اپنی شان کے موافق تو کرلو یہ کلیہ نہیں بلکہ کلھیا ہے اور کلھیا بھی ایسی ہے کہ ہاتھی بھی اس میں سما جاوے۔ یہ تو اتنا سا جملہ کہہ کے الگ ہوگئیں کرنے والوں نے جب اس کی شرح پوچھی تو وہ اتنی طویل ہوئی کہ ہزاروں جزئیات اس میں سے نکل آئیں جن سے دنیا کی بھی بربادی ہوئی اور آخرت کا بھی کوئی گناہ نہیں بچا یہ شیطان کا سا شیرہ ہے جس کا ایک قصہ ہے۔

شیطان کے شیرے کا قصہ:

شیطان سے کسی نے کہا کہ میاں تم بڑے فساد کراتے ہو، کشت وخون کرا دیتے ہو، گھر کے گھر برباد کرا دیتے ہو۔ شیطان نے کہا کہ مجھے مفت میں بدنام کر رکھا ہے میں تو کچھ بھی نہیں کرتا، چلو میں تمہیں نمونہ دکھلا دوں۔ حلوائی کی دکان پر پہنچے، شیطان نے ایک انگلی بھر شیرہ دیوار پر لگا دیا اور اسی شیرہ پر مکھیاں آ بیٹھیں۔ ان مکھیوں پر ایک چھپکلی آ گئی۔ اتفاق سے دکاندار کی بلی آ گئی۔ وہ چھپکلی پر دوڑی۔ ایک خریدار سوار کے ساتھ کتا تھا۔ وہ بلی پر جھپٹا۔ حلوائی نے غصہ میں آ کر پتھر اس

کتے کو مار دیا۔ اس کتے کے مالک یعنی سوار کو جوش آیا اس نے حلوائی کے ایک تلوار ماری۔ بازار والوں نے جمع ہو کر اس سوار کو قتل کر دیا۔ فوج میں خبر ہوگئی۔ انہوں نے بازار والوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ شیطان نے کہا دیکھا انصاف سے کہئے میرا کیا قصور، میں نے تو انگلی بھر شیرہ لگا دیا تھا اور شیرہ لگانا کوئی جرم نہیں اور اس قصہ میں تو اک انگلی ہی بھر شیرہ تھا جس کا طول یہاں تک کھنچا اور عورتوں کے قبضہ میں تو اس کی ایک بھری ہوئی مشک ہے جب چاہا ذرا سا نکال دیا، پھر اس کو مردوں نے بڑھا لیا۔ دیکھئے انہوں نے تو ایک لفظ یہ کہہ دیا تھا کہ اپنی شان کے موافق کرلو، جس کو مردوں نے شرح کرا کرا کے اتنا بڑھایا کہ ریاستوں کی ریاستیں غارت ہوگئیں۔ ہزاروں کبیرہ گناہ سرزد ہو گئے اور عورتوں کو ایک آسانی یہ بھی ہے کہ ان پر کوئی فتویٰ نہیں لگتا کیونکہ فتویٰ لگانے والے مولوی ہیں اور عورتیں پردہ کی وجہ سے ان کے سامنے ہیں، ہاں کوئی مولون ہو تو روکے۔

عورتوں کو رسوم نہ کرنا آسان ہے:

لہٰذا میں کہتا ہوں اور بیبیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ ان کو چاہئے کہ مردوں کو روکیں۔ ان کا روکنا بہت زیادہ موثر ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اصل بانی ان قصوں کی لب ولہجہ موثر ہے بلاغت عورتوں پر ختم ہے، فصاحت تو نہیں ہے کیونکہ فصاحت کے لئے الفاظ کی عمدگی شرط ہے اس سے آج کل مستورات بوجہ بے علمی کے بے بہرے ہیں۔ ہاں بلاغت بمعنی تاثیر عنوان نہ کہ اصطلاحی جو فصاحت پر موقوف ہے یہ پوری پوری ہے اس لئے ان کا کلام بے حد موثر ہوتا ہے۔ ان کا کہنا دل میں گھس جاتا ہے اس لئے اگر یہ چاہیں تو بہت جلد روک سکتی ہیں اور مردوں نے ان کاموں میں امام بنا بھی ان ہی کو رکھا ہے خود کچھ بھی نہیں کرتے۔ تمام کام تقریبات کے عورتوں سے پوچھ پوچھ کر کرتے ہیں۔ کانپور میں ایک بارات آئی تو لڑکی والے سے احباب نے پوچھا بارات کہاں ٹھہرائیں۔ اس نے کہا اس میں تمہیں کیا دخل ہے۔ ننھی کی اماں سے پوچھ لو اتنی سی بات کے لئے بھی ننھی چنی کی اماں سے پوچھنے کی ضرورت تھی۔ غرض مردوں نے ایسی اپنی مہار عورتوں کے ہاتھ میں دی ہے کہ اتنی اتنی سی بات میں بھی ان کے خلاف نہیں چل سکتے، حالانکہ ان کو شریعت سے پوچھ کر کام کرنا چاہئے تھا بت کدہ سے نکل کر مسجد میں آنا چاہئے تھا مگر یہ تو پیرانی صاحبہ سے پوچھ رہے ہیں:

از مدرسہ بکعبہ روم یا بہ میکدہ ... اے پیرہ بگو کہ طریق صواب وحیست

کبھی کسی مرد نے کسی مولوی سے جا کر نہ پوچھا کہ شادی میں فلاں فلاں کام کریں یا نہ کریں یہ استفتے عورتوں ہی سے ہوتے ہیں پھر جیسی وہ مفتی ہیں ویسے ہی فتوے بھی ہوتے ہیں۔ مردوں کو

تو یوں بے وقوف بناتی ہیں۔

مستورات کا شادی کی تقریبات میں پردے کو پس پشت ڈالنا:

اور خود تقریبات میں ایسی منہمک ہوتی ہیں کہ پردہ بھی نہیں رہتا۔ بہشتی اور کمیوں کے لئے تو رواج ہی یہ ہے کہ بیبیاں نہیں اٹھتیں اور پردہ نہیں کرتیں وہ آنے والا پردہ کر لیتا ہے اس طرح کہ اپنے منہ پر ایک کپڑا ڈال لیتا ہے۔ یہ ترکیب اس معنی پر تو بڑی عقل کی بات ہے کہ پچاس شخصوں کو اٹھنا اور پردہ کرنا مشکل ہے بجائے اس کے ایک ہی کو کرنا پڑتا ہے مگر کوئی عقلمند ان سے پوچھے کہ کیا وہ کپڑا ایسا ہوتا ہے جس میں کچھ نظر نہ آوے اور پردہ کے لئے کافی ہو جاوے، اگر وہ کپڑا ایسا ہے تو وہ منہ پر ڈال کر چلتا کیسے ہے، راستے کیسے دیکھتا ہے اور پانی ڈالنے کو گھڑونچی تک کیسے پہنچ جاتا ہے جبکہ بیچ میں پلنگ پیڑھی اور تمام سامان پھیلا پڑا ہوتا ہے۔ یہ تو بہت ہی موٹی بات ہے جب وہ پلنگ پیڑھی اور راستے کو دیکھتا ہے تو بیبیوں کو کیسے نہیں دیکھتا پھر جب اس کا دیکھنا گوارا ہے تو اس تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے کہ کپڑا منہ پر ڈالے بس زمانہ تقریب تک اس سے پردے بالکل ہی کیوں نہ اٹھا دیا جائے یہ تو کمیوں کے ساتھ برتاؤ ہے اور ایرا غیرا مہمان وغیرہ سے بھی گو قصد پردہ کا ہوتا ہے مگر طوفان بے تمیزی میں پردہ وردہ کچھ نہیں رہتا کسی کا سامنا پڑا تو بڑا پردہ یہ ہے کہ کسی کی کمر کے پیچھے سر چھپا لیا۔ غرض اس حد سے زیادہ بے تمیزی ہوتی ہے۔

ظاہری اور باطنی مفاسد:

میں نے ان تقریبات میں ظاہر مفاسد بھی دیکھے اور باطنی بھی۔ ظاہری تو یہ بے تمیزیاں اور باطنی تفاخر ریا معہ تصنع وغیرہ وغیرہ اور ان باطنی مفاسد میں سے تو شاید کوئی مستثنیٰ رہ جاتا ہو لہٰذا میں نے اپنے وطن میں حتی الامکان کل تقریبات کی رسوم اُڑا دیں اور چونکہ بات صحیح اور عقل و نقل سب کے موافق ہے اس واسطے بحمد اللہ تعالیٰ کامیابی ہوئی ایک شخص نے مجھ سے بطور اشکال کے کہا کہ ہم خوشی میں ایک کافی رقم خرچ کرنا چاہتے ہیں اور جبکہ خدا نے مال دیا ہے تو کیوں نہ خرچ کریں۔ سو ان طریقوں کو تو آپ منع کرتے ہیں۔ آخر کوئی طریقہ خرچ کا بھی تو بتائیے۔ میں نے کہا جناب یہ طریقے تو مجموعہ معاصی ہیں اور خلاف عقل بھی ہیں اگر آپ کو خرچ کرنا ہی مقصود ہے تو اس کا طریقہ عقل کے موافق یہ ہے کہ ایک فہرست بنائے غرباء کی اور جتنی رقم آپ کو خرچ کرنی ہو ان کو بانٹ دیجئے اور دیکھئے کتنی شہرت بھی ہو جائے گی گو اس کی نیت نہ ہونا چاہئے اور نفع بھی کس قدر پہنچے گا اور موجودہ رسمیں اور طریقے تو ایسے لغو ہیں کہ جن سے نہ کسی کا فائدہ اور نہ شہرت، فائدہ نہ

ہونے کا ثبوت تو یہ دیکھ لیجئے کہ ریاستوں کی ریاستیں ایک ایک تقریب میں غارت ہو گئیں اور شہرت کی حالت یہ ہے کہ آج کسی نے ہزار روپیہ تقریب میں لگائے کل دوسرے نے ایک ذرا سی بات اور ایجاد کر لی تو کہتے ہیں فلاں نے کیا کیا تھا صاحبو! نفی شہرت کی یہ رائے بھی علی سبیل التنزل تھی۔ رسوم کے خلاف عقل بتلانے کے لئے ورنہ خود شہرت ہی کیا چیز ہے۔ شہرت خود ایک مذموم چیز ہے اور یہ بھی منجملہ ان ہی مفاسد کے لئے جو تقریبات میں ہوتے ہیں پھر قطع نظر عدم جواز کے خود اپنی ذات میں تو سب کی سب ایسی ہیں۔

گہرے تعلق کی ضرورت:

کسی کے دل میں دین ہو تو خود ہی ان سے وحشت ہونے لگے، خواہ جائز بھی ہوں لیکن اگر قلب کو تعلق دوسری طرف ہے تو شغل قلب ہونے کی وجہ سے دین دار کے قلب کو اس طرف ہرگز میلان نہ ہوگا یہ ایک بڑا فتویٰ قلب کا ہے جس کو گہرا تعلق دین سے ہوگا وہ بخوبی اس وحشت کو محسوس کر سکتا ہے اور اگر کسی کو ایسا تعلق نہ ہو تو اس کو یہ تعلق بڑھانا اور پیدا کرنا چاہئے۔ یہ کوئی عذر نہیں کہ ہم کو گہرا تعلق نہیں، کیا دین ایسی چیز ہے جس سے گہرا تعلق نہ ہو اور جس کے قلب کو دین سے تعلق ہوتا ہے وہ دنیا سے مرجھایا ہوتا ہے، پھر مرجھایا ہوا دل کہیں شہرت کو ڈھونڈے گا؟ دنیا کے کاموں میں تو اس کا قول یہ ہوگا کار دنیا کسے تمام نکرد ہر چہ گیرید مختصر گیرید اور وہ دنیا کے ہر کام میں اختصار ڈھونڈے گا جیسے آدمی پاخانہ میں جاتا ہے کہ کام تو پورا کرتا ہے اور بلا قضاء حاجت وہاں سے نہیں اٹھتا مگر ہر وقت اسی خیال میں رہتا ہے کہ کب فراغت ہو اور یہاں سے نکلو اور کوئی ضرورت سے زیادہ وہاں بیٹھے تو یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ اس کو اس مکان سے یا مافی المکان سے دلچسپی اور بے فکر اور بے حس ہے۔

دنیا کے کاموں میں اختصار کی ضرورت:

اسی طرح ہم لوگ اگر دنیا کے کاروبار زیادہ پھیلائیں تو کیسے نہیں کہا جائے گا کہ یہ بے فکری اور بے حسی ہے جو آیت میں نے پڑھی ہے اس میں تعلیم اسی بات کی ہے کہ بے فکر مت رہو جب بے فکری نہ ہو تو ہر کام میں اختصار رہوگا۔

اختصار امیر اور غریب کا الگ الگ ہے:

البتہ ہر شخص کا اختصار جدا جدا ہے۔ غریب آدمی کا اختصار اور ہے اور امیر کا اور، مگر یہ یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ ہر فرقہ نے جتنا سامان بڑھا رکھا ہے یہ حد سے تجاوز اور بے فکری کی دلیل ہے جو اس

تعلیم کے خلاف ہے جواس آیت میں ہے۔غرض ہم کوفکرآخرت ضرورہونی چاہئے اوراس فکر کے دو اثر میں نے بیان کئے توترک گناہ اورتقلیل مباح اوراصل مقصودبھی دونوں ہیں جس طرح بھی ہوں اوراس کاذریعہ تذکرہ موت ہےلیکن وہ صرف ذریعہ ہےاگرکسی کوبدوں تذکرموت کےمقصودحاصل ہوجاوےتواس کوتذکرموت کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ تووسیلہ مقصود ہےخودمقصودنہیں۔

موت ھاذم اللذات ہے:

لیکن عام طورپرتجربہ سے ثابت ہے کہ ذکرموت سے زیادہ کوئی چیزاس فکرمیں سہولت پیدا کرنے والی نہیں اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا ہے اکثروا ھاذم اللذات (سنن الترمذی:۲۳۰۷) (لذات کومٹانے والی کوکثرت سے یادرکھو) دیکھئےحضورصلی اللہ علیہ وسلم نے موت کوہاذم اللذات فرمایاہے۔پس ہرلذت میں اس کویادرکھئے کہ ایک دن موت بھی آئے گی جوتمام لذات کاخاتمہ کردے گی جس کوموت پیش نظرہوگی وہ اگرحلوااورگھی بھی کھائے گاتواس کے منافع توحاصل ہوں گےمگرزبان سے چٹخارے نہ لے گااس کی تحصیل کے لئے یہ مراقبہ آیت میں تعلیم فرمایا گیااوریہ ایسامراقبہ ہےجس سے یہ دونوں مقصودیعنی ترک گناہ اورتقلیل مباح بہت ہی سہولت سے حاصل ہوسکتے ہیں بلکہ یہ ایسی چیزہے کہ نمازاورعبادت کی اصلاح کے لئے بھی کافی ہے۔اس کے منافع کی فہرست کی کچھ ضرورت نہیں،خودذکرموت ہی سب کچھ سکھادے گا۔باقی فی نفس الامرذکرموت ذریعہ ہےاورمقصودوہی ہے جومیں نےعرض کیااورذریعہ بالذات مقصود نہیں ہوتااس میں تبدیلی بھی ممکن ہوتی ہے۔اس لئےمقصوداس ذریعہ ہی پرمنحصرنہیں جس ذریعہ سے حاصل ہوسکے۔اجازت ہےلیکن چونکہ اس میں سہولت ہےاس واسطے یہ طریقہ تعلیم فرمایا گیا جیسےعراقی نےاس مصلحت کے لئے ایک طریق کی درخواست کی ہے۔

صنما رہ قلندر سزدار بمن نمائی کہ دراز و دو زینم رہ و رسم پارسائی

”مجھےتوطریق عشق میں جلانے زہدخشک کاطریق دورودرازکاراستہ ہے۔“

پارسائی طریق سلوک کوکہتے ہیں اوروہ قلندرجذب کوطریقہ جذب چونکہ اقرب طرق ہےاس واسطےاس کاسوال کرتے ہیں گوبالذات مقصودنہیں اسی طرح مقصودمذکورفی المقام کی تحصیل کے لئےممکن ہےاوربھی طریقے ہوں لیکن مراقبہ مذکورہ سے زیادہ سہولت ہوجاتی ہے۔یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ مقصود کے ساتھ اس کے ذرائع بھی بیان فرمادیتے ہیں اورذرائع میں سےبھی جواسہل اورزیادہ موصل الی المقصود ہواس کی تعلیم فرماتے ہیں۔تقریربالاسے آیت میں اس مراقبہ کے مذکورہونے پرمتنبہ کیا گیاہے۔

خلاصہ وعظ:

تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہم کو مراقبہ موت کی ضرورت ہے اور اس میں اس کا بہت آسان طریقہ بتلاتا ہوں جس سے آپ کے کسی کام میں بھی حرج نہ ہوگا۔ مراقبہ کے لئے آپ وہ وقت دیجئے جو آپ سے بیکار ہو اور وہ سونے کا وقت ہے۔ جب پلنگ پر لیٹئے تو پندرہ بیس منٹ اس مراقبہ کے لئے دیجئے کہ سوچیئے یہ سونا مشابہ موت کے ہے مع تفصیل ان امور کے...... جو موت کے وقت پیش آتے ہیں کہ اس طرح بیمار ہو کر پلنگ پر پڑنا ہوگا، دنیا کے سب کام جیسے اس وقت ختم ہو گئے اس وقت بھی ختم ہو جائیں گے دینا لینا اور جو حقوق باقی رہ گئے ہیں سو کر ان سے پیچھا نہیں چھوٹتا ایسے ہی موت سے بھی ان سے رہائی نہ ہوگی۔ نیز ان باتوں کو تفصیل وار یاد کیجئے جو موت کے بعد پیش آئیں گی جو خبر صحیح سے ثابت ہیں اور جو یقیناً پیش آنے والی ہیں۔ اس کو ذہن میں حاضر کیجئے کہ مرنے کے بعد تمام قویٰ معطل ہو جائیں گے ہمارا چلتا پھرتا جسم مٹی کا ڈھیر ہو جائے گا جس کو چار آدمی کندھوں پر لے چلیں گے، پھر ہم کو اپنے عزیز قریب اپنے ہاتھوں سے ایک تنگ و تاریک گڑھے میں ڈال آئیں گے اور مٹی دے کر تنہا چھوڑ آئیں گے، پھر منکر نکیر سے سابقہ پڑے گا۔ یہ کیسی سخت منزل ہے خدا جانے ان سے کیا معاملہ گزرے، پھر خاک میں مل جانا ہو گا اور قیامت تک اسی طرح رہنا ہوگا۔ پھر قیامت آئے گی اور ایک ایک بات پر جواب دہی کرنی ہوگی۔ میدان حشر میں گرمی کی یہ حالت ہوگی، میزان قائم ہوگی، پل صراط پر چلنا ہوگا۔ غرض ان تمام واقعات کو جو قیامت نامہ اور دیگر کتابوں میں مذکور ہیں ذہن میں حاضر کیجئے اور روزمرہ اس کا التزام کیجئے۔ انشاء اللہ بہت جلد تنبہ ہوگا اور فکر پیدا ہو جائے گی۔ جب فکر ہو جائے گی تو دل خود بخود اس طرف چلے گا کہ ان احوال سے بچنے کی کوئی تدبیر ہونی چاہئے ان تدبیروں کے معلوم کرنے کے لئے علم دین کا شوق ہوگا اور ہمت ہوگی اور اعمال خود بخود ہونے لگیں گے۔

تذکرہ موت پر بزرگوں کے کلمات

اگر ہو سکے تو بزرگوں کے کلمات سے مذکورہ موت پڑھا کیجئے۔ مثلاً اشعار ہیں:

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
خوب ملک روس ہے اور کیا زمین طوس ہے
گر میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجئے زندگی
اس طرح آواز طبل، ادھر صدائے کوس ہے
صبح سے شام چلتا ہے مئے گلگوں کا دور
شب ہوئی تو ماہرویوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی ایک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں تو تو قید آز کا محبوس ہے
لے گئی یک بارگی گور غریباں کی طرف
جس جگہ جان تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو، تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے
یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کہا کاؤس ہے
پوچھ ان سے آج تو حشمت دنیا کا حال
پاس ان کے کچھ غیر از حسرت و افسوس ہے

اَلۡجَمۡعُ بَیۡنَ النَّفۡعَیۡنِ

یہ وعظ ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۴۴ھ بعد جمعہ بمقام مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون حضرت والا نے ارشاد فرمایا، جس کو شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۴۰۰ تھی

دین کا ہر عمل مجاہدہ ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ دین تقلید ہے اور تقلید نفس کو گراں ہے ورنہ اعمال شرعیہ میں کوئی عمل فی نفسہ دشوار یا طاقت سے باہر نہیں، سب اعمال فی نفسہ آسان وسہل ہیں۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُوۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ.

اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

وَالصَّابِرِیۡنَ فِی الۡبَأۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیۡنَ الۡبَأۡسِ اُوۡلٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَاُوۡلٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ. (البقرہ:۱۷۶)

(اور صبر کرنے والے سختی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں)

بیان کے قبل عرض کر دینا ضروری ہے کہ مجھ کو بعض عذر ایسے ہیں جن کی وجہ سے نہ بلند آواز سے بیان کر سکتا ہوں نہ دیر تک بیان کر سکتا ہوں لیکن اگر سامعین توجہ سے سنیں اور باتیں نہ کریں تو انشاءاللہ سب کو آواز پہنچ جائے اور بیان اگر تھوڑی دیر بھی ہوا تو امید ہے کہ ضرورت کے موافق کافی ہوگا۔

ابتدائے بیان:

اب میں بیان شروع کرتا ہوں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شرائط کمال کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے اوپر لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡھَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ نیکی یہی نہیں کہ تم منہ کرو مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف) غیر کمال کو کمال سمجھنے کی نفی تھی لکن البر من اٰمن باللّٰہ سے شرائط کا ذکر شروع ہوا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جس کو تم کمال سمجھے ہو وہ کمال کافی نہیں بلکہ کمال

مقصود کی تحصیل کے یہ شرائط ہیں جو ہم بتلاتے ہیں۔ان شرائط کی تحصیل میں سعی کرو تو کمال مقصود حاصل ہو جائے گا اور چونکہ یہاں شرائط کمال مذکور ہیں اسی لئے یہ آیت تمام ابواب دین کو جامع ہے گو تفصیلاً نہیں مگر اجمالاً مہارت دین سب اس میں مذکور ہیں۔ چنانچہ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (نیکی یہ ہے کہ جو اللہ پر ایمان لے آئے اور یوم اخرت پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور نبیوں پر) میں امہات عقائد مذکور ہیں۔وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ (اور مال دے اللہ کی محبت سے رشتہ داروں اور یتیموں' مسکینوں اور سوال کرنیوالوں اور قیدیوں کو قید سے چھڑانے کیلئے) میں عبادات مالیہ کا ذکر ہے۔وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ میں عبادات بدنیہ کا بیان ہے اور چونکہ نماز عبادات بدنیہ میں سب سے اعلیٰ واہم ہے اور جملہ انواع عبادات کو جامع ہے اس لئے اسی کا ذکر پر اکتفاء فرمایا اور یہ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ اس مقام پر امہات ابواب دین کو بیان کیا گیا ہے جزئیات کی تفصیل نہیں کی گئی کیونکہ اس کے لئے تو بڑا وقت چاہئے اس کے بعد وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ظاہر میں مکرر معلوم ہوتا ہے کیونکہ وَ اٰتَى الْمَالَ میں عبادات مالیہ کا ذکر آ چکا ہے اور زکوٰۃ بھی عبادات مالیہ میں سے ہے مگر واقع میں یہاں تکرار نہیں اور یہ بات حدیث سے معلوم ہوئی اگر حدیث نہ ہوتی تو ہم یوں کہتے کہ یہ جملہ مکرر ہے اور تکرار کی حکمت یہ بیان کر دیتے۔

بخل طبائع پر غالب ہے:

لوگ عبادات مالیہ میں کوتاہی زیادہ کرتے ہیں کیونکہ عام طور سے بخل طبائع پر غالب ہے جان دینا اور بدن پر مشقت برداشت کر لینا تو ان کو آسان ہے مگر روپیہ اور مال خرچ کرنا دشوار ہے۔ جیسا مولانا نے ایک بدوی کا قصہ لکھا ہے کہ سفر میں ایک کتا اس کے ساتھ تھا۔راستہ میں بھوک کی وجہ سے وہ مرنے لگا تو بدوی رونے لگا۔کسی نے رونے کا سبب پوچھا تو کہا یہ کتا میرا رفیق سفر تھا۔ اب یہ مر رہا ہے اس لئے رو رہا ہوں۔پوچھا اس کو مرض کیا ہے؟ کہا اس کا مرض جوع الکلب ہے یعنی بھوکا ہے۔سائل کو بھی یہ سن کر رحم آیا۔اس نے ایک طرف بڑا سا بورا رکھا ہوا دیکھا۔پوچھا اس بورے میں کیا ہے۔کہا اس میں سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے ہیں۔اس نے کہا پھر تو دو چار ٹکڑے اس کتنے کو کیوں نہیں دے دیتا جس سے تجھے اتنی محبت ہے کہ اس کے مرنے پر رو رہا ہے۔کہا واہ صاحب واہ روٹی میں تو میرے دام لگے ہیں آنسوؤں میں کون سے دام لگے ہیں اس لئے مجھے رو لینا

آسان ہے روٹی نہیں دے سکتا۔ مولانا نے اسی مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

گفت نا ید بے درم در راہ ناں لیک ہست آب دو دیدہ دائے گاں

اس نے کہا کہ بغیر درم کے روٹی نہیں آتی لیکن دو آنسو مفت کے ہیں

خیر اس بدوی نے تو بخل کی حد ہی کر دی مگر یہ ضرور ہے کہ بخل عام طور پر طبائع پر غالب ہے اور اکثر آدمیوں کو روپیہ پیسہ ہاتھ سے نکالنا گراں ہوتا ہے۔ ہاں نماز یا قرآن جتنا چاہو پڑھوالو، اسی واسطے اکثر سود خوار بخیل نمازی اور روزہ دار بہت دیکھے جاتے ہیں۔ اسخیاء کی حالت برعکس ہے ان سے مال تو جتنا چاہو لے لو اور جان میں ایسے بخیل ہیں اور مال میں سخی ہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے واتی الزکوٰۃ (زکوٰۃ ادا کرو) کو مکرر فرمایا مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تکرار نہیں بلکہ اتی المال (مال دو) میں ایتا سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ ہے۔ چنانچہ اس حدیث کے یہ الفاظ ہیں ان فی المال الحقا سوی الزکوٰۃ (سنن الترمذی: ۶۵۹) (مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہیں) اور اس کے ساتھ آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی اس کو ترمذی نے روایت کیا اس کے بعد زکوٰۃ کا ذکر فرمایا باقی زکوٰۃ کے مصارف اس لئے بیان نہیں کئے گئے کہ اتی الزکوٰۃ سن کر تم خود ہی پوچھو گے کہ زکوٰۃ کن لوگوں کو دیں۔ جب سوال کرو گے جواب دے دیا جائے گا۔ چنانچہ دوسری جگہ ہے: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا (الآیۃ) (زکوٰۃ فقیراء، مساکین اور عاملین (جو تحصیل زکوٰۃ کیلئے اسلامی حکومت سے مقرر ہوں) کا حق ہے) اور یہ بھی ممکن ہے کہ مصارف زکوٰۃ میں پہلے بیان پر اکتفا کیا ہو جو اتی المال میں مذکور ہیں اور یہ بات ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ارشاد سے معلوم ہوئی کہ اوپر غیر زکوٰۃ کا ذکر ہے ہماری عقل وہاں تک نہ پہنچتی ہم تو اس کو تکرار ہی پر محمول کرتے ہیں اور یہاں سے معلوم ہوا کہ قرآن اپنی شرح میں حدیث کا محتاج ہے کیونکہ قرآن خبر بھی ہے کیا چیز ہے؟

قرآن کلام شاہی ہے:

قرآن کلام شاہی ہے۔ حق تعالیٰ شانہ احکم الحاکمین کا کلام ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے ہر اک کی عقل کافی نہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

چیست قرآن ایں کلام حق شناس رونمائے رب ناس آمد بہ ناس

حرف حرفش راست در بر معنی معنی در معنی در معنی

''اے کلامِ حق کو پہچاننے والے قرآن کیا ہے یہ لوگوں کے لیے لوگوں کے رب کی رونمائی ہے اور اس کا حرف حرف سچ ہے اور معنی سے لبریز ہے اسی کے معنوں کے اندر معنی مضمر ہیں''۔

قرآن کے لئے مظہر و بطن ہے پھر بعض تو ایسے ہیں جن کو علماء ہی سمجھ سکتے ہیں، عوام نہیں سمجھ سکتے اور بعض بطون ایسے ہی جن کو سب علماء بھی نہیں سمجھ سکتے بلکہ خاص خاص علماء ہی سمجھتے ہیں یعنی مجتہدین اور بعض کو مجتہدین بھی نہیں سمجھتے بلکہ انبیاء ہی سمجھتے ہیں اور وہ بھی وحی سے، پھر نہ معلوم فرقہ قرآنیہ حدیث سے کیونکر مستغنی ہو گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں سب کچھ ہے پھر حدیث کی کیا ضرورت ہے۔ یہ واقعی سچ ہے کہ قرآن میں ضروریات دین سب ہیں مگر گفتگو اس میں ہے کہ ہم ان سب کو سمجھ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں:

جمیع العلم فی القرآن لکن تقاصر عنه افهام الرجال

''قرآن میں علوم دینیہ سب ہیں مگر ہماری فہم ان کے سمجھنے سے قاصر ہے اس لئے اس کی شرح کے لئے ہم کو حدیث کی ضرورت ہے۔''

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقی شارع نہیں ہیں بلکہ آپ شارح ہیں یعنی قرآن کی شرح فرماتے ہیں۔ باقی شارع حقیقی حق تعالیٰ ہی ہیں۔ حضور بذریعہ وحی کے مبلغ ہیں اور قرآن کی تفسیر بیان فرمانے والے ہیں۔ تو ہم کو قرآن پر عمل کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تفسیر کو حل کریں اور حدیث رسول کو حل کرنے کے لئے فقہ حاصل کریں اور حدیث وفقہ کے حاصل کرنے کا بھی یہ طریقہ نہیں کہ خود مطالعہ کر لیا جائے بلکہ جس طرح صحابہؓ نے قرآن کو حضور سے پڑھ کر سمجھا اور تابعین نے صحابہ سے پڑھ کر حل کیا اسی طرح ہر زمانہ میں جو علماء ہوں ان سے سبقاً سبقاً پڑھ کر قرآن وحدیث وفقہ کو حل کرنا چاہئے، محض اپنے مطالعہ سے اجتہاد کرنے کی اجازت نہیں، کیونکہ وہ اجتہاد نہ ہوگا بلکہ ایجاد ہوگا۔ شاید کوئی کہے کہ اب تو قرآن وحدیث کے تراجم شائع ہو گئے ہیں اب ہم کو سبقاً سبقاً پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اُردو میں تو طب کی کتابوں کا بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔ تو کیا اپنے مطالعہ کے بھروسے کبھی اپنی بیوی کو بھی کتاب دیکھ کر مسہل دیا ہے۔ اگر ترجمہ کے بعد پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی تو ذرا قرابا دین سے نسخہ دیکھ کر اپنی بیوی کو تو مسہل دے لو، یقیناً آپ ایسی جرأت نہیں کر سکتے اور اگر کوئی جرأت کرے گا تو یقیناً غلطی کرے گا۔ اول تو مزاج کی رعایت نہ کر سکے گا، پھر ادویہ کے اوزان میں کتاب کا اتباع کر کے مریض کو تباہ کرے گا اور اگر ان سب باتوں کی بھی رعایت کر لی تو بحران کی رعایت

کیسے کرلوگے جوایسی نازک اور لطیف بحث ہے کہ ڈاکٹر بھی اب تک وہاں نہیں پہنچے۔اس کو اطباء یونان ہی خوب سمجھتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ ان کو الہام ہوا ہے۔ہم کو تو ہر چیز میں حق تعالیٰ کی صنعت نظر آتی ہے۔ چنانچہ بحران کی بحث دیکھ کر بھی ہم کو حق تعالیٰ ہی کی حکمت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔حکماء یونان کی اس بحث کو پڑھ کر ہم یوں کہتے ہیں ؎

چہ باشد آن نگار خود کہ بند داین نگارہا

"وہ خود کتنا حسین ہوگا جس کے یہ نقش ونگار ہیں"

بحران کی بحث کا حاصل یہ ہے کہ تجربہ سے یا الہام سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اثناء مرض میں بعض ایام ایسے ہوتے ہیں جن میں طبیعت اور مرض میں تدافع ہوتا ہے، طبیعت مرض کو دفع کرنا چاہتی ہے اور مرض طبیعت پر غالب آنا چاہتا ہے اور اس کی معین تاریخیں جن کو اطباء نے بیان کیا ہے، اسی واسطے تیمارداروں کو چاہیے کہ ابتداء مرض کی تاریخ کو محفوظ رکھیں تاکہ طبیب کو ایام بحران کے دریافت کرنے میں سہولت ہو۔ پھر واقعی یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان تاریخوں میں مریض کو کرب وتعب اور ایام سے زیادہ ہوتا ہے، جو طبیب ماہر ہے وہ پہلے سے بحران کی رعایت کر کے طبیعت کو قوت پہنچانے کی تدبیر کرتا ہے۔اب بتلائیے اگر کوئی شخص کتابیں دیکھ کر مسہل دینا چاہے وہ بحران کی رعایت کیسے کرے گا، کیونکہ مسہل کے باب میں بحران کا ذکر ہی نہیں بلکہ اس کا ذکر دوسرے باب میں ہے۔ہاں جس نے باقاعدہ فن کو حاصل کیا ہو اور مطب بھی کیا ہو اس کی نظر تمام ابواب پر ہوگی، وہ مسہل میں بھی بحران کی رعایت کرے گا۔ان تاریخوں میں مسہل نہ رہے گا۔اسی واسطے مطالعہ کتب کرنے والوں کو معالجہ کی اجازت نہیں اور اسی واسطے کتابیں دیکھ کر عوام کو افتاء کی اجازت نہیں۔ بلکہ علماء کو بھی سب کو اجازت نہیں، بلکہ فتویٰ وہی دے سکتا ہے جس نے کسی مفتی کے سامنے رہ کر یہ کام کیا ہو اور جس نے ساری عمر درس ہی دیا ہے افتاء کا کام نہیں کیا وہ فتویٰ نہیں دے سکتا۔وجہ یہ ہے کہ مفتی کی نظر مختلف ابواب پر حاوی ہوتی ہے۔وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ مسئلہ جو ایک باب میں مطلق ہے دوسرے باب میں کسی قید کے ساتھ مقید ہے اور یہ بات محض درس دینے سے حاصل نہیں ہوتی، گو اس سے افتاء میں مدد ملتی ہے مگر کافی نہیں۔کیونکہ مدرس کی نظر میں درس کے وقت سب ابواب نہیں ہوتے۔تو وہ ایک مسئلہ کو ایک باب میں مطلق دیکھ کر فتویٰ دے گا اور غلطی کرے گا، کیونکہ دوسرے باب میں ایک قید مذکور تھی جس کی اس نے رعایت نہیں کی۔ چنانچہ اس کی ایک نظیر اس وقت بھی میرے ذہن میں ہے۔فقہاء نے باب الکنایات میں لفظ اختیاری کو بھی بیان کیا ہے اور اس کو کنایہ

قرار دیا ہے کہ اس سے نیت کے بعد طلاق ہو جاتی ہے۔ اس سے بہت لوگ یہ سمجھیں گے کہ صرف نیت کے بعد طلاق معاً واقع ہو جائے گی، حالانکہ یہ غلط ہے، بلکہ نیت کے بعد قبول مراۃ کی بھی ضرورت ہے کہ وہ اخترن نفی یا اخرت الطلاق کہے دے۔ اگر اس نے اختیار کو قبول بھی نہ کیا تو نیت زوج کے بعد بھی طلاق نہ ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ اختیاری کنایہ ہونے کے ساتھ لفظ تفویض بھی ہے اور تفویض میں قبول شرط ہے۔ چنانچہ فقہاء نے باب التفویض میں اختیاری کا ذکر دوبارہ کیا ہے اور وہاں اشتراط قبول کی تصریح کی ہے۔ اب جو شخص صرف ایک باب کو دیکھے گا وہ اس کی رعایت کیسے کر سکے گا۔ اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ جو فقیہ مختلف ابواب کو جمع نہ کرے وہ فقیہ نہیں سفیہ ہے۔

پھر جو لوگ محض اُردو رسائل دیکھ کر اجتہاد کرنے لگتے ہیں ان کا تو کیا پوچھنا! وہ تو عجیب عجیب غلطیاں کریں گے۔ چنانچہ ایک جنٹلمین تھانہ بھون آئے اور وہ تھانہ بھون ہی کے رہنے والے تھے۔ ظہر کی نماز میں وہ میرے پیچھے شریک جماعت ہوئے اور دو رکعت پر سلام پھیر کر بیٹھ گئے۔ مجھے نماز ہی میں معلوم ہو گیا۔ ہماری نماز ایسی کہاں جس میں کسی کو کچھ بھی خبر نہ ہو۔ یہ تو اہل استغراق کی شان ہوتی ہے۔ ہمارا خیال تو کبھی کبھی نمازیوں کی طرف چلا جاتا ہے اور گوشہ ہائے چشم سے مقتدیوں کے افعال کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ میں نے سلام پھیر کر دریافت کیا کہ آپ درمیان میں نماز ختم کر کے کیوں بیٹھ گئے۔ تو وہ بے ساختہ فرماتے ہیں کہ میں مسافر ہوں، اس لئے قصر کیا ہے۔ میں نے کہا سبحان اللہ! حفظت شيئا وغابت عنک اشياء وطن میں اور مسافر؟ پھر وطن بھی نہ ہوتا تو مقیم کے پیچھے مقتدی کو قصر کیسا؟ ان حضرت نے یہ مسئلہ تو یاد کر لیا کہ مسافر پر قصر واجب ہے اور یہ نہ دیکھا کہ وطن مبطل سفر ہے اور اقتداء بالمقیم معیر فرض ہے۔ اسی طرح ایک مسخرہ شخص ہمیشہ چار رکعتوں کی بجائے دو رکعت پڑھا کرتا تھا اور دلیل میں یہ حدیث پیش کرتا كن في الدنيا كانک غريب (الصحيح للبخاری ۸:۱۱۰) (دنیا میں مسافر بن کر رہ) اور کہتا کہ حضورؐ نے یہ فرمایا ہے کہ دنیا میں مسافر بن کر رہو۔ میرا اس حدیث پر عمل ہے، اس لئے میں مسافروں جیسی نماز پڑھتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے اگر اب احکام سے قطع نظر کر کے صرف الفاظ پر نظر کر کے نکل سکتا ہے تو صرف یہ کہ تم چار رکعتوں کو مثل دو کے پڑھ لیا کرو، یعنی ایسی تیز پڑھو کہ چار رکعتیں دو کے وقت میں ختم ہو جائیں، جیسے جلال آباد میں ایک آقا اور نوکر نماز میں مقابلہ کرتے تھے کہ دیکھیں پہلے کون پڑھتا ہے۔ اس مقابلہ میں ان کی چار رکعتیں اتنی جلدی ہوتی تھیں کہ دوسروں کی ایک رکعت بھی پوری نہ ہوتی۔ تو ایسے ہی تم جلدی پڑھ لیا کرو، لیکن یہ بات اس حدیث سے نہیں نکلتی کہ تم چار کی دو

رکعتیں کردو، کیونکہ حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کن فی الدنیا غریبا (دنیا میں مسافر بن کر رہ) بلکہ کن فی الدنیا کانک غریب (دنیا میں مسافر کی طرح رہ) فرمایا ہے۔ پس تم مسافر جیسے ہو جاؤ، پورے مسافر کدھر سے ہوگئے۔ تو نے کانک غریب کو فانک غریب پر کیسے محمول کرلیا اور یہ بھی محض اسکاتِ خصم جاہل کے لئے الزامی جواب تھا۔ ورنہ حقیقی جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن کا یہ ارشاد ہے یقیناً آپ اس ارشاد پر سب سے زیادہ عامل تھے۔ اب دیکھ لو کہ نماز کے بارہ میں آپ کا کیا عمل تھا۔ احادیث متواترہ سے ثابت ہے کہ آپ حضر میں چار رکعتیں پڑھتے تھے اور سفر میں دو۔ معلوم ہوا کہ کانک غریب (مسافر کی طرح) سے آپ کی مراد یہ نہیں کہ حالت اقامت میں اپنے اوپر احکام سفر بھی جاری کرلو، بلکہ مقصود یہ ہے کہ دنیا سے زیادہ دل نہ لگاؤ۔ جیسا کہ مسافر سرائے سے یا منزل راہ سے دل نہیں لگاتا۔

ضرورت علماء:

غرض دین کے سمجھنے کے لئے عوام کو علماء کی سخت ضرورت ہے۔ محض ترجمہ ہدایہ و عالمگیری کا مطالعہ کر لینا ان کو کافی نہیں ہو سکتا۔ ورنہ اس کی کیا وجہ ہے کہ کتب طب کا مطالعہ کر کے اپنی بیوی کو خود مسہل کیوں نہیں دے لیتے؟ رہا یہ سوال کہ پھر تراجم سے فائدہ کیا ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ترجمہ سے محض زبان کی سہولت ہوگئی۔ مضامین کی سہولت ترجمہ سے نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ استاد ہی سے پڑھنے پر موقوف ہے۔ ورنہ اہل عرب کو حدیث و قرآن کے پڑھنے کی ضرورت نہ ہوا کرتی۔ کیونکہ ان کی تو زبان ہی عربی ہے جو قرآن و حدیث کی زبان ہے۔ مگر جا کر دیکھ لیا جائے کہ وہ بھی تعلیم و تعلم سے مستغنی نہیں ہیں اور عوام تو علماء سے کیا مستغنی ہوتے۔ علماء بھی خود علماء سے مستغنی نہیں ہیں۔ ان کو بھی اپنی ذاتیات میں ہمیشہ اور غیر ذاتیات میں بھی احیاناً دوسرے علماء سے استفسار کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ مثل مشہور ہے صاحب الغرض مجنون اور رای العلیل علیل جب کوئی ذاتی معاملہ کسی عالم کو درپیش ہوتا ہے تو اگر وہ صاحب حیثیت ہے اس کو اپنے فہم پر اعتماد نہیں ہوتا، کیونکہ یہ خدشہ باقی رہتا ہے کہ کہیں اپنی غرض کی وجہ سے میں نے یہ فتویٰ اپنے موافق نہ نکال لیا ہو اور دوسرے پہلوؤں پر اس لئے نظر نہ کی گئی ہو کہ وہ میری غرض کے خلاف ہیں۔ پھر جب تک دوسرے علماء سے مراجعت نہ ہو جائے اس وقت تک اطمینان نہیں ہوتا۔ اسی واسطے میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ اپنے معاملات میں اپنے فتویٰ پر ہرگز اعتماد نہ کرو بلکہ دوسرے علماء سے رجوع کرو۔ اور زید و عمر کے نام

سے استفتاء کرو تا کہ دوسرا شخص آزادی سے فتویٰ دے سکے اور تمہارا نام دیکھ کر رعایت نہ کرے۔ دوسرے اپنے معاملات میں اپنے فتوے پر اس لئے بھی اعتماد نہ چاہئے کہ صاحب معاملہ پریشان ہوتا ہے اور پریشانی میں رائے مختل ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ محتاط طبیب اپنے گھر والوں کا علاج خود نہیں کر سکتا، کیونکہ اپنے عزیز کی بیماری سے اس کی طبیعت مشوش ہو جاتی ہے، اسی طرح وکلاء اپنے معاملات میں خود وکالت نہیں کرتے بلکہ دوسرے شخص کو وکیل بناتے ہیں۔ایک وکیل سے میں نے پوچھا تھا کہ آپ کو تو اپنے مقدمات میں کسی کو وکیل بنانے کی ضرورت نہ ہوتی ہوگی۔کہا ضرورت ہوتی ہے۔میں نے پوچھا کیوں؟ آپ تو خود وکیل ہیں۔تو انہوں نے یہی وجہ بیان کی کہ اپنے معاملہ میں دماغ پریشان اور طبیعت مشوش ہوتی ہے، اس لئے اپنی رائے کام نہیں دیتی بلکہ دوسرے ہی کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔ہاں امداد اس کو دیتے رہتے ہیں، کیونکہ آخر تو یہ کام ہم کو بھی آتا ہے اور دو کی رائے اچھی ہوتی ہے۔تو جب علماء کو بھی علماء سے استغناء نہیں تو عوام کو کیونکر استغناء ہو سکتا ہے۔مگر فرقہ قرآنیہ کی جرأت دیکھئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مستغنی ہو گئے اور کہتے ہیں کہ بس قرآن کافی ہے۔حدیث کی کیا ضرورت ہے۔ایک شخص نے اس کا خوب جواب دیا۔کہا اچھا تم قرآن سے اعداد رکعاتِ صلوٰۃ کی دلیل تو بیان کرو۔اب تو وہ چکر میں آ گئے، کیونکہ قرآن میں نماز کی رکعتوں کا عدد کہیں بھی مذکور نہیں۔تو وہ قرآنی کہنے لگا کہ اس سوال کا جواب کل کو سوچ کر دوں گا۔اس احمق سے کوئی پوچھے کہ بناء دریافت کرنے سے پہلے تم نے عمل کیونکر شروع کر دیا۔ جب ان کے نزدیک حدیث وفقہ کوئی چیز نہیں اور قرآن سے اعداد رکعات کا علم ابھی تک ہوا نہیں تو انہوں نے نماز کیوں شروع کر دی۔ان سے تو وہ گنوار ہی زیادہ سمجھ دار نکلا جسے ایک شخص نے مسئلہ بتایا وھو عذنویت (میں نے کل کے روزہ کی نیت کی) گنوار نے اگلے دن روزہ نہ رکھا اور پوچھنے پر کہا جب نیت یاد ہو جائے گی اس وقت سے روزہ رکھوں گا۔ابھی سے کیوں بھوکا مروں۔کیونکہ بدون نیت کے تو روزہ ہوتا ہی نہیں۔اگلے دن وہ قرآنی دلیل سوچ کر لایا اور اعداد رکعات کی دلیل یہ آیت ہے: الحمد للہ فاطر السموات والارض جاعل الملئکۃ رسلًا اولی اجنحۃ مثنی وثلث ورباع. (تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں جو آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنیوالے ہیں اور بنایا فرشتوں کو پیغام لانے والا دو' تین' چار پروں والا) سبحان اللہ! کیا استدلال ہے! اس آیت میں تو حق تعالیٰ نے فرشتوں کے بازوؤں کے اعداد بیان فرمائے ہیں کہ میاں کسی کے دو بازو ہیں کسی کے تین، کسی کے چار۔اس سے رکعات صلوٰۃ کے اعداد پر کیونکر دلالت ہوگئی۔پھر اگر حضور

صلی اللہ علیہ وسلم سے رکعات صلوٰت خمسہ منقول نہ ہوتیں تو کیا اس آیت سے کوئی شخص نماز کی رکعتوں کا عدد سمجھ سکتا ہے اور وہ بھی اس تعین کے ساتھ کہ دو رکعتیں صبح ہی میں ہوں اور چار ظہر و عصر و عشاء میں اور تین مغرب میں ہرگز نہیں بلکہ اول تو اس آیت سے رکعت صلوٰۃ پر انتقال ذہن ہی نہ ہوتا اور جو اتفاقاً ہو بھی جاتا تو یہ تعیین تو کسی طرح بھی سمجھ میں نہ آتی کہ دو رکعت فلاں نماز میں ہوں اور تین فلاں میں پھر رکعات صلوات کا ثبوت قرآن سے کہاں ہوا بلکہ حدیث ہی سے ہوا کیونکہ ثبوت تو وہ ہے جو دلالت میں خود کافی ہو اور ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو اور جس میں ضمیمہ لگانے کی ضرورت ہو، وہ ثبوت نہیں اس احمق نے نظیر کو ثبوت سمجھا۔

یہ مرض آج کل تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت عام ہے۔ یہ لوگ اپنے کو بہت عاقل سمجھتے ہیں مگر ان کو علوم کی عقل خاک نہیں۔ ہاں ایک بات میں بڑے عاقل ہیں کہ سب سے زیادہ آ کل ہیں باقی دین میں آ کر تو بڑے بڑے ایل ایل بی، ایل بی ہو جاتے ہیں یعنی سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے الل جاتے ہیں اور دین سے نکل جاتے ہیں اور ایسی ہی بے تکی ہانکتے ہیں جس کے سر نہ پاؤں۔ چنانچہ ایک جنٹلمین نے مجھ سے معراج کا ثبوت مانگا میں نے کہا کہ یہ واقعہ ممکن ہے جس میں امتناع عقلی کچھ نہیں اور مخبر صادق نے اس کے وقوع کی خبر دی ہے اس لئے اس کا ماننا لازم ہے۔ واقعہ ممکنہ کے لئے مخبر صادق کی خبر کافی ثبوت ہے جس کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ وہ کہنے لگے یہ تو کچھ ثبوت نہ ہوا۔ میں نے کہا اور کیسے ہوگا، کہنے لگے کہ یہ بتلایئے کہ حضور کے سوا کسی اور کو بھی معراج ہوئی ہے؟ میں نے کہا وہ بھی اک واقعہ ہوگا اس میں بھی یہی اشکال ہوگا کہ اس سے پہلے کسی اور کو بھی ہوئی ہے یا نہیں، اگر اس میں بھی یہ اشکال ہوا تو تسلسل لازم آئے گا اور اگر وہاں سے یہ اشکال نہ ہوگا تو وجہ ترجیح کیا ہے؟ آخر آپ کو دوسرے واقعہ میں اشکال کیوں نہ ہوگا اور اس واقعہ میں کیوں ہوا؟ میں نے عقلی طور پر اس طریقہ ثبوت کا لغو ہونا اور صحیح طریقہ سے معراج کا ثابت ہونا اچھی طرح ظاہر کر دیا تھا مگر اس کو سمجھے کون وہ اپنی وہی مرغی کی ایک ٹانگ ہانکتے رہے کہ ثبوت نہیں ہوا۔ میں نے کہا حضرت بس اب تو ثبوت کے لئے اس کی کسر ہے کہ میں آپ کے سامنے اڑ کر آسمان میں جاؤں اور اللہ تعالیٰ کے پاس سے رسید لا کر آپ کو دے دوں، اگر اسی کا نام ثبوت ہے تو مجھے اس سے سکوت ہے اور آپ کا اشکال بھی قابل سقوط ہے۔ قافیہ تو مل گیا گو تاء اور طاء کا فرق رہا۔ مگر عام محاورات میں تاء اور طاء کے فرق کو کون دیکھ سکتا ہے۔ اسی لئے فقہاء نے تلاق اور طلاق اور تلاغ و تلاک میں ہر لفظ سے وقوع طلاق کا حکم کیا ہے کیونکہ محاورات میں مخارج کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ مراد ہر صورت میں

طلاق ہی ہے اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ دہلی میں ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، پھر علماء سے فتویٰ لینے گیا ایک غیر مقلد مولوی نے فتوی دے دیا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی کیونکہ اس شخص نے لفظ طلاق کو طاء سے ادا نہیں کیا بلکہ تاء سے ادا کیا ہے اور تلاق مہمل لفظ ہے اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ اب اس کو فقہاء کی تصریح دکھلائی گئی تو اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ حدیث سے یہ دلیل لاؤ۔ فقہاء کے کلام کو ہم نہیں مانتے۔ مولوی عبد الرب صاحب واعظ دہلوی گو زیادہ عربی پڑھے ہوئے نہ تھے مگر دانا اور تجربہ کار شخص تھے۔ انہوں نے ایسا جواب دیا کہ غیر مقلد مولوی ان کا منہ تکتا رہ گیا۔ آپ نے کہا کہ اگر تلاق کہنے سے طلاق کا وقوع نہیں ہوا تو اس شخص کا نکاح بھی منعقد نہیں ہوا کیونکہ ایجاب و قبول کے وقت نکاح حاء حطی سے نہیں کیا گیا تھا بلکہ نکاہ بولا گیا تھا اور عربی میں نکاہ مہمل لفظ ہے تو اگر اب نکاح نہیں ٹوٹا تو وہ پہلے ہی ٹوٹا ہوا ہے اور اگر ہاء ہوز سے نکاہ کہنا انعقاد نکاح کے لئے کافی تھا تو تلاق کہنا بھی وقوع طلاق کے لئے کافی ہے اس کا غیر مقلد کے پاس کچھ جواب نہ تھا۔ واقعی خوب کہا اسی واسطے میں نوجوان مولویوں سے کہا کرتا ہوں کہ گو تم کو مسائل یاد زیادہ ہوں مگر پھر بھی تم کو بوڑھوں کی ضرورت ہے کیونکہ ان کو تجربہ وفہم زیادہ ہے گو یادداشت تم سے کم ہو۔ بہر حال اس نے قرانی تطہیر کو ثبوت سمجھا اور دلیل میں جاعل الملئکة رسلا اولی اجنحة مثنی وثلث وربٰع (بنانے والا، فرشتوں کو پیغام لانے والا جن کے دو دو، تین تین، چار چار پر ہیں) کو پیش کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر فرشتوں کے اعداد اجنحہ سے رکعات صلوٰۃ کا ثبوت ہوسکتا ہے تو فانکحوا ماطاب لکم من النساء مثنٰی وثلث وربٰع (پس نکاح کرو عورتوں میں سے جسے تم پسند کرو دو اور تین اور چار) سے بھی ثبوت ہوسکتا ہے کیونکہ عدد کا ذکر تو وہاں بھی ہے اور اس کی بھی کچھ ضرورت نہیں خود تمہارے جسم میں بھی موجود ہیں بس تم نے ثبوت میں اپنے کو پیش کر دیا ہوتا۔

خود کوزہ وخوف کوزہ گرو خود گل کوزہ

''خود آبخورہ، آبخورہ کا خوف اور اس کا خود گر و مٹی سے بنا آبخورہ''

صوفیہ نے تو کچھ سمجھ کر کہا تھا کہ انسان میں تمام عالم منطوی ہے آسمان وزمین عرض وکرسی لوح وقلم سب انسان کے اندر مجتمع ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ کہتے ہیں:

دواک منک وما تشعر — دواک منک وما تبصر
وانت الکتاب المبین الذی — باحرفه ینظهر المضمر
وتزعم انک جرم صغیر — وفیک انطوی العالم الاکبر

''تمہاری دوا خود تم سے ہے اور تمہیں اس کا علم نہیں اور تیری بیماری تجھ سے ہے اور تو نہیں دیکھتا اور تو کھلی کتاب ہے جس کا پوشیدہ حرف حرف نظر آتا ہے اور تو اپنے آپ کو چھوٹے جسم کا خیال کرتا ہے حالانکہ عالم اکبر تجھ میں سمایا ہے''

مگر اس قرآنی فرقے نے بے سمجھے ہی اپنے اندر سے رکعات کا ثبوت بتلا دیا ہوتا بلکہ یہ جواب دیتا تو رموز واسرار میں سے سمجھا جاتا اور اب جو اس نے ثبوت دیا ہے اس سے تو اپنی حماقت و جہل کا اظہار کیا ہے جس کا منشاء یہ تھا کہ اس نے حدیث سے اپنے کو مستغنی کرنا چاہا مگر ہم کو چونکہ حدیث سے استغناء نہیں اس لئے کہ ہم کو بحمد اللہ معلوم ہو گیا کہ اس جگہ اتی الزکوۃ (زکوٰۃ دو) میں تکرار نہیں ہے بلکہ یہاں فرض کا ذکر ہے اور اوپر غیر زکوۃ کا ذکر ہے کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان فی المال حقاً سوی الزکوۃ (سنن الترمذی: ۶۹۵) ثم تلد هذه الاية. (مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔ اور پھر یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی)

ایک سوال کا جواب:

البتہ ایک سوال باقی رہے گا کہ طاعات بدنیہ میں فرض ونفل کو الگ الگ کیوں نہیں بیان کیا گیا بلکہ سب کو اقام الصلوۃ ہی میں جمع کر دیا گیا اور زکوٰۃ میں دونوں کو جدا جدا کیوں بیان کیا گیا۔ اس کا جواب وہی ہے جو اوپر رفع تکرار کے لئے علی سبیل التنزل دیا گیا تھا جس کا حاصل یہ ہے کہ طبائع میں بخل غالب ہے اور طاعات مالیہ میں کوتاہی زیادہ کی جاتی ہے اگر یہاں تفصیل نہ کی جاتی تو صدقات نافلہ کا کسی کو بھی اہتمام نہ ہوتا اس لئے یہاں فرض ونفل کو جدا جدا بیان فرما دیا گیا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ (اور اقرار کرنے کے بعد اپنے عہد کو پورا کرنے والے اور صبر کرنے والے مستحق ہیں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت) جملہ اولیٰ میں آداب معاشرت کا ذکر ہے اور جملہ ثانیہ میں اخلاق وملکات باطنہ کا۔ اب بتلایئے اس آیت سے دین کا کون سا شعبہ باقی رہ گیا۔ کوئی نہیں بلکہ تمام ابواب دین اس میں مذکورہ ہیں۔ عقائد بھی اور طاعات مالیہ و بدنیہ بھی اور معاملات ومعاشرات بھی اور اخلاق بھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اخلاق بھی دین میں داخل ہیں جن کو عام طور پر آج کل دین سے خارج سمجھا جاتا ہے مگر اس سے وہ اخلاق مراد نہیں جن کو آج کل اخلاق سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایسا اختراع ہے جیسے ہمارے ایک ہم عصر نے تواضع کی تفسیر میں اختراع

کیا تھا جب وہ کریما پڑھتے تھے اور اس میں تواضع کا ذکر آیا۔

دلا گر تواضع کنی اختیار شود خلق دنیا ترا دوستدار

''اے دل اگر تو تواضع اختیار کرے گا تو تمام مخلوق تجھ کو محبوب رکھے گی''

تو اگلے دن جب سبق سنانے بیٹھے حضرت استاد نے پوچھا بتلاؤ تواضع کسے کہتے ہیں؟ کہا یہی حقہ پان دے دینا اس جواب پر وہ خوب پٹے مگر ساری عمر کے لئے تواضع کی حقیقت یاد ہوگئی کہ حقہ پان دینے کا نام تواضع نہیں تو جیسے انہوں نے تواضع کی تعریف گھڑی تھی اسی طرح آج کل اخلاق کی تفسیر گھڑی گئی ہے اس زمانہ میں اخلاق کے یہ معنی ہیں کہ جب کوئی ملنے آئے اسی کے ہوکر بیٹھ جاؤ اور اپنے سب کاموں کو چولہے میں ڈال دو اور آنے والے کے ساتھ باتیں بناتے رہو اور بدخلقی یہ ہے کہ تمہارے ہو کر نہ بیٹھیں بلکہ حسب ضرورت مزاج پرسی وغیرہ کر کے اپنے کام میں لگ جائیں اور زیادہ باتیں نہ بنائیں۔ حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ کی نسبت میں نے جہلاء کو یہ کہتے ہوئے خود سنا ہے کہ مولانا کے اخلاق اچھے نہیں۔ بس ان کی بدخلقی یہی تھی کہ ان کے ساتھ دیر تک باتیں نہ بناتے تھے۔ چنانچہ ایک ڈپٹی صاحب درس حدیث کے وقت مولانا سے ملنے گئے۔ مولانا نے اس کی بہت زیادہ رعایت کی کہ درس کے وقت اس سے مصافحہ اور سلام و جواب کرلیا اور یہ بھی دریافت فرمالیا کہ کیسے تشریف لائے؟ کچھ کہنا ہے انہوں نے کہا نہیں۔ ویسے ہی زیارت کو حاضر ہوا ہوں اور اس جواب پر مولانا درس میں مشغول ہوگئے اور دو گھنٹہ تک ان سے بات نہ کی۔ بس اس پر ڈپٹی صاحب خفا ہوگئے اور باہر آکر بہت شکایت کی کہ مولانا بہت روکھے ہیں۔ دو گھنٹہ تک ہم بیٹھے رہے۔ ہم سے ایک بات نہیں کی اپنے ہی کام میں لگے رہے۔ وہ جانتے نہیں کہ میں کون ہوں اور پہلے سلاطین کی یہ حالت تھی کہ وہ علماء و صلحاء کے سامنے دم نہ مارتے تھے۔

شاہ فقیر کے دروازہ پر:

سلطان شاہ جہاں مع ایک عالم کے شاہ سلیم چشتی رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شاہ سلیم نے بادشاہ کو دیکھ کر پیر پھیلا دیئے۔ شاہ جہاں تو کچھ نہیں بولے مگر ان عالم کو یہ حرکت ناگوار ہوئی۔ پوچھا شاہ صاحب آپ نے پاؤں کیسے پھیلا دیئے جو کہ خلاف ادب ہے۔ فرمایا جب سے ہاتھ سمیٹ لئے پاؤں پھیلا دیئے۔ یہ بامعنی جواب سن کر عالم بھی دم بخود رہ گئے لیکن آخر تو مولوی تھے یہ دوسرے طریق سے چلے کہا دیکھئے آپ کی خدمت میں سلطان اسلام تشریف لائے ہیں جو اولی الامر میں سے ہیں اور اولی الامر کی تعظیم فرض ہے۔ ان کا ادب کیجئے۔ فرمایا یہ تمہارے سلطان

ہوں گے تم ان کا ادب کرو، میرے تو غلامانِ غلام ہیں مولوی صاحب نے پوچھا کہ آپ کے غلامانِ غلام کدھر سے ہوئے۔ فرمایا یہ ہوا و ہوس کے غلام ہیں اور ہوا و ہوس میرے غلام ہیں یہ جواب سن کر شاہ جہاں بہت متاثر ہوئے اور رونے لگے۔ اسی طرح ایک اور بادشاہ کا قصہ ہے کہ وہ کسی بزرگ سے ملنے گئے۔ خانقاہ کے دروازہ پر پہنچے تو نقیب نے روک دیا کہ یہیں ٹھہرئیے میں حضرت شیخ کو اطلاع کر دوں وہ اجازت دیں تب آگے بڑھیئے گا۔ بادشاہ کو نقیب کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا مگر چونکہ عقیدت و نیازمندی کے ساتھ آئے تھے اس لئے ضبط کیا اور جب اجازت مل گئی تب اندر پہنچے، بھرے ہوئے تو تھے ہی سامنے پہنچتے ہی یہ مصرع پڑھا:

درِ درویش راہ دربان نباید

”درویش کے دروازہ پر دربان نہیں ہونا چاہیے“

درویش نے فوراً جواب دیا

بباید تاسگ ودنیا نیاید

”ضرور ہونا چاہیے تاکہ دنیا کا کتا اس کے گھر میں نہ گھس آئے“

کیسا بے ساختہ اور پر مغز جواب ہے مگر اس زمانہ کے سلاطین کی اہلیت دیکھئے کہ باجود سلطنت کے اپنے معتقد فیہ کی ہر ناگوار و تلخ بات کا تحمل کرتے تھے کیونکہ اعتقاد کا تو واقعی یہی مقتضا ہے اور یہ بھی کوئی اعتقاد ہے کہ بزرگ صاحب ہمارے مذاق کے موافق ہم سے برتاؤ کریں تو بزرگ ہیں ورنہ بداخلاق ہیں یہ تو بزرگ کے ساتھ اعتقاد نہ ہوا بلکہ اپنے ساتھ اعتقاد ہوا۔ چنانچہ آج کل یہی حالت ہے جیسا کہ وہ ڈپٹی صاحب گئے تو تھے اعتقاد کے دعوے سے اور جب ان کے خلاف مذاق کوئی بات ہوئی تو لگے شکایت کرنے اور دھمکیاں دینے کہ خبر بھی ہے میں کون ہوں اور یہ نہ سمجھا کہ ان پر مولانا کا کون سا کام اٹکا ہوا تھا جو وہ ڈرتے یا ڈپٹی صاحب ان کا کچھ بگاڑ لیتے۔ ہاں اپنے زعم میں انہوں نے ایک ضرر مولانا کو پہنچایا کہ سالِ نو میں جو گورنمنٹ کی طرف سے خطابات عطا ہوتے ہیں ان میں مولانا کے لئے بھی شمس العلماء کا خطاب تجویز ہوا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے اس کو روک دیا اور لکھ دیا کہ مولانا اس خطاب کے مستحق نہیں اور یہ کارروائی کر کے آپ بہت خوش ہوئے اور فخر سے کہا کہ دیکھا ہم نے مولانا سے کیسا بدلہ لیا کہ ان کو خطاب ملنے والا تھا۔ ہم نے روک دیا۔ ہائے وہ بچارہ واقعی معذور تھا کیونکہ اسے بزرگوں کے مذاق کی خبر ہی نہ تھی وہ اپنے زعم میں اس کو اضرار سمجھے ہوئے تھا حالانکہ مولانا کے لئے خطاب کا نہ ملنا عید ہو گیا وہ تو

خطاب ملنے کو اپنا اضرار سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہ بات بھی مولانا تک پہنچی۔ آپ بہت ہنسے، فرمایا اس میں مجھے کیا ضرر پہنچا بلکہ ڈپٹی صاحب تو میرے محسن ہیں کہ مجھے دربار وغیرہ کی حاضری سے بچالیا کیونکہ شمس العماء کو درباروں میں جانا پڑتا ہے مگر وہ شمس مخسوف ہیں جو در در مارے پھرتے ہیں اور جو شمس غیر مخسوف ہوگا وہ کسی کے در پر نہ جائے گا بلکہ سب اسی کے پاس آئیں گے اور مولانا دوسری قسم کے شمس تھے نہ پہلی قسم کے۔ اب اگر مولانا کے پاس خطاب پہنچتا تو طبیعت تو اس کے قبول سے اباء کرتی مگر اس کا واپس کرنا مصالح کے خلاف ہوتا کیونکہ اس میں گورنمنٹ کے خطاب کی توہین ہوتی جس کو یہ حضرات گوارا نہ کرتے تھے اور مولانا کے مذاق کو کون سمجھتا جو واپسی کو عذر پر محمول کیا جاتا۔ غرض خطاب کے آنے سے مولانا بڑی ضیق میں پڑ جاتے۔ ڈپٹی صاحب نے بالا بالا ہی اسے واپس کر کے مولانا کو ایک بہت بڑی ضیق سے نجات دے دی مگر وہ اپنے دل میں یہ سمجھتے رہے کہ میں نے مولانا کو بڑا نقصان پہنچایا۔

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

''اگر خداوند کریم چاہے تو دشمن ہی بھلائی کا ذریعہ بن جائے''

اور یہ سارا غصہ اس پر تھا کہ مولانا ان کے ساتھ باتیں بنانے نہیں بیٹھے تھے۔

آداب ملاقات:

اسی طرح ایک تحصیل دار صاحب نے مولانا کی شکایت کی کہ دوپہر کو ملنے گیا تھا مولانا اس وقت جاگ رہے تھے مگر مجھے دیکھ کر قصداً پشت پھیر لی اور مجھ سے بات تک نہ کی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ روایت صحیح بھی ہو تو مولانا نے بہت اچھا کیا کیونکہ اس شخص نے بے اصول کام کیا۔ بھلا دوپہر کا وقت بھی کوئی ملنے کا وقت تھا۔ یہ وقت اہل اللہ کے لئے آرام کا وقت ہے کیونکہ وہ رات اتنے سویرے اٹھتے ہیں کہ اہل دنیا کو اس وقت نیند کی مستی میں دنیا و دین کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اب جو شخص رات کو تین چار گھنٹے جاگتا ہو وہ اگر دوپہر کو ایک دو گھنٹہ سوئے تو کیا ظلم ہے بلکہ قیلولہ تو سنت ہے مگر افسوس یہ ہے کہ لوگ آج کل انگریزوں سے تو ان کی فرصت کا وقت معلوم کر کے ملتے ہیں اور بزرگوں ملاؤں سے اپنی فرصت دیکھ کر ملتے ہیں۔ وہاں تو اپنا کام چھوڑ کر دن بھر اس لئے ضائع کرتے ہیں کہ صاحب کو جس وقت فرصت ہو اس وقت فوراً حاضر ہو جائیں اور یہاں اپنے سب کاموں سے فارغ ہو کر جب اپنی فرصت دیکھی بزرگوں کے پاس ان کا وقت ضائع کرنے کو حاضر

ہو گئے۔ ان کو اتنی عقل نہیں کہ یہ وقت ہماری فرصت کا ہے تو یہ کیا ضرور ہے کہ دوسرے کی بھی فرصت کا ہو۔ حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس بھی دوپہر کو بعض لوگ ملنے آتے تھے، مگر حضرت اتنے نرم تھے کہ سب کے ساتھ بیٹھے رہتے اور ان کی باتیں سنتے رہتے۔ آنکھوں میں نیند ہوتی سر جھکا جاتا مگر طبیعت پر جبر کر کے بیٹھے رہتے۔ بعض دفعہ کسی خادم نے اگر کہہ دیا کہ یہ وقت ملاقات کا نہیں ہے حضرت کے آرام کا وقت ہے تو حضرت خادم پر خفا ہوتے کہ تم روکنے والے کون ہو؟ یہ بے چارے محبت سے آتے ہیں اگر مجھے تھوڑی سی تکلیف ہی ہو جائے گی تو کیا بڑی بات ہے اپنے دوستوں کے لئے آدمی تکلیف بھی گوارا کر لیا کرتا ہے۔ اس کے بعد خادم خاموش ہو گئے اور لوگوں نے بھی طریقہ اختیار کر لیا کہ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر دوپہر کو حضرت کے پاس آ بیٹھے۔ ایک دن حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ نے دوپہر کو دیکھا کہ ایک صاحب حضرت کی خدمت میں بیٹھے ہیں۔ خوب دھمکایا کہ رات کو تو بیویوں کو بغل میں رکھو اور صبح کو آٹھ بجے سو کر اٹھو۔ نہ تہجد کی پرواہ نہ صبح کی نماز کی، نہ جماعت کا خیال اور دوپہر کو اپنے سب کاموں سے فارغ ہو کر آئے بزرگوں کا وقت ضائع کرنے۔ رات کو دو بجے سے جاگ اٹھتے ہیں، پھر صبح تک نہیں سوتے۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ خبردار! جو آج سے کوئی دوپہر کو آیا ٹانگیں چیر دوں گا۔ حافظ صاحب کے دھمکانے پر حضرت کچھ نہیں بولے، پھر اس دن سے کوئی ایسے وقت میں نہ آیا تھا۔

طریق اصلاح:

اس کی بھی ضرورت ہے کہ کچھ بزرگ ایسے بھی ہوں اگر سارے نرم ہی ہوں تو پھر اصلاح کیونکر ہوگی کیونکہ جو بزرگ نرم مزاج ہوتے ہیں وہ خود کسی کو کچھ نہیں کہتے۔ ہاں جو طریقہ پوچھتا ہے اسے بتلا دیتے ہیں مگر اس طرح پوچھ پوچھ کر بھی کہیں اصلاح ہوئی ہے۔ اگر بچوں سے ان کے پوچھنے پر خطاب کیا جائے اور بے پوچھے ان کی اصلاح نہ کی جائے تو بس ہو چکی اصلاح کیونکہ ان کا مذاق تو یہ ہے کہ پڑھو گے لکھو گے تو ہو گے خراب جو کھیلو گے کودو گے ہو گے نواب۔ یہ تو نظم ہے اور ایک نثر بھی ہے پڑھیں تو مریں، نہ پڑھیں تو مریں، پھر دانتا کل کل کیوں کرن۔ اب ان کا یہ مذاق ہو ان کو انہی کے اختیار پر چھوڑ دیا جائے تو یقیناً جاہل کو دن اور بد اخلاق ہی رہیں گے۔ اصلاح کی صورت یہ ہے کہ مصلح ظاہر میں عربی بد خلق بن جائے۔ امیر شاہ خاں صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا مقولہ نقل فرماتے تھے کہ جس کا پیر بڑا (تیز) نہ ہو اس مرید کے اخلاق ہمیشہ خراب رہیں گے۔ واقعی مرید کی اصلاح جبھی ہوتی جب پیر تھوڑا سا بد خلق بن جائے ورنہ اصلاح نہیں ہوتی جیسے خلیفہ مامون رشید کا

قصہ ہے کہ ایک دفعہ قاضی یحییٰ بن اکثم ان کے یہاں مہمان ہوئے۔ رات کو خلیفہ نے کسی ضرورت سے ایک غلام کو پکارا، کوئی نہ بولا۔ دوبارہ پھر آواز دی، اب بھی کوئی نہ بولا۔ تیسری بار پکارا تو ایک غلام جھلاتا ہوا بڑبڑاتا اٹھا کہ نہ دن میں چین ہے نہ رات کو چین ہے۔ دن بھر سامنے حاضر رہتے ہیں اور یہاں سے وہاں بھاگے پھرتے ہیں، رات کو بھی چین نہیں۔ ذرا آنکھ لگی یا غلام یا غلام اس سے تو سارے غلاموں کو پھانسی ہی دے دو۔ قاضی یحییٰ بن اکثم کو غلام کی اس بے باکی اور گستاخی پر بڑا غصہ آیا اور کہا امیر المومنین آپ نے غلاموں کو سخت گستاخ بنا رکھا ہے، ان کی اصلاح کیوں نہیں فرماتے۔ مامون نے جواب دیا کہ اے یحییٰ ان کی اصلاح تو بہت آسان ہے اور بعض دفعہ خیال بھی آیا کہ اصلاح کروں مگر ان کی اصلاح اس وقت ہوسکتی ہے جبکہ میں اپنے اخلاق خراب کروں۔ بس اس وجہ سے اصلاح نہیں کرتا کہ ان سسروں کی اصلاح کے لئے میں اپنے اخلاق کیوں بگاڑوں۔ مامون کو تو غلاموں کی وجہ سے اپنے اخلاق بگاڑنے کی اس لئے ضرورت نہ تھی کہ غلام اس کے پاس طالب اصلاح ہوکر نہ آئے تھے۔ نہ مامون نے ان سے اصلاح کا عہد کیا تھا مگر شیخ کو اس کی ضرورت ہے کیونکہ مریدین اپنے آپ کو اس کے سپرد کرتے ہیں اور شیخ بھی ان سے اصلاح کا وعدہ کرتا ہے۔ اب معاہدہ کے بعد اصلاح نہ کرنا خیانت ہے جیسے کوئی مریض اپنے کو طبیب کے سپرد کردے اور اس کو مسہل یا آپریشن کی ضرورت ہو اور طبیب اس لئے مسہل یا آپریشن نہ کرے کہ بیماریوں کہے گا کہ یہ تو بہت سخت حکیم ہے جو ایسے طریقہ علاج کرتا ہے۔ اب بتلایئے مریض کے اس کہنے کا طبیب کو خیال کرنا چاہئے یا اصول کے موافق کام کرنا چاہئے۔ مریض کچھ ہی کہے اور چاہے اس کو کیسی ہی تکلیف ہو کیونکہ صحت جسم سب کو مطلوب ہے مگر نامعلوم شیخ اگر اسی قاعدہ پر عمل کرے تو اس کو بدمزاج بداخلاق کیوں کہا جاتا ہے اور اس پر ملامت کیوں کی جاتی ہے۔ بس اس کا منشا بجز اس کے کیا ہے کہ دین کی صحت مطلوب نہیں۔ غرض اصلاح بدوں اس کے نہیں ہوسکتی کہ شیخ ظاہر میں اپنے کو کسی قدر بدخلق بنائے جیسا مامون نے کہا تھا کہ غلاموں کی اصلاح اس طرح ہوسکتی ہے کہ میں اپنے اخلاق بگاڑوں۔

اخلاق مامون الرشید:

مامون کے اخلاق بہت اعلیٰ درجہ کے تھے ایک دفعہ قاضی یحییٰ بن اکثم مامون کے یہاں مہمان ہوئے۔ رات کو انہیں پیاس لگی اور پیاس کی وجہ سے نیند نہ آئی۔ ادھر ادھر کروٹیں بدلنے لگے۔ مامون رشید نے پوچھا یا یحییٰ مالک تتقلب نام لے کر پکارنا بے تکلفی کی وجہ سے تھا ورنہ خلیفہ کے دل میں قاضی صاحب کی جتنی عظمت تھی وہ ابھی معلوم ہوجائے گی۔ انہوں نے بتلایا کہ پیاس لگ رہی ہے۔ خلیفہ

نے اس وقت کسی غلام کو آواز نہ دی کیونکہ تھوڑی ہی رات گزری تھی غلاموں کی آنکھ ابھی لگی تھی ان کو جلدی جگانا گوارا نہ ہوا (اور یہاں سے معلوم ہوا کہ پہلے واقعہ جو خلیفہ نے غلام کو پکارا تھا تو اس وقت رات زیادہ گزر چکی تھی اور غلام بقدر ضرورت نیند لے چکے تھے۔ خلیفہ نے کوئی ظلم نہ کیا تھا مگر غلام گستاخ تھے اس لئے صبح سے پہلے جگانا ہی ان کو ناگوار گزرا) تو خلیفہ آہستہ آہستہ خود اٹھے اور گلاس میں پانی لاکر قاضی صاحب کو خود پلایا۔ قاضی یحییٰ نے عرض کیا کہ امیر المومنین آپ نے کسی غلام کو آواز نہ دے دی۔ فرمایا ان کی ابھی آنکھ لگی ہے اس وقت ان کو جگانا مناسب نہ تھا۔ کہا پھر میں خود جا کر پی آتا ہوں۔ فرمایا تم مہمان تھے اور مہمان کا خود پانی پینے کو جانا اکرام ضعیف کے خلاف تھا اور قاضی صاحب خود جاتے بھی تو کیا ہوتا ان کو پانی ملتا تھوڑا ہی کیونکہ محل شاہی اتنا وسیع اور بڑا ہوتا ہے کہ اس میں بدون کسی کے بتلائے کیا پتہ لگے کہ پانی کہاں ہے اور پاخانہ کہاں ہے۔ چنانچہ شاہ چین ایک دفعہ کسی دوسرے بادشاہ کے یہاں مہمان ہوا۔ رات کو پاخانہ کی ضرورت ہوئی اور جگہ معلوم نہ تھی بڑا پریشان ہوا، محل شاہی اتنا بڑا کہ وہاں بیسیوں درجہ طے کر کے زینہ ملتا ہے۔ پھر زینہ کے بعد نہ معلوم کتنے درجے ہوں گے۔ پاخانہ کی کیونکہ خبر ہوئی آخر کار جب کوئی جگہ نہ ملی تو اس نے اپنی چادر میں قضاء حاجت کی اور صبح کے وقت سویرے جنگل میں جاکر خود پھینک آیا اور اپنے ملک میں واپس آکر اپنے ولی عہد کو یہ وصیت لکھی کہ جب کوئی تمہارے یہاں مہمان ہو تو سب سے پہلے اس کو پاخانہ بتلا دو اور تم بھی کہیں مہمان ہو تو سب سے پہلے پاخانہ دریافت کرلو ورنہ سخت مصیبت ہوگی۔ ہاں اگر چھوٹا گھر ہو تو سونگھ سونگھ کر شاید پتہ لگ جائے کہ پاخانہ کون سا ہے۔ بس جہاں سے بدبو آئے گی وہیں پاخانہ ہوگا مگر بعض دفعہ اس میں بھی غلطی کا اندیشہ ہے جیسے ایک آزاد شخص نے اپنا واقعہ بیان کیا۔ واللہ اعلم صحیح تھا یا غلط مگر تکذیب کی وجہ بھی کچھ نہیں وہ کہتے تھے کہ میں اپنے دوست کی شادی میں بنگالہ گیا اور ان کے یہاں مہمان ہوا۔ رات کو قضاء حاجت کی ضرورت ہوئی، پاخانہ معلوم نہ تھا، میں بڑا پریشان تھا، آخر کار سونگھنا شروع کیا۔ ایک گڑھے میں سے بدبو آئی تو میں سمجھا کہ یہی پاخانہ ہے۔ میں نے وہاں بیٹھ کر قضاء حاجت کر لی، صبح کو شادی کی تقریب میں ایک بڑے مجمع کی دعوت تھی۔ قسم قسم کے کھانے لائے گئے آخر میں کسی نے کہا کہ بھائی اچار بھی تو لے آؤ۔ اب میں نے دیکھا کہ ایک شخص اسی جگہ گیا جہاں میں نے قضاء حاجت کی تھی اور اسی گڑھے میں سے جس میں پاخانہ کیا تھا کئی برتن بھر بھر کے لائے جب میں نے اس کی بدبو سونگھی تو یقین آ گیا کہ یہ تو وہی ہے، اب میں نے دیکھا کہ لوگ اس میں سے کھانے لگے۔ میں ڈر کے مارے خاموش رہا کہ اگر تو نے اپنی حرکت کی اطلاع کی تو لوگ تجھے

ماریں گے اور وہ سب میرے سامنے اسی میں سے کھاتے رہے، اللہ معاف کرے۔ اس شخص نے بڑی غلطی کی ان کو واقعہ ظاہر کردینا واجب تھا اور اپنا عذر بھی کہ مجھے اس کی بدبو سے یہ خیال ہوا کہ شاید یہ سنڈاس ہے، بہرحال مامون رشید نے قاضی یحیٰی بن اکثم کو خود اپنے ہاتھ سے پانی پلایا اور یہ وہ سلاطین تھے جن سے بڑے بڑے سلاطین کانپتے تھے، مگر اس پر بھی علماء صلحاء کا اتنا ادب کرتے تھے کہ خود پانی پلایا، کسی غلام کو بھی نہ جگایا۔ بہرحال اخلاق یہ نہیں ہیں کہ تمہارے ہی ہوکر بیٹھ جائیں اور باتیں بنانے لگیں بلکہ اخلاق ملکات باطنہ کا نام ہے وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ (اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں جب وہ یہ کریں اور وہ صبر کرنیوالے ہیں جب کہ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں جب معاملہ کریں) میں انہی اخلاق کا ذکر ہے۔ آج کل ان کا پتہ ہی نہیں بلکہ بعض تو ان پر نکیر کرتے ہیں کہ یہ کہاں کی اصلاح ہے کہ خواہ مخواہ مسلمانوں پر بدگمانی کر کے حکم لگاتے ہیں کہ تم میں تکبر ہے تم میں حسد ہے، تم میں عجب ہے، تم کو بدنظری کا مرض معلوم ہوتا ہے۔ یہ محض بدگمانی ہے اور افسوس یہ ہے کہ ان نکیر کرنے والوں میں بعض وہ بھی جو اصلاحی مولوی ہیں اس لئے ان کی حالت عام معترضین سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ مولوی جب بگڑتا ہے تو بہت دور پہنچتا ہے اس وقت وہ مولوی سالار بخش صاحب کی اصطلاح کا مولوی ہو جاتا ہے، مولوی صاحب وعظ میں کہا کرتے تھے کہ آج کل جو کہ مولوی ہیں ان مولوی کی اصل بھی معلوم ہے۔ یہ لفظ ہے مولوی مو کہتے ہیں موسم کو اور لوی کہتے ہیں بٹیر کو، یہ تو موسم کی بٹیریں ہیں۔ مولوی سالار بخش صاحب کو کچھ مراق تھا مگر بعض لطیفے ان کے بہت اچھے ہوتے تھے۔ بعض باتیں کام کی بھی کہتے تھے تو جو مولوی بگڑتا ہے وہ مولوی صاحب کی تفسیر کے موافق مولوی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے مولویوں نے فتویٰ لگادیا کہ مشائخ بدگمانی سے مسلمانوں پر امراض قلبیہ کا حکم لگاتے ہیں اور بدگمانی حرام ہے۔ نص میں موجود ہے۔ ان بعض الظن اثم واجتنوا کثیراً من الظن (بلاشبہ بعض گمان گناہ ہیں اور بہت سے گمانوں سے بچا کرو) مگر میں کہتا ہوں سخن شناش نہ دلبرا خطا ایں جاست۔ بات یہ ہے کہ ان بعض الظن اثم کو پڑھا تم نے مگر سمجھا ہے مشائخ ہی نے، کیونکہ تمہارے پاس صرف الفاظ ہیں اور ان کے پاس معانی ہیں۔ دیوبند میں سے ایک رئیس مجھے کہنے لگے کہ تم لوگ حاجی صاحب کے پاس دوڑ دوڑ کر کیوں جاتے ہو وہ تو کچھ زیادہ پڑھے ہوئے بھی نہیں۔ حضرت نے صرف کافیہ تک پڑھا تھا میں نے کہا کہ تم کو کیسے سمجھاؤں کہ حضرت کے پاس کیا چیز ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھو وہ یہ کہ ایک شخص تو وہ ہے جس کو مٹھائیوں کے نام خوب یاد ہیں مگر اس کے پاس

کھانے کو کوئی مٹھائی بھی نہیں اور ایک وہ شخص ہے جس کے پاس قسم قسم کی مٹھائیاں موجود ہیں مگر اس کو نام معلوم نہیں اب تم بتلاؤ ان میں سے کون کس کا محتاج ہے۔ یقیناً جس کے پاس مٹھائیاں رکھی ہوئی ہیں اس کو نام یاد کرنے کی کچھ ضرورت نہیں اس کو ہر مٹھائی کی لذت حاصل ہے اور وہ مزے لے کر ہر اک کو کھا رہا ہے۔ البتہ جس کو محض نام یاد ہے وہ اسکا محتاج ہے کیونکہ محض نام یاد کرنے سے اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا نہ کچھ لذت آ سکتی ہے۔ میں جب ڈھاکہ گیا تو نواب ڈھاکہ اپنی بیویوں سے قسم قسم کے کھانے پکوا کر میرے واسطے خود لایا کرتے تھے اور سامنے رکھ کر مجھ سے پوچھتے کہ بتلایئے کہ اس کھانے کے کیا اجزاء ہیں میں کہہ دیتا کھانے کی اجازت اس بتلانے پر موقوف ہے تو مجھ کو کھانے ہی کی ضرورت نہیں اور اگر موقوف نہیں تو پھر بتلانے کی ضرورت نہیں جب کہ اصل چیز میرے پاس آ چکی ۔نواب صاحب ہنستے اور ہر کھانے کا نام اور اجزاء بتلاتے۔ بے چارے بڑے بے نفس تھے کہ نواب ہو کر خود اپنے ہاتھ سے کھانا لاتے اور یہ بھی ان کی محبت تھی کہ اپنی بیگمات سے خاص طور پر میرے واسطے کھانے پکواتے تھے۔ غرض اہل ظاہر کی اہل اللہ کے سامنے وہ مثال ہے کہ کسی کو مٹھائی کے نام تو یاد ہوں مگر آنکھ سے کبھی نہ دیکھی ہوں اور اہل اللہ کو نام تو یاد نہیں مگر حقیقت ان کے پاس موجود ہے اس لئے وہ ہمارے محتاج نہیں اور ہم ان کے محتاج ہیں اب سمجھئے کہ اہل اللہ نے اجتنبوا کثیراً من الظن (اور بہت سے گمانوں سے بچا کرو) کی حقیقت کو سمجھا ہے اور ہم نے محض الفاظ پڑھے ہیں کیونکہ انہوں نے اس کی علت تلاش کی اور گو بلا ضرورت علل کا تلاش کرنا جائز نہیں مگر مجتہدین کو تعدیہ احکام کے لئے تتبع علل جائز ہے اور مشائخ محققین بھی مجتہد ہوتے ہیں ان کو علت تلاش کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ انہوں نے اصلاح خلق کا بیڑا اٹھایا ہے جس کے لئے طریق اصلاح کو مدون کرنا ضروری تھا تو انہوں نے سمجھا کہ حرمت ظن کی علت تحقیر ہے کہ کسی کو حقیر سمجھ کر اس کے ساتھ بدگمانی نہ کرو اور اگر تحقیر نہ ہو بلکہ اصلاح مثلاً طبیب نبض دیکھ کر مریض سے یہ کہے کہ تم عنین ہو اور شاید تم نے فلاں حرکت کی ہے یا یہ کہ تم کو سوزاک ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ناجائز افعال کے مرتکب ہو تو یہ بدظنی جائز ہے کیونکہ اس کا منشا تحقیر نہیں بلکہ طریق علاج کو معین کرنا مقصود ہے۔ اب اگر بیمار انکار بھی کرے تب بھی طبیب احتیاطاً اسی مرض کا علاج کرتا ہے جو اس نے سمجھا ہے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ ظن حرام ہے؟ ہرگز نہیں پھر مشائخ کا ظن حرام کیوں ہے وہ بھی اصلاح و معالجہ ہی کی غرض سے ظن کرتے ہیں، رہی تحقیر سو بخدا محقق تو کتے کو بھی اپنے سے بدتر نہیں سمجھتا۔ مسلمان کو تو وہ کیونکر حقیر سمجھے گا کہ وہ دھمکاتے بھی ہیں۔

کبھی تعلیم وتادیب کی غرض سے سزا بھی دیتے ہیں مگر ان کی اس وقت یہ حالت ہوتی ہے جو حالت اس بھنگی کی ہوتی ہے جسے بادشاہ نے حکم دیا ہو کہ شہزادے کے سو بید لگائے یقیناً حکم شاہی کی وجہ سے وہ شہزادے کے بید لگائے گا مگر اپنی فضیلت اور شہزادے کی مفضولیت کا اسے وسوسہ بھی نہ گزرے گا بلکہ بید لگاتے ہوئے بھی وہ شہزادے ہی کو افضل سمجھے گا اور بے حد شرمندہ ہوگا بتلایئے جس شخص کی حالت ظن کے وقت میں یہ ہو اُس کا ظن حرام ہو سکتا ہے؟ کبھی نہیں یہ تو **ان بعض الظن اثم** سے استدلال کا جواب تھا اب ایک شکال اور باقی رہا کہ بعض دفعہ مشائخ طالبین سے واقعات پوچھتے ہیں کہ بتلاؤ تم نے کیا کیا گناہ کئے ہیں۔ علماء قشر کہتے ہیں کہ یہ گناہوں کا افشاء ہے اور افشاء معصیت حرام ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بلا ضرورت حرام ہے اور ضرورت سے جائز ہے جیسے ستر کا کھولنا بلا ضرورت حرام ہے اور طبیب کے سامنے بضرورت کھولنا جائز ہے اسی طرح طبیب کو واقعات پوچھنا بھی جائز ہے۔ مثلاً وہ مریض سے یہ سوال کرے کہ تم اپنی بیوی پر کبھی قادر بھی ہو یا نہیں اور قادر ہوئے تو کس طرح ہوئے ہو رغبت سے یا بہ تکلف تصور کر کے اور طبیعت کو برانگیختہ کر کے وعلیٰ ہذا القیاس تو یہ افشاء راز نہیں بلکہ ضرورت کا سوال ہے جس کے بغیر طبیب معالجہ نہیں کر سکتا اس طرح مشائخ طالب کا کچا چٹا دریافت کرتے ہیں تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ اس شخص میں کون کون سے مادے غالب ہیں تاکہ ان کا اول علاج کیا جائے میں بھی اس اعتراض سے مدت تک چکر میں رہا مگر پھر بخاری کی ایک حدیث سے معلوم ہوا کہ بضرورت تتبع عورات جائز ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ افک میں نزول وحی سے پہلے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: **اما بعد یا عائشة انه بلغنی عنک کذا وکذا فان کنت برئیته فسیبرئک الله وان کنت المممت بذنب فاستغفری الله وتوبی الیه فان العبد اذا اعترف ثم تاب تاب الله علیه (بخاری ۲۳۰:۳ حدیث الافک)** ''اے عائشہؓ مجھ کو ایسی ایسی خبر پہنچی ہے اگر تم بری ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور تمہاری برأت ظاہر کریں گے اور اگر تم سے کچھ گناہ ہو گیا تو استغفار و توبہ کر لو، کیونکہ بندہ جب اعتراف گناہ کا کرے پھر توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتے ہیں۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں واقعہ کو نقل کر کے اس کے صدور و عدم صدور کی تحقیق فرمائی اور دونوں شقوں کا حکم ظاہر فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ مصلح کو واقعات دریافت کرنا جائز ہے یہ تو اعتراضات کا جواب تھا۔

امراض قلبی کی پہچان:

رہا یہ سوال کہ امراض قلب تو مخفی ہوتے ہیں ان کا علم مشائخ کو کیونکر ہوتا ہے کیا ان پر وحی نازل

ہوتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں وحی تو نازل نہیں ہوتی بلکہ بعض دفعہ تو اشارات وکنایات سے باطن کا حال معلوم ہوجاتا ہے کیونکہ ظاہر وباطن میں باہم بہت تعلق ہے اور کبھی فراست سے صورت دیکھ کر پہچان لیتے ہیں کہ یہ شخص فلاں گناہ میں مبتلا ہے۔ حضرت عثمانؓ کا واقعہ ہے کہ ان کی مجلس میں ایک شخص نظر بد کر کے حاضر ہوا تو آپ نے مجملاً سب کو فرمایا کہ لوگوں کا کیا حال ہے ہمارے پاس ایسی حالت میں آتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے۔ یہ فراست کاملہ تھی اور اہل اللہ کو اس کا بڑا حصہ عطا ہوتا ہے۔ حدیث میں بھی وارد ہے **اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله** (سنن الترمذی: ۳۱۲۷) (مؤمن کی فراست سے ڈرو بے شک وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے) غالباً حضرت شیخ عبدالحق نے لکھا ہے کہ ایک شخص ہمارے زمانہ میں ایسا صاحب فراست ہے کہ صرف صورت دیکھ کر آدمی کا نام بتلا دیتا ہے کیونکہ صورت میں اور نام میں خاص تناسب ہوتا ہے جس کو صاحب فراست صحیح دریافت کرسکتا ہے مگر ایسی اعلیٰ فراست واقعی قابل حیرت ہے۔ باقی گفتگو اور تحریر سے اندرونی امراض کا حال معلوم کرلینا یہ تو اب بھی بہت سوں کو حاصل ہے۔ گو میں مشائخ میں سے نہیں ہوں مگر الحمدللہ مشائخ کا معتقد ہوں ان کی برکت سے مجھے بھی حق تعالیٰ نے ایسی فہم عطا فرمائی ہے کہ طرز گفتگو سے مجھے انداز طبیعت معلوم ہوجاتا ہے اور ایسا بین طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ میں یہ تو دعویٰ نہیں کرسکتا کہ یقین کا درجہ ہوتا ہے درجہ تو ظن ہی کا ہوتا ہے مگر ظن مرجوح نہیں بلکہ ظن غالب۔ ابھی چند روز ہوئے ایک شخص نے مجھے خط لکھا جس میں بیٹے کے بھو کے مرنے پر اس عنوان سے صدمہ ظاہر کیا تھا کہ ایک سترہ سالہ نوخیز نوجوان کی موت کا بہت بڑا صدمہ ہے۔ میں سترہ سالہ نوخیز کا لفظ سمجھ گیا کہ اس شخص کو اپنی بہو سے نفسانی محبت ہے۔ میں نے جواب میں اس کو متنبہ کیا کہ تم توبہ کرو۔ تم کو اپنی بہو سے ناجائز محبت ہے اب چاہے کوئی اس کو بدگمانی کہے مگر مجھے تو اس اس لفظ سے یہ مرض ایسا کھلا ہوا معلوم ہوا کہ جیسے طبیب کو قارورہ سے بخار۔ چنانچہ اس شخص نے جواب میں اس کا انکار نہیں کیا اور بحمد اللہ میں نے تجربہ کیا ہے کہ امراض باطنہ کے متعلق میری سو تجویزوں میں سے اگر سو پوری نہیں تو نناوے تو ضرور صحیح ہوئی ہیں جن میں سے اکثر کا اقرار تو خود مریض نے کیا اور بعض کا ثبوت واقعات سے ہوگیا، البتہ ایسا ادراک بدوں دلیل شرعی کے حجت نہیں۔

مرض بخل:

چنانچہ ایک مرض کی طرف اس وقت متوجہ کرتا ہوں اور وہ مرض بخل کا ہے جو ہم طالب علموں

کے طبقہ میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ہم لوگوں میں پوری سخاوت نہیں ہے حتیٰ کہ عوام میں مشہور ہو گیا کہ علماء کنجوس بہت ہوتے ہیں۔گو اس دعوے کی دلیل میں وہ بعض ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جن کا منشاء بخل نہیں بلکہ انتظام ہے۔مثلاً بعض لوگوں کو علماء کے اس فعل پر اعتراض ہے کہ یہ لفافوں کو الٹ کر دوبارہ کام میں لے آتے ہیں۔ میں ایسا بہت کرتا ہوں اور میں نے یہ طریقہ حضرت استاد سے سیکھا ہے۔مولانا کی عادت تھی کہ لفافوں کو الٹ کر دوبارہ کام میں لے آتے تھے ۔اسی وقت سے مجھے بھی اس کی عادت ہے۔سو یہ اعتراض تو لغو ہے۔اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایسے کام میں انگریزوں کی تو تعریف کی جائے اور مولویوں کو الزام دیا جائے ۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ یہ جو کاغذ بن کر آتا ہے اس میں حیض کے چیتھڑوں اور گودڑ کو کام میں لایا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں کاغذ بننے کی مشین تھی۔ میں نے وہاں جا کر خود اس کا مشاہدہ کیا ہے اور اس پر لوگ تعریف کرتے ہیں کہ انگریز بڑے عاقل ہیں، کسی چیز کو ضائع نہیں کرتے۔ ہر چیز کو خواہ کیسی ہی بے کار ہو کام میں لے آتے ہیں۔ نیز ہم نے سنا ہے کہ ولایت میں درختوں کی چھال سے بھی کاغذ بنتا ہے جو ہمارے یہاں بے کار شمار ہوتی ہے نیز ہمارے بھائی ایک ریاست میں ملازم تھے۔زمانہ جنگ میں کاغذ بہت گراں ہو گیا تھا تو انہوں نے ہم طالب علموں سے سیکھ کر یہی عمل شروع کیا کہ لفافوں کو الٹ کر دوبارہ کام میں لانے لگے اور الٹے ہوئے لفافے کلکٹر کو دکھائے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور ان کی بہت مدح لکھی کہ ہمارے منیجر نے ایک مفید طریقہ ایجاد کیا ہے جس سے ہم بہت خوش ہوئے۔سب اہل ریاست کو اس طریقہ پر عمل کرنا چاہئے۔ لیجئے اب تو انگریزوں کا بھی فتویٰ ہو گیا اب تو ان لوگوں کو جو انگریزوں کے معتقد ہیں مولویوں کے اس فعل پر اعتراض کا حق نہیں رہا تو یہ کنجوسی نہیں ہے بلکہ انتظام ہے کہ مال کو اضاعت سے بچانا ہے جب ایک لفافہ دو مرتبہ اس طرح کام دے سکتا ہے تو کیا وجہ کہ اس سے دوبارہ کام نہ لیا جاوے مگر دیکھنا یہ ہے کہ جو شخص لفافے اُلٹتا ہے وہ جیسا صرف میں منتظم ہے ایسا آمد میں بھی منتظم ہے تو اس کو یہ فعل مبارک ہے اور جو آمدنی میں حرام و حلال کی پروا نہیں کرتا محض صرف ہی میں منتظم ہے تو واقعی طماع ہے۔

مستعمل ٹکٹ کا حکم:

ایک واقعہ جس میں بعض لوگ طمع سے کام لیتے ہیں یہ ہے کہ بعض دفعہ لفافہ کا ٹکٹ مہر سے بچ جاتا ہے تو اس کو استعمال نہیں کرتا بلکہ ایسے ٹکٹ دیکھ کر سب سے پہلا کام میرا یہ ہوتا ہے کہ اس ٹکٹ کو فوراً چاک کر دیتا ہوں مگر بعض لوگ ایسے ٹکٹوں کو دوبارہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ شرعاً جائز نہیں کیونکہ

ٹکٹ اس اجرت کی رسید ہے جو ڈاک پہنچانے کے عوض میں ڈاک والوں کو دی گئی ہے اور جب خط پہنچ گیا تو انتفاع کامل ہو چکا اب ایک بار کی اجرت میں دوبارہ کام لینا حرام ہے مگر لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے مگر عوام میں اور خواص میں اتنا فرق ہے کہ عوام گناہ کر کے اس کے جواز کی دلیل بیان نہیں کرتے اور خواص ایسا کریں گے تو اس کے ساتھ لاں بھی لگائیں گے۔ بعض تو یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ حربی کا مال ہے اور حربی کا مال بدون عذر کے جس طرح بھی حاصل ہو حلال ہے۔ سو اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ صورت مذکورہ میں عذر نہیں کیونکہ جب یہ معاملہ اجارہ کا ہے اور اجارہ ایک دفعہ کے لئے منعقد ہوا ہے تو دوبارہ اس سے کام لینا یقیناً عذر ہے اور اگر پھر بھی حربی کا مال استیلاء سے آپ کو حلال ہو جاتا ہے اسی طرح اگر حربی آپ کے مال پر استیلاء کرے تو اس کے لئے بھی تو آپ کا مال جائز ہو جاتا ہے کیونکہ استیلاء ان کے حق میں بھی سبب ملک سے ہے اب بتلاؤ اگر وہ تمہارا گھر لوٹ لیں تو ان کو بھی اس کا حق ہونا چاہئے پھر اس وقت چیختے کیوں ہو اور شکایت کس لئے کرتے ہو اگر ان کو یہ حق حاصل نہیں تو معلوم ہوا وہ صرف حربی نہیں بلکہ معاہد ہیں اور جب معاہد کیساتھ عام حربیوں کا سا معاملہ کرنا آپ کو کہاں جائز ہے بعض لوگ ریل میں بلا کرائے کے سفر کرتے ہیں اور یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ حربی کے مال سے انتفاع جائز ہے پھر بعض تو کہتے ہیں کہ معاہدہ ہوا ہی نہیں اور بعض کہتے ہیں ہوا تھا مگر ٹوٹ گیا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر عہد ٹوٹ گیا ہے تو اگر وہ بھی آپ پر ظلم کریں تو ان کو حق ہونا چاہئے پھر اس وقت کیوں احتجاج کرتے اور ان کو معاہدے کیوں یاد دلاتے ہو یہ کیا جب تم کچھ کرو اس وقت تو عہد نہیں اور جب وہ کچھ کریں تو عہد ہو جاتا ہے جیسے بمبئی کے سیٹھ کرتے ہیں کہ ان کو سود سے منع کیا جائے تو یوں کہتے ہیں کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور دارالحرب میں سود جائز ہے اور جب زکوٰۃ کے لئے کہا جائے تو کہتے ہیں کہ ہمارا مال تو سودی ہے اور حرام مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ سود لینے کے وقت تو وہ حلال تھا اور زکوٰۃ دینے کے وقت حرام ہو گیا۔ ان کی مثال شتر مرغ جیسی ہے کہ اس سے اڑنے کو کہا جائے تو کہتا ہے کہ اونٹ ہوں اور کہیں اونٹ بھی اڑا کرتا ہے اور جو کہا جائے کہ پھر بوجھ اٹھا تو کہتا ہے میں تو پرندہ ہوں اور پرندہ بھی کہیں بوجھ لادا کرتا ہے۔ حضرت عطار فرماتے ہیں:

چوں شتر مرغے شناس ایں نفس را　　　نے کشد بارد نہ پرد بر ہوا

گر بپر گوئیش گوید اشترم　　　ورنہی بارش بگوید طائرم

''اپنے نفس کو شتر مرغ کی مانند (چالاک) سمجھو کہ جو تو نہ بوجھ اٹھاتا ہے اور نہ ہوا میں اڑتا

ہے لہٰذا اگر اس سے کہا جائے کہ اڑ تو کہتا ہے میں تو اونٹ ہوں اور اگر کہا جائے کہ بوجھ اٹھا تو کہتا ہے کہ میں تو پرندہ ہوں''

یہ تو بیباک لوگوں کا حال تھا اور جو محتاط ہیں وہ یہ کہہ کر مستعمل ٹکٹوں کو دوبارہ استعمال کرتے ہیں کہ گورنمنٹ ہم سے بعض ناجائز حقوق وصول کرتی ہے جیسے انکم ٹیکس وغیرہ۔ ہم اس کا عوض اس طرح وصول کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اول تو فقہاء سے استفسار کرو کہ غیر جنس سے حق وصول کرنا جائز بھی ہے یا نہیں کیونکہ گورنمنٹ تم سے نقد لیتی ہے اور تم منفعت سے عوض لیتے ہو اور اس کے حل کرنے کے بعد اگر جواز کی گنجائش ہے تو اسی شخص کو ہے جس سے گورنمنٹ ایسے حقوق وصول کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ سب پر انکم ٹیکس وغیرہ کہاں پھر آپ کے پاس اس کا حساب بھی محفوظ ہے کہ گورنمنٹ نے تم سے کتنا وصول کیا اور تم کتنا وصول کر رہے ہو۔ بس معلوم ہوا کہ یہ بھی محض بہانہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم اپنے دوسرے بھائیوں کے واسطے وصول کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں پھر کیا تم نے کبھی ان دوسروں کو ان کے یہ حقوق پہنچائے ہیں۔ یعنی جتنا انگریزوں سے وصول کیا ہو ان اہل حقوق کو حوالہ کر دیا ہو کہ ہم نے تمہارے یہ حقوق انگریزوں سے لئے ہیں تم لو اور اہل حقوق کے معلوم نہ ہونے پر اس کو فقراء میں صدقہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی کوئی نہیں کرتا پھر یہ سب مراحل طے کرنے کے بعد شیخ طریقت کا فتویٰ باقی ہے۔ اگر علماء کے فتوے سے یہ فعل جائز بھی ہو جائے تب بھی شیخ اس سے منع کر سکتا ہے کیونکہ وہ کہتا ہے کہ اس کی نبض دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مستعمل ٹکٹوں کو استعمال کر کے یہ شخص اپنی حد پر نہ رہے گا اور اس میں مرض طمع بڑھ جائے گا اس لئے اس کو یہ فعل جائز نہیں۔ دوسرے حدیث میں ہے **لا ینبغی للمؤمن ان یذل نسه** (**مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۰۳**) یعنی مسلمان کو نہ چاہئے کہ اپنے کو ذلیل کرے اور مستعمل ٹکٹ لگانے میں ذلت کا اندیشہ ہے، گو وہ کیسے ہی صاف ہوں مگر بعض دفعہ ڈاکخانہ والے خوردبین سے اسے دیکھتے ہیں اور مہر کا خفیف سا اثر ان کو نظر آ جاتا ہے جو ہم کو نظر نہیں آیا تھا، پھر اس میں بعض دفعہ جیل خانہ ہو جاتا ہے تو چار پانچ پیسوں کے لئے اپنے کو اتنے بڑے خطرے میں ڈالنا کون سی عقلمندی ہے۔ اگر ایسا ہی لگانا ہے تو پوسٹ ماسٹر کو اطلاع کر کے لگاؤ دیکھو تو کیسی خبر لی جاتی ہے۔ اسی واسطے بعض علماء کہتے ہیں کہ چونگی دے دیا کرو تاکہ بعد میں ذلت نہ ہو۔ نیز بعض دفعہ اس میں اسلام کی ذلت ہوتی ہے کیونکہ عرفاً ریل میں بے ٹکٹ سفر کرنا اور استعمالی ٹکٹوں کو دوبارہ کام میں لانا اور چونگی سے مال کو بچا لینا بے ایمانی شمار ہوتا ہے اب اگر کبھی گرفت ہوگئی اور واقعہ کھل گیا اور تم سے

عدالت میں سوال ہوا کہ تم نے یہ جرم کیوں کیا اور آپ نے یہ جواب دیا کہ میرے مذہب میں ایسا کرنا جائز تھا جیسا کہ بریلی میں ایک تاجر نے برسرِ عدالت یہی جواب دیا تھا تو عدالت والے یہ کہیں گے کہ توبہ توبہ اسلام بے ایمانی اور چوری سکھلاتا ہے اس لئے مشائخ کہتے ہیں کہ اسلام کو ذلت سے بچانے کے لئے چونگی دے دو اور چار پیسوں کی بچت نہ کرو۔ یہ وہ مفاسد ہیں جن پر علماء قشر کی نظریں نہیں پہنچتیں، ان کو مشائخ عارفین ہی سمجھتے ہیں۔

مگر افسوس یہ ہے کہ آج کل مشائخ ہی کم ہیں ہاں چوبیس ہزار اسم ذات بتلانے والے بہت ہیں لیکن اصلاح کرنے والے اور اخلاق رذیلہ کا معالجہ کرنے والے بہت کم ہیں کیونکہ اس میں عوام میں بدنامی ہوتی ہے لوگ ایسے مصلح کو بداخلاق اور تنگ مزاج کہتے ہیں تو خواہ مخواہ بدنامی اپنے سر کون لے۔ ارے میں کہتا ہوں کہ پھر اس کی ہی کیا ضرورت ہے کہ لوگ آپ کو اچھا کہیں اور تمہارا تو یہ مذاق ہونا چاہئے:

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلان مانمی خواہیم تنگ و نام را

"اگرچہ یہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے لیکن ہم بدنامی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے"

میں اس میں ننگو کو منادی بھی کہا کرتا ہوں اگرچہ رسم خط موافق نہیں مگر پڑھنے میں تو آتا ہے یعنی اے ننگو جو معرفت سے عاری ہو ہم کو نام کی ضرورت نہیں اردو میں کسی نے اس مضمون کو دوسری طرح کہا ہے:

عاشق بدنام کو پروا ہے تنگ و نام کیا اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طریقہ سے (یعنی طریق اصلاح اختیار کرنے سے) معتقد کم ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ خیال غلط ہے گو ظاہر میں تمہارے پاس آدمی کم آئیں مگر دل میں معتقد زیادہ ہوں گے اور مان لو معتقد کم بھی ہوئے تو کیا فوج بھرتی کر کے کہیں کام پر بھیجو گے اگر زیادہ معتقد بھی ہوئے اور کام کے نہ ہوئے تو ان کو لے کر کیا کرو گے۔ اس سے تو یہ اچھا ہے کہ معتقد تھوڑے ہوں اور کام کے ہوں اس میں تو زیادہ راحت ہے کہ ہجوم خلق زیادہ نہ ہوگا کیونکہ ہجوم سے اوقات میں خلل پڑتا ہے یہ جواب تو بطور ارخاء عنان کے ہے ورنہ میرا اصلی مذاق یہ ہے کہ مجھے تو گو نگے اعتقاد سے وحشت ہوتی ہے مگر جسے ہجوم خلائق سے محبت ہو جو ہر وقت اپنے گرد مجمع چاہتا ہے وہ تو بے شک معتقدین کی قلت سے گھبرائے گا اور طریق اصلاح کو اختیار نہ کرے گا۔ میں تو حق تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں کہ الحمد للہ میری پیدائش میں ایک مجذوب کی نظر و توجہ کو دخل ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مجھے بچپن ہی سے ہجوم سے نفرت ہے۔ زمانہ قیام کانپور میں یہ حالت

تھی کہ میں تنہا گلی کوچوں میں پھرتا تھا اور ہجوم سے گھبراتا تھا گو اس تنہا گردی سے بعض اوقات کچھ پریشانی بھی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک بار مدرسہ جامع العلوم کا جلسہ ہوا تو جلسہ کے لئے ایک بڑا مکان تجویز کیا گیا جو طلاق محل کے نام سے مشہور تھا وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اس محل میں ایک نواب کی بیگم طلاق لے کر رہتی تھی۔ جب میں نے جلسہ کا اشتہار شائع کیا اور جلسہ کا اس مکان میں ہونا ظاہر کیا تو اس کا نام طلاق محل کے تلاق محل تاء سے شائع کیا لفظ طلاق کو میں نے جلسے کے لئے مناسب نہ سمجھا۔ لوگ اس تصرف سے بہت خوش ہوئے کہ مکان کا نام بھی نہ بدلا اور فال بد سے بھی حفاظت ہو گئی تو جس زمانہ میں جلسہ کا اشتہار شائع کیا گیا تھا اس وقت بعض انتظامات کے لئے مجھے اس مکان میں جانا پڑا تھا۔ ایک دفعہ میں تنہا جارہا تھا کہ راستہ بھول گیا کیونکہ یہ مکان مدرسہ کے زیادہ قریب نہ تھا۔ اب مجھے کسی سے پوچھتے ہوئے بھی شرم آتی تھی کہ تلاق محل کا راستہ کدھر کو ہے۔ یہ خیال ہوا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ انہی کے مدرسہ کا تو جلسہ ہے اور یہی اشتہار شائع کررہے ہیں اور خود راستہ بھی نہیں جانتے۔ غرض دشواری سے راستہ ملا اور یہ خمیازہ تھا تنہا گردی کا مگر پھر بھی بچپن ہی سے میری یہی حالت ہے۔ اسی کا اثر اب بھی ہے کہ مجھے ہجوم سے نفرت ہے۔ اسی واسطے میں بیعت میں جلدی نہیں کرتا بلکہ بہت سے شرائط کے بعد کرتا ہوں اس میں ہمارے بعض احباب کی رائے یہ ہے کہ اتنی سختی نہ کرنا چاہئے بلکہ جہاں تک ہو سکے لوگوں کو اپنے سے وابستہ کرنا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ وابستہ کر کے اصلاح کرو تب تو فائدہ بھی ہے ورنہ تو وابستہ ہو کر طریق سے بے کار اور پابستہ ہو جائے گا کیونکہ جلدی بیعت کر لینے سے وہ یہ سمجھے گا کہ اس طریق میں عمل کے اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ اب بتلاؤ وہ طریق سے پابستہ ہو گا یا نہیں اور جب اس سے شرطیں کی جائیں گی تو عمل کی ضرورت ابتداء ہی سے اس کے ذہن نشین ہو جائے گی، پھر وہ عمل کا اہتمام کرے گا اور بار بار روک ٹوک کرنے سے اس میں ترقی ہو گی اگر وہ روک ٹوک کا تحمل کرتا رہا تو انشاءاللہ بہت جلد اصلاح پذیر ہو جائے گا اور بدوں اس کے تو فضول بھرتی کرنا ہے۔

غرض اخلاقِ باطنہ کی حقیقت یہ ہے کہ اعمال باطنہ درست ہوں چونکہ اس سے علماء تک بھی غافل ہیں اس لئے حق تعالیٰ نے اس کا اہتمام فرمایا ہے کہ شرائطِ کمال میں ان کو بھی داخل فرمایا۔ چنانچہ اول وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا (اور وہ اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں جب وہ عہد کریں) فرمایا اور اس سے آگے ارشاد فرمایا: وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ (اور صبر کرنیوالے ہیں سختی اور تکلیف میں اور جنگ کے وقت) یہی جزو اس وقت مقصود

بالبیان ہے اور جو مضمون میں بیان کرنا چاہتا ہوں اس کو اسی جزو سے تعلق ہے۔

مقصد وعظ :

اول میں مقصود کی تعیین کرتا ہوں اس کے بعد آیت سے اس کا ارتباط بیان کروں گا۔ اس وقت مجھے دو چیزوں کے متعلق کچھ بیان کرنا ہے۔ شاید آپ یہ سمجھے ہوں کہ ایک رمضان ہوگا اور ایک عید۔ نہیں صاحب ایک عید ہے اور ایک وعید۔ عید تو رمضان ہے شاید یہ کہو یہ کیسی عید ہے سو سن لیجئے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محاورہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کو عید فرمایا ہے۔ حدیث میں ہے شهرا عيده ينقضان (الصحيح لمسلم كتاب الصيام: ۳۱) کہ دو مہینے عید کے کم نہیں ہوتے آپ تو عید کا مہینہ شوال کو سمجھتے ہوں گے اور ذی الحجہ کو مگر نہیں حدیث میں اس کی تفسیر ذوالحجہ ورمضان وارد ہے اور انکا ناقص نہ ہونا بایں معنی ہے کہ نقصان ایام ثواب کم نہیں ہوتا۔ مثلاً رمضان ۲۹ دن کا ہو تو ثواب پورے تیس دن کا ملے گا اور ذوالحجہ میں بھی اختلاف ہلال سے نقصانِ ایام محتمل تھا کیونکہ ذوالحجہ میں نو روزے ہیں یکم سے عرفہ کے دن تک تو اگر کبھی تاریخ کے اختلاف سے یہ صورت ہو کہ جس دن کو ہم نے عرفہ سمجھا تھا وہ شہادت سے یوم النحر ثابت ہوا اور اس دن کا روزہ نہ رکھ سکے تو روزہ رکھنے والوں کو پورے نو دن کے روزوں کا ثواب ملے گا، گو ظاہر میں آٹھ ہی روزے ہوئے۔ اب یہاں یہ سوال ہوگا کہ ذوالحجہ کا شہر عید ہونا تو ظاہر ہے کیونکہ عید اسی ماہ میں واقع ہوئی ہے لیکن رمضان کو کس اعتبار سے شہر عید کہا گیا کیونکہ عید الفطر تو ختم رمضان کے بعد آئی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رمضان کو مقدمہ عید ہونے کی وجہ سے شہر عید کہا گیا اور مقدمہ اس لئے ہے کہ عید کا لطف رمضان ہی سے آتا ہے، جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے ہوں اسی کو عید کے دن کھانے پینے کا لطف ہے ظاہراً بھی اور باطناً بھی اور جس نے روزے رکھے نہ ہوں اس کی کیا عید اس کے لئے تو یہ دن اور باقی سب یکساں ہیں۔ یہ تو ظاہری بے لطفی ہے اور باطن میں اس طرح کہ روزے رکھنے کی وجہ سے اس کا دل عید کے دن منشرح نہ ہوگا بلکہ معصیت کی وجہ سے بے چین ہوگا اور یہ دن معلوم ہوگا جیسے پھٹکار برس رہی ہو۔ (قال الشاعر خوشی کے ترانے خبر دے رہے ہیں، سحر جلوہ بخش جہاں عید ہوگی مگر جن کے دل مر چکے ہیں انہیں کیا جہاں عید ہوگی وہاں عید ہوگی) یہاں سے ایک لطیفہ سمجھ میں آیا جو بطور بشارت کے سناتا ہوں وہ یہ کہ میں نے شوقِ وطن میں دعویٰ کیا کہ موت مسلمانوں کے لئے بہرحال رغبت کی چیز ہے عید ہے

اگر چہ مسلمان جہنم میں بھی جائے جیسے رمضان عید ہے اگر چہ اس میں فاقہ ہی ہو یعنی جیسے رمضان اس لئے عید ہے کہ عید کا لطف اسی سے ہے اسی طرح بعضے مسلمانوں کے لئے جہنم سے جنت کا لطف بڑھ جاوے گا۔ جیسا بعض کو بلاواسطہ بھی جنت کا لطف بھی حاصل ہوگا، البتہ جہنم جیسے اثر کے اعتبار سے لطف افزا ہے۔ ذات کے اعتبار سے مثل گرم حمام کے ہے جہاں گرم گرم پانی سے غسل دیا جاتا ہے تکلیف وہ بھی ہے لیکن اس تکلیف کا انجام تصفیہ وتزکیہ ہے اسی لئے کفار کے حق میں **لایزکیھم** (نہیں پاک کرے گا) فرمایا گیا ہے اور مومنین کے باب میں عقوبت کے بعد **حتی اذا هذبوا ونقوا** (انہیں پاک نہ کرے گا) آیا ہے (رواہ البخاری) مگر گرم پانی کا بھی تحمل مشکل ہے تو بندہ میلا ہو کر ہی کیوں جاوے کہ حمام سے غسل دیا جائے جس کی برداشت نہ ہو سکے اور اس لئے وہ مصیبت نظر آوے۔ جیسے ایک چمار کے لڑکے کا قصہ ہے کہ وہ بگولے میں لپٹ کر اڑ گیا تھا اور ایک راجہ کے محل پر جا پڑا۔ لوگوں نے جو اس کو آسمان سے گرتا ہوا دیکھا، یوں سمجھے کہ یہ کوئی اوتار ہے۔ فوراً اس لڑکے کو تعظیم وتکریم کے ساتھ راجہ کے پاس لائے۔ راجہ نے وزیر سے مشورہ کر کے یہ رائے طے کی کہ بادشاہ زادی کا نکاح اسی لڑکے سے کر دیا جائے کیونکہ اس سے بہتر کون ہوگا۔ یہ تو ابھی خدا کے پاس سے آ رہا ہے لیکن چونکہ ظاہر میں خراب خستہ تھا اس لئے حکم دیا کہ اس کو حمام میں لے جا کر غسل دیا جائے وہاں جو اس کے بدن پر گرم گرم پانی پڑا تو چیخنے چلانے لگا اور یہ سمجھا کہ مجھے مجرم قرار دے کر یہ سزا دی جا رہی ہے۔ وہاں سے نکال کر اسے قیمتی پوشاک پہنائی گئی۔ اس سے اور زیادہ رویا، پھر بہلانے کے لئے اس کے سامنے جواہرات ڈالے گئے۔ ان کو دیکھ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور رونا بند نہ ہوا، پھر شہزادی کو اس کے سامنے بھیج دیا گیا کہ شاید اس کو دیکھ کر مانوس ہو، اس نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور پہلے سے زیادہ چلانے لگا۔ آخر کار یہ رائے قرار پائی کہ ابھی عالم غیب سے تازہ تازہ آیا ہے اس لئے دنیا سے وحشت کرتا ہے۔ چند دن اس کے حال پر چھوڑ دیا جاوے تا کہ مانوس ہو جائے۔ چنانچہ چھوڑ دیا گیا۔ چھوٹنے کے ساتھ ہی محل سے نکل کر بھاگا اور اپنی ماں کے پاس پہنچا اور اپنی سرگزشت اس طرح بیان کی کہ مجھے بہت سے آدمیوں نے پکڑ لیا۔ میں جب بھی نہ مرا، پھر مجھے ایک جگہ لے گئے اور تتا تتا پانی میرے اوپر ڈالا (یعنی گرم گرم) میں جب بھی نہ مرا تو پھر مجھ کو کفن پہنایا (**یہ پوشاک کی قدر کی**) میں جب بھی نہ مرا، پھر میرے سامنے آگ کے انگارے رکھے (**یہ جواہرات کی قدر کی**) کہ شاید ان سے جل جائے۔ میں جب بھی نہ مرا، پھر ایک ڈائن کو جس کی بڑی بڑی آنکھیں تھی (یہ شہزادی کی گت

بنائی) میرے پاس بھیجا تا کہ مجھے کھالے میں جب بھی نہ مرا۔ اسی طرح اس نے سب باتوں کو مصیبت وعذاب ہی کے پیرایہ میں بیان کیا تو جس طرح اس چمار کے لڑکے نے حمام کے غسل کو عذاب سمجھا تھا اسی طرح ممکن ہے کوئی مسلم جہنم کو بھی اپنے لئے عذاب محض سمجھے ورنہ حقیقت میں وہ مسلمانوں کے لئے مثل حمام کے ہے تمہارے واسطے عذاب نہیں ہے۔ عذاب تو کافروں کے لئے ہے اسی واسطے ارشاد ہے: اعدت للکافرین یعنی جہنم ہونے کی حیثیت سے تو کفار ہی کے لئے، مسلمانوں کے لئے نہیں ہے بلکہ ان کے لئے تو محض حمام ہے۔ گو گرم گرم پانی اور خادمان حمام کے ملنے ولنے سے تکلیف بھی ہوتی ہے مگر خدا کی قسم تم کو کفار کے برابر تکلیف نہ ہوگی، پھر مسلمانوں کو وہاں خدا تعالیٰ سے محبت زیادہ ہو جائے گی اس لئے بھی جہنم سے تکلیف زیادہ نہ ہوگی کیونکہ محبوب کے ہاتھ سے جو تکلیف ہوتی ہے وہ تکلیف محض نہیں ہوتی اور گو حق تعالیٰ یہاں بھی محبوب ہیں مگر دنیا میں ہماری محبت ناقص ہے اس لئے بعض دفعہ کلفت دہ واقعات سے تکلیف ہوتی ہے جیسے ایک شخص ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر دعا کیا کرتا تھا کہ اے اللہ! مجھے کھینچ، کسی مسخرہ نے سن لیا اور اس نے کہا کہ اس کو مزہ چکھانا چاہئے۔ چنانچہ اگلے دن ایک رسی ساتھ لے کر پہلے سے درخت پر جا بیٹھا۔ جب اس نے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے کھینچ، تو اس نے رسی میں پھانسی لگا کر اسے لٹکا دیا اور نرم آواز سے کہا میرے بندے اس رسی کو اپنے گلے میں ڈال لے میں کھینچ لوں گا۔ یہ بیوقوف بڑا خوش ہوا کہ دعا قبول ہوگئی اور سچ مچ اللہ میاں مجھ سے کلام فرما رہے ہیں۔ اس نے رسی کو گلے میں ڈال لیا۔ اس نے کھینچنا شروع کیا۔ جب زمین سے دو گز اٹھ گیا اور گلا گھٹنے لگا تو آپ کہتے ہیں کہ اے اللہ! میں نہیں کھنچتا، مجھے چھوڑ۔ خیر یہ حکایت تو مسخرہ پن کی ہے مگر ہماری حالت دنیا میں یہی ہے کہ ذرا سی تکلیف میں ساری محبت دھری رہ جاتی ہے مگر آخرت میں ایسا نہ ہوگا۔ وہاں محبت قوی ہوگی اس لئے مومن کو عذاب میں بھی مشاہدہ راحت کا ہوگا البتہ کفار کو خالص عذاب کے مشاہدہ سے آخرت میں حق تعالیٰ سے بغض بڑھ جائے گا۔ غرض یہ تو عید ہے یعنی رمضان جس کا بیان اس وقت ہوگا اور دوسری وعید ہے یعنی طاعون جس کو عام لوگ وعید سمجھتے ہیں اور خواص تو اس کو بھی عید کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تو عید بھی میں واو عاطفہ ہے یعنی عید وعید گویا دو عیدین مجتمع ہیں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ کیسی عید ہے۔ چنانچہ لوگ کہتے ہیں کہ اس مرتبہ رمضان جیسے اچھی موسم میں آئے تھے کہ رات بھی ٹھنڈی اور دن بھی ٹھنڈا اس سے بڑا لطف آتا مگر طاعون نے کام کھو دیا اور سارا لطف کرکرا ہو گیا اس کو تم عید کہہ رہے ہو۔

مگر ہم کہتے ہیں کہ طاعون سے لطف دوبالا ہوگیا۔ یہ عجب رمضان ہے کہ رمضان بھی اور طاعون بھی ہے۔ دو نعمتیں جمع ہورہی ہیں۔ شاید کوئی کہے کہ یہ کیسی نعمت ہے۔ میں کہتا ہوں واقعی نعمت ہے، کیونکہ سبب شہادت ہے اور اس میں نعمت کی صفت ایسی قوی ہے کہ جس شخص کو طاعون بھی نہ ہو مگر وہ طاعون کی جگہ پر صابراً محتسباً قیام کرے اور یہ سمجھ کر ٹھہرا رہے کہ جو کچھ ہوگا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوگا، اس کے لئے بھی شہادت کا ثواب ہے گو تندرست ہی رہے۔ اور جو شخص طاعون کی جگہ سے بھاگے اس کے لئے حدیث میں سخت وعید ہے۔ مگر بھاگنا یہ ہے کہ طاعون کی وجہ سے جائے۔ باقی کسی ضرورت سے جانا بھاگنا نہیں ہے۔ شریعت نے تنگی میں نہیں ڈالا کہ کوئی ضرورت بھی پیش آئے تب بھی طاعون کی جگہ سے باہر نہ جاؤ مگر اس کا ایک معیار ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص کسی ضرورت سے باہر جاتا ہے وہ یہ دیکھ لے کہ بستی میں طاعون نہ ہوتا تو کیا جب بھی باہر جاتا۔ اگر جب بھی باہر جاتا تو یہ فرار نہیں اور اگر اس وقت باہر نہ جاتا اور اب جارہا ہے تو یہ فرار ہے اور ضرورت خدا تعالیٰ سے معاملہ ہے۔ اس کو ہر شخص اپنے دل میں خود ٹٹول لے

کار با او راست باید داشتن راست اخلاص صداق افراشتن
خلق راگیرم کہ بفریبی تمام در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا باخلق آرے جملہ راست باخدا تزویر وحیلہ کے رواست

”حق تعالیٰ کے ساتھ سب کام درست رکھنا چاہئے اخلاص اور سچائی کا علم بلند رکھنا چاہئے...میں نے فرض کیا کہ تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے ہی دیا مگر حق سبحانہ وتعالیٰ کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے...مخلوق کے ساتھ تیرے سب کام درست ہیں خدا تعالیٰ کے ساتھ مکر وحیلہ کب جائز ہے“

اور اگر کوئی واقعی ضرورت سے جائے جس کا معیار ابھی بتلا چکا ہوں تو پھر اس کو بدنام کرنا بری بات ہے اور کوئی بدنام بھی کرے تو اس کو خدا کے ساتھ اپنا معاملہ درست رکھنا چاہئے اور کسی کے کچھ کہنے کی پروانہ کرنی چاہئے۔ لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ خواہ مخواہ بھی بدنام کیا کرتے ہیں، بلکہ بعض دفعہ جھوٹ موٹ بھی بدنام کرتے ہیں۔ میری نسبت یہاں ایک محلہ میں جس کا نام نہیں لیتا یہ مشہور ہوا کہ اپنی بہو کو جو طاعون میں مرگئی تھی دفن کرکے دو بوریاں غلہ کی اور پانچ روپیہ تقسیم کرکے بھاگ گیا (اور خدا کے فضل سے میری کوئی بہو ہی نہیں) خیر یہ شہرت تو گو غلط تھی مگر اچھی ہوئی کہ دو بوریاں غلہ کی تقسیم کرنا بھی میری طرف منسوب کردیا۔ بھلا مولویوں کو یہ بات کب نصیب ہوتی ہے کہ ان کی طرف یہ شہرت ہو۔ مولویوں کو تو عام لوگ کنجوس کہا کرتے ہیں، لیکن بھاگنے کی شہرت تو غلط بھی تھی اور بری بھی

تھی۔اب اس راوی کو چاہئے کہ اس وقت مجھے دیکھ کر یہ بھی کہہ دے کہ بھاگ کے آ بھی گئے، کیونکہ اب تو میں سامنے موجود ہوں۔دراصل یہ واقعہ بھائی صاحب کا ہے۔اپنی بہو کے مرنے کے بعد غلہ کی بوریاں اور پانچ روپے انہوں نے تقسیم کئے تھے اور اس کے بعد کسی ضرورت یا بے ضرورت (مجھ کو معلوم نہیں) وہ سہارن پور چلے گئے۔اگر وہ بے ضرورت گئے تھے تو فرار تھا ورنہ نہیں۔بلا تحقیق تو ان کو بھی کچھ نہ کہنا چاہئے تھا نہ کہ اُلٹا ان کی جگہ مجھے بدنام کرنا شروع کر دیا، حالانکہ میں کہیں بھی نہیں گیا۔ غرض دوسری عید یہ طاعون ہے جو شہادت ہونے کی وجہ سے نعمت ہے۔

ایک شبہ کا جواب:

بعض کو شبہ ہوتا ہے کہ طاعون تو احادیث سے عذاب معلوم ہوتا ہے۔تو بات یہ ہے کہ احادیث میں بنی اسرائیل کے لئے اس کی ابتداء کو عذاب کہا گیا ہے۔نیز اس امت کے بعض عصاۃ کے لئے بھی قہر ہونا معلوم ہوتا ہے۔چنانچہ ایک حدیث میں **اذا کثر الزنا فی قوم فشافیھم الطاعون او کما قال** کہ جب زنا کی کثرت ہوتی ہے تو طاعون آتا ہے۔باقی یہ بھی حدیثوں میں ہے: **وھی شھادۃ لکل مسلم.** (اور وہ ہر مسلمان کیلئے شہادت ہے) سو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک چیز میں دو حیثیتیں ہو سکتی ہیں کہ ایک واسطے شہد ہو اور دوسرے کے واسطے زہر ہو۔ایک کے حق میں رحمت ہو اور دوسرے کے لئے زحمت ہو۔چنانچہ دواؤں میں بھی یہی حال ہے کہ ایک دوا ایک کو موافق ہے دوسرے کو ناموافق ہے۔اسی طرح ممکن ہے کہ طاعون عامہ مسلمین کے واسطے نعمت و شہادت ہو اور کفار اور بعض اہل مصیبت کے واسطے قہر ہو۔مولانا فرماتے ہیں:

در حق او مدح در حق تو ذم ۔۔۔ در حق او شہد و در حق تو سم

''اس کے حق میں تعریف ہے تیرے حق میں برائی ہے اس کے حق میں شہد ہے''

مگر اہل معصیت بھی دل شکستہ نہ ہوں۔میں ان کو بھی بشارت سناتا ہوں۔وہ یہ کہ آپ کو اہل مصیبت کی فہرست سے نکلنے میں دیر کیا لگتی ہے۔آپ ایک منٹ میں اہل معصیت کی فہرست سے نکل کر اہل طاعت میں داخل ہو سکتے ہیں۔بس توبہ کر لو، ابھی تم اہل طاعت ہو جاؤ گے۔ **التائب من الذنب کمن لا ذنب له** (مشکوۃ المصابیح: ۲۳۶۳) (گناہوں سے توبہ کرنیوالا ایسا ہے جیسا اس نے گناہ کیا ہی نہیں) شاید تم یہ کہو کہ توبہ کر کے کیا کریں۔وہ تو ہماری کم ہمتی سے تھوڑی ہی دیر میں ٹوٹ بھی جائے گی۔میں کہتا ہوں اس کی پروانہ کرو۔جب توبہ ٹوٹ

جائے فوراً دوبارہ سے پھر توبہ کرلو۔ حدیث میں ہے: **ما اصر من استغفر و ان عاد فی الیوم سبعین مرۃ.** (مشکوٰۃ المصابیح: ۲۳۴۰) (وہ گناہوں پر اصرار کرنے والا نہیں جو توبہ کرے خواہ دن میں اسی گناہ کا ستر مرتبہ بھی اعادہ کرے) مگر شرط یہ ہے کہ توبہ دل سے ہو، یعنی توبہ کے وقت یہ عزم پختہ ہو کہ اب سے یہ گناہ نہ کروں گا۔ اس طرح توبہ کر کے چاہے دس دفعہ بلکہ چاہے سو مرتبہ توبہ ٹوٹے کچھ پروا نہیں۔ ہر دفعہ پھر اسی طرح توبہ کرتے رہو۔ تم خدا کے مقبول اور اہل طاعت میں شمار ہو جاؤ گے اور جس نے اس طرح بار بار توبہ شکست کرنے کو کھیل کہا ہے یہ اس کی جہالت ہے۔ حدیث میں صاف تصریح ہے کہ **ما اصر من استغفر و ان عاد فی الیوم سبعین مرۃ** کہ توبہ کرنے والا خواہ کتنی ہی مرتبہ توبہ شکست کرے مصر نہیں بلکہ وہ اس آیت کا مصداق ہے: **وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ** (ہاتھ میں تسبیح، زبان پر توبہ اور دل گناہ کے ذوق سے معمور، ایسے استغفار پر گناہ بھی مسکراتا ہے) اور اگر کسی کاہل کے کلام میں ایسی توبہ کی مذمت ہو جیسے کسی بزرگ کا شعر ہے ؎

سبحہ بر کف توبہ بر لب دل پُر از ذوقِ گناہ   معصیت راخندہ می آید بر استغفار

اس کا مطلب یہ ہے کہ توبہ دل سے نہ ہو، بلکہ توبہ کرتے ہوئے دل میں یہ عزم ہو کہ یہ گناہ پھر کروں گا۔ تو اس صورت میں یہ توبہ ہی نہیں (مگر میں ایک بات کہتا ہوں، وہ یہ کہ گویا توبہ معتبر نہیں مگر بیکار بھی نہیں۔ اگر کسی سے حقیقی توبہ نہ ہو سکے وہ اس کو بھی نہ چھوڑے بلکہ اسی طرح توبہ کرتا رہے۔ اس ناقص توبہ سے انشاء اللہ ایک دن کامل توبہ نصیب ہو جائے گی۔ کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ کو اس کی یہ ظاہری عجز و زاری ہی پسند آجائے اور اس کی برکت سے باطنی توبہ بھی حاصل ہو جائے۔

طاعون حقیقت میں عید ہے:

تو یہ طاعون حقیقت میں عید ہے۔ گو تم اس کو عید سمجھتے ہو اور اس سے گھبراتے ہو مگر جب تم اس سے گھبراتے ہو تو وہ اب ان شاء اللہ بہت جلد چلا جائے گا، کیونکہ نعمت قدردان کے پاس رہا کرتی ہے، ناقدروں کے پاس نہیں رہا کرتی اور میں دفع کی تدابیر کی ممانعت نہیں کرتا۔ شرعاً تدابیر حفظ ما تقدم کرنا جائز ہے مگر شرط یہ ہے کہ نفرت سے نہ ہو، جیسے آسیب کی ناک میں دھونی دیا کرتے ہیں بلکہ محض احتیاطاً ہو اور یہ سمجھ کر ہو کہ دوا اور تدبیر بھی سنت ہے اور اگر طاعون آجائے تو ہم اس پر بھی راضی ہیں۔ غرض اس وقت عجیب دولت ہے کہ دو نعمتیں جمع ہو رہی ہیں: ایک طاعون اور ایک رمضان۔ پھر ہر نعمت میں چند در چند نعمتیں ہیں۔ چنانچہ دونوں کے فضائل سے معلوم ہوتا ہے اور

لطف یہ ہے کہ دونوں لفظوں میں بھی تو تعدد کی صورت ہے کہ رمضان میں الف نون ایسا ہے جیسا تثنیہ میں ہوتا ہے اور طاعون میں واؤ نون ایسا ہے جیسا جمع کے صیغے میں ہوتا ہے۔ تو ہر نعمت بجائے خود متعدد نعمتیں ہیں تو اس وقت یہ رمضان چند جدید نعمتوں کا جامع ہو کر آیا ہے۔ اب اس کے متعلق میں ایک اور بات بیان کرتا ہوں جس سے رمضان و طاعون دونوں کا نعمت ہونا اچھی طرح واضح ہو جائے گا، اور اسی سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ اس آیت کو رمضان و طاعون سے کیا ربط ہے۔

رمضان اور طاعون:

تو سنیے حق تعالیٰ نے اس مقام پر مجاہدہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور وہ صبر ہے جس کے دو محل بتلائے ہیں۔ ایک تو ضراء و بأسا جس کی تفسیر فقر و مرض سے کی گئی ہے اور ایک بأس جس کی تفسیر جہاد سے کی گئی ہے اور فقر و مرض امر غیر اختیاری ہے اور باس اختیاری ہے۔ تو اس آیت میں یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ مجاہدہ کی دو قسمیں ایک اختیاری اور ایک غیر اختیاری اور یہ کہ مجاہدہ خواہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری ہو دونوں میں فضیلت ہے۔ اور یہ مضمون آیت سے تو اجمالاً ثابت ہو رہا ہے مگر احادیث میں اس کی شرح بہت تفصیل سے مذکور ہے۔ چنانچہ حدیث میں مرض کے بھی بہت فضائل وارد ہیں۔ مثلاً بخار کو طہور کہا گیا ہے کہ اس سے گناہ دور ہوتے ہیں اور یہ کہ مرض سے حق تعالیٰ بندہ کو وہ درجات عطا فرمانا چاہتے ہیں جن کو وہ عمل سے حاصل نہ کر سکتا تھا۔ اسی طرح ثبات فی الحرب کے بہت فضائل ہیں۔ اب اس کے ساتھ ایک مقدمہ یہ سمجھئے کہ اعمال شرعیہ جتنے بھی ہیں سب مجاہدہ ہیں۔ دین کا ہر کام مجاہدہ ہے، کیونکہ مجاہدہ کہتے ہیں خلاف نفس کو اور دین کا ہر کام نفس کی اصلی حالت کے اعتبار سے نفس کے خلاف ہے۔ گو کسی شخص کو کسی خاص حالت کی وجہ سے اعمال میں ناگواری نہ ہو بلکہ لذت آتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مجاہدہ کرتے کرتے اس کے نفس کی حالت بدل گئی ہے کہ وہ امارہ سے مطمئنہ ہو گیا ہے۔ اب چاہے اس کو تبدیل حقیقت کہا جائے یا تغیر حالت اہل طریق کا۔ اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ نفس کی جو تین قسمیں ہیں امارہ، لوامہ، مطمئنہ، یہ انواع ہیں یا اصناف بعض، کہتے ہیں یہ انواع ہیں۔ ان کے نزدیک جب نفسِ امارہ مطمئن ہوتا ہے تو گویا حقیقت کا تبدل ہوتا ہے اور پہلی جماعت کے نزدیک حقیقت نہیں بدلتی بلکہ اوصاف بدلتے ہیں اور تبدل وصف کی وجہ سے صنف آخر پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر یہ اختلاف اصناف کا اختلاف بھی ہو تب بھی وصف سابق کا تبدل ایسا ہوتا ہے کہ گویا حقیقت ہی بدل گئی۔ جبھی تو بعض کو اختلاف نوعی کا شبہ ہوا۔ چنانچہ عالم اور جاہل اور ایک دیہاتی اور بادشاہ کے نفس میں ایسا اختلاف بیّن ہوتا ہے کہ دونوں کو

ایک نوع کے افراد کہنا بظاہر بعید معلوم ہوتا ہے۔ پس یا تو یہ کہا جائے کہ علم سے نفس کی حقیقت ہی بدل گئی یا یوں کہا جائے کہ وصف ایسا بدلا کہ تبدل حقیقت کے مثل ہو گیا۔

اس پر ایک لطیفہ یاد آیا، دہلی میں ایک مولوی صاحب تھے جو قوم کے جولاہے تھے۔ لوگ ان کو باوجود عالم ہونے کے جولاہا ہونے کی وجہ سے حقیر سمجھتے تھے۔ انہوں نے کیا حرکت کی کہ ایک فتویٰ مرتب کر کے شائع کیا کہ گیہوں ناپاک ہے، اس کا کھانا حرام ہے کیونکہ اس کے کھیت میں کھاد ڈالا جاتا ہے اور اسی سے گیہوں کی پیداوار بڑھتی ہے تو یقیناً کھاد کے اجزاء گیہوں میں آتے ہیں اور اجزاء ناپاک ہیں۔ اس لئے گیہوں ناپاک ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ جس کو اس مسئلہ میں مجھ سے اختلاف ہو میں اس سے گفتگو کرنے کو تیار ہوں۔ یہ فتویٰ جو شائع ہوا تو مخلوق بڑی پریشان ہوئی۔ حتیٰ کہ بادشاہ تک خبر پہنچی اور بادشاہ نے دربار میں سب علماء کو جمع کیا اور ان مفتی صاحب کو بھی بلایا اور ان سے دلائل پوچھے گئے۔ انہوں نے وہی دلیل بیان کی کہ گیہوں کے اندر کھاد کے اجزاء شامل ہیں، اس لئے ناپاک ہے۔ علماء نے کہا کہ گو کھاد فی نفسہٖ ناپاک ہے مگر گیہوں کی شکل میں آ کر اس کی حقیقت بدل گئی اور تبدل ماہیت سے حکم بدل جاتا ہے۔ مفتی صاحب نے کہا اچھا تو گیہوں کی صورت قبول کرنے سے وہ کھاد پاک ہو گیا۔ علماء نے کہا ہاں۔ کہا پھر حیرت ہے کہ گیہوں کی شکل قبول کرنے سے کھاد تو ایسا بدل جائے کہ ناپاک سے پاک ہو جائے اور قرآن و حدیث و فقہ پڑھ کر انسان میں اتنا بھی تغیر نہ آئے کہ وہ جولاہہ سے شیخ بھی ہو جائے۔ آخر اس کی کیا وجہ کہ آدمی اتنے علوم حاصل کرنے کے بعد بھی آدمی جولاہہ کا جولاہہ ہی رہے۔ بادشاہ ہنس پڑا کہ مولوی صاحب کو جولاہہ سے شیخ بننے کا شوق ہوا ہے، اس واسطے یہ فتویٰ نکالا۔ لوگوں سے کہا بھائی! یہ اس فتوے میں معذور ہیں تم ان کو جولاہہ کہنا چھوڑ دو اور ان کو حقیر نہ سمجھو۔ یہ تو ایک لطیفہ تھا مگر اس میں شک نہیں کہ ایک جاہل دیہاتی اور ایک فاضل علامہ کے نفس میں اس درجہ اختلاف ہوتا ہے کہ دونوں کو نوع واحد کہنا بس منطق ہی کی اصطلاح ہے۔ ورنہ ہمارے اُستاد مولانا محمد یعقوب صاحب تو یہ فرمایا کرتے تھے کہ انسان نوع نہیں بلکہ جنس ہے اور اس کے افراد ایک ایک نوع منحصر فی فرد واحد ہیں۔ جیسے شمس اور فرماتے ہیں کہ ہر شخص کی طبیعت و مذاق کو دوسرے سے اس درجہ اختلاف ہے کہ دونوں کے نوع واحد کی فرد کہنا دشوار ہے۔ بہر حال بعض لوگوں کو جو اعمال شرعیہ ناگوار نہیں ہوتے اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ فی نفسہٖ ناگوار نہیں بلکہ وجہ یہ ہے کہ اس کے نفس کی حالت بدل گئی یا اس کے نفس کی حقیقت بدل گئی۔ اس لئے ناگوار چیز خوشگوار

ہوگئی۔ جیسے لدیغ کا حاسہ بدل جاتا ہے کہ اس کو نیم کے پتے شیریں معلوم ہوتے ہیں اور اس مثال سے آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ طاعون کا نعمت ہونا کچھ بعید نہیں، گو آپ کو ظاہر میں وہ قہر معلوم ہوتا ہے مگر ممکن ہے کہ کسی شخص کو نعمت معلوم ہوتا ہو کیونکہ اس کے نفس کی حالت بدل گئی ہے واللہ عارفین سے اس رمضان کا لطف پوچھو ان کو تو اس میں ایسا مزہ آ رہا ہے جیسے چائے میں نمک کی چاشنی مل گئی ہو اور یاد رکھو تم کو طاعون سے ناگواری اسی وقت تک ہے جب تک کہ مبتلا نہیں ہوئے اور جو لوگ طاعون میں مبتلا ہو کر مر چکے ہیں ان سے اس کی قدر پوچھو وہ جانتے ہیں کہ یہ تو بڑے مزے کی چیز ہے ہم خواہ مخواہ اس سے گھبراتے تھے۔ واللہ اے مسلمانو! جب تم خدا کے یہاں جاؤ گے اور طاعون میں مرنے والوں کو شہداء کے درجے میں دیکھو گے اس وقت کہو گے اے اللہ یہ تھا طاعون جس میں یہ منافع ہیں۔ ہائے ہم تو گدھے تھے کہ خواہ مخواہ اس سے گھبراتے تھے ہماری وہی مثال تھی کہ گدھے کو دیا تھا نمک اس نے کہا میری آنکھیں ہی پھوڑ دیں اسی طرح بخدا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس وقت بہت بڑی نعمت عطا فرمائی ہے مگر آپ کو اس کی قدر نہیں مرنے کے بعد آپ کو اس کی قدر ہوگی اور اس وقت آپ اپنی اس حالت پر ندامت سے روئیں گے۔

جیسے سلطان محمود کے ایک غلام کا قصہ ہے کہ سلطان نے اس کو ہندوستان سے گرفتار کر کے اپنے ساتھ غزنی میں رکھا اور تعلیم وتہذیب سے شائستہ کر کے ایک بڑے ملک کا صوبہ دار بنایا جس وقت سلطان محمود اس کے سر پر تاج رکھنے لگے تو غلام رونے لگا۔ سلطان نے کہا عزیز من یہ وقت تو خوشی کا ہے تم روتے کس لئے ہو حضور اس وقت مجھے اپنی ماں کا ایک مقولہ یاد کر کے رونا آ گیا حضور جس وقت میں ہندوستان میں تھا تو بچپن ہی سے آپ کا خوف غالب تھا پھر میں بڑا ہوا اور ہندوستان پر آپ کے حملوں کی خبر سنی تو یہ خوف اور بڑھ گیا، پھر اتفاق سے آپ نے میرے شہر کے قریب حملہ کیا تو میرے حواس باختہ ہوگئے، پھر تقدیر سے آپ کا مقابلہ اس فوج سے ہوا جس میں یہ غلام بھی موجود تھا۔ اس وقت تو میری بدحواسی کا کچھ ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ بالآخر میں آپ کے ہاتھوں قید ہوا اب تو مجھے ہر وقت موت سامنے نظر آتی تھی مگر پھر آپ نے میرے ساتھ ایسا کرم ولطف کا معاملہ فرمایا جو میرے گمان میں بھی نہ تھا۔ حتیٰ کہ آج اس لطف کی انتہا ہوگئی کہ حضور اپنے دست مبارک سے میرے سر پر تاج رکھ رہے ہیں تو اس وقت مجھے اپنی ماں کی بات یاد آ کر رونا آ گیا کہ کاش آج وہ میرے سامنے ہوتی تو میں اس سے کہتا کہ بیوقوف اسی محمود سے تو مجھے ڈراتی تھی جس کے لطف وکرم کا یہ حال ہے۔ صاحبو! میں بقسم کہتا ہوں کہ مرنے کے بعد اسی طرح آپ اپنی

حماقت پر روئیں گے کہ ہائے یہی وہ طاعون تھا جس کو ہم نے ہوا سمجھا تھا جس کے لطف و کرم کا یہ حال ہے کہ جو لوگ اس کے ہاتھوں مرے ہیں آج ان کے سر پر شہادت کا تاج رکھا جا رہا ہے۔

طاعون کی مثال:

پس اب یہ شبہ جاتا رہا کہ ناگوار چیز نعمت کیونکر ہو سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ تم نے صورت دیکھ کر اس کو ناگوار سمجھا۔ حقیقت کی تم کو خبر نہیں۔ حقیقت منکشف ہو جائے تو خود اس کو نعمت سمجھو کہ طاعون کی ایسی مثال ہے جیسے کسی حسین عورت کے چہرہ پر مٹی کا ہڈو لگا دی جائے جس کا نقشہ نہایت خوفناک ہو تو ناواقف تو ہڈو کو دیکھ کر ڈرے گا اور جو اس سے واقف ہے وہ کبھی نہ ڈرے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دراصل یہ نہایت حسین صورت ہے اور ہڈو تو اوپر سے لگائی گئی ہے تا کہ ناواقف کا امتحان کیا جائے مگر حقائق کو تو ہم کیا جانیں۔ اور میں ہی کیا بیان کروں کیونکہ خود مجھے بھی حقائق کا علم نہیں، خود میرے ہی مثال اس فوجی کے طوطے جیسی ہے کہ اس کو **الم تر کیف** تک قرآن کی سورتیں یاد تھیں ایک شخص نے اس سے قرآن سنا تو وہ الم تر کیف تک سنا کر رہ گیا اس نے کہا آگے پڑھو تو وہ کہتا ہے کہ آگے تو ہمارے میاں کو بھی یاد نہیں اسی طرح کوئی آپ سے پوچھے آپ بھی کہہ دیجئے گا کہ آگے تو ہمارے مولوی کو بھی معلوم نہیں۔

بہر حال حقائق کو تو اہل حقائق جانتے ہیں بس میں تو ایک آسان سی بات بتلائے دیتا ہوں کہ تم محبت پیدا کر لو، محبت کے بعد تم کو طاعون خود ہی گوارا ہو جائے گا کیونکہ محبت سے سب تلخیاں شیریں ہو جاتی ہیں بلکہ عاشق اگر محبوب کے سامنے پٹے تو زیادہ لذت آتی ہے۔ تنویر میں ایک عاشق کا قصہ لکھا ہے کہ اس کو کسی سے محبت تھی محبوب کے تعلق والوں نے اس کو مارا اور سو درے لگائے۔ ننانوے کوڑوں تک تو بالکل خاموش رہا جب اخیر درہ لگا تو اس نے ایک آہ کی کسی نے کہا میاں یہ کیا نامردی تھی کہ ننانوے کوڑوں کا تو تحمل کر لیا اور ایک کوڑے کا تحمل نہ ہو سکا۔ کہا ننانوے کوڑوں تک تو محبوب بالا خانہ پر کھڑا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا اور میں اس وقت زبان حال سے یہ کہہ رہا تھا۔

بجرم عشق تو ام می کشند و غوغائیست   تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائیست

''تیرے عشق کے جرم میں مجھے کھینچے لئے جاتے ہیں اور بھیڑ لگی ہوئی ہے تو بھی تو کوٹھے پر آ کر دیکھ لے کہ کتنا اچھا تماشہ ہو رہا ہے''

تو اس لذات میں مجھے الم کا مطلق احسان نہیں ہوا۔ ننانوے کوڑوں کے بعد وہ میری نگاہ سے غائب ہو گیا اس لئے تو آخری کوڑے کے الم کا احساس ہوا اس کو تو اس لئے الم کا احساس ہوا کہ اس کا

محبوب غائب ہو گیا تھا اور جس کا محبوب ہر وقت ساتھ ہو وھو معکم اینما کنتم (اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں تم ہو) بلکہ جان سے بھی زیادہ نزدیک ہو نحن اقرب الیہ من حبل الورید اس کو تو کسی وقت بھی تلخی کا احساس ہونا ہی نہ چاہئے۔ یعنی آپ خدا کے حکم پر جمے رہیں اور کفار کی ایذاؤں سے نہ گھبرائیں کیونکہ آپ ہماری نگاہ کے سامنے ہیں ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں پھر جس کو فانک باعیننا کا مشاہدہ ہوا اس کی لذت کا کیا پوچھنا۔ شاید اس پر آپ یہ کہیں کہ تم نے اکسیر کا نسخہ تو بتلا دیا یعنی محبت مگر خود یہ اکسیر کہاں سے لائی جائے۔ کہاں سے پیدا ہو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو سخی کیمیا گروں کے پاس سے حاصل کرو۔ بخیلوں کے پاس نہ جانا وہ پتہ نہ دیں گے اور نہ دھوکا بازوں کے پاس جانا وہ الٹا گمراہ کریں گے تم سے رقم بھی اینٹھ لیں گے اور مقصود سے دور کر دیں گے بلکہ سخی کیمیا گروں کو تلاش کرو اور ان کی صحبت میں بیٹھا کرو یعنی اہل محبت کی صحبت سے تم کو بھی محبت حاصل ہو جائے گی۔

آہن کہ بپارس آشنا شد   فی الحال بصورت طلا شد

''لوہا جب پارس سے جا کر ملا وہ فوراً سونا بن گیا''

اگر اعتقاد کے ساتھ بھی یہ صحبت نصیب نہ ہو تو کم از کم آزمائش ہی کے طور پر ان کے پاس چلے جایا کرو اور دیکھو کہ طاعون وغیرہ سے جو تم کو وحشت ہے وہ کم ہوتی ہے یا نہیں۔ انشاء اللہ ان کے پاس بیٹھنے ہی سے دل میں اطمینان و سکون ہو گا، پھر اس تجربہ کے بعد اعتقاد سے بھی صحبت نصیب ہو جائے گی اور ایک دن صاحب محبت ہو جاؤ گے۔ لیجئے میں نے آسان تدبیر بتلا دی ہے جس میں کچھ بھی مشقت نہیں مگر شرط یہ ہے کہ اہل محبت کی صحبت پرہیز کے ساتھ اختیار کی جاوے پرہیز یہ ہے کہ اہل دنیا کی صحبت سے بچو اور اہل دنیا وہ ہیں جو غیر اللہ کا تذکرہ زیادہ کریں۔ اہل دنیا کی اس سے زیادہ سہل پہچان کسی نے نہ بتلائی ہو گی یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے کہ آج سارے مضامین باجود عالی ہونے کے سہل عنوان سے زبان پر آ رہے ہیں۔ بس یہ طریقہ ہے حصول محبت کا کہ اہل محبت کے پاس زیادہ بیٹھو اور اہل دنیا سے جو کہ غیر اللہ کا تذکرہ زیادہ کرتے ہیں بچو، پھر آپ کا یہ حال ہو گا کہ لوگ تو طاعون سے ڈریں گے اور تم خوش ہو گے کہ بڑا مزہ آ رہا ہے کہ سب لوگ میرے محبوب کو یاد کر رہے ہیں کوئی صدقہ کر رہا ہے کوئی دعا کر رہا ہے، کوئی نماز کا اہتمام کر رہا ہے کیونکہ طاعون میں نمازی بھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ (اس وقت عصر کی اذان ہو گئی ہے فرمایا کہ کچھ مضمون باقی ہے جس کو عصر کے بعد بیان کروں گا جس کو فرصت و شوق ہو وہ نماز کے بعد بیٹھ جاویں) پھر عصر کے بعد حسب معمول دعا و خطبہ سے بیان شروع فرمایا۔

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ. ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ. ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہ. صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی اٰلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم.

امابعد: میں یہاں تک مضمون بیان کر چکا تھا کہ اس وقت دو نعمتیں جمع ہو رہی ہیں ایک رمضان، ایک طاعون اور اب یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس سے ان دونوں کا کیا ربط ہے۔ اس کی تمہید بیان کر رہا تھا کہ اذان ہوگئی حاصل تمہید کا یہ ہے کہ اس آیت میں دو قسم کے صبر بالعبادت و دیگر دو قسم کے مجاہدوں کی تعلیم دی گئی ہے (کیونکہ صبر خود مجاہدہ ہے) تو صبر یا مجاہدہ غیر اختیاری جو امر غیر اختیاری کے متعلق ہو اور دوسرا صبر یا مجاہدہ اختیاری جو امر اختیاری کے متعلق ہو اور متعلق کی قید اس لئے بڑھائی کہ صبر یا مجاہدہ بذاتہٖ اختیاری و غیر اختیاری کی طرف منقسم نہیں بلکہ صبر یا مجاہدہ تو فی نفسہٖ اختیاری ہی ہے البتہ اس کا متعلق کبھی امر اختیاری ہوتا ہے کبھی غیر اختیاری۔

اس حیثیت سے صبر یا مجاہدہ کی دو قسمیں ہوگئیں، پھر میں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ دین کا ہر عمل مجاہدہ ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ دین میں تقلید ہے اور تقلید نفس کو گراں ہے ورنہ اعمال شرعیہ میں کوئی عمل فی نفسہٖ دشوار یا طاقت سے باہر نہیں، سب اعمال فی نفسہٖ آسان و سہل ہیں۔ البتہ ان میں جو قیود و ضوابط ہیں کہ اس کام کو اس طرح کرو اس طرح نہ کرو بس یہ قیود نفس کو گراں ہیں وہ آزادی کا طالب ہے کہ جس طرح چاہا کر لیا شریعت نے نفس کی آزادی ہی کو توڑا ہے باقی عمل کوئی ایسا نہیں ہے جس میں دشواری یا دقت ہو اور یہ قاعدہ ہے کہ ایک کام خود آزادی سے کیا جائے تو آسان معلوم ہوتا ہے اور اسی کام کا پابند کوئی دوسرا کر دے تو اسی وقت گرانی شروع ہو جاتی ہے۔ راز وہی ہے کہ نفس کو تقیید ناگوار ہے۔ مثلاً چپ رہنا اختیار سے تو آسان ہے بعض دفعہ ہم گھنٹوں خاموش رہتے ہیں مگر نماز میں چپ ہونا گراں ہے کیونکہ وہاں تقیید ہے کہ جب تک نماز پوری نہ ہو بات کرنا جرم ہے اور ویسے گھنٹوں میں خاموش رہتے ہیں تو اس میں پابندی کچھ نہیں اس وقت اپنے کو مختار سمجھتے ہیں کہ جب جی چاہے گا بول لیں گے اس لئے وہ گراں نہیں اور نماز کی خاموشی گراں ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے نماز کے بارہ میں انھا لکبیرۃ فرمایا ہے جہاد کو انہ لکبیر نہیں فرمایا مگر نماز کو گراں فرمایا ہے کیونکہ جہاد میں اتنی تقیید نہیں جتنی نماز میں ہے۔ مجاہد کھا سکتا ہے، پی سکتا ہے، بول سکتا ہے، بات کر سکتا ہے اور نماز میں کچھ نہیں کر سکتا حتیٰ کہ ادھر ادھر دیکھ بھی نہیں سکتا اور ادھر

ادھر خیال بھی نہیں لے جا سکتا کیونکہ اس سے خشوع میں کمی آتی ہے اور کسی کو خشوع کی بھی پرواہ نہ ہوتو خیالات وساوس کی وجہ سے اکثر عدد رکعات میں سہو ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے سجدہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ دوسری مصیبت معلوم ہوتی ہے اس لئے غیر خاشعین بھی خیالات کے لانے میں آزاد نہیں ہیں تو نماز میں پوری قید ہے۔ ظاہر کی بھی اور باطن کی بھی۔ پھر نماز میں ظاہری لذت کچھ نہیں اور جہاد میں ظاہری حظ بھی موجود ہے گو اس کا قصد جائز نہیں وہ ظاہری حظ یہ ہے کہ لوگ بہادروں کے حملے دیکھ رہے ہیں اور جب کوئی موقع پا کر اپنے مقابل پر وار کرتا ہے تو مخلوق کی زبان سے بیساختہ تعریف نکلتی ہے کہ واہ کیا تلوار ماری ہے اسی واسطے جہاد میں بعض منافقین بھی ناموری کے لئے شریک ہو جاتے تھے، ثواب کا تو ان کا اعتقاد نہ تھا ہاں جوہر شجاعت دکھانے کو آتے تھے لیکن نماز ان پر بڑی گراں تھی۔ خصوصاً عشاء وصبح کی نماز پھر نماز میں ایک بات یہ ہے کہ شروع سے آخر تک ایک حال پر نہیں ہوتی اگر ایک ہی حال پر ہوتی جب بھی آسان ہو جاتی کیونکہ ایک حالت میں پابند ہو جانا پھر آسان ہے مگر یہاں یہ کیفیت ہے کہ افعال مختلف ہیں۔ اول قیام تھا تو پھر رکوع ہے اور رکوع کے بعد بھی سجدہ متصلاً نہیں بلکہ بیچ میں پھر قیام ہے گو آج کل لوگوں نے یہ طریقہ ایجاد کر لیا ہے کہ رکوع ہی سے سجدہ میں پہنچ جاتے ہیں مگر یہ ناجائز ہے۔ بعض علماء کے یہاں تو اس طرح نماز ہوتی ہی نہیں اور حنفیہ کے یہاں ہو جاتی ہے مگر ناقص ہوتی ہے پھر سجدہ کے بعد قعدہ ہے اور وہ بھی دیر تک نہیں بلکہ قعدہ کے بعد پھر سجدہ، پھر قیام پھر وہی کیفیت جو اول تھی۔

نماز میں مکمل مجاہدہ:

غرض نماز کی گرانی تقیید ہی کی وجہ سے اور یہ شریعت کے ہر کام میں موجود ہے اس لئے دین کا ہر کام مجاہدہ ہے، بالخصوص جس عمل کی حقیقت ہی تقیید ہو وہ تو پورا مجاہدہ ہے۔ چنانچہ یہاں جو عمل مذکور ہے یعنی صبر اس کی حقیقت ہی یہ ہے کہ **حبس النفس علی مایکرہ** کہ نفس کو ناگوار بات پر جمایا جائے اور مقید کیا جاوے اب کہیں تو حبس کے ساتھ کچھ اور بھی کرنا پڑتا ہے ہے اور کہیں محض حبس ہی حبس ہوتا ہے اور کچھ نہیں کرنا پڑتا جیسے سامنے سے کوئی عورت آ رہی ہے وہاں حکم ہے کہ اس کو مت دیکھو یہ عمل بہت گراں ہے کیونکہ یہاں حبس ہی حبس ہے اور کچھ نہیں اگر اس کے ساتھ کوئی دوسرا کام بھی ہوتو حبس سہل ہو جاتا ہے۔ یہ تفصیل میں نے اس لئے کی تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ صبر فی نفسہ تمام اعمال شرعیہ کو عام ہے۔ گویہاں اس کے دو ہی محل مذکور ہیں کیونکہ حبس النفس کی دوصورتیں ہیں۔ ایک حبس محض اور ایک حبس مقترن بشی آخر اور ظاہر ہے کہ اس تفصیل سے کوئی عمل

شرعی خارج نہیں ہوسکتا۔اب رہی اس تخصیص محل کی حکمت سویا تو تخصیص ذکری اہتمام کی وجہ سے ہے کہ مواقع صبر میں یہ مواقع زیادہ قابل اہتمام ہیں یا جیسا کہ میں نے اوپر کہا تھا کہ اس جگہ ہر باب کے امہات کا ذکر کیا گیا ہے تمام جزئیات کا احاطہ نہیں کیا گیا بلکہ جزئیات کو فہم مخاطب پر چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ طاعات بدنیہ میں سے تمثیلاً صرف نماز کو بیان کیا گیا سب کو نہیں ذکر کیا اسی طرح یہاں کہا جائے کہ مواقع صبر میں سے تمثیلاً دو محل بتلا دیئے گئے باقی کو فہم سامع پر چھوڑ دیا گیا۔

بہرحال یہ ثابت ہو گیا کہ اعمال شرعیہ سب مجاہدہ ہیں اور بالخصوص اعمالِ رمضان میں مجاہدہ کی شان دیگر اعمال سے بہت زیادہ ہے۔تیسرا سال ہے کہ اب بحث میں چند بیان مسلسل ہوئے ہیں ان میں یہ بحث مکمل ہو چکی ہے کہ روزہ تراویح اور اعتکاف یہ سب مجاہدات ہیں اور میں نے ثابت کر دیا ہے کہ صوفیہ نے جو مجاہدہ کے چار ارکان بیان کئے ہیں تقلیل طعام، تقلیل منام، تقلیل کلام، تقلیل الاختلاط، مع الانام یہ ارکان اربعہ اعمال رمضان میں نہایت خوبی کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں ان میں سے بعض بیانات طبع بھی ہو گئے اور بعض جلد ہی طبع ہونے والے ہیں تو اس وقت ایک نعمت یہ ہے کہ ہم کو اعمال رمضان کی دولت حاصل ہے جو کہ مجاہدہ فی الاعمال الاختیاریہ ہے جس کو صبر حین الباس سے مناسبت ہے کیونکہ ثبات فی الحرب بھی مجاہدہ فی الطاعۃ الاختیاریہ ہے اور اعمال رمضان بھی۔اب مجاہدہ فی الاحوال الاضطراریہ رہ گیا جو کہ صبر فی الباسا و الضراء (سختی اور تنگی میں صبر) ہے اس سے طاعون کو ربط ہے کیونکہ اوپر کہہ چکا ہوں کہ فی الباساء و الضراء (سختی اور تنگی میں صبر) کی تفسیر فقر و مرض سے کی گئی ہے۔اور طاعون کا مرض ہونا ظاہر ہے تو اس میں صبر کرنے کی وہی فضیلت ہوگی جو اس جگہ صبر فی الباساء و الضراء کی مذکور ہے۔ یہ مناسبت ہے اس آیت کو رمضان و طاعون کے بیان سے،اب آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اس وقت کتنی قسم قسم کی نعمتیں مجتمع ہیں۔اول تو دیگر اعمال کے ساتھ اعمال رمضان مجتمع ہیں جو مجاہدہ اختیاریہ ہے اور پھر ان کے ساتھ طاعون مجمع ہے جو مجاہدہ غیر اختیاریہ ہے اور طاعون گو نعمت ہے مگر مجاہدہ اس واسطے ہے کہ اس میں بلاء کی شان بھی موجود ہے کہ ذرا سی دیر میں آدمی چٹ پٹ ہو جاتا ہے۔ابھی یہاں پھر رہا تھا اور تھوڑی دیر میں قبرستان پہنچ گیا۔بس اس کی وہ شان ہے بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ اور چونکہ اس میں دو حیثیتیں ہیں اس لئے حق تعالیٰ نے دونوں کی رعایت فرمائی ہے کہ نعمت کی حیثیت سے تو طاعون سے بھاگنے کو حرام کر دیا اور بلاء کی حیثیت سے تدبیر و علاج کو جائز فرما دیا اور گو بھاگنا بھی اطباء کے نزدیک ایک تدبیر و علاج ہے مگر شریعت نے اس تدبیر سے بوجہ دوسری حیثیت کے منع فرما دیا۔دوسرا میں کہتا

ہوں کہ بھاگنا دراصل تدبیری نہیں بلکہ سوء تدبیر ہے کیونکہ بھاگنا جیسا ضعف قلب سے ناشی ہے اسی طرح وہ ضعف کا منشاء بھی ہے یعنی بھاگنے والا اس فعل سے ضعف کو اپنے قلب پر غالب کر لیتا ہے طبی قاعدہ ہے ایسے امراض ضعیف القلب پر سب سے پہلے قبضہ کرتے ہیں تو بھاگنے والے نے تو اسی وقت اپنے اوپر طاعون کو قبضہ دے دیا۔ اگر وہ یہاں نہیں مرا تو دوسری جگہ جا کر مرے گا۔ اب بتلایئے بھاگنا تدبیر کس طرح ہے۔ دوسرے میں کہتا ہوں کہ اگر بھاگنا مفید بھی ہو اور بھاگنے والا طاعون سے بچتا بھی ہو تب بھی شریعت کو حق ہے کہ اس مفید فعل سے منع کر دے کیونکہ بعض مفید افعال سے آپ بھی تو منع کرتے ہیں۔ مثلاً لڑائی میں بھاگنا تمام عقلاء کے نزدیک جرم ہے حالانکہ یقیناً بھاگنے والے کو تو بھاگنا مفید ہی ہے اس کی تو جان بچتی ہے مگر اس کو آپ کے لیڈر بھی تدبیر نہیں کہتے بلکہ بے تدبیری کہتے ہیں اسی طرح ہم طاعون سے بھاگنے کو بے تدبیری کہتے ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک دلیل شرعی سے طاعون سے بھاگنا ویسا ہی ہے جیسا جنگ سے بھاگنا اور جہاد سے بھاگنا کیونکہ طاعون کی نسبت حدیث میں وارد ہے۔ والفار منه كالفار من الزحف (مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۵۷) (طاعون سے بھاگنا ایسا ہے جیسا میدان جنگ سے بھاگنا) اور ایک حدیث میں طاعون کی نسبت وارد ہے والفار منه كالفار من الزحف اور ایک حدیث میں طاعون کی حقیقت میں وخز اعدائكم الجن (تمہارے جنوں میں دشمنوں کے نیزہ مارنے سے) وارد ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس وقت جنات کا اور انسانوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ جنات انسانوں کے اندرون جسم میں زخم لگاتے ہیں جس سے طاعون ہوتا ہے اور مقابلہ سے بھاگنا عقلاً بھی بے تدبیری ہے اس لئے شریعت نے فرار کو حرام کر دیا گو اس حقیقت میں اطباء اور ڈاکٹروں کو اختلاف ہے۔ اطباء طاعون کا سبب اختلاف ہوا کو اور ڈاکٹر جراثیم کو بتلاتے ہیں مگر اس سے مضمون حدیث کی نفی نہیں ہو سکتی کیونکہ ممکن ہے کہ یہ بھی سبب ہو اور وہ بھی مگر اصل سبب وخز جن ہو اور ظاہری سبب وہ ہو جو تم کہتے ہو۔ پھر ایک اور بات بھی ہے کہ یہاں سے بھاگ کر جو لوگ دوسری جگہ جاتے ہیں وہ وہاں کے آدمیوں کی نگاہ میں ذلیل ہوتے ہیں۔ خصوصاً اگر تم طاعون کی جگہ سے بھاگ کر کسی شہر میں اپنے کسی دوست یا عزیز کے گھر میں ٹھہرے ہو اور اتفاقاً تمہارے جانے کے بعد اس کے گھر کوئی بیمار پڑ گیا تو اس وقت اس کی نگاہ میں تمہاری بہت ذلت ہوگی جس کو قرائن سے تم خود بھی سمجھ جاؤ گے کیونکہ وہ یہ سمجھا جائے گا کہ میرے گھر میں تو بیماری نہ تھی یہ کم بخت میرے گھر بیماری لے آیا اور اگر وہ بیمار مر گیا تو اس کی موت گھر والوں کے نزدیک تمہارے نامہ اعمال میں درج ہوگی، سچ ہے ۔

عزیز یکہ از درگہش سرتبافت   بہر درد کہ شد ہیچ عزت نیافت

''ایسا غالب حسن جس نے اس کی درگاہ سے نہ پھیرا جس دروازہ پر گیا کچھ عزت نہ پائی''

پھر اس طرح یہ لوگ دوسری جگہ بھی طاعون پھیلاتے ہیں نہ بطریق عدوی کے بلکہ اسی قاعدہ سے کہ یہ وہاں جا کر لوگوں کے قلوب میں وہم پیدا کرتے ہیں تو دوسری بستی کے لوگ ان بھاگنے والوں سے یوں کہتے ہیں کہ خدا خیر کرے کہیں ہماری بستی میں بھی طاعون نہ ہو جائے جس سے ان میں بھی قبول طاعون کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیسی رحمت ہے کہ آپ نے بھاگنے سے منع فرما دیا اور مقام طاعون میں جمے رہنے کی فضیلت ایسی بتلائی ہے جس سے ثبات سہل ہو گیا۔

دو نعمتیں:

بہر حال یہ دو نعمتیں اس وقت مجتمع ہو گئیں اور متعدد نعمتوں کے جمع ہونے کی تو لوگ تمنا کیا کرتے ہیں اور یہ تمنا کم پوری ہوتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ ایک نعمت کسی کو دے دیتے ہیں اور ایک کسی کو، چند مختلف نعمتیں ایک وقت میں ایک شخص کو کم عطا ہوتی ہیں تو ایک نعمت والا دوسرے پر حسد کرتا ہے اور حسد کی وجہ سے یہ چاہتا ہے کہ میرے پاس دوسری نعمت بھی ہوتی۔ مثلاً عادۃ اللہ یہ ہے کہ ایک کو علم و عقل عطا ہوتا ہے مال زیادہ عطا نہیں ہوتا اور دوسرے کو علم و عقل نہیں تو اس کو مال زیادہ دیا جاتا ہے تو اب ان میں سے ہر ایک دوسرے پر حسد کرتا ہے اور اجتماع نعمتیں کی تمنا کرتا ہے جس کو علم و عقل حاصل ہے وہ مال کی بھی تمنا کرتا ہے بلکہ بعض دفعہ خدا تعالیٰ کی شکایت کرتا ہے کہ میں اتنا بڑا عالم و عاقل صاحب فہم ہوشیار ہوں مجھے تو مال نہیں دیا گیا اور فلاں جاہل کو بہت کچھ ساز و سامان دے دیا گیا یہ بیوقوف شکایت اس لئے کرتا ہے کہ یہ ایک نعمت کو دوسری نعمت کے استحقاق کا سبب سمجھتا ہے اور دونوں نعمتوں کو استحقاق سے جمع کرنا چاہتا ہے حالانکہ ہر نعمت الگ الگ ہے ان میں سے کوئی دوسرے کے استحقاق کا سبب نہیں مگر بعض اہل عقل اپنی عقل و فہم کو رزق کا سبب سمجھتے ہیں اور جب مسبب مرتب نہیں ہوتا تو خدا کی شکایت کرتے ہیں۔ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ وہ ایک شہر پر گزرے، دیکھا کہ دن میں شہر پناہ کا دروازہ بند ہے۔ لوگوں سے سبب پوچھا معلوم ہوا کہ بادشاہ کا باز اڑ گیا ہے۔ بادشاہ نے شہر پناہ بند کرنے کا حکم دے دیا کہ کہیں دروازہ سے نہ نکل جائے۔ یہ بہت ہنسے اور سمجھ گئے کہ بادشاہ عقل سے کورا معلوم ہوتا ہے۔ بھلا باز کو دروازہ سے نکلنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو اوپر سے بھی جا سکتا ہے۔ پھر آسمان کی طرف منہ کر کے حق تعالیٰ سے عرض

کرنے لگے واہ حضور! ایسے احمق کو بادشاہت دے دی اور ہم اتنے بڑے عاقل و عارف ہماری یہ حالت کہ پیر میں جوتا بھی نہیں۔ یہ بزرگ علم وعقل کو استحقاق مال کا سبب نہ سمجھتے تھے نہ انہوں نے بطور شکایت کے یہ کہا تھا بلکہ محض ادلال کے طور پر کہا تھا لیکن میں نے یہ حکایت اس لئے بیان کی کہ بعض لوگ یہی بات بطور شکایت کے طور پر کہا کرتے ہیں تو وہ حق تعالیٰ کا جواب سن لیں پھر شکایت کریں۔ ارشاد ہوا کہ اچھا کیا تم اس پر راضی ہو کہ تمہارا علم ومعرفت اور فقر اس بادشاہ کو دے دیا جائے اور اس کی حماقت و جہالت اور سلطنت تم کو دے دی جائے۔ یہ جواب سن کر ان کا رنگ زرد ہو گیا اور اپنی دولت معرفت کے سلب ہونے سے ڈر گئے۔ فوراً سجدہ میں گرے اور عرض کیا میں اپنے فقر پر راضی ہوں۔ مجھے سلطنت کی ضرورت نہیں تو اب جو لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہم کو عقل دی اور مال نہ دیا وہ سمجھ لیں کہ دونوں نعمتیں کم جمع ہوتی ہیں بس کسی کو ایک نعمت ملتی ہے کسی کو دوسری تو یہ اجتماع نعمتیں ایسی چیز ہے جس کی اکثر تمنا کی جاتی ہے۔ اب یہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ اس وقت بدوں طلب ہی کے دونوں کو جمع کر دیا۔ شہادت ایسی نعمت ہے جس کا ہر مسلمان طالب ہے کوئی مسلمان ایسا نہیں جو شہادت کا طالب نہ ہو لیکن شہادت گھر بیٹھے حاصل نہیں ہوتی اس کے لئے سفر کرنا اور راستوں کی مصیبت جھیلنا پڑتی ہے اور جروح وقروح اس کے علاوہ جس میں نہ نوافل زیادہ ہو سکتے ہیں نہ روزہ رکھ سکتے ہیں نہ تراویح کا اہتمام ہو سکتا ہے نہ اعتکاف ہو سکتا ہے، تو جو لوگ جہاد میں شریک ہو کر شہادت حاصل کرتے ہیں وہ ان اعمال کی برکات سے محروم رہتے ہیں اور جو گھر پر رہ کر ان اعمال کی برکتیں حاصل کرتے ہیں وہ جہاد سے اور شہادت سے محروم رہتے ہیں۔

لیکن یہ وقت ایسا ہے کہ اس میں دونوں نعمتیں ساتھ ساتھ حاصل ہو رہی ہیں۔ صیام وقیام تو ظاہر ہے باقی شہادت، وہ طاعون سے گھر بیٹھے حاصل ہو رہی ہے مگر ہمارے حال پر افسوس ہے کہ ہم اس اجتماع کو پسند نہیں کرتے حالانکہ یہ وہی شہادت تو ہے جس کے آپ ہمیشہ متمنی رہا کرتے ہیں۔ اب اس سے بھاگتے کیوں ہو۔ **وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ الاية** اس بھاگنے سے ہماری وہی حالت ہے جو اس شخص کی تھی جو روز دعا کرتا تھا کہ اے اللہ مجھے کھینچ اور جب کھینچنے لگا تو کہتا ہے کہ اے اللہ مجھے چھوڑ میں نہیں کھنچتا اور جیسے ایک پیر جی صاحب نے حضرت حافظ محمد ضامن صاحب سے عرض کیا تھا کہ حضرت کچھ ہمیں بھی دولت عطا فرما دیجئے۔ فرمایا ہاں ہاں ضرور دیں گے کہا۔ کب؟ فرمایا جب موقع ہوگا۔ پھر جب غدر ہوا تو حافظ صاحب نے کہلا بھیجا کہ آؤ اب دولت ملنے کا موقع ہے وہ کہتے تھے کہ ہمت نہ ہوئی اور ایسی دولت

سے محروم رہا تو یہ محض قلت محبت اور قلت تعلق کی دلیل ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ سے محبت ہو تو اس وقت بہت خوش ہونا چاہئے تھا کہ نعمت شہادت جو ہزار تمناؤں سے حاصل ہوتی ہے گھر بیٹھے مل رہی ہے پھر ایک شہادت تو محض ثبات فی مقام الطاعون ہی سے حاصل ہوتی ہے چاہے طاعون نہ بھی ہو مگر شرط یہ ہے کہ ایسی نیت سے جا رہے کہ یہاں رہنے سے مجھے شہادت کا ثواب ملے گا اور دوسری شہادت شاید اور بھی مل جائے اگر کسی کو طاعون ہو گیا شاید تم یہ کہو کہ بس پہلی ہی شہادت کافی تھی دوسری کی کیا ضرورت تھی۔ میں کہتا ہوں صاحب شہادتیں جمع ہو جائیں تو حرج کیا ہے شہادتوں سے تو ایمان کامل ہوتا ہے پھر آپ کے لئے تذکرۃ الشہادتین تصنیف ہوگا ایک حسن کا ایک حسین کا پھر اس سے گھبراتے کیوں ہو جذبات طبیعہ سے تو میں منع نہیں کرتا اگر طبعی طور پر کسی وقت پریشانی ہو تو اس کا مضائقہ نہیں مگر دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ آپ بہت سے وحشت ناک امور کی وحشت کو ان کے منافع کے تصور سے دفاع کرتے ہیں تو ایسے ہی طاعون سے جو طبعی وحشت ہے اس کو اس کے اجر وغیرہ کی بشارتوں کے استحضار سے کیوں نہیں رفع کرتے۔ یہی بشارتیں تو ہیں جن کی خاصیت حب لقاء اللہ ہے۔ جس پر پھر دوسری بشارت حب اللہ للقاء ہ حدیث میں وارد ہے وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاء ہٗ ومن کرہ لقاء اللہ کرہ اللہ لقاء (الصحیح للبخاری ۸:۱۳۳) (جو اللہ تعالیٰ سے ملنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا چاہتے ہیں اور جو لقاء اللہ سے کراہت کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی لقاء سے کراہت فرماتے ہیں) اس پر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائیں کہ بہت ہی کام کا سوال کیا یا رسول اللہ انا لنکرہ الموت یارسول اللہ ہم تو سب کے سب موت سے گھبراتے ہیں تو کیا ہم من کرہ لقاء اللہ کے مصداق ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لیس ذلک ولکن المومن اذا حضرہ الموت بشر برضوان اللہ وکرامۃ فلیس شی احب الیہ مما امامہ فاحب لقاء اللہ (الحدیث) اے عائشہؓ اس کراہت کا اعتبار نہیں (کیونکہ یہ تو طبعی کراہت ہے جو عفو ہے) بلکہ بات یہ ہے کہ مسلمان جب مرنے لگتا ہے تو فرشتے اس کو رضوان وکرامت کی بشارت سناتے ہیں اس وقت وہ حق تعالیٰ کی لقاء کا مشتاق ہو جاتا ہے اور کافر کو عذاب کی دھمکی دیتے ہیں وہ اس وقت خدا کے پاس جانے سے گھبراتا ہے اور کراہت کرتا ہے۔ جواب کا حاصل یہ ہوا کہ محبت وکراہت سے وقت موت مراد ہے یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی فرمائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی

عارف اس کو بیان نہ کر سکتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بشارت کا خاصہ ہے عدم کراہت موت۔ پس بشارات کا تصور کرنا چاہئے جو حدیث میں وارد ہیں ان سے عقلاً موت کا اشتیاق پیدا ہو جائے گا اور وحشت مذمومہ نہ رہے گی گو طبعی وحشت بھی ہو اور اگر یہ حب موت طبیعت پر غالب ہو گئی تو طبعی وحشت بھی زائل ہو جائے گی اور اب اس کا یہ حال ہوگا کہ طبعاً موت کا مشتاق ہو جائے گا اور یوں کہے گا: ۔

خرم آن روز کزیں منزل ویراں بروم　　راحت جان طلبم وز پئے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

''جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے اپنی جان محبوب حقیقی پر قربان کروں اور خوش وخرم کوچ کر جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش وخرم اور غزل پڑھتا ہوا چلا جاؤں''

اور بعض واقعات موت کے مشتاقین کے ہم نے خود دیکھے ہیں کہ مولانا فتح محمد صاحب کے ایک شاگرد نور احمد طالب علم تھے جن کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی۔ وہ مولانا کی وفات کے بعد وطن جانے کو تیار تھے۔ سامان باندھ چکے تھے کہ دفعتاً رات کو طاعونی بخار ہوا اور گلٹی نکل آئی۔ لوگ یہ سمجھے کہ اس وقت ان کا دل بہت ٹوٹا ہوگا کہ میں گھر جانے کو تھا کہ یہ بلا کہاں سے آ گئی۔ لوگ ان کو تسلی دینے لگے کہ انشاء اللہ تم اچھے ہو جاؤ گے گھبراؤ نہیں تو وہ کہنے لگے کہ بس اب یوں نہ کہو اب تو اللہ تعالیٰ سے ملنے کو جی چاہتا ہے، پھر ان کا انتقال ہو گیا اور جنازہ کی نماز میں نے پڑھائی۔ مجھے کشف وشف تو کچھ ہوتا نہیں لیکن ان کے جنازہ میں مجھے بہت انوار محسوس ہو رہے تھے اور یہ طاعون کی برکت تھی کیونکہ طاعون شہادت ہے اور طاعون میں مرنے والا قتیل سیف کے برابر شہید ہے۔ چنانچہ قیامت میں شہداء سیف اور اموات فراش طاعون والوں کے بارہ میں جھگڑیں گے۔ شہداء سیف کہیں گے کہ یہ بھی ہماری طرح اعداء اللہ کے زخم سے مرے ہیں یہ ہمارے درجے میں رہنے چاہئیں اور اموات فراش کہیں گے کہ یہ تو ہماری طرح بستر پر مرے ہیں یہ ہمارے ساتھ رہنے چاہئیں۔ پھر حق تعالیٰ فیصلہ فرمائیں گے کہ طاعون والوں کا زخم دیکھا جائے اگر شہداء سیف کے زخم کے مشابہ ہو تو شہداء کے درجے میں ہیں ورنہ نہیں۔ چنانچہ زخم دیکھا جائے گا تو بالکل شہداء کے زخم سے مشابہ ہوگا لونہ لون دم والریح ریح مسک بالآخر شہداء کے درجے میں رہیں گے۔

طاعون کے منافع آجلہ:

یہ تو طاعون کے منافع آجلہ ہیں، ان کو سوچئے تا کہ وحشت کم ہو اور اشتیاق پیدا ہو۔ اب

میں ان مجاہدات غیر اختیاریہ کے منافع عاجلہ بیان کرتا ہوں، وہ یہ کہ ان مجاہدات اضطراریہ سے نفس کی تہذیب وتمحیص ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رنج وغم میں اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ ساری فوں فاں اور فرعون بے سامانی رخصت ہو جاتی ہے۔ جو بات مجاہدات اختیاریہ سے برسوں میں حاصل نہ ہو وہ ان مجاہدات اضراریہ سے ایک دن میں حاصل ہو جاتی ہے، تو یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ مثلاً باپ مرگیا اور اس کے رنج وغم میں نفس ڈھیلا ہوگیا۔ یہ بات اگر تم اختیار سے حاصل کرنا چاہتے تو ہرگز نہ کر سکتے تھے۔ حتیٰ کہ اس واسطے سے بھی کیونکہ باپ کو مارنا حرام ہے بلکہ باپ کی اتنی قدر ہے کہ اگر وہ کافر بھی ہو تب بھی خود مارنا بلکہ دوسرے کو دلالت کرنا سب حرام ہے۔ بس اس کی مثال صید جرم جیسی ہے کہ اس کا شکار کرنا اور کسی کو بتلانا یا اشارہ کرنا سب جرم ہے اور باپ خود مر جائے تو اس پر صدمہ ورنج سے ثواب ملتا ہے۔ اس پر ایک بات یاد آ گئی۔ ہندو کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا بھی عجیب مذہب ہے کہ اپنی ماری تو حلال اور خدا کی ماری ہوئی حرام، مگر ہاں اس کا برعکس ہے کہ خود مارو تو حرام اور خدا تعالیٰ باپ کو ماردیں تو تم کو ثواب ملتا ہے۔ اب بتلایئے یہ اجر وثواب اپنے اختیار سے آپ کیونکر حاصل کر سکتے تھے اور باپ کے مرنے سے رنج پیدا ہو کر جو نفس کی تہذیب و تمحیص ہوتی ہے وہ کیونکر حاصل کر سکتے تھے۔ پھر ایک عجیب رحمت ہے، وہ یہ کہ جن مجاہدات اضطراریہ سے یہ تمحیص وتہذیب حاصل ہوتی ہے وہ مجاہدہ نہایت سہل ہے، کیونکہ حقیقت اس کی ترک ہے یعنی جزع فزع نہ کرنا جس میں کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا اور ان مواعظ میں جو تیسرے سال ہو چکے ہیں وہ بتلا چکا ہوں کہ قاعدے کے موافق ترک فی نفسہ مجاہدہ نہیں بلکہ اصل مجاہدہ عمل ہے۔ لیکن یہ حق تعالیٰ کی عنایت ہے کہ ترک پر بھی جو کہ کچھ بھی مشکل نہیں ثواب دیتے ہیں، بلکہ بعض محققین نے کہا ہے کہ نفس مصیبت پر بھی اجر ملتا ہے اور مجاہدہ صبر پر جدا اجر ملتا ہے۔ شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ ثواب تو صبر پر ملتا ہے اور صبر عمل ہے تو ثواب عمل پر ملا نہ کہ مصیبت پر۔ تو میں کہتا ہوں کہ تم احادیث کو دیکھو، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس مصیبت سے جو نفس کو تکلیف ہوتی ہے اس پر بھی ثواب ملتا ہے اور صبر کا اجر الگ ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ کسی کے کانٹا لگ جائے تو اس پر ثواب ہے، چراغ گل ہو جائے اور اس سے پریشانی ہو اس پر بھی ثواب ہے۔ کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اور ڈھونڈنے میں پریشانی ہو اس پر بھی ثواب ہے۔ ان احادیث میں صبر کی قید نہیں۔ عارفین نے اس کو سمجھا ہے اور اہل حال تو اس کے غلبہ سے بہت دور پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت رابعہ بصریہؒ جب حج کرنے آئیں (ان کو رابعہ اس لئے کہتے ہیں کہ ان سے پہلے تین بچے ان کے

والدین کے ضائع ہو چکے تھے، یہ چوتھی تھیں، اس لئے رابعہ نام کہا گیا) بڑی عاشق تھیں۔ ایک دن آگ پانی لئے ہوئے دوڑی ہوئی جارہی تھیں، کسی نے پوچھا کہاں جاتی ہو؟ کہا میں آج جنت و جہنم کا فیصلہ کروں گی۔ جنت کو آگ لگادوں گی اور جہنم کو ٹھنڈا کردوں گی۔ کیونکہ ساری مخلوق انہی کی وجہ سے عبادت کرتی ہے، کوئی جنت کا طالب ہے، کوئی جہنم سے خائف ہے، میرے محبوب کا کوئی طالب نہیں۔ بس ان کا خاتمہ ہونے کے بعد جو کوئی عبادت کرے گا وہ میرے محبوب کو یاد کرنے کے لئے کرے گا۔ مگر یہ مجذوبوں کی باتیں ہیں۔ حضرت رابعہؒ پر جذب غالب تھا۔ اہل کمال کی یہ باتیں نہیں ہوتیں۔ ان کی ریس میں تم کبھی ایسی بات نہ کہنے لگنا ورنہ کان پکڑے جائیں گے، بلکہ اہل کمال بھی اگر ایسی بات کہیں تو ان کی زیادہ گرفت ہو جائے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گنوار کا مقدمہ اپنے ربیب کے ساتھ تھا۔ حاکم عدالت نے تفریحاً پوچھا یہ تیرا کیا لگتا ہے۔ کہنے لگا یہ میرا کڈھیلڑا ہے۔ حاکم نے پوچھا کڈھیلڑا کسے کہتے ہیں؟ کہنے لگا تو نہیں جانتا۔ اس نے کہا نہیں تو آپ کیا مزہ کی تفسیر فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دیکھ کڈھیلڑا اسے کہیں ہیں (کہتے ہیں) جیسا تیرا باپو (باپ) مرجائے اور تیری ماں مجھے کرلے اور تو اس کے گیلوں (ساتھ) آئے تو تو میرا کڈھیلڑا ہوگا۔ بھلا کوئی ایل ایل بی تو ایسی تفسیر کر کے دیکھے۔ اسی طرح اگر بڑا بیٹا اپنے چھوٹے بھائی کو باپ کی ڈاڑھی پکڑتے ہوئے اور باپ کو اس سے خوش ہوتے ہوئے دیکھ کر خود بھی باپ کی ڈاڑھی کو پکڑنے لگے تو بتلایئے اس کی کیا گت بنے گی۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ مجذوبوں کی باتیں انہی کی زبان سے اچھی ہیں۔ دوسروں کی نقل کرنا جائز نہیں۔ غرض حضرت رابعہؒ حج کر کے بیت اللہ کے سامنے کھڑی ہو کر عرض کرتی ہیں کہ یا اللہ! آپ کو ثواب دینا پڑے گا چاہے حج قبول ہوا یا نہ ہوا، اگر حج قبول ہوا تب تو ایسے حج میں ثواب کا وعدہ ہے اور اگر حج قبول نہ ہوا جب بھی ثواب دینا ہوگا۔ کیونکہ اس وقت یہ بہت بڑی مصیبت ہے کہ میں کس اشتیاق کے ساتھ گھر سے آئی اور کیسی مشقت اُٹھائی اور پھر عبادت قبول نہ ہوئی اور اس کا مصداق ہوگئی

از در دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم   ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

''دوست کے دروازے سے کیا عرض کروں کہ کس عنوان سے گیا۔ سراپا اشتیاق وشوق سے گیا لیکن ناامید واپس لوٹا''

اور اس سے بڑھ کر کیا مصیبت ہوگی اور آپ کا وعدہ ہے کہ مصیبت پر بھی اجر ملتا ہے تو اس صورت میں مصیبت کا اجر دینا ہوگا۔ سبحان اللہ! دعا کیا ہے پوری وکالت ہے کہ ہر صورت میں اپنا

استحقاق ثابت کردیا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے لندن میں ایک اُستاد نے اپنے شاگرد پر دعویٰ کیا تھا کہ اس سے میں نے یہ شرط کی تھی کہ تم وکالت سے پہلا مقدمہ جیتو تو اپنی رقم مجھ کو دینا پڑے گی اور اس نے فلاں مقدمہ جیتا ہے، اس لئے مجھے یہ رقم ملنی چاہئے۔ شاگرد نے جواب دہی کی اور مقدمہ جیتنے سے انکار کیا۔ استاد کے پاس ثبوت کافی نہ تھے اس لئے ہار گیا۔ جب یہ ہار گیا تو اُستاد نے دوبارہ دعویٰ دائر کیا کہ اب تو شرط پائی گئی، کیونکہ یہ میرے مقابلہ میں اس مقدمہ میں تو جیت گیا، لہٰذا اب وہ رقم دلوائی جائے۔ اس پر شاگرد کو رقم دینا پڑی۔ تو جیسے اس وکیل نے ہر حال میں اپنا استحقاق ثابت کردیا اسی طرح حضرت رابعہؒ نے ہر صورت میں استحقاق ثابت کیا، مگر یہ سب کلام ان کا بطور ادلال کے تھا ورنہ استحقاق کس کا اور کیسا جو عطا ہو جائے محض فضل ہے مگر انہوں نے قواعد سے یہی سمجھا کہ مطلق مصیبت پر بھی اجر ہے۔ چاہے صبر ہو یا نہ ہو۔ گو صبر نہ کرنے پر مستقل گناہ ہو، مگر اس سے نفس مصیبت پر اجر ملنے کی نفی نہیں ہوتی۔ غرض یہ دلائل سے صحیح ہے۔

مجاہدہ اختیاریہ اور مجاہدہ اضطراریہ کے ثمرات:

البتہ ان دونوں مجاہدوں میں ایک اور فرق ہے۔ وہ یہ کہ مجاہدہ اختیاریہ میں تو فعل کا غلبہ ہے۔ اسی لئے اس میں انوار زیادہ ہوتے ہیں، کیونکہ انوار کا ترتب عمل پر ہوتا ہے اور مجاہدہ اضطراریہ میں فعل کم ہوتا ہے، اس لئے اس میں نورانیت کم ہوتی ہے لیکن اس میں انفعال کا غلبہ ہوتا ہے، اس سے قابلیت میں قوت بڑھتی ہے اور اس انفعال و قابلیت کی خود اعمال اختیاریہ کا اثر راسخ ہونے کے لئے سخت ضرورت ہے۔ اسی لئے بزرگوں نے ایسے مجاہدات بھی بہت زیادہ کرائے ہیں۔ یہ خاصیتیں ہیں دونوں مجاہدوں کی۔ اور اس وقت تو مجاہدات اختیاریہ و اضطراریہ دونوں موجود ہیں۔ کیونکہ اعمال رمضان بھی ہیں جو مجاہدہ اختیاریہ میں ہیں اور طاعون مجاہدہ اضطراریہ ہے۔ پھر مجاہدہ اختیاریہ و اضطراریہ کے جمع ہونے کی چند صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ مجاہدہ اضطراریہ مقدم ہو اور اختیاریہ مؤخر ہو۔ اس صورت میں اول قابلیت و انفعال قوی ہوگا۔ پھر مجاہدہ اختیاریہ یعنی اعمال سے نور ہوگا۔ ایک صورت یہ ہے کہ مجاہدہ اختیاریہ مقدم ہو، اضطراریہ مؤخر ہو۔ اس صورت میں نور حاصل بالاعمال کا رسوخ و ثبات قوی ہوگا۔ یہ تو اس وقت ہے جب دونوں میں تقدم و تأخر ہو اور اگر دونوں ساتھ ساتھ ایک وقت میں مجتمع ہوں تو ایک ہی وقت میں اور اس نور کا ثبات بھی اب اگر اس اجتماع کا امتداد ہوا اور دونوں دیر تک جمع رہے تو یہ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ (نور پر نور ہے اللہ تعالیٰ جس کو مناسب سمجھتا ہے اپنے نور سے اور دیتا ہے)

کا مصداق ہوگا۔اب یہ حق تعالیٰ کی دوسری عنایت ہے کہ اس وقت تقدیم وتاخیر واقتران سب کی برکتوں کو جمع فرمادیا کہ اس بستی میں رمضان سے پہلے بھی طاعون تھا۔تو اس مجاہدہ اضطراریہ کے تقدم سے انفعال وقابلیت میں ترقی ہوئی۔ پھر رمضان آ گیا اور رمضان میں بھی طاعون رہا۔تو اقتران کی برکتیں بھی عطا ہو رہی ہیں اور اگر رمضان کے بعد بھی کچھ اثر رہا تو پھر مقدم کا تأخر اور مؤخر کا تقدم بھی حاصل ہو جائے گا۔غرض یہ عجیب رمضان ہے جو بہت سی برکتوں کے ساتھ آیا ہے۔اب میں قرآن کی آیتوں سے یہ بتلاتا ہوں کہ حق تعالیٰ دونوں قسم کے مجاہدوں کو جمع کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ لَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ (کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اتنا کہہ کر چھوٹ جائیں گے اور انکی آزمائش نہ ہوگی اور جو ان سے پہلے تھے ہم نے ان کو پرکھا ہے پس اللہ تعالیٰ معلوم کرے گا ان کو جو سچے ہیں اور ان کو جو جھوٹے ہیں) یعنی تم کو محض آمنا کہنے پر نہ چھوڑا جائے گا بلکہ مجاہدات اضطراریہ سے تمہارے صدق وکذب کا امتحان لیا جائے گا۔ایک مقام پر ارشاد ہے:اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا یَاْتِکُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ مَسَّتْھُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ (کیا تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر ان لوگوں جیسے حالات نہیں گزرے جو تم سے پہلے لوگ ہو چکے ان کو (انکی) سختی اور تکلیف پہنچی کہ متزلزل ہو گئے کیا رسول بھی کہنے لگے اور وہ لوگ جو ایمان لائے تھے وہ بھی کہنے لگے اللہ کی مدد کب کس طرح آئے گی) جس میں بتلا دیا ہے کہ مجاہدہ اختیاریہ کے ساتھ اضطراریہ کو جمع کیا کرتے ہیں۔ پہلے لوگوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ تھا اور فرماتے ہیں ینفقون فی السراء والضراء. اس میں ترغیب انفاق کی ہے حالت ضراء میں بھی۔جس میں دو مجاہدوں کا جمع ہے کہ فقر بھی ہے اور انفاق بھی ہے۔ایک اضطراری مجاہدہ ہے ایک اختیاری۔ان نصوص سے تو عادۃ اللہ معلوم ہوئی کہ دونوں مجاہدوں کو جمع کرنا مقاصد میں سے ہے۔ پھر احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں کے اجتماع سے فضیلت واجر وبرکت بھی بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں وضوء علی المکارہ کی فضیلت وارد ہے۔اسی طرح صدقہ کے بارہ میں ارشاد ہے خیر الصدقة جھد المقل کہ بہتر صدقہ تنگ دست کا صدقہ ہے جس میں جمع بین المجاہدتین ہے اور ایک دوسری حدیث میں جو ظاہراً اس کے خلاف آیا ہے کہ خیر الصدقة ما کان عن ظھر غنی (الصحیح للبخاری

۱۳۹:۲) کہ بہتر صدقہ وہ ہے جس کے بعد اپنے پاس غنی باقی رہے۔ان دونوں تطبیق کے لئے بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ اختلاف باعتبار اختلاف اشخاص کے ہے۔ حدیث اول باعتبار اقویاء کے ہے اور حدیث ثانی باعتبار ضعفاء کے ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ دونوں حدیثوں میں اختلاف ہی نہیں بلکہ ہر ایک دوسرے کی مفسر ہے اور مطلب یہ ہے کہ جھد المقل اس وقت بہتر ہے جب کہ اس کے بعد دل میں غنا باقی رہے۔اور جو ایسا نہ ہو تو جھد المقل بہتر نہیں بلکہ اب وہ صدقہ بہتر ہے جس کے بعد ظاہر میں غنا باقی رہے۔ بہرحال یہ بات ثابت ہوگئی کہ مجاہدہ اضطراریہ واختیاریہ کا جمع ہونا شریعت میں محمود و مطلوب ہے۔ پھر اگر مجاہدہ اضطراریہ سے عمل میں قلت بھی ہو جائے اور محض فرائض و واجبات ہی پر اکتفا ہوتا رہے تب بھی مجاہدہ کاملہ کا ثواب ملتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ مریض و مسافر کے لئے ان اعمال کا ثواب پورا لکھا جاتا ہے جو وہ سفر و مرض سے پہلے کرتا تھا۔تو اب اگر اس رمضان میں بوجہ طاعون کے اتنا عمل نہ ہوسکا ہو جتنا پہلے رمضانوں میں معمول تھا تو ان شاء اللہ ثواب پورا ملے گا۔ یہ کتنی بڑی برکت ہے کہ عمل تھوڑا کیا اور ثواب پورا ملا۔

خلاصہ وعظ:

یہ احکام تھے جمع بین المجاہدتین کے جن کو میں نے اجمالاً بیان کیا ہے۔ عاقل کے لئے اتنا اشارہ کافی ہے۔ وہ ان کو بسط و تفصیل کے ساتھ خود سمجھ سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت بہت سی نعمتیں مجتمع ہیں جن کی ہم کو قدر کرنا چاہئے کہ اول تو حق تعالیٰ نے مجاہدہ اضطراریہ سے ہماری تمحیص ذنوب کی، پھر مجاہدہ اختیاریہ یعنی اعمال رمضان کی توفیق دی۔ پھر تقدیم و تاخیر مجاہدتین کی برکتیں الگ عطا ہوئیں اور جمع کی برکتیں جدا عطا ہوئیں۔تو اب یوں کہنا چاہئے کہ یہ رمضان اپنی چند در چند نعمتوں کی وجہ سے ایسا ممتاز رمضان ہے کہ اس کے متعلق یہ شعر پڑھنا چاہئے جو میرا ہی شعر ہے، جو میں نے ملا علی قاری کے شعر پر لگایا تھا۔اب میں دونوں شعروں کو ملا کر پڑھتا ہوں، جن میں اول ان کا ہے، دوسرا میرا ۔

لهذا الشهر في الاسلام فضل ومنقبة تفوق على الشهور

ربيع في ربيع في ربيع ونور فوق نور فوق نور

''اس ماہ کے لیے اسلام میں ایک فضیلت ہے اور ایسی منقبت وافضلیت ہے جو بعض حیثیتوں سے تمام مہینوں کی منقبت پر بڑھی ہوئی ہے یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا وجود اقدس خود بہار، پھر ولادت طیبہ کا مہینہ بہار ہے (ربیع الاول) ورموسم بھی بہار کا تھا اور حضور

اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نور تمام انوار پر فائق تھا یعنی نور پر نور اور اس پر بھی نور ہیں''
ربیع سے تو مجاہدہ اضطراریہ مجازاً مراد لے لیا جاوے، کیونکہ فصل ربیع بھی بلا اختیار ہی آتی ہے اور نور سے مجاہدہ اختیاریہ مراد لے لیا جاوے اور اس کا موجب نور ہونا ظاہر ہے اور ربیع و نور کا تکرار ہر مجاہدہ کی متعدد برکتوں کو ظاہر کر رہا ہے۔ کیونکہ مجاہدہ اضطراریہ میں تقدیم و تاخیر و اقتران کی برکتیں جمع ہیں اور مجاہدہ اختیاریہ میں صوم و تراویح و تلاوتِ قرآن کے انوار مجتمع ہیں۔ تو یہ شعر اس وقت بہت ہی حسب حال ہے اور چونکہ ایک مجاہدہ میں محل اجتماع کی شان جدا ہے اور دوسرے میں جدا، اور محل اجتماع کی شان بدلنے سے خود اجتماع کی شان بدل جاتی ہے۔ اس لئے جس طرح دونوں مجاہدہ کے نفع متعدد ہیں، اسی طرح دونوں کا جمع بھی متعدد ہے۔ اس لئے وعظ کے نام میں نفع کو تشنیہ رکھا گیا اور جمع کو بھی۔ بس اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو ان برکتوں سے حصہ عطا فرمائیں۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ سیدنا ومولانا محمدٍ وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ وسلم.
وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین.

تحقیق معنی الطاعون واسبابہٖ

قال الحافظ فی الفتح وقال جماعة من الاطباء منهم ابو علی بن سینا الطاعون مادة سمية تحدث ورما قتالا يحدث فی المواضع الرخوة والمغابن من البدن واغل بما تكون تحت الابط او خلف الاذن او عند الاربية قل وسببه دم دئی مائل الی العفونة والفساد يستجبل الی جوهر سمی يفسد العضو ويغير ما يلببه ويودی الی القلب كيفية دديئة فيحدث القئ والغطيان والغشی والخفقان وهو لوداء ته لا يقبل من الاعضاء الا ما كان اضعت بالطبع واراده ما يقع فی الاعضاء الرئيستوالاسود منه قل يسلم منه واسلمه الاحمر ثم الاصفر والطواعين تكثر عندالموباء فی البلاد الوئيته ومن ثم اطلق علی الطاعون وباء واما الوباء فهو فساد جواهر الرالهواء الذی هو مادة الروح ومدده قلت فهٰذا ما بلغنا من كلام اهل اللغة واهل الفقه والاطباء فی تعريفه والحاصل ان حقيقة ورم ينشا عن هيجان الذم وانصاب الدم الی عضو فيفسده وان غير ذٰلک من الامراض العامته الناشئة عن فساد الهواء يسمی طاعون بطريق المجاز لانسترا كهما فی عموم المرض

به او كثرة الموت الدليل على ان الطاعون يغاير الوباء ما سياتى فى رابع احاديث الباب ان الطاعون لا يدخل المدينة وقد سبق فى حديث عائشة قدمنا المدينة وهى اوبا ارض الله وفيه قول بلال اخر جونا الى ارض الوباء وما سبق فى الجنائز فى حديث ابى الاسود قدمت المدينة فى خلافته عمروهم يموتون موتا ذريعا وما سبق فى حديث الغرينين انهم استوخموا المدينة وفى لفظ انهم قالوا انها ارض وئبة فكل ذلک يدل على ان الوباء كان موجود بالمدينة وقد صرح الحديث الاول بانه لا يدخلها فدل على ان الوباء غيرالطاعون وان من اطلق على كل وباء طاعونا فبطريق المجاز. والذى يفرتق به الطاعون من الوباء اصل الطاعون الذى لم يتعرض له الاطباء ولا اكثر من تكلم فى تعريف الطاعون وهو كونه من طعن الجن ولا يخالف ذلک ما قال الاطباء من كون الطاعون ينشا عن يهجان الدم وانصابه لانه يجوز ان يكون ذلک يحدث عن الطعنة الباطنة فتحدث منها المادة المسية ويهيج الدم بسببها او ينصب وانما لم يتعرض الاطباء لكونه من طعن الجن لانه امر لا يدركه العقل وانما عرف من الشارع فتكلموا فى ذلک على ما اقتضنته قواعدهم۔

طاعون کے معنی اور اس کے اسباب کی تحقیق:

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ اطباء کی ایک جماعت جن میں شیخ الرئیس ابوعلی ابن سینا بھی شامل ہیں کا یہ قول ہے کہ طاعون ایک قسم کا زہریلا مادہ ہے جس سے ورم پیدا ہوتا ہے، یہ مادہ بغل کے نیچے، کان کے پیچھے یا ان کی ہڈی کی جڑ کے پاس ہوتا ہے۔ طاعون ایک قسم کا ردی خون ہے جو قدرے بدبودار اور فاسد ہوتا ہے اور یہ ایک زہریلے مادے میں تبدیل ہو جاتا ہے جس سے عضو بگڑ جاتا ہے اور قریب کی جگہ بھی خراب ہو جاتی ہے۔ نیز اس زہریلے مادے کی روایت دل کی طرف متعدی ہوتی ہے جس کی وجہ سے قے، متلی، غشی اور خفقان شروع ہو جاتا ہے۔ یہ مادہ اپنی روایت کی وجہ سے کمزور اعضاء پر اثر کرتا ہے۔

طاعون زیادہ تر وباء والے شہروں میں وبا کے زمانے میں ہوتا ہے اور اسی وجہ سے طاعون کو بھی وباء کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن وباء ہوا کے ان جوہروں کے فساد کو کہتے ہیں جو روح کا مادہ ہے۔ یہ جو کچھ بیان ہوا، اہل لغت، اہل فقہ اور اطباء کا کلام ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ طاعون کی حقیقت ایک ورم

ہے جو خون کے ہیجان اور اس کے خون کے کسی عضو تک پہنچنے سے پیدا ہوتا ہے۔ بس اس عضو میں بگاڑ پیدا کرتا ہے۔ یہاں یہ امر بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بعض دیگر عام امراض جو فساد ہوا سے پیدا ہوتے ہیں ان کو بھی بطور مجاز کے طاعون کہہ دیا جاتا ہے، اس لئے کہ وہ مرض بھی طاعون حقیقی کی مانند ہوتا ہے، یا کثرت اموات کا سبب ہوتا ہے اور اس امر کی دلیل کہ طاعون حقیقی وبا کے علاوہ بیماری ہے جو عنقریب چوتھی حدیث میں آئے گی اور وہ یہ ہے کہ "طاعون مدینہ میں داخل نہیں ہوگا" حضرت عائشہؓ کی حدیث میں گزرا ہے جس میں بیان ہے کہ ہم مدینہ آئے اور وہاں وباء تھی اور اسی بارے میں حضرت بلالؓ کا قول ہے "کہ ہم وباء والی زمین کی طرف نکلے" اور حدیث ابی اسود جو جنائز کے بارے میں گزری ہے کہ میں عمرؓ کے زمانہ خلافت میں مدینہ آیا اور لوگ کثرت سے مر رہے تھے اور جیسا کہ حدیث عرنیین میں بیان ہوا کہ لوگوں نے مدینہ کو مضر صحت پایا اور ایک روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ مدینہ وباء والی زمین ہے۔ پس ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ مدینہ میں وباء موجود تھی اور حدیث اول میں تصریح ہے اس امر کی کہ طاعون مدینہ میں داخل نہ ہوگا۔ پس ثابت ہوا کہ وباء اور طاعون الگ الگ بیماریاں ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ ہر وباء کو طاعون کہہ دیتے ہیں ان کا یہ کہنا بطور مجاز ہے نہ کہ بطور حقیقت۔ باقی وہ چیز جس سے طاعون اور وباء میں فرق کا پتہ چلتا ہے وہ طاعون کا اصلی اور حقیقی سبب ہے جس کا اطباء نے بیان ہی نہیں کیا، کیونکہ وہ اس حقیقت کو سمجھے ہی نہیں اور وہ اصلی سبب یہ ہے کہ طاعون درحقیقت جنات کے نیزہ مارنے سے پیدا ہوتا ہے اور یہ بات اطباء کے اس قول کے مخالف بھی نہیں جو وہ بیان کرتے ہیں کہ طاعون ہیجانِ خون سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ ہیجانِ خون خونی طور پر جنات کے نیزہ زنی سے ہوتا ہو، پھر اس سے زہریلا مادہ پیدا ہوتا ہو اور چونکہ جنات کی نیزہ زنی ایک ایسی حقیقت ہے جو عقل سے معلوم نہیں ہوسکتی بلکہ حضرت شارع علیہا السلام کے فرمان سے پتہ چلتا ہے۔ لہٰذا اطباء نے اس چیز سے بحث نہیں کی۔ انہوں نے تو جو کچھ کہا ہے اپنے ذاتی قاعدوں کی رو سے کہا ہے۔

المؤيدات لكون الطاعون من وخز الجن

ومما يؤيد ان الطاعون انما يكون من طعن الجن وقوعه غالبًا في اعدال الفصول وفي اصح البلاد هواء ويطيبها ماء ولانه لو كان بسبب فساد الهواء لدام في الارض لان الهوء يفسد تارة ويصح اخرى وهذا يذهب احيانا ويجبى احيانا على غير قياس ولا تجربته فربما جاء سنة

وربما ابطا سنين وبانه لو كان كذٰلك لم الناس والحيوان والموجود بالمشاهدة انه يصيب الكثير ولا يصيب من هم بجانبهم مما هو فى مثل مزجهم ولو كان كذٰلك لعم جميع البدن وهٰذا يختص موضع منالجسد ولا يتجاوزه ولان فساد الهواء يقتضى تغير الاخلاط وكثرة اسقام وهٰذا فى الغالب يقتل بلا مرض او قال شيخنا ولان فساد الهواء لا يختص فى بلدة واحدة بمحله منها ولاّ يدور من محلة الى محلة والمشاهد فى الطاعون دور انه وجولانه من مكان الى مكان ومن محلة منها الى محلة حتٰى ان فى محلة حريق من الطاعون كحريق السعير ومحلة اخرى مطمئنة لا تشعر بشى من ذٰلك ثم يمشى وينتقل هٰكذا من مكان الى مكان له جولة كجولة العسكر من الاعداء فدل على انه من طعن الجن كما ثبت فى الاحاديث.

طاعون کے جنوں کی نیزہ زنی سے پیدا ہونے کی تائیدات کے بیان میں

وہ اُمور جو اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ طاعون جنوں کے نیزہ مارنے سے پیدا ہوتا ہے ان میں سے ہیں اول، طاعون بہت اچھے موسم میں ایسے شہروں میں نمودار ہوتا ہے جو ہوا اور پاکیزگی کے لحاظ سے بہت بہتر ہوتے ہیں۔ دوم، اگر طاعون فسادِ ہوا کے سبب پیدا ہوتا تو چاہئے تھا کہ ہر زمانے میں دنیا میں طاعون رہتا کیونکہ ہوا صاف اور گندی برابر ہوتی رہتی ہے مگر یہ طاعون اس طور پر اچانک نمودار ہو جاتا ہے اور اچانک غائب ہو جاتا ہے جس کا قیاس ممکن نہیں۔ بس کبھی تو دو دو سال برابر رہتا ہے اور کبھی ایک سال آیا پھر آئندہ سال نمودار ہوا۔ تیسرے یہ اگر طاعون کا سبب فسادِ ہوا ہوتا تو یہ انسانوں اور حیوانوں کو سب کو لاحق ہوتا، حالانکہ مشاہدہ یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو ہوتا ہے اور بہت سوں کو نہیں ہوتا۔ چوتھے یہ کہ اگر فسادِ ہوا سے ہوتا تو اس کا اثر تمام بدن پر ہونا چاہئے تھا مگر یہ کسی خاص حصہ بدن میں ہوتا ہے اور اس مخصوص جگہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ پانچویں، فسادِ ہوا تغیر اخلاط اور بیماریوں کی کثرت کو مقتضی ہے مگر طاعون زیادہ تر بغیر بیماری کے انسان کو ختم کر دیتا ہے۔ (حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ فسادِ ہوا کسی ایک شہر میں کسی ایک

محلّہ سے مخصوص نہیں ہوتی اور نہ یہ صورت کہ آج ایک محلّہ کی ہوا خراب ہوئی کل دوسرے میں خراب ہوگئی اور اس کی درست ہوگئی، حالانکہ طاعون میں مشاہدہ یہ ہے کہ یہ ایک محلّہ سے دوسرے محلّہ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چلتا ہے۔ یہاں تک کہ آج ایک محلّہ طاعون سے جل رہا ہے جیسے دوزخ کی تپش اور دوسرے محلّہ میں بالکل امن ہے اس قسم کی کوئی بات محسوس نہیں پھر یہ یہاں سے روانہ ہوتا ہے اور اسی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے جیسا دشمن کا لشکر ایک جگہ سے دوسری جگہ روانہ ہوتا ہے۔

ومن وخزالجن:

موسی فناء امتی بالطعن والطاعون قیل یا رسول الله هذا الطعن وقد عرفناه فما الطاعون قال وخز اعدائکم من الجن وفی کل شهادة اخرجه احمد ثم ذکر له الحافظ طرقا عدیدة وقال والحدیث صحیح بهذاالاعتبار وقد صححه ابن خزیمة والحاکم واخرجاه واحمد والطبرانی من وجه آخر عن ابی بکر بن ابی موسی الاشعری قال سالت عنه رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال هو وخزا عدائکم من الجن وهو لکم شهادة ورجاله رجال الصحیح الا ابابلج ورسمه یحی وطقه ابن معین والنسای وجماعة وضعفه جمعة بسبب التشیع وذلک لا یقدح فی قبول روایته عند الجمهور وله طریق ثالثه اخرجها الطبرافی ورجاله رجال الصحیح الاکریبا واباه وکریب وثقه ابن حبان وله حدیث آخر فی الطاعون اخرجه احمد وصحه الحاکم من روایة عاصم الاحوال عن کریب بن الحرث عن ابی بردة بن قیس اخی ابی موسی الاشعری رفعه اللهم اجعل فناء امتی قتلا فی سبیلک بالطعن والطاعون قال العلماء اراد صلی الله علیه وسلم ان یحصل لامته ارفع انواع الشهادة وهو القتل فی سبیل الله بایدی اعدائهم اما من الانس واما من الجن (تنبیه) یقع فی الالسنة بلفظ وخز اخوانکم ولم اره بلفظ اخوانکم بعد التتبع الطویل البالغ فی شی من طریق الحدیث (ص ۱۵۱ و ۲۵۱ جلد ۱۰) ملخصاً۔

اس حدیث کی تحقیق کہ طاعون جنات کے نیزہ مارنے سے ہوتا ہے:

ازاں جملہ حضرت ابوموسیٰ والی حدیث کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان میری امت کی

موت طعن اور طاعون سے ہے۔ آپ سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طعن کو تو ہم جانتے ہیں لیکن طاعون کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے جنات میں سے دشمنوں کا نیزہ مارنا اور طعن اور طاعون دونوں میں شہادت ہے۔ یہاں سے ترجمہ ترک کر دیا گیا کیونکہ یہ بحث عوام الناس کی سمجھ سے باہر ہے جب تک کوئی شخص فن اصول حدیث کا ماہر نہ ہو اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ فرمایا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا اللہ! میری امت کو اپنی راہ میں طعن اور طاعون سے ماریئے۔ علماء فرماتے ہیں کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے واسطے اعلیٰ درجہ کی شہادت چاہی اور وہ اللہ کے راہ میں قتل ہونا ہے اپنے دشمنوں کے ہاتھوں۔ وہ دشمن انسان ہو یا جنات (اس سے وہ شبہ بھی دور ہو گیا جو لوگ کہتے ہیں کہ طاعون سے مشرکین کی نسبت مسلمان زیادہ مرتے ہیں۔ پس ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے جہاد اور طاعون میں شہید ہونے کو طلب فرمایا ہے تاکہ مسلمانوں کے درجات بلند ہوں۔

تحقيق الفراء من الطاعون و القدوم ببلدة هو بها

اخراج البخاری فی صحیحه عن عبدالرحمن بن عوف سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول اذا سمعتم بالطاعون بارض فلا تقدموا عليه واذا وقع بارض وانتم بها فلا تخرجوا فرار منه ام قال الحافظ وقد اخرج الطحاوی بسند صحیح عن انس ان عمراتی الشام فاتقبله ابو طلحة وابو عبدة فقال یاامیر المومنین ان معک وجوه الصحابة وخيارهم وانا تركنا من بعدنا مثل حریق النار فارجع العام فرجع وفی هذا الحدیث جواز رجوع من اراد دخول بلدة فعلم ان بها الطاعون وان ذالک لیس من الطیرة وانما هی من منع الالقاء الی التهلكة او سدا الذريعة لئلا يعتقد من دخل الى الارض التی وقع بها ان لودخلا وطعن العدوی المنهی عنها وقد زعم قوم الهنی عن ذلک انما هو للشر یه وانه ریجوز الا قدام علیه لمن قوی توکه وصح یقینه تمسکوا بماجاء عن عمرانه قدم قال رجوعه من سرغ كما اخرجه ابن ابی شیبة بسند جید عن القاسم بن محمد عن ابن عمر قال جئت عمر حين قدم فوجدته قائلا فی جنائه فانتظرته فی ظل الخباء فسمعه یقول حين تضود اللهم الغفرلی رجوع من سرخ واخرج الطحاوی بسند صحيح عن زيد بن اسلم عن ابیه قال قال عمر اللهم ان الناس قد نحلونی ثلثا انا ابرا

الیک منهن زعموا انی فردت من الطاعون وانا ابرا الیکن من ذلک وذکر الطلاء والمکس وقدور دعن غیر عمر التصریح بالعمل فی ذلک بمحض التوکل فاخرج ابن خزیمة بسند صحیح عن هشام بن عروة عن ابیه ان الزبیر بن العوام خرج غازیا نحو مصر فکتب الیه امراء مصران الطاعون قد وقع فقال انما اخرجنا للطعن والطاعون قد خلها فلقی طعفا فی جبهته ثم سلم.

وفی الحدیث ایضا منع من وقع الطاعون ببلد هوا فیها من الخروج منها وقد اختلاف الصحابة فی ذلک واخرج احمد بسند صحیح الی ابی منیب ان عمرو بن العاص قال فی الطاعون ان هذا رجز مثل السیل من تکنبه اخطاه ومثل النار من اقام احرقته فقال شرجیل بن حسنة ان هذا رحمة بکم دعوة نبیکم وقبض الصالحین قبلکم وفی معظم الطرق ان عمرو بن العاص صدق شرجیل وغیره علی ذلک وقتل عیاض جواز الخروج من الارض التی یقع بها الطاعون عن جماعت من الصحابة منهم ابو موسی الا شعری والمغیرة بن شیبة ومن التابعین منهم الا سود بن هلال ومسروق منهم من قال النهی فیه للتنزیه فیکره ولا بجرم وخالفهم جماعة فقالوا بحرم الخروج منها الظاهر النهی الثابت فی الحادیث الماضیة وهذا وهو الراجح عند الشافعیة وغیرهم (کالحنفیه ۱۲) دیؤیده ثبوت الوعید علی ذلک فاخرج احمد وابن خزیمة من حدیث عائشة فی اثناء حدیث بسند حسن قلت یا رسول الله فما الطاعون قال غده کغدة الابل المقیم فها کالشهید والفار منها کالفارمن الزحف وله شاهد من حدیث جابر رفعه الفار من الطاعون کالفار من الزحف والصابر کالصابر فی الزحف اخرجه احمد ایضا وابن خزیمة وسند صالح للمتابعات وقال الطحاوی والذی یظهر والله اعلم ان حکمة النهی عن القدوم علیه لئلا یصبب من قدم علیه تنقدیر الله فیقول هؤلا انی قدمت هذه الارض لما اصابنی ولعله لواقام فی المواضع الذی کان فیه لاصحابه فار مان لایقدم عله حسما للمادة ونهی من وقع وهو بها ان یخرج من الارض التی نزل بها لئلا یسلم فیقول مثلاً لواقمت فی تلک الارض لاصابنی ماصاب اهلا لعله لو کان اقام بها ما اصابه من ذلک شی اه ویؤیده ما اخرجه الیثم بن کلیب والطحاوی والبیهقی بسند حسن عنابی موسی انه قال ان هذا الطاعون قد وقع فمن اراد ان تبنزه عنه فلیفعل واحذروا ثنتین ان یقول قائل خرج خارج فسلم وجلس جالس فاصیب فلو

كنت خرجب لسلمت كما سلم فلان اول كنت جلست اصبت كما اصيب فلان لكن ابو موسى حمل النهى على من قصد الفرار محضاً ولا شک ان الصود ثلث من خرج الصد الفرار محضا فهذا تينا وله النهى لامالة ومن خرج لحاجة متمحضة لالقصدالوار اصلا ويتصور ذلک فيمن تهيا للرحيل من بلد كان بها الى بلد اقامة مثلاً فاتفق وقوع الطاعون فى اثناء تجهيز فهذا الم يقصد الفرار اصلا فلا يدخل فى النهى والثالث من عرضت له حاجة فار ادالخروج الهى وانضم الى ذلک انه قصد الراحته من الا قامة بالبلدالتى واقع بها الطاعون فهذا محل النزاع فمن منع نظر الى صورة الفرار (فى الجملة ومن اجاز نظر انى انه مستثنى من عموط لخروج فرارٌ لانه لم تمحض للفرار وانما هو لقصد التداوى وعلى ذلک يحمل ماوقع فى اثراتى موسى المذكوران عمر كتب الى ابى عبيدة ان لى اليک حاجتة فلا تضع كتابى من يدک حتى تقبل الى فكتب اليه انى قد عرفت حاجتک وانى فى جند من المسلمين لا اجد بنفسى رغبه عنهم فكتب اليه امام بعد فانک نزلت بالمسلمين ارضا غميفته فارفعهم الى ارض نزحة فدع ابوه عبيدة ابا موسى فقال اخرج فاتد للمسلمين منزلا حتى انتقل بهم فذكر القصة وانه نزل بالناس فى مكان اخر فاتفع الطاعون وقوله غميقة اى قريبة من المياه والنزور وذلک مما يفسد غالبا به الهواء لفساد المباه والنزهة والفسيحة البعيدة عن الوخم فهذا يد لعلى ان عمر داى ان النهى عن الحروم انما هو لمن قصدا الفوار ممتحضا وقد كان امر عمر لابئ عبيدة بذلک بعد سماعها للحديث ليس فى هذا اثبات الا عدوى وانما هو من فان اتصلاح الا هوية من انفع لا يشاء البدن وبالعكس وقد ذكر العلما فى النهى عن حكما منها ان لو شرع الخروج فخرج الاقوياه لكان فى ذالک كسر قلوب الضعفاء وقد قلوا ان حكمة الوعيد فى الفرار من الزحف لما فيه من كسر قلب من لم يفرو ادخال الرعب عليه نجد لانه ومنها ما ذكروه بعض الاطباء ان لمكان الذى يقع به الوياء ييكيف امزجة اهله.

تحقیق دوبارہ آنے اور جانے کے اس جگہ جہاں طاعون ہو:

امام بخاری نے عبدالرحمن بن عوف سے حدیث بیان کی کہ انہوں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا جب تم کو معلوم ہو کہ کسی جگہ طاعون ہے تو وہاں مت جاؤ اور جب

طاعون اس جگہ ہو جہاں تم موجود ہو تو وہاں سے باہر نہ نکلو اس سے بھاگنے کے خیال سے حافظ فرماتے ہیں کہ امام طحاوی نے حضرت انس سے صحیح سند کے ساتھ حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عمرؓ ملک شام کی طرف آئے ان کو حضرت ابو طلحہؓ اور ابو عبیدہؓ ملے اور کہا اے امیر المومنین آپ کے ساتھ بڑے بڑے صحابہ ہیں اور ہم نے اپنے پیچھے لوگوں کو آگ کی طرح جھلستا ہوا چھوڑا ہے۔ آپ واپس ہو جایئے۔ پس وہ واپس ہو گئے۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ جب کوئی شخص کسی شہر میں داخل ہونا چاہے پھر اس کو داخل ہونے سے پہلے معلوم ہو جائے کہ وہاں طاعون ہے تو اس کو جائز ہے کہ واپس لوٹ جائے اور اس کا یہ واپس ہونا کسی شگون کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس واسطے کہ خود کو ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت ہے بلکہ اس کے اعتقاد کی سلامتی کے لئے ہے یعنی یہ کہ اگر طاعون کی جگہ وہ شخص داخل ہوا اور اتفاقاً اس کو بھی طاعون ہو جائے تو اعتقاد ہو جائے گا کہ یہاں آنے کی وجہ سے یہ طاعون ہوا تو اس اعتقاد بد سے روکنے کے لئے ممانعت ہے کہ طاعون کے شہر میں نہ جائے اور چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ جس کا توکل قوی ہوا اعتقاد درست ہو اس کو جائز ہے کہ طاعون کی جگہ میں چلا جائے اور یہ لوگ دلیل میں یہ بات پیش کرتے ہیں کہ حضرت عمر موضع شام میں داخل ہوئے بغیر جو واپس ہو لئے تھے اس پر بعد میں بہت نادم ہوئے۔ ابن ابی شیبہ نے بہت قوی سند کے ساتھ بروایت قاسم بن محمد کے ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ جب عمر واپس آئے ہیں ان کے پاس آیا۔ پس ان کو خیمہ میں پایا تو ان کے خیمہ کے سایے میں بڑے درد سے یہ کہتے ہوئے سنا اے اللہ میرے شام کی طرف سے واپس ہو جانے کو معاف فرما دیجئے اور امام طحاوی نے زید بن اسلم سے اور انہوں نے اپنے والد سے بیان کیا ہے کہ عمرؓ نے فرمایا اے اللہ لوگوں نے میری طرف غلط بات منسوب کر دی ہے میں تجھ سے ان کے اس امر کی برأت ظاہر کرتا ہوں۔ ان کا گمان ہے کہ میں طاعون سے بھاگا ہوں اور میں اس امر سے برات ظاہر کرتا ہوں اور طلا اور مکس بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے علاوہ دیگر اصحاب سے اس بارے میں محض توکل کی بنا پر صریح عمل ثابت ہے۔ چنانچہ ابن خزیمہ صحیح سند کے ساتھ ہشام ابن عربی سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت زبیر ابن العوام مصر کی طرف غزوہ کے لئے گئے تو مصر کے حکام نے ان کو اطلاع کی کہ یہاں طاعون ہے انہوں نے فرمایا ہم جہاد اور طاعون کے لئے ہی نکلے ہیں۔ لہٰذا وہ مصر میں داخل ہو گئے پھر ان کے نیزہ لگا پیشانی میں مگر زندہ رہے۔

حدیث شریف میں اس کی ممانعت بھی وارد ہے کہ جس جگہ طاعون ہو وہاں کے لوگ وہاں

سے باہر نہ نکلیں مگر اس میں صحابہ کا اختلاف ہے۔ حضرت عمرو بن عاص نے طاعون کے بارے میں فرمایا ہے کہ طاعون عذاب ہے مثل سیلاب کے جس کو یہ پہنچ پڑا اس کا قصور ہوا اور جو اس میں ٹھہرا اس کو مثل آگ کے جلا دیا۔ شرجیل بن حسنہ نے کہا یہ تمہارے رب کی رحمت اور تمہارے نبی کی دعاء ہے اور اللہ تعالیٰ نے تم سے بیشتر لوگوں کو اس مرض میں موت دی ہے اور معظم طریق میں ہے کہ حضرت عمرو بن عاص نے شرجیل کی تصدیق کی اس قول میں اور حضرت عیاض نے صحابہ کرام کی ایک جماعت سے جن میں ابو موسیٰ اشعری اور مغیرہ بن شعبہ ہیں اور تابعین میں سے اسود بن بلال اور مسروق ہیں یہ نقل کیا ہے کہ جس جگہ طاعون ہو وہاں سے نکلنا جائز ہے اور بعض نے کہا ہے ممانعت تنزیہی ہے مگر نکلنا حرام نہیں اور بعض نے کہا ہے کہ نکلنا حرام ہے جیسا کہ ظاہر حدیث سے ثابت ہے اور حضرات شوافع اور احناف کے نزدیک راجح مذہب یہی ہے کہ طاعون والی زمین سے باہر نکلنا حرام ہے اور ان کے ثبوت کی تائید وہ وعید ہے جس کو امام احمد اور ابن خزیمہ نے بیان کیا۔ حضرت عائشہؓ والی حدیث کسی حدیث کے دوران بیان میں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طاعون کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ اونٹ کا غدود ہے جو شخص اس میں رہے وہ شہید ہے اور جو اس سے بھاگے وہ ایسے ہے جیسے جہاد سے بھاگے اور ایک ایسی ہی حدیث حضرت جابرؓ سے مرفوعاً مذکور ہے کہ طاعون سے بھاگنے والا جہاد سے بھاگنے والے کی مانند ہے اور اس میں صبر کرنے والا جہاد میں صبر کرنے والے کی مانند اور اس حدیث کو بھی امام احمد اور ابن خزیمہ نے صحیح سند سے بیان کیا ہے۔ امام طحاوی نے فرمایا کہ تمام احادیث کو ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ طاعون کی زمین پر آنے کی ممانعت کی وجہ یہ ہے۔ اگر میں یہاں نہ آتا تو مجھے طاعون نہ ہوتا (حالانکہ) جس جگہ وہ پہلے تھا وہاں بھی اس کو طاعون ہو سکتا تھا لہٰذا ممانعت کر دی گئی کہ طاعون زدہ علاقہ میں نہ آئے اور اسی طرح طاعونی علاقے سے نکلنے کو اس لئے منع فرمایا کہ اگر اس جگہ سے نکل کر اس کو طاعون نہ ہو تو وہ کہے گا کہ اگر میں بھی اس جگہ ہوتا تو مجھے طاعون لگتا حالانکہ اگر وہاں رہتا تو تقدیر الٰہی کے بموجب ممکن تھا کہ اس کو وہاں بھی طاعون نہ ہوتا۔ بس دونوں صورتوں میں فساد اعتقاد تھا۔ لہٰذا ممانعت کی گئی اور اس بیان کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو ھیثم بن کلیب نے اور طحاوی اور بیہقی نے سند حسن سے حضرت ابو موسیٰ سے روایت کی ہے۔

شَوقُ اللِّقَآء

یہ وعظ ۸ مئی ۱۹۱۲ء بمقام شاہی مسجد مرادآباد حضرت والا نے ارشاد فرمایا
جس کو آغا رفیق صاحب نے قلم بند فرمایا

غرض مرنا فی نفسہٖ کوئی خوف کی چیز نہیں مگر یہ اُس وقت حاصل ہوگا جب اعمال نیک ہوں گے کیونکہ اعمال نیک ہونے کی خاصیت رغبت موت ہے اور اعمال سیئہ کا خاصہ نفرت و وحشت ہے۔ خود قرآن شریف اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ موت سے عقلاً ڈرنا نامقبولیت کی دلیل ہے اور موت کی رغبت مطلوب ہے اور ہماری یہ حالت ہمارے اعمال سے پیدا ہو سکے گی۔ پس اعمال صالحہ میں کوشش کیجئے اور خدا تعالیٰ سے توفیق مانگیں۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ.

اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

فَقَدۡ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی سُوۡرَۃُ الۡجُمُعَۃِ وَلَا یَتَمَنَّوۡنَہٗۤ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡھِمۡ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ. (الجمعہ:۷)

’’وہ کبھی اس کی تمنا نہیں کریں گے بوجہ (خوف سزا) ان اعمال (کفریہ) کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو خوف اطلاع ہے ان ظالموں (کے حال) کی‘‘

کل کے وعظ میں خشیت کا بیان ہوا تھا جس میں آخرت کے بھولنے خوف نہ کرنے اور موت کے یاد نہ کرنے کی شکایت کا بیان تھا۔ چونکہ یہ مضمون ایک مہتم بالشان مضمون ہے اور اس وقت اس کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ آج کل غفلت بڑھی ہوئی ہے، آخرت کو لوگوں نے بھلا دیا ہے اور اعمال و افعال کے حساب پر نظر نہیں ہے اس وجہ سے مناسب یہی ہے کہ اس کی تکمیل اس بیان سے کی جائے۔

غفلت کا اصل سبب:

واضح ہو کہ غفلت کا اصل سبب موت کو بھلا دینا ہے اور اکثر امراض کا سبب غفلت ہے اس لئے ضرورت ہے اس امر کی کہ موت کو یاد دلایا جائے اور غفلت سے متنبہ کیا جائے اور جب یہ کمی دو ہو جائے گی تو نافرمانی وعصیان بھی دور ہو جائیں گے۔

ان وجوہ سے موت کا یاد کرنا ضروری ہوا اور موت کو یاد نہیں کرتے بوجہ توحش کے، پس توحش کی علت نکالنا ضروری ٹھہرا اور وہ اعمال سیئہ میں، پس اعمال کی اصلاح اس کا علاج ہوگا اس

لئے بجائے وحشت موت سے انس ہو جائے گا۔ چنانچہ جو آیات میں نے پڑھی ہیں وہ اسی مضمون کے متعلق ہیں۔ ان میں ان یہود کو مخاطب بنانے کا ارشاد ہے جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ خداوند تعالیٰ ان آیات میں ان کے اور وہ کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے بوجہ ان اعمال کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتے ہیں۔ دعویٰ حقانیت کا ایک امتحان مقرر کیا ہے جس میں امتحان کے متعلق پیش گوئی بھی کی گئی ہے۔ امتحان یہ ہے کہ یہود یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ آخرت ہمارا حصہ ہے۔

مناظرہ کا اصل قاعدہ:

ان آیات میں جناب باری نے گفتگو کی ہے ایسے طرز سے جس میں ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ مناظرہ کا یہ طریقہ ہے۔ آج کل مناظرہ کا طرز عجیب و غریب ہے کہ تمام عمر اسی قیل وقال میں گزر جاتی ہے۔ قرآن مجید کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مناظرہ کا طرز یہ نہیں ہے جو آج کل ہم سمجھے ہوئے ہیں بلکہ مناظرہ کا قاعدہ وہ ہے جو خداوند تعالیٰ نے استعمال فرمایا ہے یعنی مخاطب کو اول سمجھانا اس کے اعتراضات کو نرمی اور سکون سے دفع کرنا آہستگی اور اطمینان سے بتلانا جس میں خشونت اور تحقیر بالکل نہ ہو بلکہ اظہار حقیقت ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قُلْ لِعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (۲) وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (۳) اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (۴) اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ان آیات کلام پاک سے واضح ہوتا ہے کہ نرمی سے سمجھا دو اور خشونت و تحقیر سے باز رہو۔

شفقت سے مخاطب کرنے کا اثر:

بات اصل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کو بندوں پر شفقت ہے، جیسی ماں باپ کی شفقت ہوتی ہے۔ پس شفقت میں جیسا ماں باپ کا قاعدہ ہوتا ہے کہ اچھی چیز اور اچھی عادت پر پیار کرتے ہیں اور بری و مکروہ باتوں پر جھڑکتے اور مارتے بھی ہیں مگر یہ عداوت و بغض کی وجہ سے نہیں اور مقصود دل دکھانا نہیں ہوتا نہ تحقیر ہوتی ہے۔ اسی طرح خداوند تعالیٰ کو اپنے بندوں پر شفقت ہے۔ شفقت سے مخاطب کرنے میں مخاطب پر بھی شفقت کا اثر ہوتا ہے ممکن ہے بعض لوگ اس موقع پر یہ شبہ پیش کریں کہ جب خداوند تعالیٰ بندوں پر شفقت فرماتا ہے تو قرآن مجید میں سخت الفاظ کیوں ہیں اور سختی سے کیوں مخاطب کیا گیا ہے اس کا جواب دو مثالوں سے سمجھئے ایک تو یہ کہ کوئی شخص اپنے مخاطب کی تحقیر کرتا ہوا کہے کہ ہمارے

مہربان دوست نے یہ فرمایا ہے جیسا آج کل محاورہ ہے اس مہربان سے مراد نامہربان ہوتی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ شفقت الفاظ سے نہیں ہوتی ہے بلکہ دل سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ از دل خیز و بر دل ریزد۔ دوسرے کہ والدین اپنے بچوں کو کمبخت کہتے ہیں۔ والدین کا بچوں کو کمبخت کہنا درحقیقت دل سے نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی ایک پیار کا کلمہ سمجھا جاتا ہے اور مراد شفقت ہی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کے جو الفاظ آئے ہیں لب ولہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی یہی شفقت ہے۔ احادیث میں حضرت ابوذر غفاری کا واقعہ مشہور ہے۔ آپ نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کہنے والا جنت میں داخل ہوگا اگرچہ وہ زانی وسارق ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ ابوذر غفاری کا شبہ کچھ ایسا بڑھا کہ کئی مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آخیر مرتبہ جواب میں حضور نے فرمایا **وان رغم انف ابی ذر** (**مسند احمد ۱۵۲:۵**) یعنی اگرچہ ابوذر کی ناک خاک آلود ہو جائے۔ ابوذر اس کلمہ سے ایسے مسرور ہوئے کہ روایت حدیث میں ہمیشہ اس جملہ کو نقل کرتے تھے، حالانکہ روایت حدیث میں اس جملہ کے نقل کی ضرورت نہیں تھی لیکن چونکہ حضور کے الفاظ سے ابوذر کو ایک لذت حاصل ہوئی اور وہ شفقت کے اثر میں ڈوبے ہوئے تھے اس لئے روایت حدیث میں داخل کر دیئے اور بزبان حال کہا کہ میری خوشی اسی میں ہے کہ یہ الفاظ روایت حدیث میں ضرور پڑھے جائیں۔ چنانچہ اب تک یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ صحاح کی احادیث میں یہ روایت انہیں الفاظ سے پڑھی جاتی ہے اور نقل کی جاتی ہے۔

دل زبان کا ترجمان ہے:

ہمارے الفاظ میں اگر تیزی ہوتی ہے تو ناملائم ہوتی ہے اور اگر نرمی ہوتی ہے مداہت اور تخلق کے ساتھ ہوتی۔ ہماری وہ حالت ہے کہ:

چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی　　　چونکہ خوردی تند و بدلگامی شوی

"جب بھوکا ہوتا ہے تو کتے کی مانند ہوتا ہے اور جب شکم سیر ہوتا ہے تو بدمزاج اور بدزبان ہوجاتا ہے"

شفقت میں الفاظ دل شکن زبان پر نہیں آتے ہیں بلکہ جو الفاظ دل سے نکلتے ہیں ان کا مفہوم خود ظاہر میں کیسا ہی ہو لیکن شفقت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ دل چونکہ زبان کا ترجمان ہے اس لئے زبان سے نکلے ہوئے الفاظ دل کی کیفیت پر دال ہوتے ہیں۔

راقم گنہگار لکھنے کی مثال:

لیکن افسوس ہے کہ ہم آداب معاشرت سے بھی واقف نہیں ہم کو اگرچہ شریعت نے ہمارے

واسطے آداب معاشرت اور آداب کلام سب کچھ بیان کر دیئے ہیں لیکن آج کوئی یہ جانتا بھی نہیں کہ شریعت نے ہم کو کیا آداب معاشرت و آداب کلام سکھائے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ فرمایا لایقل احدکم خبثت نفسی (الصحیح للبخاری ۵۱:۵) یعنی جب تم میں سے کسی کا جی خراب ہوا کرے تو یہ نہ کہا کرو کہ میرا جی میلا ہے کیونکہ مسلمان میلا نہیں ہوتا لیکن آج فخر کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ راقم گنہگار، عاصی، پر معاصی وغیرہ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص گورنمنٹ کو ایک عرضی لکھے اور اس کے آخر میں لکھے فدوی فلاں باغی تب معلوم ہو کہ اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ خاکسار لکھو لیکن گنہگار کا لفظ استعمال نہ کرو یہ بالکل سچ ہے کہ ہم گنہگار ہیں لیکن گنہگار ہو کر ظاہر کرنا کوئی خوبی نہیں۔ گنہگار آج کل وہ شخص لکھتا ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ میں گنہگار نہیں ہوں اپنے کو گنہگار سمجھنا کوئی بری بات نہیں مگر گنہگار کہنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ غرض ہم کو آداب کلام کی بھی تعلیم دی گئی ہے، پھر مناظرہ میں حسن الفاظ کا استعمال کس طرح جائز ہوگا جبکہ اوپر کی آیات میں جن الفاظ کا امر ہے مگر آج کل دیکھا جاتا ہے کہ ساری دین داری گالیاں دینے میں سمجھ لی گئی ہے۔

ہر امر میں اتباع سنت کی ضرورت:

کیا یہ امر تعجب خیز نہیں ہے کہ ہم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نماز، روزہ میں کیا اور باقی آداب کلام وغیرہ میں چھوڑ دیا ہے۔ یہ بات ہرگز ٹھیک نہیں ہے، ہم پر لازم ہے کہ ہم بالکل نمونہ کے موافق بنیں اور ہر امر میں حضور کی اطاعت اختیار کریں۔ نمونہ کی مثال ایسی سمجھنا چاہئے کہ آپ نے کسی درزی کو ایک کپڑا نمونہ کے موافق تیار کرنے کے واسطے دیا اور اگر وہ درزی نمونہ کے خلاف ایک آستین بڑی بنا لادے تو کیا اس سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ یہ آستین کیوں بڑھی۔ اس کا کیا جواب ہوگا۔ اسی طرح اگر قیامت میں تمام سوالات کو چھوڑ کر اللہ میاں صرف یہی سوال کریں کہ تم نے اپنے اس نمونہ کا کہ رسول کے خلاف کیوں کیا تو کیا جواب ہوگا۔ علاوہ اس کے آپ کے خلاف کرنے سے آپ کو وقت اطلاع اعمال کے ایذاء بھی تو ہوتی ہے۔

حکایت مرزا قتیل:

چنانچہ مرزا قتیل کا ایک قصہ یاد آیا کہ یہ فارسی کے ایک مشہور شاعر ہیں جن کا کلام تصوف کے رنگ میں ہوتا ہے۔ ایران کے ایک شخص نے مرزا قتیل کا کلام دیکھ کر خیال کیا کہ یہ کوئی بڑا بزرگ شخص ہے۔ یہ اعتقاد دل میں لے کر وہ ایران سے بغرض ملاقات روانہ ہوا۔ اتفاق سے مرزا صاحب اس وقت حجامت بنوا رہے تھے۔ حجام داڑھی کی صفائی کر رہا تھا۔ اس شخص کو یہ دیکھ کر بہت

غصہ آیا اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''افسوس آغا ریش می تراشی'' (آغا ڈاڑھی کترا رہے ہو) مرزا قتیل نے جواب میں کہا کہ ''بلے ریش می تراشم و لے دل کے نمی خراشم'' (ہاں میں ڈاڑھی کاٹ رہا ہوں کسی کا دل نہیں دُکھا رہا) چونکہ مرزا قتیل کا رنگ تصوف کی طرف زیادہ مائل تھا اس لئے اس جواب میں بھی وہی رنگ رکھا ہے آج بھی یہی حالت ہے کہ برے کام کرتے ہیں۔ ناشائستہ حرکات کا ارتکاب ہوتا ہے لیکن منع کرنا یا اعراض ہونے پر جواب دے دیا جاتا ہے کہ ہمارا ذاتی فعل ہے کسی کو ہم ایذا تو نہیں دیتے۔ اس شخص نے مرزا قتیل کا جواب سن کر کہا کہ ارے دل رسول اللہ می خراشی یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے اعمال دیکھیں گے تو کس قدر خوش ہوں گے۔ ذرا غور کرو کہ ہمارے نام اور ہمارے اعمال میں کس قدر تبائن ہے۔ غرض نو وارد کا یہ فقرہ سن کر کہ ''آرے دل رسول اللہ می خراشی'' (ہاں تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دُکھا رہے ہو) مرزا قتیل آہ کر کے بے ہوش ہو گئے اور جب کچھ ہوش آیا تو بزبان حال کہتے تھے کہ:

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی مرا با جان جاں ہمراز کردی

''اللہ پاک آپ کو نیک بدلہ دے کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اور مجھے محبوب حقیقی سے ہمراز کر دیا''

غرض جب کسی کا نمونہ بن جائے تو کوئی بات نمونہ کے خلاف نہ ہونی چاہئے بلکہ نمونہ کے موافق بننے کی کوشش کرنا چاہئے۔ خداوند تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے لئے نمونہ بنایا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ نماز اور روزہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہو اور دوسری باتیں ہامان وفرعون کے مطابق ہوں۔ غرض یہ ہے کہ ہر بات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور اتباع کرنا چاہئے تاکہ پورا اتباع حاصل ہو۔

بعض لوگ وعظ وخطاب میں برعکس مذکورین کے اس قدر ترقی اختیار کرتے ہیں کہ وہ مداہنت کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ احادیث میں سختی اور نرمی دونوں چیزوں کا ذکر ہے، البتہ سختی کی دو قسمیں ہیں۔

سختی کی دو قسمیں:

ایک سختی دنیا کے لئے اور دوسری دین کے لئے۔ دنیا کے لئے جو سختی ہوتی ہے وہ اپنے نفع کے لئے ہوتی ہے جیسے اظہار ریاست وجاہ اور دین کی اللہ کے واسطے ہوتی ہے۔ نرمی بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔

نرمی کی دو اقسام:

ایک نرمی تالیف قلوب کے لئے اور دوسری اپنے نفع کے لئے لیکن ہم لوگ جو نرمی و سختی کرتے ہیں وہ محض اپنے نفس کے لئے کرتے ہیں۔

سختی فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں اور نہ اس میں کچھ مضائقہ ہے لیکن شفقت و دل سوزی کے ساتھ ہونی چاہئے اگر سختی میں شفقت و دل سوزی ہوگی تو دل آزاری نہ ہوگی۔

مولانا اسماعیل شہید کے وعظ میں نصیحت کی شرکت:

مولانا محمد اسماعیل صاحب شہیدؒ وعظ بیان فرمایا کرتے تھے۔ مولانا کے ایک مخالف بھی وعظ میں شریک ہوتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے جبکہ وہ وعظ سننے کے لئے جارہے تھے دریافت کیا کہ کہاں جاتے ہو؟ کہنے لگے کہ مولانا محمد اسماعیل صاحب کا وعظ سننے جارہا ہوں۔ کہا کہ بھئی تم تو کہتے تھے کہ وہ مخالفین کو سب وشتم کرتے ہیں؟ کہا کہ بے شک مگر اس میں بھی مزا آتا ہے۔

اب نفس کو ٹٹول لو کہ تم میں یہ بات کہاں تک پائی جاتی ہے۔ واللہ محض غیظ نفس سے برا بھلا کہنے میں پاک نہیں ہوتا۔ مولوی صاحب ایک شخص سے ناراض ہوئے لیکن برا بھلا کہنے اور دل کا غبار نکالنے کا موقع نہیں ملا۔ ممبر پر بیٹھ کر خوب جی کی ہوس پوری کر لی۔ وعظ میں اچھی طرح بچارے کی خبر لی اور خوب برا کہا۔ یہ طریقہ ہمارے واعظین کا ہے فحش اور غلیظ گالیوں تک سے انہیں خوف نہیں ہوتا۔ جو کچھ جی میں آتا ہے بے ساختہ کہہ بیٹھتے ہیں۔ کیا یہی طریقہ ہدایت کا ہے۔ اسی طرح ہدایت ہوتی ہے میں نے اپنی آنکھ سے ایک رسالہ میں لکھا دیکھا ہے کہ ایک صاحب کسی کے رد میں اس کا قول نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں کہ اس قول میں گوبر کی بو آتی ہے۔ بھلا قول میں اور گوبر کی بو یہ حالت ہم لوگوں کی رہ گئی۔ خدا رحم فرمائے۔ مناظرہ قرآن شریف میں بھی ہے لیکن نہایت مناسب طریقہ پر ہے۔ پس قرآن شریف میں مباحثہ اور مناظرہ کا یہ قاعدہ رکھا گیا ہے کہ اول سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور پھر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ارشاد ہے کہ امانت علیه بو کیل جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ درپے نہ ہو جائے اگر وہ سمجھانے سے سمجھ جائیں تو خیر ورنہ ان کے درپے نہ ہو جائے۔

مناظرہ کی ترتیب:

مذکورہ بالا تعلیم سے معلوم ہوتا ہے کہ مناظرہ کی ترتیب یہ ہے کہ اول سمجھائیں اور سمجھانے کے بعد اگر مایوسی ہو تو اس سے اعراض کریں۔ درپے ہونا مناسب نہیں ہے۔ ع

کار خود کن کار بیگانہ مکن مکن "اپنا کام کرو دوسرے کا کام مت کرو"

مقصود اپنا کام ہے اگر تبلیغ اور سمجھانے سے کام چل گیا تو خیر ورنہ اپنا کام چھوڑ کر اس کے درپے ہو جانا اور اسی میں مصروف ہو کر اسی کو اپنا نماز، روزہ سمجھ لینا سخت غلطی ہے۔ دوسرے کی خدمت کے لئے اپنا کام چھوڑنا پسندیدہ نہیں۔ ہر کام میں اعتدال مناسب ہے۔

قرآن شریف اسی طریقہ کو بتلاتا ہے۔ایک آیت میں نصاریٰ سے احتجاج ہے جبکہ انہوں نے کوئی دلیل نہیں مانی تو خداوند تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَ کَ مِنَ الْعِلْمِ (الخ) یعنی بعد دلائل کے بھی جو شخص کج بحثی کرے اس سے خاص طور پر قسما قسمی کرلو اور اس آیت میں یہودی مخاطب ہیں یعنی اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّکُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ الخ یعنی اگر تم حق پر ہو اور آخرت تمہارے لئے ہے تو موت سے ڈرو مت کیونکہ موت نعمائے آخرت میں داخل ہونے کا ایک ذریعہ ہے اسلئے اگر تم اپنے کو واقعی حق پر سمجھتے ہو تو موت کی تمنا کرو۔ چنانچہ اس امتحان میں یہود ناکامیاب رہے اور ان کے سکوت سے میدان خالی ہوگیا۔مدعی پسپا ہوئے اور اب تبلیغ عام کا خوب موقع ملا۔
چنانچہ اس مقام پر بھی خدا نے بتلایا ہے وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا یعنی وہ موت کی تمنا نہ کرسکیں گے اور علت اس کی یہ ہے کہ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ یعنی جو کچھ انہوں نے کیا ہے اور اپنی زندگی میں برے کام کئے ہیں اور مشاغل کو بڑھا رکھا ہے وہ ان کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرسکیں گے۔پس غور کرنے سے معلوم ہوگیا کہ موت کی تمنا نہ کرنے کا باعث کیا ہے۔یعنی ارشاد ہوا کہ اعمال سیئہ کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کریں گے۔پس قرآن شریف یہ بتلاتا ہے کہ موت کی عدم تمنا کا سبب اعمال سیئہ ہیں مگر معاصی و تمنا جمع نہیں ہوسکتیں جب اعمال سیئہ ہوں گے تو موت سے انس ہوگا۔
اس مقابلہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جیسے اعمال سیئہ میں اثر ہوتا ہے کہ انسان موت سے نفرت کرتا ہے اور متوحش ہوتا ہے اسی طرح اعمال صالحہ میں موت سے وحشت نہیں ہوتی ایک حکم نصاً ثابت ہوا یعنی اعمال سیئہ میں موت سے نفرت و وحشت اور دوسرا حکم یعنی اعمال صالحہ میں موت۔
اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم لوگ موت کو کیسا سمجھتے ہیں۔ذرا اپنے قلوب کو ٹٹول لیں اور دیکھیں کہ ہم میں موت سے نفرت پائی جاتی ہے یا موت کی تمنا اور یہ وسوسہ نہ ہو کہ اس آیت میں ہم کو خطاب ہی نہیں، پھر اس سے ہم کیوں فکر میں پڑیں۔سو سمجھ لینا چاہئے کہ گو خطاب خاص ہے مگر مضمون عام ہے اور یہ خداوند تعالیٰ و تبارک کی رحمت ہے کہ دوسروں کی حکایت میں ہماری تنبیہ مقصود ہے اور دوسروں کے واقعات بتلا کر ہم کو بتلایا جاتا ہے کہ ایسے خطرات سے بچو تاکہ تم بھی محفوظ رہ سکو۔پس یہ ہماری رعایت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت خداوند تعالیٰ کو ہمارے ساتھ منظور ہے، جیسے کہا گیا ہے:

خوش تر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

''ایسے اسراروں کا دوسروں کی حکایات و تمثیلات میں بیان ہونا مناسب ہے''
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ساتھ قرآن مجید میں ایسی رعایت رکھی گئی ہے جو

کسی کے ساتھ ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ نے دوسری امم کے ذکر میں امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے بڑی بڑی قیمتی ہدایات بیان فرمائی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہم تدبر نہیں کرتے اور نہیں خیال کرتے کہ خداوند تعالیٰ نے ہمارے واسطے کیا کیا مفید باتیں فرمائی ہیں۔

ترجمہ کو خود پڑھ کر سمجھنے کی کوشش لاحاصل ہے:

افلا یتدبرون القرآن الآیۃ (کیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟) لیکن تدبر میں صرف مطالعہ ترجمہ قرآن اور اپنی رائے پر اکتفانہ کریں۔ لوگ سخت غلطی کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا خود اردو ترجمہ دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ اس قسم کے اردو ترجمے دیکھ کر ایک اردو دان شخص قرآن مجید کو اچھی طرح سے نہیں سمجھ سکتا۔ البتہ قرآن مجید کے سمجھنے، اس میں تدبر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ علوم درسیہ کو حاصل کیا جائے لیکن یہ صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو فارغ ہیں اور علوم درسیہ کے حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس وقت ہے اس لئے جو لوگ غیر فارغ ہیں یا ان کے لئے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انکو ترجمہ سبقاً سبقاً پڑھنا چاہئے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ترجمہ کو حرفاً حرفاً کسی مولوی صاحب سے پڑھے اور سمجھے خود پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرنا لاحاصل ہے کیونکہ اس میں بڑی غلطیاں ہوتی ہیں اور کچھ کا کچھ لوگ سمجھ لیتے ہیں۔ تجربات سے اس کے نقصانات بہت کچھ معلوم ہوئے ہیں۔

خود ترجمہ دیکھنے کی عجیب مثال:

اس کی مثال طب جیسی ہے یعنی طب کی کتابیں خود دیکھ کر علاج وغیرہ کرنے کی کوشش کرنا سخت غلطی ہے کیونکہ خود دیکھ لینے سے طب کے اصل راز اور صحیح حقیقت کا ادراک حاصل نہیں ہو سکتا۔ البتہ پڑھنا اور اساتذہ سے تجربات اور معلومات حاصل کرنا مفید ہوگا۔

ضرورت استاد:

اسی طرح آج کل اردو دانوں میں یہ مرض پھیل گیا ہے کہ اردو مسئلہ مسائل کی کتابیں خود دیکھ کر عالم بن جاتے ہیں جو خد بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ درحقیقت ایسے ہی لوگ سخت نقصان پہنچارہے ہیں اور معنی تو بڑی چیز ہے الفاظ ہی بدونِ استاد کے ٹھیک نہیں ہوتے۔

ایک عالم نے خود قرآن شریف حفظ کیا تھا اور مجھے سنایا۔ مجھے اس میں بہت غلطیاں نظر آئیں۔ چنانچہ سورہ کہف میں مولوی صاحب نے پڑھنا تھا لکنا یعنی الف کے ساتھ میں نے کہا کہ چونکہ یہ لفظ لکن آتا ہے اس لئے اس میں الف نہیں پڑھا جاتا۔

اسی طرح لکھنو میں ایک ذی علم شخص نے دعویٰ کیا کہ ہم محتاج استاذ نہیں۔ایک حافظ نے اس دعویٰ کو سنااوران سے سننے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ سورہ حم السجدہ نکالی اور شروع کیا جب یہاں پہنچے وقال اللذین کفروا ربنا ارنا اللذین اس آیت میں الذین بفتح ذال ہے لیکن انہوں نے اللذین بکسر ذال پڑھا تھا۔

حضرت حکیم الامت کا زمانہ طالب علمی میں قرآن پاک سنانے کا واقعہ:

میں خود اس قسم کے ایک اشتباہ میں مبتلا ہو چکا ہوں جس زمانہ میں ابتدائی کتابیں عربی کی پڑھا کرتا تھا۔اپنی مسجد میں رمضان شریف میں قرآن شریف سنایا۔ختم قرآن مجید کا دن تھا، والد صاحب قبلہ بھی شریک تھے سورۃ والفجر پڑھ رہا تھا جب اس آیت پر پہنچا **فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗ اَحَدٌ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗ اَحَدٌ** (پس اس روز نہ تو خدا کے عذاب کے برابر کوئی عذاب دینے والا نکلے گا اور نہ اس کے جکڑنے کے برابر کوئی جکڑنے والا نکلے گا) اس کے معنی سمجھ میں نہیں آئے۔ مجھے یہ دھوکا ہوا کہ **عذابہ** میں ضمیر مضاف الیہ کافر کی طرف ہے۔پس اس صورت میں **"لایعذب" بفتح الذال** ہوگا۔چنانچہ ایسا ہی پڑھا اور والد صاحب نے ٹوکا اور بتلایا **لایعذب** یعنی بکسر الذال میں نے والد صاحب کے بتلانے پر بھی خیال نہیں کیا اور اسی طرح پڑھا، پھر والد صاحب نے بتلایا غرض تین مرتبہ ایسا ہی ہوا صرف ونحو پر غرہ تھا خیال یہی ہوا کہ میں جو کچھ پڑھتا ہوں قاعدہ سے وہی صحیح ہے۔نیم ملا خطرہ ایمان بالکل صحیح ہے جب تیسری مرتبہ والد نے بتلایا تو میں ڈر گیا کہ باپ ہیں کہیں ماریں نہیں۔ چنانچہ جس طرح والد صاحب نے بتلایا تھا اسی طرح پڑھا اور نماز پڑھ کر قرآن شریف دیکھا کیونکہ اس وقت بھی خیال تھا کہ جو کچھ میں نے پڑھا ہے وہی صحیح ہے۔چنانچہ ایک قرآن شریف میں دیکھا **لایعذب بکسر الذال** نکلا یقین نہیں ہوا اور خیال ہوا ہے غلط چھپ گیا ہو دوسرے کلام مجید دیکھا۔ غرض کئی کلام مجید دیکھنے پر یقین ہوا کہ صحیح **لا یعذب** بکسر الذال ہی ہے اور سمجھ میں آیا کہ **عذابہ** میں ضمیر مجرور کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔غرض معنی سمجھ کر پڑھنے میں بھی غلطی ہو جاتی ہے۔

صحت الفاظ کے لئے استاد کی ضرورت:

اس سے معلوم ہوا کہ معنی پڑھنے اور الفاظ کی صحت کرنے کے لئے بھی استاد کی ضرورت ہے اور اگر اعراب بھی ٹھیک کر لئے مگر حروف تو غلط رہیں گے۔صحت الفاظ کا حاصل کرنا علم تجوید ہو سکتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اکثر علماء بھی اس سے غافل ہیں۔اکثر علماء ایسے ہوتے ہیں کہ علم تجوید سے واقف نہیں ہوتے اور بجائے اس کے کہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے جی خوش ہو دل گھٹ جاتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اہل علم بھی قرآن کو درست کریں۔علماء نے سمجھ رکھا ہے کہ اس میں ہے

ہی کیا اس لئے اس کی طرف توجہ نہیں کرتے حالانکہ یہ سخت غلطی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ تجوید لازم واجب تو ہے ہی نہیں پھر اس کی طرف اتنی توجہ لا حاصل ہے۔

قرآن شریف کا صحیح پڑھنا واجب ہے:

کاش وہ دیکھتے کہ قرآن شریف کا صحیح پڑھنا تو واجب ہے اور اظہار اخفا و ادغام ایک ایسی چیز ہے کہ جب تک اظہار و اخفا و ادغام ادا نہ ہوگا قرآن شریف صحیح نہیں پڑھ سکتا اور قرآن شریف کا صحیح پڑھنا واجب تھا اس لئے تجوید بھی واجب و لازم ہوئی، اس کی توضیح ایک مثال سے ہوگی۔ مثلاً اردو میں ایک لفظ پنکھا ہے جس میں نون ساکن ہے مگر یہ دیکھئے کہ کہاں سے ادا ہوتا ہے سو نون کا مخرج اصلی دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ نوک زبان ہے جو اوپر کے دانتوں سے لگتی ہے لیکن پنکھن کہنے میں نون اپنے مخرج سے ادا نہیں ہوتا اور یقین ہے کہ اگر کوئی شخص اس نون کو اس کے اصلی مخرج سے ادا کرے یعنی پ ن زبر پن اور پھر لفظ کھا ملا دیا جاوے تو یقیناً یہ لفظ غلط ہے یہ طرز ادائے صحیح وہی ہے جس کو قراء اخفاء کہتے ہیں۔ پس جس طرح اردو میں اخفا کے اہتمام سے لفظ غلط ہو جاتا ہے اور اس کو اردو لفظ نہ کہیں گے اسی طرح عربی میں بھی اس کے احتمال سے لفظ غلط ہو جاتا ہے اور عربی زبان عربی نہ رہے گی حالانکہ کلام مجید میں ارشاد ہے قرآناً عربیاً جو دال ہے عربیۃ کے وجوب حفظ پر اس سے یہ امر معلوم ہو گیا کہ تجوید لازم ہے اور شبہ اس کے عدم وجوب کا جاتا رہا۔

آج کل تمام تجوید چھوڑ کر اس میں سے صرف ضاد و طاء کا فرق لے کر اس پر جھگڑا کیا جا رہا ہے اور پھر جھگڑے اور مناقشہ پر بھی وہ غلط ہے۔

مخرج وصفات یونہی کتابیں دیکھ لینے سے حاصل نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ کوئی استاد ان کا بتلانے والا نہ ہو۔ قاعدہ اگرچہ معلوم ہو جائے گا لیکن ہیئت ادا بغیر سماع کے سمجھنا ناممکن ہے۔ کسی کا شعر ہے:

گر مصور صورت آں دلستان خواہد کشید   لیک حیرانم کہ نازش راچسان خواہد کشید

”اگر یہ تسلیم کر لیں کہ مصور اور اس دلبر کی تصویر واقعی اتار لے گا تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کے ناز و انداز کی عکاسی کیسے کرے گا“

”اگرچہ مصور محبوب کی تصویر تو کھینچ لے گا لیکن میں حیران ہوں کہ اس کے ناز و ادا کی تصویر کس طرح ہوگی۔“

محض کتاب میں دیکھ کر ایک رائے قائم کر لی ہے بعض نے ضاد۔ دال ظاء کو ایک دوسرے کی جگہ پڑھنا شروع کر دیا ہے حروف کو غیر مخرج سے ادا کرتے ہیں اور صحیح ادا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

اس حروف کے صحیح ادا کرنے کی پہچان یہ ہے کہ روشنائی دانتوں کے اگلے حصہ میں لگا دی

جائے اگر ضاد ادا کرنے میں روشنائی زبان کو لگے تو مخرج ٹھیک ہے ورنہ نہیں۔ مشاق ایسا ہی کرتے ہیں اور اس امتحان سے صحت کا اطمینان ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں کی جانب سے علم قرات وتجوید کے حصول میں عذر کیا جاتا ہے کہ یہ بہت مشکل چیز پورے طور پر نہیں آسکتی اور جب تک مدتوں اس میں کوشش نہ کی جائے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ عذر نہایت غیر معقول ہے اس لئے کہ یہ کون کہتا ہے کہ علم تجوید میں آج ہی حمزہ اور عاصم بن جاؤ بلکہ جس طرح سے کہ بخاری ومسلم پڑھتے ہو اور بخاری ومسلم نہیں بن جاتے بلکہ ادھورے رہتے ہو اسی طرح یہ بھی سیکھو اور اس میں بھی ادھورے رہو۔

حاصل اس تمام کا یہ ہوا کہ جب حروف تک میں استاد کی ضرورت ہے تو اردو کے ترجمے دیکھ کر اعتماد کر لینا کیسے ٹھیک ہوگا۔ ترجمہ دیکھو ترجمہ دیکھنے کی ممانعت نہیں لیکن جہاں کہیں شبہ رہے اپنی رائے اور فہم پر اعتماد نہ کرو کسی محقق سے دریافت کر لو تا کہ غلطی کا احتمال نہ رہے۔

غرض سب سے مقدم کام قرآن شریف کا سمجھنا ہے اور سوچنا ہے سو اس کو لوگوں نے بالکل ترک ہی کر دیا۔ الا ماشاء اللہ۔

قرآن مجید سمجھ کر پڑھنے سے نفع:

میرے ایک ملنے والے ڈاکٹر صاحب ہیں۔ وہ کلام مجید کو اس قدر سوچ اور سمجھ کر پڑھتے ہیں کہ انہیں کلام مجید کے سمجھنے میں ایک عجیب ملکہ حاصل ہو گیا ہے اور کچھ طبیعت ایسی مناسب پائی ہے کہ کلام مجید کے وہ لطائف ونکات بیان کرتے ہیں کہ عجیب وغریب ہوتے ہیں۔ ہر واقعہ پر ایک شہادت قرآن مجید سے پیش کر دینا ایک معمولی بات ہے۔ قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھنے سے عجیب وغریب معلومات حاصل ہوتی ہیں اور انسان مرتبہ اعلیٰ تدبر وفہم پر پہنچ سکتا ہے۔ غرض قرآن مجید میں اسلوب بیان اس قدر پاکیزہ ہے کہ دوسروں کو بتلا کر ہمیں سمجھایا جاتا ہے۔ پس آیت مذکورۃ العنوان میں یہود کو خطاب ہے اور تنبیہ ہمیں مقصود ہے۔ خوب فرمایا ہے:

بشنوید اے دوستاں ایں داستاں	خود حقیقت نقد حال ماست آں
نقد حال خویش را گر پے بریم	ہم ز دنیا ہم زعقبی بر خوریم

''دوستو اس داستان کو سنو جو ہماری موجودہ حالت کے موافق ہے اگر اپنی موجودہ حالت میں غور وفکر کرتے رہا کرو تو دونوں جہان کا ہم کو فکر حاصل ہو''

جب خدا تعالیٰ کو اس طرز سے ہماری بھلائی مقصود ہے تو ہم کو بھی چاہئے کہ جب ہم کوئی

آیت دیکھیں تو اس کو اپنے حال پر منطبق کر لیں اور اپنے وجدان کو ٹٹول کر دیکھیں کہ ہم میں تو یہ مرض نہیں پایا جاتا کیونکہ وجدان سے کام لینے سے معلوم ہو ہی جاتا ہے۔ ارشاد ہے بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ (بلکہ انسان اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا) پس اس مضمون خاص کے متعلق بھی ہر شخص جب غور کرے گا اور اپنے وجدان کو دیکھے گا تو موت سے اس میں وحشت و نفرت ہوگی اور سبب اس کا وہی اعمال سیئہ ہیں اور یہی وہ مرض ہے جو یہود کے لئے مذکور ہوا جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہود کے متعلق جو آیت ہے وہ آج ہمارے حال پر منطبق ہے۔

امراء وسلاطین میں نفرت موت:

خصوص امراء وسلاطین میں موت سے اس قدر نفرت پائی جاتی ہے کہ وہ موت کے ذکر کو بھی پسند نہیں کرتے۔ میں نے سنا ہے کہ دہلی کے قلعہ میں جنازہ نکلنے کے لئے ایک دروازہ خاص طور پر بنا دیا تھا اس لئے کہ کہیں اور دروازہ مردے کے نکلنے سے منحوس نہ ہو جائے اور اس دروازہ کا نام جس میں سے مردہ نکالا جاتا تھا مناسب تو یہ تھا کہ موت کا دروازہ رکھ دیتے لیکن اس خیال سے کہ موت کا نام لینا بھی ٹھیک نہیں ہے اس کا نام خضر دروازہ رکھا گیا تھا۔ بے چارے خضر کو بھی بدنام کیا۔ اگرچہ خضر کے حیات میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک وہ اس وقت بھی زندہ ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ مدتوں زندہ رہ کر وفات پا چکے ہیں مگر نام رکھنے والے نے اپنے نزدیک زندہ گمان کر کے دروازہ کا نام خضر دروازہ رکھا ہے۔ اسی طرح ایک مناظرہ کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ وہ دو فاضلوں میں جھگڑا اور مباحثہ رہا کرتا تھا۔ بادشاہ تیمور لنگ کے دربار میں ایک بار ایک فاضل نے دوسرے سے کوئی مسئلہ فرائض و تقسیم کا پوچھا؟ ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کو فرائض نہیں آتی تو یہ ہار جائیں گے۔ انہوں نے اپنی ذہانت سے فوراً ایک نکتہ تصنیف کر کے کہا کہ موت کا ذکر دربار میں کرتے ہو یہ ہرگز مناسب نہیں ہے۔ غرض اس وقت اس طرح اپنے عجز کو مستور کر لیا پھر مطالعہ کتب کا کر کے اس فن میں ایک کتاب لکھ کر ان کے پاس بھیج دی کہ جو کچھ دیکھنا ہو اس کتاب میں دیکھ لیا کرو۔ تمہیں اس سے ہر مسئلہ کا پتہ چل جائے گا۔

مستورات میں موت سے وحشت:

ہمارے قصبہ میں بھی ایک ایسا ہی قصہ مشہور ہے۔ ایک بڑھیا قصبہ میں رہتی تھی۔ بڑی سن رسیدہ لب گور تھی۔ کسی لڑکی نے اس بڑھیا سے کہا کہ مرتی بھی تو نہیں، اس نے بہت برا منایا اور اپنی ایک ہم عمر ساتھن سے کہا کہ فلانی نے مجھ کو اس طرح کہا کہ بڑھیا تو یوں ہو جا (یعنی مرجا) پھر

آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کہا کہ اللہ میاں سنیو مت۔ سبحان اللہ اگر اللہ میاں جبکہ واقعی سننے والے ہیں تو سن ہی چکے، اب نہ سننے کے کیا معنی اور اگر نعوذ باللہ سننے والے نہیں ہیں تو یہ دعا ہی کب سنیں گے۔ غرض موت سے اس بڑھیا کو بھی نفرت تھی جو بالکل لب گور تھی۔ اب بھی عورتیں ہیضہ اور طاعون کا نام نہیں لیتی اور کچھ اور نام رکھ لیتی ہیں مگر جب ان باتوں سے بھی موت پر دلالت ہونے لگی تو اب مناسب یہ ہے کہ موت کا نام ہمیشہ بدلتی رہو۔

مذکورہ بالا واقعات سے اس امر کا اچھی طرح سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ موت سے لوگوں کو کس قدر وحشت اور مقربین و مقدمین میں داخل سمجھتے ہیں حالانکہ اوپر کی آیت میں تصریح ہے کہ علامت ولایت و مقبولیت کی تمنا ہے موت کی۔ چنانچہ ارشاد ہوا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ الخ (اگر تمہارا خیال ہے کہ تم اولیاء اللہ میں سے ہو) جب یہ حالت ہے تو اپنے کو بزرگ کس طرح سے سمجھا جاتا ہے، پھر اس میں بھی نفاق کہ اپنے کو عالم و فاضل سمجھ کر گنہگار خاکسار لکھتے ہیں۔ غرض اس بات میں ہر شخص اپنے خیال وخبط میں مبتلا ہے۔ الا ماشاء اللہ پھر بعض لوگ ایسے ہیں کہ خود اپنی عقیدت لوگوں میں پیدا کرتے ہیں اور ان کی نظروں میں اپنے کو بزرگ بناتے ہیں اور جب وہ لوگ کچھ سمجھ کر تعظیم وادب کرتے ہیں اور بزرگ خیال کرتے ہیں تو انہیں خیال ہوتا ہے کہ ہم حقیقت میں بزرگ ہیں۔ تب تو لوگ ہم سے عقیدت رکھتے ہیں اور ہماری طرف رجوع کرتے ہیں، اس کی مثال بعینہٖ اشعب طماع کی سی ہے۔

حکایت اشعب طماع:

اشعب طماع عرب میں ایک شخص تھے، بچے اور بڑے انہیں سب ہی چھیڑا کرتے تھے۔ ایک روز وہ کہیں جارہے تھے۔ راہ میں لڑکوں نے انہیں چھیڑنا شروع کیا اور بہت ہی تنگ کیا۔ جب وہ بہت ہی مجبور ہوئے تو لڑکوں سے کہنے لگے کہ ارے مجھے کیا چھیڑتے ہو فلاں جگہ جاؤ کھانا بٹ رہا ہے۔ لڑکے یہ سن کر اس طرف چل دیئے اور اشعب کھڑے ہو کر سوچنے لگے کہ شاید وہاں کھانا بٹ ہی رہا ہو کیونکہ یہ سب لڑکے وہاں جارہے ہیں۔

آج کل کے بزرگوں کی بھی یہی حالت ہے کہ گردن جھکا کر بیٹھ گئے۔ بزرگوں کی سی باتیں کرنے لگے اور لوگوں میں عقیدت پیدا کر کے خود کو بزرگ خیال کرنے لگے۔ ان کو اپنے بزرگ ہونے کا استدلال بھی نظر آنے لگا کہ لوگ ہم کو کچھ سمجھتے ہیں حالانکہ اس قسم کی عقیدت اپنے ہی بیان کئے ہوئے فضائل سے پیدا ہوئی تھی اور یہ کبر اس درجہ بڑھا ہے کہ امراء کو تو اپنی امارت پر ناز تھا ہی، اس زمانہ میں دیکھا جاتا ہے

کہ غریبوں کو بھی اپنی غریبی پر ناز ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ برادری کے معاملات میں زیادہ خرابی انہی غریبوں سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی امیر کے ہاں کوئی تقریب ہوئی اور برادری کے غریب اینٹھ گئے۔ شامل ہی نہیں ہوتے اور کہتے ہیں میاں تم اپنی امیری میں مست ہو اور ہم اپنی غریبی میں مست ہیں۔

ہمارے ہاں ایک انسپکٹر صاحب تھے اور اس قدر نازک مزاج تھے کہ باوجود اس امر کے کہ مسجد ان کے دروازہ پر لگی ہوئی تھی لیکن گرمیوں کے موسم میں دھوپ کی وجہ سے نماز کو نہیں آیا کرتے تھے۔ ان کے ہاں کسی بچہ کی بسم اللہ کی تقریب تھی۔ برادری کے ایک غریب آنکھوں سے معذور جو انسپکٹر صاحب کے مکان سے بہت دور رہتے تھے روٹھ گئے اور تقریب میں شریک نہ ہوئے۔ ان غریب صاحب نے اتنا غرور اور غصہ کیا کہ انسپکٹر صاحب نے کبھی اپنے دوران انسپکٹری میں بھی نہ کیا ہوگا۔ کسی طرح منتے ہی نہ تھے جو انہیں منانے جاتا اس سے بھی ناخوش ہو جاتے جب ان کی یہاں تک نوبت پہنچی تو انسپکٹر صاحب سخت پریشان ہوئے اور عین دوپہر میں انسپکٹر صاحب دھوپ کی حالت میں ان کے مکان پر گئے اور ان کی خوشامد کر کے انہیں راضی کر لیا۔ میں بہت خوش ہوا کہ انسپکٹر صاحب کو آج دھوپ کی قدر معلوم ہوئی ہوگی۔

حق سبحانہ وتعالیٰ کی بے انتہا شفقت:

افسوس ہے کہ خداوند تعالیٰ تو ہم پر شفقت فرمائے اور گرمیوں کے موسم میں ہمارے لئے حکم دے کہ ابردوا بالظہر یعنی ظہر کی نماز ٹھنڈے وقت پڑھا کرو اور پھر اس کے حکم کی طرف نہ دوڑیں اور ایک معمولی بھائی ہم پر بے رحمی کرے اور ہم کو دھوپ میں دوڑائے اور اس کی خوشامد کرنے کے لئے چلیں اور پھر خدا تعالیٰ کی شفقت بھی کیسی کہ باوجودیکہ جب خداوند تعالیٰ نے ہمارے لئے احکام نازل فرمائے اور ہمارے واسطے ضوابط مقرر کئے ہم وہاں موجود نہ تھے لیکن خداوند تعالیٰ کی شفقت و رحمت ہمارے حال پر اس وقت بھی تھی جس نے ہمارے حال کے مناسب احکام مقرر کرائے۔

مانبو دیم و تقاضیا ما نہ بود . لطف تو گفتہ نامی شنود

(نہ ہم تھے نہ ہم نے تقاضا کیا تھا۔ تیرے لطف و کرم کے بارے میں نہ ہی کچھ کہا تھا)

ہماری راحت کے لئے ہمارے لئے آسانیاں رکھی گئیں اور مزید براں ان راحتوں میں فضیلت بھی رکھی گئی۔ ممکن تھا خداوند تعالیٰ ایسی آسانیاں رخصت کے طریق پر رکھتا ہے لیکن خداوند تعالیٰ نے شفقت مدنظر رکھ کر فضیلت رکھی۔ چنانچہ ابراد ظہر میں فضیلت آئی ہے۔ میں نے دل میں ان انسپکٹر صاحب کی حالت پر کہا کہ حضرت یہ وہ دھوپ ہے جس کی وجہ سے آپ نماز کو نہ آیا کرتے

تھے مگر ایک بھائی کے واسطے اسی میں نکل کھڑے ہوئے۔

افسوس بھائی کا روٹھنا گوارا نہ ہوسکا اور خدا تعالیٰ کی ناراضی کا سہار ہوگئی۔ مولانا روم نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

ای کہ صبرت نیست از فرزند و زن　　صبر چوں داری زرب ذوالمنن

(اے وہ شخص تجھے فرزند و زن سے صبر نہیں پھر احسان فرمانے والے رب کے لئے تو صبر رکھتا ہے)

بہر حال واقعات سے دیکھا گیا ہے کہ امراء کو امارت پر اور غرباء کو اپنی غریبی پر ناز ہوتا ہے۔ اسی طرح سے بعضے لوگوں کو گنہگاری کا بھی فخر ہے اور اپنے کو عاصی پر معاصی گنہگار وغیرہ کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ بھی کوئی بڑا کمال ہوا، کمال تو یہ ہے کہ عبادت کرے اور تقصیروار سمجھے اور خداوند تعالیٰ سے عفو تقصیر کی دعا کرے۔

من نہ گویم کہ طاعتم بہ پذیر　　قلم عفو برگنا ہم کش

(میں نہیں کہتا کہ میں نے نیکی کی، میرے گناہوں کو معاف فرمانا) عموماً اس قسم کے القاب وہ لوگ لگا لیتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ ہیں۔ یہ گویا اپنے کچھ ہونے کا اقرار ہوتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی کمال ہے کہ ڈاکو اپنے ڈاکو ہونے کا اعلان کرتا پھرے۔ ایسے شخص کو سزا دی جاتی ہے اور دی جانی چاہئے بھی، عدالت میں یہ عذر نہیں سنا جاتا کہ میں نے انکساری سے ایسا کیا تھا، البتہ اپنے مالک و حاکم کے سامنے اقرار اور توبہ اور عذر کرنا چاہئے۔ یعنی گناہ کا اعلان کوئی ناز کی بات نہیں ہے بلکہ نیکی کر کے اپنے کو تقصیروار سمجھنا اور اپنے گناہ کے عفو کے لئے توبہ کرنا یہ کمال خوبی کی بات ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: **وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ** (جو لوگ (اللہ کی راہ میں) دیتے ہیں اور ان کے دل اس سے خوف زدہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جانے والے ہیں) اس میں ایک قرأت تو یہ بھی ہے کہ **الذين يولون ما اتو** یعنی دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ڈرتے ہیں۔ دوسری قرأت میں ہے کہ **ياتون ما اتوا وقلوبهم وجلة** یعنی کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں مگر مقصود دونوں سے حاصل ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا کہ اس سے مقصود وہ لوگ ہیں جو زنا اور چوری کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو نماز روزہ کرتے ہیں اور پھر ڈرتے ہیں یعنی نیک کام کرتے ہیں اور پھر خدا سے ڈرتے ہیں اور یہ سوال دوسری قرأت پر تو ظاہر ہے اور غالباً حضرت عائشہؓ نے اس بنا پر پوچھا ہے اور اول قرأت پر سوال ہی کی ضرورت نہیں، خود اسی سے ظاہر ہے اور اگر سوال کو اس پر منطبق کرنا ہو تو یوں تون کی تفسیر میں "المال" نہ کہا جاوے گا

بلکہ ''الوجود'' کہیں گے اور ''ایتاء وجود'' بمعنی ایجاد وکسب ہوگا جس کا حاصل یوجدون اعمالنا اجدو ہوگا۔ اور محتمل ہوگا طاعات وذنوب دونوں کو اور سوال صحیح ہو جاوے گا۔

غرض اس میں کمال خشیت ہے یعنی کمال دین حاصل کر کے پھر خوف رہتا ہے۔ خوف کا لطف درحقیقت اس وقت ہی ہے جبکہ طاعت بھی ہو۔ طاعت کے خوف میں ایک نور رہتا ہے اور نافرمانی میں جو خوف ہوتا ہے اس میں وہ نور نہیں ہوتا اگر چہ یہ خوف بھی غنیمت ہے لیکن جس خوف میں خاص نور ہو اس کے لطف کے کیا کہنے ہیں۔ نافرمانی کے خوف میں ایک بات اور ہوتی ہے یعنی توحش جس کا بڑا سبب استحضار دوزخ ہوتا ہے۔ نافرمان جب اپنی نافرمانی کا تصور کرے گا اور دوزخ کا استحضار اس کے ذہن میں ہوگا تو اس کو توحش ہوگا اور وہ پریشان نظر آئے گا، لیکن طاعت کے خوف میں سکون اور عظمت باری کا غلبہ لذت ولطف اور نور پیدا کرتا ہے۔ بادشاہ کی درگاہ میں ایک مجرم کا خوف اپنے جرم سے ہوتا ہے اور پٹنے کا خیال اسے زیادہ خائف بنا دیتا ہے۔ اس خوف میں توحش اور پریشانی ہوتی ہے، لیکن وزراء ومصاحبین کا خوف بادشاہ سے صرف طاعت کا اثر ہوتا ہے۔ وزراء اور مصاحب ہر وقت اس خیال میں رہتے ہیں کہ کہیں بادشاہ کی رضا وطاعت میں کوئی فرق نہ آ جائے۔ یہی فرق خدا کے نافرمان بندوں اور اطاعت بردار انسانوں کے خوف میں ہے۔

طاعت کے ساتھ خوف کی ضرورت:

غرض اعمال کے ساتھ جو خوف ہوتا ہے اس میں لذت ہوتی ہے۔ اللہ اکبر! صحابہ کی یہ حالت تھی کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہما میں گفتگو ہوئی۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے بہت لوگوں کو مسلمان کیا اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی بہت نیک کام کئے اور سب پر اجر کے اُمیدوار ہیں۔ اعمال نیک میں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں تو اس پر راضی ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جو کام کئے اس پر اجر مل جاوے اور جو بعد میں کئے ہیں ان پر نہ اجر ملے نہ مواخذہ ہو۔

اس کا تجربہ کر لیجئے وہ لوگ جن کے نوکر ہیں یا بیوی بچے ہیں ان کو اچھی طرح سے اس کا تجربہ ہو جائے گا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نوکر یا بیوی بچوں نے کوئی کام آقا، خاوند، باپ کی خوشنودی اور رضا کے لئے کیا لیکن وہ پسند نہ آیا اور اس قدر غصہ آیا کہ کام نہ کرنے پر اس قدر غصہ نہ آتا۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ طاعت کے ساتھ بھی خوف ہونا چاہئے۔ رضا جوئی اور خوف ساتھ ساتھ ہیں۔ ایک مثال سے اس کی مزید توضیح ہوگی۔

طاعت اور رضا جوئی ساتھ ساتھ ہونے کی مثال:

ایک شخص نے طاعت و رضا کے قصد سے پنکھا کیا۔ پنکھے سے آقا کی ٹوپی اُڑگئی۔ آقا اس پر اور اُلٹا ناراض ہوگیا۔ جس کا سبب سوء ادب ہوا۔ پس جب بندوں کی طاعت و رضا میں یہ حال ہے تو کیا خداوند تعالیٰ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی فروگذاشت کے سبب ناراض ہو اور تمہارے کاموں کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھے، لیکن خداوند تعالیٰ کی شفقت کہ ہماری ایسی فروگزاشتوں اور کمزوریوں پر اس کی نظر نہیں ہوتی اور ہماری اس خدمت کو حسنات میں لکھ لیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ اُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ. (اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا) چنانچہ اس آیت کے متعلق حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اس آیت میں سیئات سے مراد وہ طاعات وعبادات ہیں جو پورے حکم کے موافق نہ ہوں اور یہ ضرور مشکل کام ہے کہ طاعات وعبادات پورے پورے حکم کے موافق ہوا کریں۔ کیونکہ ہم اول تو اس کا ارادہ واہتمام ہی نہیں کرتے اور یہ کھلا ہوا جرم ہم پر ہر وقت موجود ہے۔ دوسرے اہتمام کر بھی لیں تو بے پروائی ہو جاوے گی۔ اپنے روزہ اور نماز کو دیکھ لیجئے کہ ان کی کیا حالت ہے، اخلاص پایا نہیں جاتا۔ دوسرے آداب مہمل رہتے ہیں۔ غرض یہ اعمال جو ہماری نظر میں حسنات ہیں درحقیقت حسنات نہیں بلکہ ایک قسم کے مکروہات ہیں اور آیت مذکورہ بالا میں حسب ارشاد حاجی صاحب سیئات سے یہی مراد ہیں جنکی نسبت خداوند تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ ان کو حسنات میں لکھ لیں گے۔

ہمارے طاعات وافعال کی حالت:

غرض خداوند تعالیٰ کی پوری رضا کے موافق کام کرنا سخت مشکل ہے۔ موٹی بات ہے کہ جب ہمارا نوکر ہماری پوری رضا کے موافق کام نہیں کرسکتا تو ہم کس طرح سے دعویٰ کرسکتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے تمام احکام موافق ان کی مرضی کے بجالاتے ہیں اور بڑا افسوس تو یہ ہے کہ ہم اس کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ ہمارے اعمال موافق مرضی کے ہوں۔ کیا ہم اس پر قادر نہیں ہیں کہ نماز میں اپنے قلب کو خدا کی طرف متوجہ رکھیں اور دوسرے کا خیال قصداً پیدا نہ ہونے دیں۔ اگر ہم چاہیں اور کوشش کریں تو ایسا ضرور کرسکتے ہیں لیکن باوجود قادر ہونے کے بھی ہم نے کوشش بھی نہیں کی اور یہی وہ قصور ہے جو حسنات کو مکروہات بنا رہا ہے۔ مثلاً نماز ہی ہے کہ اس میں قصداً کوئی دوسرا خیال

نہیں لانا چاہئے اور اگر بلا قصد کوئی خیال آجائے تو خیر لیکن آپ کے پاس کوئی ایسی نماز ہے جس میں کوئی دوسرا خیال قصداً نہ لایا گیا ہو۔ میں کہتا ہوں کہ عمر بھر میں میری تو کوئی ایسی نماز نہ ہوگی۔

اطاعت کی حالت میں خوف کا ہونا محبت کا مقتضاء ہے:

پس جب ہمارے طاعت وافعال کی یہ حالت ہے تو ہم کو باوجود اعمال صالحہ کے بھی ڈرنا چاہئے۔ طاعت کر کے ڈرنا ان لوگوں کا طریقہ ہے جو خدا سے محبت رکھتے ہیں۔ اس کی مثال میں محمود وایاز کا واقعہ قابل ذکر ہے۔

ایک مرتبہ محمود نے اپنے خزانے سے ایک نہایت قیمتی گوہر منگا کر وزیراعظم کو دے کر حکم دیا کہ اس کو توڑ ڈالو۔ وزیراعظم نے عذر کیا کہ یہ ایک نہایت قیمتی موتی ہے، ہرگز مناسب نہیں کہ اس کو توڑ ڈالا جائے۔ محمود نے دوسرے وزیر کو دیا۔ اس نے بھی اس قسم کا عذر کیا۔ سب سے آخر میں محمود نے وہ موتی ایاز کو دے کر حکم دیا کہ اس کو توڑ ڈالو۔ ایاز نے فوراً توڑ ڈالا۔ محمود نے نہایت غضبناک ہو کر کہا تم نے ایسا قیمتی موتی کیونکر توڑ ڈالا۔ ایاز نے جواب میں کہا کہ خطا ہوئی۔ محمود کو یہ ادا پسند آئی اور کہا کہ وزراء نے موتی کے قیمتی ہونے کا خیال کیا اور میرے حکم واطاعت پر توجہ نہ کی اور ایاز نے باوجود اطاعت وفرمانبرداری کے اقرار قصور کیا۔ یہی ادا ہے جو مجھے ایاز کی بھاتی ہے۔

اس حکایت سے معلوم ہوا کہ اطاعت وفرمانبرداری کی حالت میں خوف کرنا محبت کا مقتضا ہے کہ خطا ہونے پر تو قصور کا اقرار کرے ہی مگر خطا نہ ہونے کی حالت میں بھی خوف کرے اور اقرار خطا کرے۔ لیکن جب ہم اپنے کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم باوجودیکہ ہر وقت خطاوار ہیں لیکن خطاوار ہونے پر بھی اقرارِ جرم نہیں کرتے۔ خدا کے لئے قلوب کو ٹٹول کر دیکھو کہ ہم کہاں تک افعال و اعمال میں خداوند تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کرتے ہیں۔ جب ہمیں اپنی حالت پر نظر ڈالنے کا موقع ملے گا تو معلوم ہوگا کہ ہم کیا ہیں اور واضح ہو جائے گا کہ کوئی قلب کسی وقت جرم سے خالی نہیں۔

ہماری طاعات کا حال:

ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ بارش ہوئی۔ ایک بزرگ صاحب فرمانے لگے۔ الحمدللہ! سبحان اللہ! آج کیسی موقع پر بارش ہوئی کہ کیا کبھی بے موقع بھی بارش ہوئی تھی جو آج کی بارش موقع کی بتلائی جاتی ہے۔ دیکھو ظاہر میں تو طاعات اور بارش پر شکر تھا مگر اس میں کیسی خوفناک بات نکل آئی۔ اسی طرح ہماری سب طاعات ایسے ہی شواہد سے پر ہوتی ہیں۔ پس اس

حالت میں ان طاعات پر اگر مواخذہ ہی نہ ہو غنیمت ہے چہ جائیکہ دعویٰ استحقاق اجر کا کیا جاوے۔

ایک تنخواہ دار ملازم ہے، مہینہ بھر سخت کام کرتا ہے، اطاعت کرتا ہے، آقا کی رضا جوئی میں رہتا ہے اس لئے کہ مہینہ پر کھرے روپے ملیں گے۔ مگر کھرے کا مستحق تب ہی ہوگا جب خدمت بھی سلیقہ سے کی ہو۔ اسی طرح ہم جو کچھ کرتے ہیں اسی اُمید پر کہ ہمیں آخرت میں کچھ ملے گا اس میں بھی مستحق ثواب اس وقت ہو سکتے ہیں جب ہمارے اعمال وافعال بھی اس قابل ہوں، لیکن ہمارے اعمال وافعال تو اس قابل ہی نہیں ہوتے کہ ان پر کوئی اجر دیا جا سکے۔ یہ خداوند تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ وہ ان کو حسنات میں لکھ دیتا ہے، ورنہ وہ حسنات میں شمار ہونے کے قابل نہیں ہوتے۔ چنانچہ اسی لئے عارفین باللہ سے ذرا ذرا سی بات پر پوچھ ہو جاتی ہے اور گوشمالی کر دی جاتی ہے، جیسا کہ اس حکایت میں معلوم ہوا کہ کسی بزرگ نے کہہ دیا تھا کہ آج بارش خوب موقع پر ہوئی، جس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ کبھی بے موقع بھی بارش ہوتی ہے اور جس سے اس قسم کا احتمال ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کے کام احیاناً غیر وقت پر اور غیر مفید بھی ہوتے ہیں، کیونکہ نفی مفید محتمل ہوتی ہے مطلق اثبات کی۔ بلکہ بعض اوقات مطلق نفی بھی موہوم ہوتی ہے احتمال وقوع کو اس کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی شخص بادشاہ کی تعریف کرے اور کہے کہ بادشاہ جولاہے نہیں، تیلی نہیں، چمار نہیں، دھنے نہیں وغیرہ، بھلا یہ بھی کوئی اوصاف کمال ہیں۔ ان سے تو یہ موہوم ہوتا ہے کہ خدانخواستہ بادشاہ میں کوئی اس قسم کا عیب محتمل تھا ورنہ اس نفی کی کیا ضرورت تھی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص کے ہاں شادی تھی۔ انہوں نے اپنے لڑکے کے لئے ایک ظریف سے دوشالہ لے کر اوڑھا دیا اور جب بارات دلہن کے مکان پر پہنچی تو لوگ وہاں آئے اور پوچھنے لگے کہ دولہا تم میں سے کون ہے۔ وہی ظریف فوراً بول اُٹھے کہ دولہا تو یہ ہے لیکن دوشالہ میرا ہے۔ دولہا والوں نے کہا یہ کیا حرکت ہے۔ اس میں بڑی بدنامی ہے۔ لوگ کہیں گے کہ دولہا کے لئے دوشالہ مانگ کر لائے ہیں۔ تم کو اس دعویٰ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ظریف نے کہا معاف کیجئے غلطی ہوئی، اب نہ کہوں گا۔ اور لوگ آئے، انہوں نے پوچھا کہ دولہا کون ہے؟ ظریف صاحب کہنے لگے کہ دولہا یہ ہیں اور دوشالہ میرا نہیں۔ لوگوں نے کہا کہ تم عجیب آدمی ہو۔ اس سے تو ضرور شبہ ہوتا ہے، تم کو اس کا ذکر ہی کرنا کیا ضرور ہے۔ تیسری مرتبہ پھر لوگوں نے دولہا پوچھا تو ظریف نے کہا دولہا تو یہ ہیں اور دوشالہ کا کچھ ذکر ہی نہیں۔ تو دیکھئے یہ نفی خود موہوم اثبات کو ہے۔ پس اس صورت میں اگر ایسے تنزیہ بھی مواخذہ ہو حق بجانب ہے۔ چنانچہ بعض اوقات عارفین باللہ سے ایسے معاملات وجزئیات پر پوچھ بھی ہو جاتی ہے۔

ہماری طاعات کی عجیب مثال:

مگر ہم پر خداوند تعالیٰ کی عنایت ورحمت ہے کہ ہماری کمزوریوں اور ناکارہ کاموں کو حسنات میں داخل کردیتے ہیں۔

این قبول ذکر تواز رحمت است　　چوں نماز مستحاضہ رخصت است

اسی طرح ہمارا ذکر کیا جس طرح مستحاضہ کی نماز اسی طرح ہماری تسبیح وتنزیہ ویسی ہے جیسی بادشاہ کی مدح کی مثال ذکر کی گئی ہے، جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

شاہ را گوید کسے جولاہہ نیست　　این نہ مدح ست اومگر آگاہ نیست

''اگر کوئی بادشاہ کے بارے میں کہے کہ وہ جولاہا نہیں ہے تو یہ اس کی تعریف نہیں مگر (وہ شخص بادشاہ کے مرتبہ سے) واقف نہیں ہے'' اسی لئے حضرت مولانا حکایتاً فرماتے ہیں

مابری از پاک و ناپاکی ہمہ　　وزگراں جانی و چالاکی ہمہ

من نہ کردم پاک از تسبیح شاں　　پاک ہم ایشاں شوند درفشاں

''جیسی پاکی تم بیان کرتے ہو ہم اس سے بھی پاک ہیں اور ہم طرح کی سستی اور تیزی سے بھی پاک ہیں اور ان کی تسبیح سے میں پاک نہیں ہوتا بلکہ وہ خود پاک ہوجاتے ہیں اور ۔ ۔ ۔ خوبیوں کا اظہار ہوتا ہے''

اب آپ نے اندازہ کرلیا کہ ہماری تسبیح، نماز اور روزہ کا کیا حال ہے کہ اس پر مواخذہ ہوتا تو بے جا نہ تھا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہمارا کوئی باورچی ہمارے لئے ایسے کھانا پکاوے جیسی کہ ہماری نماز ہے، یعنی نہ اس میں نمک ٹھیک ہو نہ مصالحہ وغیرہ درست ہو۔ کیا ہم اس پر خفا نہ ہوں گے، ضرور ہوں گے۔ اسی طرح ہماری نماز پر خداوند تعالیٰ کو حق حاصل ہے کہ وہ ناخوش ہو اور مسترد کردے۔ مگر نہیں، وہ ہم پر عنایت فرماتا ہے اور ہماری نماز کو حسنات میں لکھ دیتا ہے۔ اسی طرح ہمارے استغفار کی کیفیت ہے کہ ہمارا استغفار کرنا بھی محتاج استغفار ہے، یعنی ہم خدا سے جو استغفار کرتے ہیں وہ استغفار بھی استغفار کثیر کا محتاج ہے، جس کی وجہ میں کسی نے خوب کہا ہے ؎

سبحہ برکف توبہ برلب دل پراز ذوق گناہ　　معصیت راخندہ می آید براستغفار ما

''ہاتھوں میں تسبیح، لب پر توبہ اور دل گناہ کے ذوق سے معمور ایسے استغفار پر مصیبت بھی مسکراتی ہے''

اور چونکہ ہم سے اسی قسم کے بہت اُمور ناپسندیدہ سرزد ہوتے رہتے ہیں جن کے ناپسندیدہ ہونے کا ادراک بھی نہیں ہوتا، اسی لئے خداوند تعالیٰ نے ہم کو توبہ کی جو تعلیم دی ہے اس میں ایسے

صیغے بھی رکھے ہیں کہ جو ہمارے ایسے غیر معلوم گناہوں کے لئے بھی مفید ہیں۔ مثلاً استغفرک ما علمت منہا۔ یعنی جن گناہوں کا ہم کو علم نہیں ہے ان سے بھی ہم کو توبہ کی تعلیم فرمائی ہے۔

ہماری طاعات محض صورت ہیں:

بلکہ اگر ہماری طاعات پورے طور پر درست بھی ہوں تب بھی ہماری طاعات وعبادات کی مثال ایسی ہوگی کہ جیسے کمہار مٹی کے خوشنما کھلونے بنا کر ان پر رنگ چڑھتا اور ان کو ہو بہو اصلی پھلوں کی طرح بنا کر امراء کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ امراء ان کو دیکھتے ہیں اور انعام دیتے ہیں۔ اسی طرح ہماری یہ طاعات وعبادات ہوں گی کہ وہ ظاہر میں تو کچھ ہیں اور حقیقت میں کچھ بھی نہیں۔ لیکن خداوند تعالیٰ اوپر بھی انعام دیتا ہے۔ غرض ہماری یہ طاعات بھی صورت محضہ ہیں جن کو طاعات بھی نہ کہنا چاہئے۔

ہماری طاعات کی ظاہری صورت درست نہ ہونے کی حکایت:

مگر ہم پر افسوس ہے کہ طاعات کی صورت بھی درست نہیں کرتے۔ کم از کم ہم کو چاہئے کہ ہم اپنی طاعات وعبادات کی صورت تو درست کرلیں۔ معنوی اعتبار سے تو ہم کیا درستی کرتے۔ افسوس ہم کو شرم کرنا چاہئے کہ ہم اس مقدمہ میں اس بہروپئے سے بھی گئے گزرے ہیں جس کی حکایت عالمگیر کے ساتھ مشہور ہے کہ عالمگیر ایک مرتبہ دکن جارہے تھے۔ عالمگیر ایک بزرگ دوست بادشاہ تھے۔ علماء اور درویشوں سے بہت محبت رکھتے تھے۔ افسوس پہلے بادشاہ جو دنیا دار کہلاتے تھے ایسے ہوتے تھے اور اب اکثر مشائخ بھی ایسے نہیں ہوتے۔ عالمگیر درمیان راہ میں علماء اور فقراء سے ملتے جارہے تھے۔ ایک مقام پر ایک درویش ملا جو درحقیقت ایک بہروپیہ تھا۔ واقعہ اس کا یہ ہے کہ عالمگیر کی تخت نشینی کے وقت ایک بہروپیہ دربار میں حاضر ہوا کہ اپنا کمال دکھلا کر انعام حاصل کرے۔ لیکن بادشاہ نے فوراً پہچان لیا اور کہا کہ کمال دکھاؤ جب انعام کے مستحق ہو سکتے ہو اور کمال یہی ہے کہ ایسے میں آؤ جو پہچانے نہ جاؤ۔ چنانچہ اس نے بہت کوشش کی اور بہت مرتبہ مختلف طریقہ سے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، لیکن بادشاہ دانشمندی سے شناخت کر لیتے تھے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من اندازِ قدت را می شناسم

"جس رنگ کا چاہو لباس زیب تن کرلو میں تمہارے قد کے انداز کو پہچانتا ہوں"

غرض جب وہ بہروپیہ تنگ آ گیا تو اس موقع کو کہ عالمگیر دکن کو جارہے تھے غنیمت سمجھا۔ ایک مقام پر درویش بن کر بیٹھ گیا اور مشہور کر دیا کہ فلاں مقام پر ایک بڑا پہنچا ہوا درویش ہے۔ چنانچہ جس وقت عالمگیر وہاں پہنچے اور معلوم ہوا کہ اس مقام پر ایک بڑا درویش مقیم ہے اس سے

ملاقات کی خواہش پیدا ہوئی اور وزراء و مصاحبین سے کہا کہ بزرگ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکرعرض کرو کہ اگر وہ خود تشریف لاسکیں تو بلالاؤ ورنہ ہم خود ان کے پاس چلیں گے۔ بادشاہ کے حکم سے وزراء بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معمولی گفتگو سے تصوف کے مسائل غامضہ پر بحث شروع ہوئی۔ اس زمانہ کے لوگ ہر فن میں کامل و عالم ہوتے تھے۔ چنانچہ علمی مسائل کی بحث میں وزراء اس کے معتقد ہوگئے اور واپس آکر بادشاہ سے بیان کیا کہ درویش بڑا کامل و فاضل و عالم ہے۔ اس کو دربار میں بلانا بے ادبی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ آپ خود وہاں تشریف لے جائیں۔ بادشاہ نے فرمایا اچھا۔ واقعی حق الٰہی ایسی چیز ہے کہ سلاطین کو بھی اس کے سامنے سرنگوں ہونا زیبا ہے۔ پہلے بادشاہ نیک ہوتے تھے اور مناسب بات مان لیتے تھے۔

سر بادشاہان گردن فراز بدر گاہ او بر زمین نیاز

”بادشاہوں کی گردنیں بھی اولیاء اللہ کے آگے جھک جاتی ہیں“

چنانچہ بادشاہ درویش سے ملے اور اپنے وہ شبہات جو تصوف کے متعلق انہیں پیش آرہے تھے درویش کی خدمت میں پیش کئے۔ درویش نے نہایت تحقیق اور سنجیدگی سے جواب دیا اور بادشاہ بہت خوش ہوئے اور ایک توڑا اشرفی کا درویش کی خدمت میں پیش کیا۔ درویش بہت بگڑے اور ایک لات مار کر توڑے کو پھینک دیا اور کہا کہ تو ہمیں سگ دنیا بنانا چاہتا ہے۔ عالمگیر بہت متاثر ہوئے اور یہ سن کر واپس تشریف لے آئے اور وزراء سے کہا کہ حقیقت میں بڑے بزرگ ہیں، ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ دکن سے واپسی میں انہیں وطن لے جائیں گے۔ یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ دیکھا کہ وہ پیچھے سے آرہا ہے اور قریب آکر اس نے بادشاہ کو سلام کر کے دفلی بجادی۔ غور کیا تو وہ بہروپیا ہے۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے اور سو روپیہ انعام دیا۔ اس نے سلام کیا اور خوش ہوا۔ بادشاہ نے دریافت فرمایا کہ بھئی ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم نے تمہیں اشرفیوں کا انعام دیا اور تم نے اس کو قبول نہیں کیا، حالانکہ وہ ایک بڑی رقم تھی، اگر قبول کر لیتے تو اب ہم واپس تھوڑا ہی لیتے۔ اس کوتاہ فہمی کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ بہروپے (درویش) نے عرض کیا کہ حضور یہ ٹھیک ہے، مگر بات یہ ہے کہ نقل پوری نہ ہوتی، کیونکہ وہ نذرانہ قبول کر لینا وضع درویشی کے خلاف تھا اور اب میری حیثیت کے موافق انعام مل گیا، یہی کافی ہے۔

عالمگیر اس جواب سے بہت متاثر ہوئے۔ پس اے صاحبو! ہمیں اس نقل سے عبرت پکڑنی چاہئے اور معنوی خوبیاں پیدا نہ ہوسکیں تو ظاہری صورت ہی کی درستی کا اہتمام کرنا چاہئے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعاؤں کی برکات:

یہ خداوند تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ باوجود اس امر کے کہ ہماری طاعت کی سیرت اور صورت کچھ بھی درست نہیں لیکن ہم کو نوازا جاتا ہے اور یہ سب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعاؤں کی برکت ہے کہ ہماری معمولی نیکیاں باوجود اس کے کہ ان میں فروگزاشتیں ہیں مگر سب حسنات میں لکھی جاتی ہیں۔ راز اس میں یہ ہے کہ محبوں کے متعلقین بھی ایک درجہ میں محبوب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک واقعہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ کا دریافت ہوا کہ ایک درویش مولانا رحمۃ اللہ کی خدمت میں امتحان درویشی لینے بڑے تزک و احتشام سے آئے۔ بہت سے گھوڑے اور خادم اور بھنگی اور گھسیارے وغیرہ بھی ساتھ تھے۔ مولانا نے سب کی دعوت کی اور شاہ صاحب اور ان کے مخصوصین کی خدمت کے لئے تو مولانا نے اپنے خادم مقرر کئے اور خود شاہ صاحب کے نوکروں کی خدمت میں مصروف ہوئے۔ شاہ صاحب کے نوکروں اور بھنگیوں کو اپنے ہاتھ سے اسی شان کے برتنوں میں کھانا کھلایا جیسے برتنوں میں خود کھاتے تھے۔ درویش مولانا کا یہ انکسار اور خلق دیکھ کر مولانا کے کمال کے قائل ہوگئے۔

اسی طرح چونکہ ہم کو رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے نسبت ہے۔ ہماری اسی نسبت کا یہ طفیل ہے کہ خداوند تعالیٰ ہم پر شفقت ورحمت فرماتا ہے۔ ورنہ ہم کیا اور ہمارے اعمال کیا۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا　　بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

''آپ کے ساتھ میرا تعلق اور نسبت ہوجانا بھی کافی ہے''

ورنہ اگر حقیقت ہماری اعمال کی دیکھی جاوے تو اوپر معلوم ہوچکی ہے۔ پھر سمجھ لیجئے کہ ان طاعات کے بعد ہم کو ڈرنا چاہئے یا نہیں۔ نیز حقیقت یہ ہے کہ طاعت کر کے ڈرنا کمال کی بات ہے اور گناہ کر کے ڈرنا کوئی بڑی بات نہیں، کیونکہ گناہ سے تو خوف ہوا ہی کرتا ہے۔

شیطان کی رہزنی:

بعض ایسے احمق ہیں کہ وہ گناہ کر کے بھی نہیں ڈرتے بلکہ بزعم خود ناز رحمت پر اور گناہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک ایسے ہی احمق جاہل کی ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک شرابی تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ شراب سے توبہ کرلے۔ شرابی نے کہا کہ خدا کی بڑی رحمت ہے، وہ خود معاف فرمائے گا، توبہ کر کے بخشوایا تو کیا ہوا۔ لاؤ شراب۔ میں شراب پی کر مرتا ہوں تاکہ اس کی رحمت پر بھروسہ خوب معلوم ہوجائے اور یہ شیطان کی رہزنی تھی کہ ایسے ناپاک خیالات میں مبتلا کر کے برباد کیا۔ اس قسم کی حکایات کو آج کل کے صوفی خوب مزے لے کر بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خشک

لوگ تصوف کے ان رموز کو کیا جانیں۔ ان کی حقیقت وہی جان سکتے ہیں جو ان رموز سے واقف ہیں۔ ہاں بھئی خدا ہمیں ایسے رموز سے بچائے جو بالکل ڈبو دینے والے ہوں۔

اسی طرح آج کل لوگ گناہ پر دلیری کرتے ہیں اور خدا کی رحمت کو ذریعہ نجات سمجھ کر ہر قسم کے فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اللهم احفظنا من هذا البلاء العظيم۔ یہ تو ہماری طاعات وعبادات اور اعمال کا حال کہ اس میں ہر قسم کی کمزوریاں ملی ہوئی ہیں۔

اپنی بشری کمزوریوں کے باوجود خود کو بزرگ سمجھنے کی مثال:

لوگوں کو اپنی طاعات پر فخر ہے۔ خود اپنے ہی معتقد بنائے ہوئے لوگوں کے کہنے سے اپنے کو بزرگ خیال کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا حال بعینہٖ اشعب طماع کا سا ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، اسی طرح اور حکایت مشہور ہے کہ ایک شخص کا گھوڑا نہایت عیب دار تھا۔ اس نے دلالوں سے کہا کہ اس کو بیچ دو۔ دلال نے کہا کہ اچھا، اور خریداروں کو بلا کر ان سے گھوڑے کے اوصاف بیان کرنے لگا، یہ ایسا عمدہ گھوڑا ہے اور اس میں یہ یہ خوبیاں ہیں۔ مالک نے جب دلال کی زبان سے یہ خوبیاں سنیں تو کہنے لگا کہ بھئی! اگر یہ ایسا ہے تو ہمیں ہی دے دو۔ اس نے کہا بھلے مانس! خود اپنا دس برس کا تجربہ تو تو نے غلط سمجھا اور میری ایک فرضی مصلحت کی حکایت کو صحیح سمجھا۔ اس طرح ہم کو خود ہمارے اعمال، ہماری عادتیں جن کا ہم کو سالہا سال سے تجربہ ہے ہمیں متنبہ نہیں کرتیں لیکن خوش اعتقاد مریدوں کے گمانوں پر ناز کئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس سب کا معیار تو وہی ایک امر ہے جس کا بیان ہو رہا ہے۔ یعنی تمني موت و وحشت عن الموت۔ (موت کی تمنا اور موت سے وحشت) اگر یہ شخص مقبول ہے تو موت سے ہرگز وحشت نہ ہوگی اور جب وحشت ہے اور وحشت اعمال سیئہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ ہمارے اعمال ضرور ناپسندیدہ ہیں۔ اگر ہمارے اعمال صالحہ ہوتے تو ہمیں موت سے رغبت ہوتی۔ اس کی مثال اس طرح سے ہے کہ دو تحصیلوں میں دو شخص تحصیل دار ہیں۔ ایک کا عملہ حساب کتاب، کاغذات، رجسٹر وغیرہ سب ٹھیک ہیں اور اس کی توقع یہ ہے کہ حاکم میرے کام کو دیکھے اور میں ترقی حاصل کروں۔ دوسرا شخص سست ہے۔ اس کا عملہ بھی خراب، کاغذات رجسٹر وغیرہ بھی خراب۔ اس کی شکایات بھی کئی مرتبہ ہو چکی ہیں۔ دفعتاً ان دونوں تحصیل داروں کو خبر ملے کہ حاکم بالا یا کلکٹر صاحب کل تحصیل کا معائنہ کریں گے۔ پہلا ملازم جس کا سب کام ٹھیک اور عمدہ ہے، بہت خوش ہوگا اور کہے گا کہ جلد پیشی ہو تو اچھا۔ حسب قول شیرازیؒ ؎

خرم آں روز کہ ازیں منزل ویراں بردم	راحت جاں طلبم و زپے جاناں بردم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے	تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بردم

''وہ دن بہت اچھا ہوگا کہ اس ویرانہ مکان (دنیا) سے جاوں جان کو آرام مل جائے اور محبوب کے دیدار کے لئے چلا جاوں میں نے یہ نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش وخرم اور غزل پڑھتا ہوا چلا جاوے''

اور دوسرا ملازم ڈرے گا اور آرزو کرے گا کہ توقف ہو تو بہتر ہے۔ یہی حال ہمارا ہے۔ نیک آدمی ہر وقت اس امر کی خواہش کرے گا کہ جلد حضور خداوند ہو کہ لطف دیدار حاصل کروں اور بُرا آدمی گھبرائے گا اور چاہے گا کہ جو دن مل جائے غنیمت ہے۔ یہ سبب ہے فرق کا درمیان تمنائے موت اور اس کی عدم خواہش ہیں۔

الدنیا سجن المؤمن کی عجیب مثال:

ایک اور مثال حضرت فرماتے تھے کہ ایک طوطا پنجرے میں بند ہے اور باغ کے ایک درخت میں بندھا ہوا ہے۔ درخت پر دوسرے طوطے دوڑ رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں۔ یہ طوطا پنجرے میں بند ہے۔ چاہے گا کہ یہ قفس ٹوٹ جائے اور میں ان طوطوں میں مل جاؤں، اور ایک اور طوطا پنجرے میں بند ہے اور اس کے گرداگرد بلیوں کا ہجوم ہے۔ وہ اس قید ہی کو غنیمت سمجھے گا۔ اسی طرح انسان کا بدن گویا ایک قفس ہے۔ اس کے ٹوٹنے کی ہر شخص تمنا نہیں کرسکتا۔ جو لوگ نیک ہیں وہ البتہ یہ خواہش ظاہر کریں گے کہ جلد قفس عنصری ٹوٹ جائے اور روح نکل کر واصل بحق ہو۔ ایسے لوگ تمنائے موت کریں گے اور جو لوگ سیئات میں مبتلا ہیں وہ ہرگز ایسی تمنا نہیں کرسکتے۔ بلکہ موت سے گھبرائیں گے اور ڈریں گے۔ یہی مطلب ہے **الدنیا سجن المؤمن وجنة الکافر** (سنن الترمذی: ۲۳۲۴) (دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے) وہ طوطا جس کے گرد بلیوں کا ہجوم ہے، قفس کو جنت خیال کرتا ہے اور جو باغ میں لٹکا ہوا ہے وہ قفس کو جیل خانہ سمجھتا ہے اور وطن اصلی کو یاد کر کے اس کی آرزو کرتا ہے۔

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش　　　باز جوید روزگار وصل خویش

''ہر شخص کا قاعدہ ہے کہ جب اپنی اصل سے جدا ہوتا ہے تو اس زمانہ وصول کو ڈھونڈتا ہے''

نافرمان دنیا پرست کو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہاں سے جانے میں بیوی بچے چھوٹیں گے، دوست احباب سے علیحدگی ہوگی۔ یہ خیال موت سے متنفر بنادیتا ہے اور جو لوگ اعمال صالحہ رکھتے ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ اگر دنیا کی بیوی چھوٹی جائے گی تو کیا ہے، وہاں بہت سی بیویاں مل جائیں گی اور اس سے یہ نہ سمجھیں کہ متبعین کو اپنے اعمال پر توکل ہوتا ہے۔ یہ نہ سہی لیکن اطاعت و

عمل صالح میں بالذات یہ خاصیت ہے کہ اس سے شوقِ آخرت وحسن ظن پیدا ہوتا ہے۔

موت سے کراہت طبعی مذموم نہیں:

اس موقع پر ایک شبہ ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسلم شریف میں ایک حدیث ہے: من احب لقاء اللّٰہ احب اللّٰہ لقاء ہٗ من کرہ لقاء اللّٰہ کرہ اللّٰہ لقاء ہٗ. (الصحیح للبخاری: ۸:۱۳۳) یعنی جو شخص خدا کو محبوب رکھتا ہے خدا اس کی ملاقات کو دوست رکھتا ہے۔ اور جو اس کے ملنے کو ناگوار سمجھتا ہے خداوند تعالیٰ اس کے ملنے کو محبوب نہیں رکھتے اور اسی حدیث میں ہے: والموت قبل لقاء اللّٰہ. یعنی لقاء الٰہی بعد موت کے ہوتی ہے اور اسی حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حضورؐ سے کہا کہ کلنا یکرہ الموت. یعنی ہر شخص ہم میں سے موت سے نفرت رکھتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عائشہؓ! عین وقت موت کا ذکر ہے کہ اس وقت مؤمن کو بشارت ملتی ہے۔ اس لئے وہ لقاء موت کا متمنی ہوتا ہے اور عاصی اس کے خلاف کراہت کرتا ہے، یعنی یہ حجاب رحمت کے وقت کا ذکر نہیں، کیونکہ آیت میں قرب موت کی قید سے مطلق تمنا کو علامت قبول فرمایا ہے اور حدیث سے اس وقت کراہت کا عموم معلوم ہوتا ہے۔ پس آیت وحدیث میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت تعارض نہیں۔

کراہت کی دو قسمیں:

حقیقت یہ ہے کہ کراہت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک طبعی، دوسری عقلی۔ کراہت طبعی کی مثال یہ ہے کہ اس طور سے سمجھنی چاہئے کہ کسی شخص کے جسم میں ایک دنبل نکلا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ اس میں نشتر لگاؤ۔ اس نے کہا نہیں بھئی مجھ سے ایسی تکلیف گوارا نہ ہوگی۔ آخر اس نے ڈاکٹروں کی طرف رجوع کیا۔ ایک ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے کہا بغیر نشتر کے اچھا نہ ہوگا۔ یہ سن کر جی گھبرایا۔ دوسرے ڈاکٹر سے پوچھا، اس نے بھی یہی کہا۔ غرض چار ڈاکٹروں سے ملا اور چاروں نے یہی رائے ظاہر کی۔ سب کی رائے سن کر وہ رضامند ہوگئے اور کہا کہ اچھا ڈاکٹروں کو بلاؤ اور نشتر لگادو۔ لوگوں نے کہا کہ بھئی تم تو نشتر سے بہت ڈرتے تھے۔ اب کیا ہوگیا؟ کہا بھئی تھوڑی دیر کی تکلیف ہمیشہ کا آرام ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر نے نشتر لگایا۔ اس وقت اس کے منہ سے ایک آہ بھی نکلی لیکن قلب اندر سے شگفتہ ہے۔ اب ڈاکٹر فیس مانگتا ہے۔ لوگوں نے کہا بھئی ڈاکٹر نے نشتر لگایا، تکلیف دی اور تم اسے فیس دینا چاہتے ہو۔ کہاں ہاں بھئی! یہ تکلیف بھی راحت کا موجب ہے، سو روپیہ انعام کے اور دے دو۔

موت کے وقت کراہت طبعی نہ ہونا مقبولیت کی علامت ہے:

اس مثال میں کراہت طبعی اور رغبت عقلی جمع ہے۔ پس حضرت عائشہؓ کا قول کراہت طبعی پر محمول ہے کہ موت سے طبعاً ڈر معلوم ہوتا ہے اور عین مرنے کے وقت مؤمن کی یہ کراہت بھی زائل ہوجاتی ہے اور آیت میں رغبت عقلی کا اثبات ہے اور عاصی کو یہ رغبت عقلی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ بلکہ عقلاً بھی اس لئے کراہت ہوگی کہ جانتا ہے کہ مرنے سے یہاں کا سراسر خسارہ اور وہاں صرف عتاب، پھر ظاہر ہے کہ عقل ایسے امر کو ناگوار سمجھے ہی گی اور موت کے قرب کے وقت کراہت طبعی کا بھی جاتا رہنا یہ مقبولین کی حالت سے مشاہد ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں ایک نوعمر طالب علم تھے، مدرسہ میں پڑھا کرتے تھے، قصبہ میں طاعون ہوا اور سب لوگ بھاگنے لگے، بہت سے طالب علم بھی چلے گئے، وہ طالب علم جانے لگے اور اپنے آنے کی اطلاع گھر والوں کو بھی کردی اور گاڑی بھی کرایہ کرلی۔ ایسے وقت میں ظاہر ہے کہ وطن جانے کا ان کو کتنا اشتیاق ہوگا۔ یکا یک اس تیاری میں انہیں طاعونی بخار آیا۔ لوگوں نے انہیں سمجھایا اور تسکین دی کہ گھبرانا مت، آرام آجائے گا۔ طالب علم نے کہا کہ ایسا مت کہو۔ اب تو خدا تعالیٰ سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔

یہ طالب علم مجاہدہ وغیرہ سے خالی تھے، لیکن نیک تھے۔ موت کے وقت خدا سے ملاقی ہونے کا اس قدر شوق غالب ہوا کہ تسکین دینے والوں کی باتیں بری معلوم ہونے لگیں۔ آخر بے چارے کا انتقال ہوگیا اور ان کا اسباب مکان روانہ کرنے کی تجویز ہوئی۔ ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ وہ طالب علم اس سے یہ کہہ رہے ہیں کہ فلاں چیز اسباب میں رکھی بھول گیا تھا۔ فلاں طاق میں رکھی ہے اسے بھی اسباب میں باندھ دینا۔

مجھے ان کے جنازہ پر نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اللہ اکبر! جنازہ پر ایسی رونق تھی کہ بے ساختہ دل کھنچا جاتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ کاش اس جنازہ پر ہم ہوتے۔ یہ دل کشی ہوتی ہے موت کی تمنا کرنے والوں اور اعمال صالحہ رکھنے والوں میں۔ غرض موت کے وقت کراہت طبعی بھی جاتی رہتی ہے اور اس رغبت موت سے کسی کو یہ وسوسہ نہ ہو کہ کیا صلحاء کو خوف عذاب کا نہیں رہتا۔ اگر خوف نہ رہے تو ایمان نہ رہے اور اگر خوف رہے تو اس احتمال کے ہوتے ہوئے رغبت موت کی کیسے ہوسکتی ہے۔ گو وہ رغبت عقلی ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ عقل کا مقتضاء یہ ہے کہ احتمال ضعیف سے بھی تجنب کرے۔

احتمال کے دو درجے:

بات یہ ہے کہ خوف احتمال مکروہ اور توقع مکروہ کو کہتے ہیں اور احتمال کے دو درجے ہوتے

ہیں۔ ایک احتمال غالب دوسرا مغلوب۔ مثلاً ایک بیمار ہے بدپرہیز، بدعلاج، اس کے مرنے کا احتمال غالب ہوگا۔ گو احتمال صحت یہی ہوگا مگر مغلوب، اور دوسرا مریض ہے کہ پرہیز بھی کرتا ہے اور علاج بھی اس کے مرنے کا احتمال مغلوب اور صحت کا غالب۔ پس اسی طرح اعمالِ حسنہ کے ساتھ جو اہتمام ہوگا عذاب کا وہ مغلوب ہوگا۔ اور ایمان میں اتنا بھی احتمال کافی ہے اور اُمید نجات کی غالب ہوگی اس لئے وہ احتمال مغلوب عذاب کا واقع نہ ہوگا رغبت موت کا اور اعمال سیئہ کے ساتھ جو خیال عذاب کا ہوگا وہ غالب ہوگا۔ اس لئے اس سے توحش پیدا ہوگا۔ پس اب کوئی تعارض نہ رہا اور آیت وحدیث دونوں کا مفہوم ٹھیک ہوگیا۔ غرض اس اہتمام غالب کو جو اعمال سیئہ سے عذاب کی نسبت ہے مغلوب بنا اور پھر احتمال غالب کو مغلوب بنانا بجز اعمال کی درستی کے ناممکن ہے۔

حسن ظن کی مثال:

حدیث شریف میں آیا ہے کہ کوئی شخص مرنے نہ پاوے مگر خدا کے ساتھ نیک گمان رکھ کر محققین نے کہا ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ اعمال صالحہ کے ساتھ مرنا چاہئے۔ کیونکہ اعمالِ صالحہ کا خاصہ ہے کہ اس سے حسن ظن غالب رہتا ہے اور حسن ظن کا خاصہ ہے کہ اس میں شوق ہوتا ہے۔ اس حسن ظن کی مثال کھیتی کی سی ہے۔ ایک کاشتکار وہ ہے کہ جس نے کھیتی کا خوب کام کیا ہے۔ اس کی غالب اُمید یہ ہوگی کہ کھیتی اچھی پیدا ہوگی، اس کو اگر خوف بھی ہوگا تو محض احتمال عقلی۔ دوسرا وہ شخص ہے جس نے کچھ نہیں کیا اور اسے اُمید ہے کہ سب کچھ مل جاوے گا۔ شاید کسی وقت بلاقصد دانہ گر گیا ہو اور وہ جم آوے مگر یہ اُمید بالکل موہوم ہوگی اور غالب یہی اندیشہ ہوگا کہ کچھ نہ ملے۔

اعمالِ حسنہ کا خاصہ:

اسی طرح اعمالِ حسنہ کا خاصہ یہ ہے کہ خدا سے ملنے کی محبت ہوجاتی ہے۔ اور محبت عجیب چیز ہے۔ دنیا میں جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب محبت ہی کا ثمرہ ہے۔ کیا خوب کہا ہے کہ ؎

''از محبت تلخ ہا شیریں شود'' (محبت سے تلخیاں شیریں بن جاتی ہیں)

حتیٰ کہ اگر محبت میں احتمال کسی قدر کلفت کا بھی ہو مگر غلبہ محبت میں وہ اہتمام شوق کو کم نہیں کرتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ جب محبوب کے پاس جاؤ گے پہلے دو جوتیاں پڑیں گی، پھر محبوب اس پر عنایت کی نظر کرے گا۔ یہ گوارا ہوگا اور خوشی سے گوارا ہوگا۔ میرٹھ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک رئیس نے اپنے ملازم کو مارا اور پھر دو روپیہ دے دیئے۔ رئیس نے کہا کہ نوکر سے پوچھو کیا حال ہے؟ کہا کہ اگر روز اسی طرح پٹتے رہیں تو بہت اچھا ہے۔ دو روپیہ تو ملا کریں گے۔

غرض اگر ایسے احتمال میں کہ تکلیف کے بعد فضل و راحت ہوگی شوق غالب ہوگا۔ پس مومن کامل کو اگر چہ دوزخ میں جانے کا احتمال ہی ہو، لیکن وہ محبت کی حالت میں اس کو بھی گوارا کرلے گا اور یہاں کے آرام سے وہاں کی اس تکلیف کو زیادہ پسند کرے گا۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے کہ کسی شخص سے کہا جائے کہ تمہارے لئے دو باتیں تجویز کی گئی ہیں، جو چاہے منظور کرلو، ترتیب کا تمہیں اختیار ہے۔ ایک تو یہ کہ پہلے تمہیں ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں تین روز کے لئے بند کیا جائے گا اور جب تم اپنی مدت مقررہ تک وہاں بسر کرلوگے تو پھر تمہیں ہمیشہ کے لئے ایک باغ ملے گا جس میں عمدہ مکانات ہوں گے اور وہاں تمہاری نہایت شان و شوکت اور حشم و خدم کے ساتھ شادی کی جاوے گی۔ دوسری صورت یہ کہ پہلے تمہیں باغ دیا جائے گا اور مدت مقرر کے بعد تمہیں ہمیشہ کے لئے ایک کوٹھڑی میں بند کردیا جائے گا جہاں ہمیشہ کی تکلیف ہے۔

ان دونوں صورتوں میں ظاہر ہے کہ ہر شخص کو اول ہی صورت پسند ہوگی۔ غرض جس عیش میں زوال عیش کا خوف ہو وہ اس تکلیف سے بڑا ہوگا جس کے زوال کے بعد عیش ہو اور اس وقت کے بعد راحت حاصل ہو۔ اسی طرح مومن کو دوزخ میں اس اُمید سے چندے پڑا رہنا کہ آئندہ راحت نصیب ہوگی گوارا ہے۔ دنیا کی راحت کہ جس کے بعد بحالت کفر ابدی عذاب ہے ناگوار ہے، آرام پر ترجیح دے گا۔

رسالہ شوق وطن کے مطالعہ کی ترغیب:

ان مثالوں کے سن لینے سے تو اب کوئی شبہ نہیں رہا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آخرت دنیا سے ہر حال میں بہتر ہے۔ اب ذرا سا خیال ہوگا تو صرف یہ کہ دوزخ کی تکلیف یہاں کے آرام سے کیسے اچھی ہوسکتی ہے۔ میں نے اس بحث میں ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ''شوق وطن'' ہے۔ یہ رسالہ اس وقت لکھا گیا جبکہ ہمارے قصبہ میں طاعون کا بہت زور تھا اور لوگ پریشان تھے۔ اس رسالہ کے مطالعہ سے لوگوں کی حالت بدل گئی اور مرنے کی ترغیب پیدا ہوگئی۔ موت کو زندگی سے اچھا سمجھنے لگے۔ اس رسالہ کے میں نے دو کالم کرکے چھپوائے ہیں۔ ایک میں احادیث درج کی ہیں اور مقابل میں ان کا ترجمہ ہے۔

خلاصہ وعظ: غرض مرنا فی نفسہ کوئی خوف کی چیز نہیں۔ مگر یہ اس وقت حاصل ہوگا جب اعمال نیک ہوں گے۔ کیونکہ اعمال نیک ہونے کی خاصیت رغبت موت ہے اور اعمال سیئہ کا خاصہ نفرت و وحشت ہے۔ خود قرآن شریف اس اَمر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ موت سے عقلاً ڈرنا نامقبولیت کی دلیل ہے۔ اور موت کی رغبت مطلوب ہے۔ اور ہماری یہ حالت ہمارے اعمال سے پیدا ہوسکے گی۔ پس اعمالِ صالحہ میں کوشش کیجئے اور خدا تعالیٰ سے توفیق مانگئے۔

احکام و مسائل متعلق موت

وعظ بمقام چرتھاول ضلع مظفر نگر

موت کی حقیقت اس سے زیادہ ہے کہ چھ سو تلواریں ایک دم سے لگائی جائیں۔ ایک بال پکڑ کر دیکھو سارے جسم کو اس سے کیا نسبت ہے۔ جب بال کے اُکھڑنے سے ایسی تکلیف ہوتی ہے تو خیال میں آ سکتا ہے کہ تمام جسم سے روح نکلنے میں کیسی تکلیف ہوتی ہوگی اور کوئی عذاب بھی نہ ہو تو صرف یہی تکلیف دنیا کے عیش تلخ کرنے کو کافی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

چونکہ موت کے متعلق مسائل کے معلوم ہونے کی زیادہ ضرورت ہے، لہٰذا اس وقت بیان کئے جاتے ہیں۔ افسوس ایسی یقینی چیز جس کے آنے میں کسی کو کلام نہیں اس کو ایسا دل سے بھلا رکھا ہے، دیکھو اللہ تعالیٰ کے وجود میں ملحدین کو شبہ ہوا ہے۔ لیکن موت کے آنے میں کسی کو شک نہیں۔ موت وہ چیز ہے کہ عیش وآرام کو مکدر راحت وچین کو منغص کر دیتی ہے، بلکہ منکرین حساب کو بہ نسبت معتقدین کے زیادہ خوف ہونا چاہئے تھا، کیونکہ ان کے عقیدے کے بموجب ان کے تمام آرام چین موت کے ساتھ منقطع ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس کی نسبت ایسی غفلت ہوئی ہے کہ مؤمنین ومنکرین سب نے مل کر بھلا دیا ہے۔ موت کے یاد دلانے کے واسطے سب سے بڑا محرک مردہ کو دیکھنا اور تجہیز وتکفین میں حاضر ہونا ہے، لیکن افسوس آج کل مردہ کو دیکھ کر ہر شخص یہی خیال کرتا ہے کہ یہ دن اسی کے واسطے تھا نہ کہ میرے لئے۔ اگر یہ سمجھا جاتا کہ یہ حال ہمارا بھی ہونے والا ہے اور ہمارے واسطے بھی یہ دن آنے والا ہے تو واللہ ہرگز ایسی بے فکری کی باتیں ظہور میں نہ آتیں۔ میت کی تجہیز وتکفین کے واسطے آتے ہیں اور طرح طرح کی گفتگو ہوتی ہے، کبھی ترکہ کا ذکر ہے کہ منقولہ میں کیا چھوڑا اور جائیداد کیا ہے۔ خیر یہاں تک بھی غنیمت ہے کہ ذکر تو مردہ ہی کا ہے لیکن بعض تو اپنے مقدمہ معاملہ کا ذکر شروع کر دیتے ہیں۔ کل ہمارے فلاں مقدمہ کی تاریخ ہے، فلاں وکیل کے پاس جانے کی ضرورت ہے، کبھی مدت کے ملے ہوئے دوستوں سے مل کر اظہار خوشی ہو رہا ہے۔ آپ سے تو عرصہ میں ملاقات ہوئی۔ کیا کہوں فرصت نہیں ہوئی۔ گویا یہ بھی دوستوں کی ملاقات کا ایک ذریعہ ہے۔

تعزیت میں مستورات کا مصنوعی رونا:

عورتوں کی حالت کیا بیان کی جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ایسے مجمعوں میں بھی کیسی بے ہودگی اور بے تمیزی سے کام لیتی ہیں۔ تعزیت کے لئے جاتی ہیں اور وہاں اپنے مردہ رشتہ داروں کا ذکر کر کے روتی ہیں۔ لیکن یہ مصنوعی رونا بھی تھوڑی دیر کے بعد ختم ہوجاتا ہے اور پھر ادھر ادھر کی فضول باتیں شروع ہوجاتی ہیں۔ کسی کی غیبت ہو رہی ہے، کسی کے افعال پر اعتراض ہو رہا ہے، کسی کے نسب پر حرف گیری ہو رہی ہے۔ اور پھر بڑا غضب یہ ہے کہ ایک بیوہ کو سب کے ساتھ علیحدہ منہ ڈھکنا پڑتا ہے۔ بھلا کہاں تک خون کا پانی کرے۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ ایک تو یہ بے چاری خود ہی زندہ درگور ہوگئی

ہے۔ اس کی ذرا تو دل داری کرتے نہیں بلکہ ہر آنے والی بی بی کی اس امر میں کوشش ہوتی ہے کہ میرے ساتھ نالہ و بکا زیادہ جوش کے ساتھ ہو، تاکہ اظہار ہمدردی ہو۔ ایک بیوہ کو دیکھو اور اس کا دن میں صبح سے شام تک چالیس پچاس کے ساتھ رونا اور بیان کرنا ظاہراً کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ یہ بندی خدا کی کس طرح زندہ رہ جاتی ہے۔ بجز اس کے کہ اپنی زندگی کی وجہ سے بچ جاتی ہے اور پھر یہ زور شور تین روز اس درجہ کا رہتا ہے کہ العیاذ باللہ اور بعد تیجے کے بھی چالیسویں تک اگر چالیس پچاس کا نمبر روزانہ نہیں ہوتا تو دس پندرہ سے کم بھی نہیں۔ کیسی ہی تندرست عورت ہو لیکن بعد چالیسویں کے اگر کوئی دیکھے تو معلوم ہو کہ ناک پکڑے سے دم نکلتا ہے۔ علاوہ حرمت شرعی کے کیا یہ اُمور اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی اصلاح کے واسطے تمام ادنیٰ اور اعلیٰ پوری کوشش کریں۔ بھائیو! اگر ایمان کی پرواہ نہیں تو ذرہ جان ہی کا خیال کرلو۔ مرنے والا مر گیا، ان زندوں کے مال پر رحم کرو۔ میرے ایک دوست بیان کرتے تھے کہ میرے بھائی صاحب کے انتقال کے بعد چالیس روز میں والدہ کی ایسی کیفیت ہوئی تھی جیسے کوئی پرانا دق کا مریض ہو اور یہ صرف اسی کا نتیجہ تھا کہ برادری کی عورتوں کے ساتھ ہر روز بیس بیس مرتبہ طوعاً و کرہاً رونا پڑتا تھا۔ کھانا کھانے بیٹھے ہیں اور کوئی ڈولی آ گئی۔ بس کہاں کا کھانا، فوراً چٹائی بچھی، منہ ڈھک لیا، دوپہر کو مر کھپ کر ذرا کمر ٹیکی اور کوئی دوسرے مہربان آ پہنچیں۔ بس فوراً گریہ شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ رات میں ایک دو بجے اگر کوئی مہمان آتا ہے تو بجائے اس کے کہ سلام دعا ہو۔ بس دروازہ ہی سے رونے کی آواز سے اپنی آمد کی خبر دی جاتی ہے۔

نوحہ پر عذاب دنیوی و اُخروی:

غرض چالیس روز تک اس کے مقابلہ میں فرض و واجب کی بھی کیا حقیقت ہے۔ بعض عورتیں تو فی الحقیقت ایسی بدحواس ہو جاتی ہیں کہ نماز وغیرہ ان سے چھوٹ جاتی ہے اور جو عالی ہمت پڑھنے والی ہوتی ہیں ان کو نماز کی برکت سے کبھی دس پانچ منٹ کی راحت بھی مل جاتی ہے۔ کیونکہ اگر نماز پڑھنا شروع کر دی ہے تو کسی کے آنے پر نماز کے ختم تک کام شروع کرنے میں تأمل کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی دعا کی نوبت نہیں پہنچتی۔ بس سلام پھیرتے ہی منہ بسورنا شروع ہو جاتا ہے۔ غرض کہاں تک کوئی ان مکروہات کو بیان کرے۔ مفصل کیفیت ہر شخص بخوبی جانتا ہے۔ بتلاؤ تو جب علماء ان اُمور میں اصلاح کی شکایت کرتے ہیں ان کا کیا نفع ہے۔ تمہاری جان کو دنیا و آخرت کے عذاب سے بچاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے جو اُمور شرعاً ممنوع ہیں اور قابل وعید ہیں ان پر دنیا میں بھی کوئی کم یا زیادہ سزا ضرور ہے۔ نوحہ پر جو عذابِ اُخروی

ہونے والا ہے اگر اس سے قطع نظر کر کے دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ عذاب دنیوی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ لیکن شارع علیہ السلام نے جو طریقہ موت کی یاد کا ارشاد فرمایا ہے اس پر کچھ توجہ نہیں کی جاتی۔ بلکہ جہاں تک غور کیا جاتا ہے ساری خرابیاں موت کے بھلا دینے ہی کی وجہ سے ہو رہی ہیں۔ حقیقی بھائی ادنیٰ ادنیٰ چیزوں پر کیسے ایک دوسرے کے دشمن جانی ہو جاتے ہیں۔ کہیں پرنالوں پر سر پھوٹ رہے ہیں، کہیں آ بچک پر تلواریں کھنچ رہی ہیں۔ کیا ممکن کہ چار بزرگوں میں کوئی بات فیصل ہو جائے۔ ہزار ہا روپیہ برباد کیا جاتا ہے اور ہائی کورٹ تک نوبت پہنچتی ہے۔

موت کی یاد کی ضرورت:

اگر موت کا ذرا بھی خیال ہوتا تو ہرگز یہ حال نہ ہوتا۔ اگر کوئی فرشتہ ہمارا دُنیوی معاملات میں انہماک دیکھ کر آسمان پر جائے اور اس سے فرشتے دریافت کریں کہ دنیا والے کبھی موت کو بھی یاد کرتے ہیں تو وہ ضرور کہے کہ ان کے کسی برتاؤ و انداز سے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ابھی تک آپ کو مرنے والا سمجھتے ہیں۔ دیکھو اگر کسی شخص پر کوئی مقدمہ فوجداری کا قائم ہو جائے اور پیشی مقدمہ میں ایک مہینہ کی مہلت بھی ہو لیکن اس کا ہنسنا بولنا سب ناگوار ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس قسم کی باتیں کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میاں تم کو ہنسی سوجھتی ہے یہاں دل کو لگ رہی ہے۔ اس شخص کو تو ایک مہینہ کی مہلت بھی تھی۔ موت کی تو کچھ بھی مہلت نہیں۔ لیکن باوجود اس کے کسی برتاؤ سے اس کا خوف ظاہر نہیں ہوتا۔ زبانی یہ کہنا کہ ہم کو موت کا خوف ہے ہرگز قابل تصدیق نہیں، کیونکہ ایسا یقین وہ **الاعتقاد الجازم مع غلبة الحال** صاف معلوم ہوتا ہے کہ موت کے آنے کا یقین بہت ضعیف ہے اور ساری خرابیوں کی جڑ یہی ہے کہ لوگ موت سے بے خبر ہیں۔ اگر یہ یاد رہے تو سارے حوصلے بجھ جائیں۔ شہوت وغضب کا غلبہ نہ رہے۔ جب دُنیوی تکلیف کے اندیشہ سے کسی مقدمہ وغیرہ میں ہمارا اضطراب ایسا ہوتا ہے افسوس خیالِ موت نے کیوں ہمارا عیش و آرام تلخ نہ کر دیا۔ بالخصوص بوڑھوں کے لئے بچوں کو توقع ہے کہ ہم جوان ہوں گے، جوانوں کو یہ کہ ہم بوڑھے ہوں گے، لیکن افسوس یہ بوڑھے کس خیال میں ہیں۔ کیا آپ کو بچپن اور جوانی کی اُمید ہے۔ دُنیوی اُمور میں سب سے زیادہ چاق و چوبند یہ بوڑھے ہی ہوتے ہیں۔ انسان کی عمر بڑھتی جاتی ہے اس کے ساتھ حرصِ مال بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اس میں اولاد کی بہبودی کی بڑی فکر ہوتی ہے۔ یہ خواہش ہوتی ہے کہ جہاں سے ہو سمیٹ سمیٹ کر ان کے واسطے چھوڑ جائیے۔ اولاد کی فکر میں اپنی اوقات ضائع کرنا اور زندگی تلخ کرنا بڑے نادانی کی بات ہے۔ تمہارا آرام و تکلیف تو تمہارے اعمال پر موقوف ہے۔ اگر اولاد کے واسطے دین برباد کیا اور ان کے عیش کا سامان مہیا کیا تو ان کا عیش

تمہارے کس کام آئے گا۔ یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی کہ ایک پیسہ بھی تمہارے واسطے خرچ کریں۔

خرابیٔ نیت کی بناء پر ثواب نہیں پہنچتا:

اگر یہ خیال ہو کہ تمہارے واسطے تیجہ اور دسواں کیا جائے گا تو یاد رکھو کہ اس سے تم کو کچھ بھی نفع نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ اُمور برادری کے خوف سے کئے جاتے ہیں۔ اور جب خرابی نیت سے خود کوئی ثواب نہیں پاتے تو تم کو کیا بخشیں گے۔ اس پر تعجب نہیں ہوسکتا کہ کلمہ اور قرآن پڑھا جائے اور ثواب کچھ نہ ہو۔ دیکھو خود نماز جو لوگوں کو دکھلانے کو پڑھی جائے مقبول نہیں ہوتی، بلکہ دوزخ میں لے جانے والی جیسا کہ فرمایا ہے شیخ شیرازیؒ نے ؎

کلید در دوزخ است آں نماز　　　　که در چشم مردم گزاری دراز

(وہ نماز دوزخ کی کنجی ہے جو لوگوں کو دکھلانے کے لئے دراز کر کے پڑھی جائے) تیجے میں جو لوگ ہوتے ہیں وہ دو قسم سے خالی نہیں۔ یا تو برادری کے خوف سے حاضر ہوتے ہیں کہ اگر ہم نہ جائیں گے تو ہمارے یہاں کون آئے گا۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر کچھ بھی نہ پڑھے اور عذر بیان کر کے چلا جائے تو کچھ شکایت نہیں ہوتی اور اگر کوئی گھر بیٹھے سارا قرآن ختم کر کے مردہ کو بخش دے ہرگز شکایت رفع نہیں ہوتی۔ پھر ظاہر ہے جو لوگ اس برادری کی شکایت رفع کرنے کی نیت سے آئے ہیں ان کے پڑھنے پڑھانے کا کیا ثواب ہوسکتا ہے۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو پیسوں اور چنوں کے واسطے آتے ہیں۔ ان کی برائی یہی کافی ہے کہ ہمیشہ تمہارا مرنا مناتے ہیں۔ جب کوئی کھاتا پیتا بیمار ہوتا ہے یہ لوگ اس کی موت کا انتظار کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں، جب ان کی وسعت اور فراغت اسی پر منحصر ہے، یہ بھی صاف ظاہر ہے جو پیسوں اور چنوں کے واسطے آئے ہیں۔ ان کے کلمہ کلام کا کیا ثواب ہوگا۔ نہ دینے والوں کو نفع نہ لینے والے کو۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے کلمہ سے کیا خوش ہوں گے جو اس کے اسم مقدس کو ایک چنے کے عوض میں بیچتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا نام دونوں عالم کی قیمت میں بھی ارزاں ہے۔

قیمت ہر دو عالم گفتی　　　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(اپنی قیمت دونوں جہان کے برابر بتلائی۔ نرخ اونچا کرو کہ یہ ابھی بہت سستا ہے)

حدیث شریف میں مذکور ہے کہ قیامت میں ایک گنہگار کے ننانوے دفتر اعمال بد کے کھولے جائیں گے اور ہر دفتر اتنا بڑا ہوگا جہاں تک نظر پہنچے۔ میزان رکھی ہوگی اور پلہ برائیوں کا جھک جائے گا۔ وہ شخص نہایت مایوس ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اے شخص! ہم تجھ پر ظلم نہیں کریں گے۔ تیری ایک نیکی ہمارے پاس باقی ہے۔ وہ عرض کرے گا اے باری تعالیٰ! ان ننانوے دفتروں کے سامنے

ایک نیکی کیا کام دے گی؟ حکم ہوگا تو اس کو لے تو جا اور وزن کرا۔ وہ پرچہ لے کر میزان پر جائے گا اور وزن کرائے گا۔ فوراً پلہ نیکیوں کا وزنی ہو کر جھک جائے گا۔ اس پرچہ میں یہ کلمہ شہادت ہی لکھا ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت ہے کہ قیامت رکی ہوئی ہے۔ **لا تقوم القیامة حتیٰ یقال اللّٰه اللّٰه** (قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک اللہ اللہ کہا جائے گا) اور دنیا میں بھی اس قاعدہ کی پابندی ہے۔ جب رعایا باغی ہو جاتی ہے ان کے گھروں کو آگ لگا دی جاتی ہے اور عام سزا کا حکم دیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے صور پھونکا جائے گا۔ گویا اللہ کا نام تمام آسمان وزمین کی جان ہے۔ ایسے عزیز نام کو ایک ایک چنے کی عوض میں بیچنا کیسی حماقت اور گستاخی ہے۔ اگر کوئی قرآن مجید کو اوپلے کے عوض میں بیچنے لگے تو کیا یہ کسی مسلمان کو نا گوار نہ ہوگا۔ لیکن حقیقت میں یہ دونوں کام یکساں ہیں، کیونکہ روپیہ پیسہ اللہ تعالیٰ کے نام مبارک کے مقابلہ میں اوپلے سے بھی حقیر ہے ۔

اللہ اللہ میکنی از بہر نان ۔۔۔ بے طمع پیش او اللہ را بخواں
کہ گہے اللہ دروغے میزنی ۔۔۔ از برائے مسکہ دوغے میزنی
خلق را گیرم کہ بفریبی تمام ۔۔۔ درغلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا با خلق آری جملہ راست ۔۔۔ باخدا تزویر حیلہ کے رو راست
کاربار او است باید داشتن ۔۔۔ رایت اخلاص و صدق افراشتن

”روٹی کی خاطر اللہ اللہ کرتے ہو ایک مرتبہ اللہ کا نام بغیر طمع وحرص کے پڑھو تو کبھی جھوٹی آہ کھینچتا ہے گویا مکھن حاصل کرنے کیلئے چھاچھ ہوتا ہے اس نے فرض کیا تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے دیا مگر خدا کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے مخلوق کے ساتھ تیرے سب کام درست ہیں خداوند تعالیٰ کے ساتھ مکر وحیلہ کب جائز ہے حق تعالیٰ کے ساتھ سب کام درست رکھنا چاہئے اخلاص اور سچائی کا علم بلند رکھنا چاہئے“

اگر کوئی تمہارے سامنے پاخانے پھرے اور پھر بغیر وضو کیے ہوئے نماز شروع کر دے تو جیسے تم کو اس پر غصہ آئے گا اور منع کرو گے ایسے ہی علماء جب بے قاعدہ قرآن پڑھتے دیکھتے ہیں تو منع کرتے ہیں۔ اس پر قرآن شریف کی تعلیم کی اجرت کو قیاس نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ تو ضرورتاً اشاعت قرآن کے لئے جائز ہے اور یہاں ثواب مقصود ہے اور ثواب کی قیمت دونوں عالم بھی نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا تعلیم پر حق الخدمت کو تیجے کی قرآن خوانی پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

ختم تراویح میں حافظ کو چندہ دینا ناجائز ہے:

اسی طرح ختم تراویح کے دن جو حافظ کو چندہ اکٹھا کر کے دیا جاتا ہے وہ بھی ناجائز ہے جہاں مشروط یا

معروف ہو، کیونکہ روپیہ کی طمع سے قرآن پڑھنا ہے۔ایسے پڑھنے کا ثواب کیا ہوسکتا ہے۔ یہ غنیمت ہوا گر اس پر مواخذہ نہ ہو اور حافظ کو محض روپیہ کے واسطے پڑھنا ظاہر ہے، کیونکہ پندرہ رمضان کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کچھ نہ ملے گا تو حافظ صاحب ہرگز نہ پڑھیں گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کو بھی محنت کی عوض میں دیا جاتا ہے تو کسی چکی پیسنے والی کو بلا لیا ہوتا۔اس سے نصف بلکہ چوتھائی پر راضی ہو جاتی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ صاحب بغیر اس کے کوئی حافظ نہیں ملتا تو میں یہ کہوں گا کہ ایسے حافظوں سے قرآن مجید سننے سے یہ بہتر ہے کہ کوئی **الم تر کیف** سے تراویح پڑھا دیا کرے۔ یہ اول تو دین فروشی ہے اور دوسرے لوگوں پر دباؤ ڈال کر چندہ لیا جاتا ہے۔ چندہ کی فہرست مجمع میں پیش کی جاتی ہے۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی کچھ لکھنا ہی پڑھتا ہے، بعد کو غیرت دلائی جاتی ہے۔ میاں یہ تو تمہاری حیثیت کے خلاف ہے، کم سے کم دو چند تو کر دیجئے۔طوعاً و کرہاً جب چاروں طرف سے زور ڈالا جاتا ہے، بے چارے کو بڑھانا پڑتا ہے۔ یہ رقم قطعاً حرام ہوتی ہے، کیونکہ حلت عطایا میں طیب خاطر شرط ہے۔اول تو یہ موقع تھا کہ خوشی سے دیا جاتا تب بھی لینا جائز نہ ہوتا اور اس پر اور ایک امر موجب حرمت مزید ہو گیا۔ جب معلوم ہوا کہ ایسے کاموں سے میت کو ثواب نہیں ہوتا تو کس اُمید پر انسان اولاد کے واسطے اپنا ایمان خراب کرے، جبکہ مرنے کے بعد ان سے کچھ بھی نفع نہ پہنچے اور اس کے اعمال اس پر سوار ہو جاویں۔ ان کی قسمت میں اگر عیش ہے تو عیش ملے گا۔ اگر مصیبت ہے تو مصیبت پہنچے گی۔ غرض ان کی کیفیت کے بعد مرنے کے تم کو کچھ خبر نہ ہوگی۔ بعضے بڑھیوں کا مسئلہ ہے کہ اولاد اگر آرام سے ہوگی تو میری گور ٹھنڈی رہے گی۔ یہ خبر نہیں کہ ٹھنڈک وہاں کچھ کام نہیں آ سکتی۔ اولاد کا عیش و آرام قبر کے سانپ بچھوؤں اور آگ سے کچھ بھی ٹھنڈک نہیں پہنچا سکتا۔ اگر مفید ہے تو اپنا عمل ہے اور موت کا یاد رکھنا جیسا کہ فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے **اکثروا ذکرھا دم اللذات**. کیا اس سے یہ مراد ہے کہ صرف موت کا نام لے لیا کرے بلکہ اگر اول سے آخر تک ساری حالت پیش آمدنی میں بیس مرتبہ غور کر لیا کرے تو شہید کا ثواب پائے۔

موت کی تکلیف:

بعض علماء نے لکھا ہے کہ موت کی تکلیف اس سے زیادہ ہے کہ چھ سو تلواریں ایک دم سے لگائی جائیں۔ایک بال پکڑ کر دیکھو سارے جسم کو اس سے کیا نسبت ہے۔ جب بال اُکھڑنے سے ایسی تکلیف ہوتی ہے تو خیال آ سکتا ہے کہ تمام جسم سے روح نکلنے میں کیسی تکلیف ہوتی ہوگی اور کوئی عذاب بھی نہ ہو تو صرف یہی تکلیف دنیا کے عیش تلخ کرنے کو کافی ہے۔

حکایت حضرت ابراہیم ادھم:

حضرت ابراہیم ادھم کے ترک سلطنت کے بعد ایک وزیر آپ کے پاس حاضر ہوا، اور عرض

کیا کہ آپ نے لوگوں کا دل توڑ دیا، اگر سلطنت کے ساتھ درویشی کو جمع کیا جاتا تو کیا مضائقہ تھا۔ آپ نے فرمایا: بھائی فکر کے ساتھ کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ اگر تم مجھ کو ایک فکر سے چھڑا سکو تو میں سلطنت کا وعدہ کرتا ہوں۔ وزیر نے خیال کیا کہ کوئی دُنیوی فکر ہوگی، جس میں ہم لوگوں کی کوشش کارآمد ہوگی۔ بہت خوشی سے کہا حضرت فرمائیے کیا فکر ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے: "فریقٌ فی الجنة وفریقٌ فی السعیر" (ایک فریق جنت میں اور ایک فریق جہنم مین ہیں) مجھے اس امر کی فکر ہے کہ میں کس فریق میں ہوں گا۔ وزیر سن کر متحیر ہوگیا اور کچھ جواب نہ دے سکا۔ من جملہ معتقدات کے منکر نکیر کا قبر میں آنا اور مردہ سے سوال کرنا ہے۔ اگر جواب معقول نہیں ملتا تو نہایت سختی کرتے ہیں۔ سر کو مونگری سے کوٹتے ہیں۔ وہ ایسی مونگری ہے کہ اگر پہاڑ پر پڑے تو ریزہ ریزہ کردے۔ ایک اور فرشتہ اندھا اور بہرہ عذاب کے لئے مسلط ہوتا ہے اور قیامت تک عذاب ہوتا رہتا ہے۔ پھر اس کا خیال کرے کہ قیامت میں زمین مثل گرم تانبہ کے ہوگی۔ سب بے قرار ہوں گے۔ گرمی آفتاب سے بھیجے مثل ہانڈیوں کے پکتے ہوں گے۔ کسی کو قرار و چین نہ ہوگا۔ جب یہ واقعات پیش آنے والے ہیں تو کس خواب غفلت میں پڑے سو رہے ہو۔ کیا معافی کا پروانہ آگیا ہے۔ اگر اعمالِ صالحہ سے اُمید نجات ہے تو معاصی کی وجہ سے اہتمام مواخذہ بھی ہے۔ نہ معلوم اعمال داہنے ہاتھ میں آئے یا بائیں میں۔ ایک بزرگ نے کہا ہے کہ قیامت میں جس نے جو گناہ کیا ہوگا اس کی صورت نظر آئے گی۔ مثلاً بدکار بدکاری کرتا ہوا نظر آئے گا۔ چور چوری کرتا ہوا معلوم ہوگا۔ عقائد میں سے ایک یہ ہے کہ پل صراط پر گزر ہوگا۔ ابرار سلامتی سے گزر جائیں گے، کفار و فاسق کٹ کٹ کر گریں گے

چوں چنین کار اسب اندر رہ ترا — خواب چوں می آید اے ابلہ ترا

"اس راہ کے اندر تیرے کام ایسے ہیں تو اے بے وقوف تجھے نیند کیسے آسکتی ہے"

یہ مراد نہیں ہے کہ سو مت، بلکہ یہ کہ اس سے بے فکر نہ ہونا چاہئے۔

موت کو یاد کرنے کا طریق:

اس تفصیل سے جو موت کو یاد کرے گا اور بیس مرتبہ، اُس سے گناہ کیسے صادر ہوسکتے ہیں وہ تو ولی کامل ہوجائے گا۔ حکایت مشہور ہے کہ ایک بادشاہ کسی درویش سے ملا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب چلنے لگے تو فقیر نے ایک گولی منگا کر ان کو دی۔ بادشاہ نے درویش کا تبرک سمجھ کر اس کو کھا لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس قدر غلبہ شہوت ہوا کہ بے تاب ہو گئے۔ تمام بیبیوں اور لونڈیوں سے صحبت کی لیکن پھر بھی چین نہ آیا۔ دل میں خیال کیا کہ مجھ کو ایک گولی سے یہ حالت پیش آئی۔ شاہ صاحب دن میں کئی گولیاں کھاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بدکار ہوں گے۔ درویش کو کشف سے بادشاہ کا خطرہ معلوم ہو گیا۔ بعد کو جب بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو درویش نے کہا افسوس ہے کہ ایک چلہ میں شاید تمہارا انتقال ہو جائے۔ سنتے ہی سناٹا چھا گیا۔ فوراً تخت سلطنت چھوڑ چھاڑ کر گوشہ عزلت اختیار کر لیا۔ لڑکے کو ولی عہد بنایا۔ چلتے وقت درویش نے بہت سی گولیاں دے دی تھیں اور کہا تھا صبح شام ان میں سے ایک ایک کھا لیا کرنا، عبادت کی قوت رہے گی۔ چنانچہ یہ روز ان میں سے دو گولیاں استعمال کرتے رہے، لیکن خبر بھی نہ ہوئی۔ ایک دن کم ہوا اور دوسرا گزرا۔ یہاں تک کہ چالیسواں دن آ پہنچا۔ لیکن موت کے متعلق آثار نہ معلوم ہوئے۔ چالیس دن جب پورے گزر گئے تو بادشاہ درویش کے پاس پھر حاضر ہوئے اور مدت گزرنے اور موت کے نہ آنے کا حال بیان کیا۔ درویش نے کہا یہ تمہارے خطرہ کا جواب تھا کہ یہ فقیر بڑا بدکار ہوگا۔ تمہیں تو چالیس دن کی مہلت تھی، پھر بھی گولیوں سے تم پر کچھ اثر نہ ہوا، مجھ کو ایک ساعت کا بھی اطمینان نہیں۔

صفائی معاملات بھی ذکر موت میں داخل ہے:

موت کی یاد میں یہ بھی داخل ہے کہ معاملات کو صاف رکھے۔ اپنے ذمہ میں لوگوں کے جو حقوق ہوں ان کی اطلاع اپنے عزیزوں کو کرتا رہے، تا کہ اگر کسی کو رحم آ جائے تو اس کے بعد اس کو دَین سے بری کرا دے۔ صاحب قرض کی روح جنت میں نہیں جاتی، بلکہ جب تک قرض ادا نہ ہو معلق رہتی ہے۔ افسوس ہے کہ جن ماں باپ نے اس کے واسطے اپنے ایمان کو فدا کر دیا ان کی روح کو یہ معلق رکھتا ہے۔ درمختار میں ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک ایک دانگ کے عوض میں جو دو تین پیسہ کا ہوتا ہے، سات سو نمازیں دلائی جائیں گی۔ آج کل تو لوگ اس کو بھی لازمہ ریاست سمجھتے ہیں کہ کسی کا حق ٹال کر دیں۔ مطل الغنی ظلم اجارہ میں قبل شروع کرنے کام کے جانبین کی رضامندی شرط ہے۔ بعد کو اپنی تجویز سے دے دینا حرام ہے، بلکہ حکام کو بازار کے نرخ میں دست اندازی شرعاً جائز نہیں ہے۔ مالک کو اختیار ہے چاہے جس نرخ سے فروخت کرے، نرخ تو اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہے: "ان اللّٰہ ھو القابض الباسط" (بے شک اللہ تعالیٰ ہی روزی میں فراخی اور تنگی کرنے والے ہیں) حقوق العباد ایسی سخت چیز ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت میں سب لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ لوگو! جس کسی کا مجھ پر کوئی حق ہو وہ آج مجھ سے لے لے۔ میں چاہتا ہوں کہ قیامت میں مجھ پر

دار و گیر نہ ہو۔ اگر چہ ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے کسی کا حق مار لیا، لیکن حقیقت میں بہت ہی کم ظلم کا مال ہضم ہوتا ہے۔ کسی پر کوئی مقدمہ قائم ہو گیا۔ ہزاروں کے وارے نیارے ہو گئے، کسی کو کوئی بیماری ایسی لگ جاتی ہے کہ دوا و ڈاکٹروں کی فیس میں گھر بک جاتا ہے۔ کیا خوب کہا ہے

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن　　اجابت از در حق بہر استقبال می آید

(مظلوم کی بد دعا سے ڈرو، کیونکہ اللہ کی طرف سے قبولیت استقبال کو آتی ہے)

انچہ بر تو آید از ظلمات و غم　　آں زبیبا کی و گستاخی است ہم

(تجھ پر جو ظلمات وغم آئیں تو اس کا سبب گستاخی و بے باکی ہے)

بعض مسلمان سود میں مبتلاء ہیں۔ بہت کم ایسے ہوں گے جو سود دینے سے بچے ہوں گے۔ جائیداد کو رہن کرنے میں سود دیتے ہیں۔ بعض اوقات کسی نئی جائیداد پر مائل ہو کر مکان و جائیداد کو رہن کر دیتے ہیں اور برسوں سود دیتے رہتے ہیں۔ جب سود دینے کی برائی سنتے ہیں تو اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہیں، توبہ نہیں کرتے، ایسے لوگوں کے حال سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ تو موت کے خیال سے کوسوں بھاگتے ہوں گے۔ مگر موت کو قریب و یقینی سمجھتے تو کیوں اس طول امل و بلائے عظیم میں مبتلا ہوتے۔ ایسے لوگوں کا بجز اس کے کوئی علاج نہیں کہ اس جائیداد کو فوراً بیچ کر قرضہ سے اپنی جان کو آزاد کریں، ورنہ سود کا قصہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اگر کہیں اس سے روپیہ برسنے کی اُمید تھی تو خریداری ہی کو اتنے عرصہ تک ملتوی کرنا چاہئے تھا۔ جہاں تک تجربہ ہوا، معلوم ہوا کہ ایسے لوگ اکثر اپنی پہلی جائیداد کو بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ سود لینے والے کو ستر گناہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے ادنیٰ یہ ہے کہ اپنی ماں سے برا کام کیا اور باقی ۶۹ اِس سے زیادہ ہیں اور دینا اور لینا برابر ہے۔ لقولہ علیہ السلام وہم سواء اگر مہاجن آپس میں یہ تجویز کریں کہ کسی مسلمان کو ہرگز روپیہ نہ دیا جائے تو کارروائی کی ہزاروں تجویزیں سمجھ میں آجاویں لیکن دین کی تو فکر ہی نہیں۔ سوچے ہماری بلا اگر چھوڑنے کا ارادہ کیا جائے تو سو باتیں نکل آئیں لیکن بعضے ان میں سے خلاف وضع ہوں گی۔ پھر وضع ہی کو اختیار کر لو یا دین کو، دنیا میں کوئی کسی پر عاشق ہو جاتا ہے تو کیا کیا ذلت گوارا کرتا ہے۔ برسرِ بازار جوتیاں کھانا گوارا ہوتی ہیں لیکن دوست کی گلی نہیں چھوٹتی۔ اللہ تعالیٰ جوتیاں بھی نہیں لگاتے۔ محبت اور وضع داری جمع نہیں ہو سکتیں۔

اے دل آں بہ کہ خراب از گلگوں باشی　　بے زر گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہِ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں　　شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

"اے دل یہی بہتر ہے کہ محبوب حقیقی کی محبت وعشق میں مشغول رہ کر بغیر مال و دولت کے

حشمت و جذبہ میں قارون یعنی دنیا داروں سے بڑھے رہو۔ لیلیٰ یعنی محبوب کی منزل میں جان کو سینکڑوں خطرے ہیں پہلی شرط اس راہ کے لیے مجنوں بن جانا ہے''۔

صاحبزادہ کی شادی میں اگر کہیں قرض نہ ملے تو آخری تجویز یہی ہوتی ہے کہ زمین زیور بیچ کر کام کیا جاوے، اور یہ سب بلا ضرورت برادری کی خوشی کے واسطے کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے واسطے اگر یہ کام کیا جائے تو کیا بعید ہے۔ جب ظاہراً کوئی اُمید ادائیگی کی بالفعل نہیں ہے تو کس اُمید پر زیور و مکان رہن کرتے ہو۔ کوئی بزرگوں کے پاس آ کر کہتا ہے صاحب ایسا تعویذ یا وظیفہ بتلایئے کہ قرض ادا ہو جائے۔ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ کوئی کہے صاحب ایسا تعویذ دیجئے کہ بیٹا ہو جائے لیکن نکاح نہ کروں گا۔ تو پھر بیٹا کیا منہ سے جھڑے گا۔

موت کے وقت ضروری احکام:

چند اُمور ایسے عرض کرتا ہوں جن کا مرنے کے وقت خیال رکھنا چاہیے۔ ہماری حالت پر افسوس ہے کہ لوگوں کو مرنا بھی نہیں آتا۔ صحابہ سب لکھے پڑھے نہ تھے لیکن سمجھ دار تھے۔ یہ کیا مبارک شریعت ہے جس میں مرنے کے بھی قاعدے بتلائے گئے ہیں۔ جب کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کے واسطے جانا مسنون ہے۔ کوئی ایسی بات نہ کہے جس سے مریض کو کسی قسم کا یاس ہو، بلکہ اُمید کی بات کہے۔ اکثر عورتیں مریض کے پاس بیٹھ کر ایسی نا اُمیدی کے کلمات کہتی ہیں جس سے مریض کی دِل شکنی ہوتی ہے۔ خدا ہی کرے گا جو یہ بخار جائے گا۔ شارع علیہ السلام نے جانوروں پر بھی رحم فرمایا اور حکم دیا کہ ایک جانور کے سامنے دوسرا نہ ذبح کیا جائے تاکہ اس کی دِل شکنی نہ ہو۔ بھلا اتنا تو خیال کرنا چاہئے کہ اس کا دل نہ دُکھے۔ جب ایسی نا اُمیدی کے کلمے اس کے سامنے کہے جائیں گے تو مریض کو ضرور اپنی جان کا اندیشہ ہو جائے گا۔ بلکہ ایسے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جس سے اس کو معلوم ہو کہ اب مرض بہت ہی خفیف ہے اور میں جلد اچھا ہو جاؤں گا۔ مسلمان کی دِل داری بڑی عبادت ہے۔ ہر اُمر میں اس کا لحاظ چاہئے۔ اس کی نسبت ایک کام کی بات عرض کرتا ہوں جس سے یہ اُمر سہل ہو جائے۔ دیکھو ہر شخص جانتا ہے کہ اولیاء اللہ کی تعظیم ضروری ہے اور انہیں مسلمانوں میں اولیاء بھی ہیں۔ کسی کے ماتھے پر تو لکھا ہی نہیں، ہر شخص کی نسبت یہی گمان کرے کہ شاید یہ اللہ کا ولی ہو یا آئندہ ہو جائے۔ جب ایسا خیال کرے تو کیوں کسی کے دل کو دکھائے۔ **المسلم من سلم المسلمون من لسانہٖ ویدہٖ** (الصحیح للبخاری: ۱ : ۹) (مسلمان وہ ہے جس کے زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں) جب کسی مریض سے مایوسی ہو جائے اور خود اس

کی بھی توقع زیست نہ رہے تو آخری وقت میں ان باتوں کا خیال رہے۔ اس کے سامنے دنیا کی بات نہ کہی جائے۔ کوئی بات ایسی نہ کہی جائے جس سے اس کی توجہ الی الحق میں فرق آوے۔ جیسا کہ رواج ہے ایک طرف بی بی کھڑی کہہ رہی ہے مجھے کس پر چھوڑ چلے۔ کبھی بچوں کو اس کے سامنے لایا جاتا ہے۔ تھوڑا سا وقت جو کلمہ کلام میں صرف کرتا وہ پیار و محبت میں جاتا ہے۔ اس بات کی کوشش چاہئے کہ خاتمہ تو خیر پر ہو جائے، خود کسی بچہ وغیرہ کو سامنے مت لاؤ۔ اگر وہ دیکھنا چاہے تو فوراً دکھلا دو، تاکہ اس کے خیال سے بھی جلد نجات ہو۔ اس کے سامنے اللہ کا نام لو، کلمہ پڑھو، توبہ استغفار پکار پکار کر کرو لیکن اس سے مت کہو۔ اس مضمون کو اُردو میں بھی کہو کہ اے اللہ! میرے گناہ معاف فرما تاکہ وہ بھی سن کر کہنے لگے۔ قرآن مجید خاص کر یٰسین شریف قریب پڑھی جائے۔ آج کل اس سورت سے جاہلوں کو بڑی وحشت ہوتی ہے کہ بعضے بُرا مان جاتے ہیں اور نعوذ باللہ نامبارک سمجھتے ہیں۔

اس پر ایک قصہ یاد آیا، دہلی میں ایک ڈوم تراویح میں آتا تھا۔ حافظ صاحب سے کہہ رکھا تھا کہ جس دن وہ سورت آوے جو مردوں پر پڑھی جاتی ہے مجھے خبر کر دینا تاکہ میں اس روز نہ آؤں۔ لوگ اس کو مذاق سمجھے۔ ایک روز پوچھنے لگا حافظ صاحب! وہ سورت کب آجاوے گی؟ انہوں نے کہا وہ تو رات پڑھی گئی۔ سنتے ہی نہایت غمگین ہوا، اُٹھ کر چلا گیا۔ دوست آشناؤں سے ملا، یہاں تک کہ تیسرے روز مر گیا۔ یہ سورت اس وقت کے واسطے اس لئے مقرر فرمائی گئی ہے کہ اس میں بعث ونشر کا ذکر ہے۔ قیامت کے حالات ہیں اور آخر میں یہ مبارک الفاظ بھی **سبحان الذی بیدہٖ ملکوت کل شیٔ والیہ ترجعون** (اس کی ذات پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا پورا اختیار ہے اور تم سب کو اسی کے پاس لوٹنا ہے) نہایت مناسب ہیں تاکہ اس کے عقیدے تازے ہو جاویں۔

(۳) جنت کا ذکر کرے اور دوزخ کا ذکر مردہ کے سامنے نہ کیا جائے۔ اس میں ایک نکتہ ہے۔ ایمان کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں: خوف و اُمید۔ خوف اس غرض سے کہ گناہوں کو چھوڑے اور اعمال صالحہ کی طرف متوجہ رہے۔ مرتے وقت اعمال کا موقع نہیں، ڈرانے سے پھر کیا نتیجہ ہو سکتا ہے بجز اس کے کہ نا اُمید ہو کر بے ایمان مرے۔ سبحان اللہ! یہ شریعت کیسی معقول ہے۔ اگر غور کیا جائے تو سب حکمتیں سمجھ میں آجائیں۔

(۴) قریب مرنے کے منہ قبلہ کی طرف کر دیں۔ اگر مُردہ کے منہ سے کوئی کلمہ کفر کا نکلا ہو یا کلمہ سے انکار کیا ہو تب بھی غنیمت سمجھیں، کیونکہ وہ معاف ہے۔ جب بیماری میں معذور تھا تو اب تو بدرجہ اولیٰ ہونا چاہئے اور قلب کی ہم کو خبر نہیں ہے۔ حضرت مرشدی حاجی صاحب بیان

فرماتے تھے کہ لوہاری میں ایک بزرگ تھے۔ جب وہ مرنے لگے تو لوگوں نے کہا حضرت کلمہ پڑھیے۔ آپ نے منہ پھیرلیا۔ پھر کہا گیا، پھر آپ نے منہ پھیرلیا۔ لوگوں کو نہایت حیرت ہوئی، دل میں کہنے لگے اب کیا اُمید ہے کہ جب ایسا شخص کامل کافر ہو کر مرے۔ میاں جی نور محمد صاحب تشریف لائے۔ پوچھا خان صاحب کیسے ہو؟ کہنے لگے الحمد للہ! اور کہا حضرت ان لوگوں سے فرما دیجیے کہ مجھ کو دق نہ کریں۔ یہ مجھ کو مسمّی سے اسم کی طرف لاتے ہیں۔

دست بوسی چوں رسید از دست شاہ   پائے بوسی اندراں دم شرم گاہ

''بادشاہ اگر دست بوسی کے لیے کسی کو ہاتھ دے دے تو اس وقت پاؤں چومنا جرم ہے''

جب مشاہدہ ہو گیا پھر اسم کی کیا ضرورت ہے۔ ایسے مقام پر تو یہ تنزل ہے۔

ساری خرابیوں کی جڑ:

اگر موت میں سختی ہو اُس سے بدگمانی نہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ بعض روایات میں آیا جب کسی بندہ کا درجہ بڑھانا منظور ہوتا ہے اور اس کے گناہ بہت ہوتے ہیں سکرات کی تکالیف میں مبتلا کیا جاتا ہے جس سے اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے اور دنیا سے پاک و صاف ہو کر جاتا ہے۔ ساری خرابیاں جہالت کی ہیں۔ اگر علماء کی صحبت اختیار کریں تو ضروری باتیں سب معلوم ہو جاویں۔ لیکن لوگوں کو تو ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ ایسا نہ ہو مولوی صاحب کچھ کہہ بیٹھیں: میاں تمہاری صورت خلاف شرع ہے، پاجامہ خلافِ سنت ہے۔ برخلاف اس کے اگر کوئی طبیب کہہ دے کہ میاں تم پر سوداویت کا غلبہ معلوم ہوتا ہے، جلد اس کا علاج کرلو، ایسا نہ ہو کہ مرض بڑھ جائے۔ تو اس کو بڑی شفقت سمجھتے ہیں۔ افسوس ایمان کو بدن کے برابر بھی عزیز نہیں رکھتے۔ اگر ان لوگوں کو جسم کے برابر بھی ایمان کی محبت ہوتی تو مولویوں کی نصیحت پر برا نہ مانتے۔ اوپر کی مثال سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ مردہ پر تکالیف وغیرہ دیکھ کر بدگمانی نہ کریں۔ بعض اوقات اولیاء اللہ کو خود اپنا حال نہیں معلوم ہوتا کہ میں کس درجہ کا ہوں۔ اس میں بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات کسی نوکر کی خدمت تم کو پسند ہوتی ہے اور اس کو اپنے دل میں بہت محبوب و عزیز سمجھتے ہو۔ لیکن اس کے سامنے اپنی توجہ و محبت کا اظہار نہیں کرتے۔ ایسا نہ ہو کہ گستاخ ہو جائے اور کام میں بے پروائی کرنے لگے۔ یہی معاملہ بعض لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ ایک بزرگ نجم الدین صاحب تھے، ان کو اس کی نہایت تمنا و التجا تھی کہ کسی طرح یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک میرا کیا مقام ہے۔ ایک مرتبہ

ان کے ایک مریدان کی اجازت سے کسی دوسرے بزرگ کی زیارت کو گئے۔انہوں نے دریافت کیا کہو بھائی تمہارے یہودی پیر اچھے ہیں۔انہوں نے اس وقت بہت ضبط کیا، جب واپس آئے تو پیر نے پوچھا کہ وہاں گئے تھے؟ کہا حضرت گیا تو تھا مگر وہ تو بڑے ہی گستاخ و بے ہودہ معلوم ہوتے ہیں۔انہوں نے کہا کیا معاملہ ہوا؟ کہنے لگے حضرت! آپ کی شان میں ایسی گستاخی کی جس سے مجھ کو نہایت رنج ہوا۔پیر نے کہا کیا کہا؟ اصرار کے بعد بتایا حضرت! انہوں نے آپ کو اس طرح پوچھا تھا کہ تمہارے یہودی پیر اچھے ہیں۔پیر کو یہ سنتے ہی حالت وجد طاری ہوگئی۔یہ ایک رمز تھا دونوں بزرگوں کے درمیان۔انہوں نے یہ خبر کی تھی کہ تم کو نسبت موسوی حاصل ہے۔لیکن یہ نسبتیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ حاصل ہوئی ہیں۔آپ ہی کی ذات مبارک سے فیض آیا ہے۔بعض اوقات جن کی یہ نسبت ہوتی ہے موسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر مرتے ہیں۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

''جب خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا تو تطویل کلام سے کیا فائدہ سلامتی اس میں ہے کہ اس فضا میں سکوت کیا جائے''

ایک اس بات کا خیال چاہئے کہ بعد مرنے کے اس کی تعریف کریں۔حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک جنازہ گزرا۔لوگوں نے اس کی تعریف کی۔آپؐ نے فرمایا وجبت۔دوسرا ایک اور جنازہ گزرا تو لوگوں نے اس کی برائی کی۔آپؐ نے فرمایا وجبت۔صحابہ نے عرض کیا حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے آپ کی کیا مراد تھی۔آپؐ نے فرمایا جس کی تم نے تعریف کی اس کے واسطے جنت واجب ہوگئی اور جس کی تم نے برائی کی اس پر دوزخ واجب ہوگئی۔انتم شھداء اللہ فی الارض (تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو)

مکہ معظمہ میں اب بھی یہ دستور ہے کہ جب بازار میں سے کوئی جنازہ نکلتا ہے تو سب دکاندار کھڑے ہوجاتے ہیں اور کہتے ہیں بڑا اچھا آدمی تھا۔آخر معدن دین اور معدن الاسلام ہے۔یہاں لوگ کفار کی رسموں کی تقلید کرتے ہیں اور ہر اَمر میں ان سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ہندوؤں کی رسمیں ہندوؤں کے عقیدے اختیار کرتے ہیں۔چیچک میں گوشت سے پرہیز کرتے ہیں۔بعض جگہ شادی کی تاریخیں پنڈتوں سے پوچھی جاتی ہیں۔بعض جگہ لباس ہندوؤں کا استعمال کرتے ہیں۔بجائے لنگی کے دھوتیاں باندھتے ہیں۔برتن ہندوؤں کے برتتے ہیں، نام ہندوؤں کے سے رکھتے ہیں۔

تہذیب نصاریٰ کو اپنانے پر اظہارِ افسوس:

جو زیادہ تہذیب وتعلیم کے مدعی ہیں۔وہ اپنی شان کے مناسب نصاریٰ کی وضع اختیار

کرتے ہیں۔کھانے میں چھری کانٹے استعمال کئے جاتے ہیں۔گویا اپنے انجام کی خبر دیتے ہیں کہ ہم چھریوں اور کانٹوں کے عذاب کے مستحق ہیں۔لباس میں کوٹ پتلون کو پسند کرتے ہیں۔ایسے ایک شخص ایک مرتبہ میرے پاس تشریف لائے تھے،کوئی کرسی وغیرہ نہ تھی۔ بہت دیر تک کھڑے رہے،جب زیادہ دیر ہوئی اور بیٹھنے پر اصرار ہوا تو ایک دفعہ اپنے بدن کو تول کر بھد سے گر گئے۔ چونکہ اجسام ثقیل کا میلان مرکز کی طرف ہوتا ہے اس وجہ سے گرنا تو سہل ہوا لیکن اُٹھنے میں بے چارے پر مصیبت ہوگئی۔انگریز جن کا لباس ہے ان کو اس کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی ہے۔مزاج ان کے گرم ہیں،اس وجہ سے جنگلوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔حفاظت کے لئے کتے رکھتے ہیں۔ بھلا ہم لوگوں کو کتوں کی کیا ضرورت ہے،بجز اس کے کہ ایک شان سمجھی جائے اور حاکم وقت کی تقلید ہے۔

کتا پالنے والے کی حکایت:

ایک شخص ریل میں کتا لئے ہوئے بیٹھے تھے اور ظاہراً وضع بھی ایسی نہ تھی جس سے مسلمان سمجھے جاتے۔ایک دوسرے صاحب گئے تو آپ نے شکایت کی کہ آپ نے سنت سلام سے کیوں پرہیز کیا۔انہوں نے یہ عذر کیا کہ حضرت میں نے مسلمان نہیں سمجھا تھا۔ کہنے لگے کیا اسلام صرف وضع سے معلوم ہوتا ہے اور کہنے لگے میں نے سنا ہے حدیث شریف میں مذکور ہے کہ جہاں کتا ہوتا ہے وہاں فرشتے نہیں آتے۔پس یہ خیال کر کے جب تک کتا میرے پاس رہے گا موت کا فرشتہ نہیں آئے گا۔میں نے کتا رکھنا اختیار کیا ہے۔انہوں نے کہا جناب کتے بھی تو مرتے ہیں جو فرشتہ کتے کی جان نکالے گا وہی آپ کے واسطے بھی کافی ہوگا،کتے کی موت مروگے۔

ایک کفن چور کی حکایت:

ایک بزرگ کے زمانے میں کوئی کفن چور مشہور تھا اور وہ ان کا عقیدت مند بھی تھا۔ایک روز ان بزرگ نے چور سے کہا کہ تم ہمارا کفن بھی کیوں چھوڑو گے۔ کہنے لگا حضرت آپ کیا فرماتے ہیں آپ کے ساتھ ایسی گستاخی کر کے کہاں رہوں گا۔درویش نے کہا تمہارا کچھ اعتبار نہیں،مجھ کو اطمینان نہیں ہوسکتا۔چور نے کہا آخر آپ کو کس طرح اطمینان ہوگا،مجھ سے پانچ روپے لے لو۔اس نے کہا آپ کے اطمینان کے لئے یہی صحیح۔ایک روز درویش صاحب کا انتقال ہوگیا اور کفن چور حسب عادت کفن کی فکر میں گئے۔جیسے ہی اندر ہاتھ بڑھایا اُنہوں نے ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کیوں صاحب یہی ٹھہری تھی۔

اولیاء اللہ سے شاذ و نادر ایسی باتیں وقوع میں آئی ہیں۔عقیدے نہ خراب کرنے چاہئیں۔

ہاتھ پکڑتے ہی کفن چور فوراً ڈر کر مر گیا۔ بزرگ اپنے ایک خلیفہ کو خواب میں نظر آئے اور یہ سب قصہ بیان کیا کہ وہ بدعہد آیا تھا۔ دیکھو ہم سے روپیہ بھی لے چکا تھا لیکن پھر بھی اپنی حرکت سے باز نہ آیا۔ ہم نے تو ہنسی سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا، لیکن وہ ایسا بزدل تھا کہ مر ہی گیا۔ ہمیں تو محض اسے مطلع کرنا تھا، کفن کا کچھ ایسا خیال نہ تھا۔

عریاں ہی دفن کرنا تھا زیر زمیں مجھے　　　ایک دوستوں نے اور لگا دی کفن کی شاخ

خلیفہ کو حکم دیا کہ تم اس کی تجہیز و تکفین کرو اور میرے پاس دفن کرنا۔ مجھے ہاتھ پکڑنے کی لاج ہے۔ میں اس کے واسطے بخشش طلب کروں گا۔ بزرگوں سے تعلق رکھنے کا یہ نفع ہے۔

کفن دفن میں تاخیر مناسب نہیں:

ایک ضروری اَمر یہ ہے کہ کفن دفن میں دیر نہ کی جائے۔ اس میں گوشت و پوست بگڑ جانے کا احتمال ہے۔ بد بو سے آب و ہوا کے خراب ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ شریعت نے ان اُمور پر کیسی توجہ فرمائی ہے۔ کیسی پردہ داری ہے۔ اگر اولاد ماں باپ کو ایسی ردی حالت میں اپنی آنکھوں سے دیکھے گی تو اس کو کیسا صدمہ ہوگا یا نفرت ہو جائے گی۔ بعض اوقات ایسا مادہ ہوتا جس کے اثر سے خراب بد بو آ جاتی ہے۔ بعض لاش کو دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ اس خیال سے کہ ماں باپ کے پاس دفن کریں گے، کیا وہاں بھی ماں کا دودھ پیے گا۔ اگر منع کیا جائے تو سختی سمجھتے ہیں، حالانکہ حدیث شریف میں ہے مؤمن کے واسطے گھر سے اس کی قبر تک فرشتے دعاء و استغفار کرتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ جس قدر زیادہ فاصلہ ہوگا اس کی رحمت کا سامان ہے یہ بڑی نادانی ہے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مصلحتوں میں دخل دینا۔ اگر کوئی باورچی کھانا پکاتا ہے تو کوئی اس کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ اگر انجینئر کسی اچھے خاصے مکان کے گرانے کا حکم دے تو فوراً اگر لاکھ روپیہ کا بھی مکان ہو تو گرا دیا جاتا ہے۔

نہ معلوم اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاموں میں دخل دینے کی کیوں جرأت کی جاتی ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ انسان کی خلقت خاک ہے اور زمین اس کی اصل ہے۔ اس لئے جہاں تک جلد ممکن ہو سکے اصل میں پہنچا دو۔ کیا بری رسم ہے کہ مردوں کو عورتوں کے اختیار میں چھوڑ دیتے ہیں۔ عورتوں کو ان اُمور میں ہرگز دخل نہ دینے دو۔ ان کو رونے جھیکنے دو۔ عاقل مردوں کو جمع کرو۔ بعد مرنے کے فوراً اہتمام تجہیز و تکفین شروع کر دو۔ جب لے کر چلو تو جلدی چلو۔ حدیث شریف میں ہے مردوں کو جلد قبر کی طرف لے چلو۔ اگر نیک ہے تو اس کی راحت کی

طرف جلد لے جاؤ، اگر بد ہے تو جلد اپنی گردنوں کو اس سے چھڑاؤ۔ اگر اچھا ہے تو انعام و اکرام کی طرف لے جاتے ہیں۔ جیسے پیاسے کو پانی کے پاس۔ دار الظلمت جس کو سمجھے ہوئے ہو وہ مومن کے لئے بڑی نورانی ہے۔ ایک روز بادشاہ اکبر کی رات میں آنکھ کھل گئی، چراغ گل ہوگیا تھا۔ بہت گھبرائے، قبر یاد آئی۔ فوراً چراغ روشن کرایا، بیربل کو بلایا اور کہا کہ اس اندھیرے کو دیکھ کر مجھے قبر کی تاریکی یاد آئی جس سے نہایت وحشت ہے۔ خدا نے دشمن کے منہ سے سچی بات نکلوادی۔ اس نے کہا حضور! مسلمانوں کی قبر میں اندھیرا ہی نہیں۔ آپ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ۲۳ سال کی روشنی جیسے آب و تاب کے ساتھ اب تک قائم ہے اسی طرح جب سے آپ زیر زمین تشریف لے گئے ہیں وہی روشنی زیر زمین موجود ہے، جس سے مسلمانوں کی قبریں روشن اور نورانی ہوجاتی ہیں۔ اگرچہ یہ بات اس نے خوشامد میں کہی، لیکن سچی کی۔ فی الحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک ایسی ہے جس سے قبر میں روشنی ہوتی ہے۔ مُردے سے حب فرشتے پوچھتے ہیں: "من ھذا الرجل" مؤمن جواب میں کہتا ہے یہ ہمارے نبی علیہ السلام ہیں۔ نورِ ایمان سے اس جواب کی توفیق ہوتی ہے۔ یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک سے اس کی قبر تک پردے اُٹھ جاتے ہیں اور یہ صورت مبارک کو دیکھ لیتا ہے۔ اس طرح زیارت کی اُمید پر مسلمانوں کی موت کی تمنا بھی جائز ہے۔ کسی نے شوق میں کیا خوب کہا ہے

کششے کہ عشق دارد نہ گزاردت بدیساں — بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

"عشق کی کشش تجھ کو اس طرح نہ چھوڑے گی جنازہ پر اگر نہ آئے تو مزار پر ضرور آئے گا"

موت کی خبر دور دراز دینا مناسب نہیں:

ایک خراب رسم موت کے متعلق یہ ہے کہ موت کی خبر دور دراز تک دی جاتی ہے۔ باہر سے لوگوں کی آمد شروع ہوجاتی ہے۔ گھر والے کو مہمان داری کی فکر میں ایک دوسری مصیبت پیش آتی ہے۔ آٹے پسوائے جاتے ہیں، دانے دلوائے جاتے ہیں، شادی کی طرح جنس کا اہتمام کیا جاتا ہے اور مہمانوں کی آسائش کی فکر کی جاتی ہے۔ اس سے سمجھ دار شخص خیال کرسکتا ہے کہ اس طرح لوگوں کے آنے سے اس مصیبت زدہ کا غم غلط ہوتا ہے یا اور بلا کا سامنا ہے، یتیم و بیوہ کا مال اس طرح برباد ہوتا ہے۔ اس کی اصلاح یوں ہوسکتی ہے کہ عزیز و اقارب کو موت کی اطلاع دی جائے اور ساتھ ہی اس میں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ تم ہرگز یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ہم نے مولویوں سے

ممانعت سنی ہے۔ جانے والا تو رسم ادا کرنے کو جاتا ہے ورنہ بعد مر جانے کے اس کے ہاں جانے کی اب کیا حاجت ہے۔ اس کو سن کر خوش ہو جائے گا کہ ایک دردسری گئی۔ اگر بالفرض ناراض بھی ہوگا تو مضائقہ نہیں۔ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا رضامند کرنا مقدم ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ مخلوق بھی خوش رہے اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری تعمیل ہو جائے۔ اگر اللہ سے کچھ تعلق ہے تو کوئی دِقت و دشواری نہیں۔ دنیا میں اگر کوئی کسی پر عاشق ہو جاتا ہے تو اس کی رضا کے مقابلہ میں کسی کے ملامت وفضیحت کی پرواہ نہیں کرتا۔ اگر اس محبت میں یہ اُمور پیش آ دیں تو کیا عجب ہے۔ ایک رسم یہ ہے کہ مُردے کے ساتھ اناج وغیرہ قبر پر لے جاتے ہیں۔ اس میں اظہار ونمود کی نیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی اس نیت کا اظہار کرے تو اس سے پوچھا جائے کہ اگر صرف ایصال ثواب مقصود تھا تو قبر تک لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں تھے جس سے ثواب زیادہ ہوتا۔ صدقات میں سب جانتے ہیں کہ اخفا بہتر ہے۔ باوجود انکار کے منکرین کے دل اپنی نیتوں سے خوب واقف ہوں گے۔ یہ اناج مُردے کے واسطے ہوتا ہے یا برادری کے خوف سے اور ملامت سے بچنے کے لئے اس طریقہ کو بالکل چھوڑ دینا چاہئے اور اگر کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف ہے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خفگی کا خیال نہیں تو ہمت کرو، ان رسوم کفار کو چھوڑ دو۔ اس میں تمہارے دین و دنیا کی سلامتی ہے۔ ایصالِ ثواب سے منع نہیں کیا جاتا۔ لیکن اس میں نیت اظہار ونمود نہ ہو، بالخصوص غریبوں کو احکام شریعت پر زیادہ توجہ سے عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ امیر تو اپنے غم میں یہاں کچھ عیش بھی اُٹھاتے ہیں اور تمہاری سب اُمیدیں آخرت پر ہی منحصر ہیں تو کیسے افسوس وحسرت کا سبب ہوگا اگر تم اپنی حرکتوں سے آخرت بھی برباد کر دو گے۔

اَشرَفُ المَواعِظ

(پہلا وعظ)

اگر کوئی وقت مقرر کر کے یہ خیال کیا کرو کہ میں اللہ میاں کے سامنے کھڑا ہوں اور میزان بھی موجود ہے اور حساب ہو رہا ہے اور پل صراط کے سامنے کھڑا کر کے چلنے کا حکم دیا گیا ہے تو دیکھو تو پھر تم سے کیسے گناہ ہوتے ہیں اور خوف دل میں پیدا ہو جائے گا اور شریعت پر چلنا مشکل نہ رہے گا۔ جب شریعت پر چلنے لگے پھر پل صراط پر چلنا کوئی بات نہیں۔ محققین کے نزدیک پل صراط صورت ہے شریعت کی۔ تو سالک یعنی شریعت پر چلنے والا صراط پر اب چل رہا ہے اور اپنی حالت کو ہر وقت درست رکھو، نہ معلوم کس وقت طلبی ہو جائے۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُھُمۡ وَھُمۡ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مُّعۡرِضُوۡنَ. (الانبیاء:۱)

ترجمہ: ان (منکر) لوگوں سے ان کا (وقت) حساب قریب آ پہنچا اور یہ ابھی غفلت میں پڑے ہیں اور اعراض کئے ہوئے ہیں۔

سامعین وعظ کے متعدد اغراض:

پہلے یہ عرض کئے دیتا ہوں کہ وعظ سننے سے لوگوں کے اغراض متفاوت ہوتے ہیں۔ بعض کی غرض صرف مجمع کی شرکت ہوتی ہے اور بعض کی غرض مجلس خیر کی برکت ہوتی ہے اور بعض کی غرض اپنے امراض کا علاج ہوتی ہے۔ اس طرح پر کہ واعظ جو کہتا جائے اس کو اپنے احوال پر منطبق کر کے دیکھتے جائیں اور غرض درحقیقت یہی ہونی چاہئے۔ رہی یہ بات کہ اپنے امراضِ خفیہ ہر شخص کو کب معلوم ہو سکتے ہیں جن کو وہ مضامین وعظ پر منطبق کر سکے، تو اصل یہ ہے کہ ہر مؤمن کے واسطے خواہ وہ کتنا ہی ضعیف کیوں نہ ہو ایک نورِ عظیم ہے کہ جس سے اپنے نفع اور ضرر کو دیکھ سکتا ہے جیسے شمع ہوتی ہے کہ اس میں کم وبیش نور ضرور ہوتا ہے۔ مگر اس بصیرت کے لئے اتباعِ دین کا قصد ضرور شرط ہے، جو کوئی دین کا اتباع کرتا ہے نورِ عقل کے ساتھ وہی دیکھ سکتا ہے اور آج کل حال اس کے خلاف ہو گیا ہے۔ لوگ عقل کا اتباع کرتے ہیں اور دین کو اس کے تابع بناتے ہیں۔

کفرِ خفی: امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ احکام مقصود بالذات نہیں ہیں۔

صرف مصالح خاصہ سے حکم کر دیا ہے۔ مثلاً جماعت کی فضیلت مطابق واقع کے نہیں ہے۔ صرف ترغیباً ثواب کا وعدہ ہوگیا ہے۔ اس لئے یہ سن کر کہ بغیر جماعت کے بھی نماز ہو جاتی ہے، خوش ہو جاتے ہیں۔ خیال کیجئے کہ تاجر بازار میں بیٹھ کر دو چند نفع کے ساتھ فروخت کر سکتا ہے پھر گھر پر کسی کو فروخت کرتے دیکھا ہے۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ یہ کفر خفی ہے۔ کفر کبھی خفی بھی ہوا کرتا ہے کہ خود اس شخص کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا۔ لوگوں کا گمان ہے کہ کبھی ایمان بوقت موت سلب ہو جاتا ہے۔

موت کے وقت ایمان سلب نہیں ہوتا:

میں کہتا ہوں کہ بوقت موت ایمان سلب نہیں ہوتا، اس واسطے کہ موت کے وقت تو آدمی مسلوب الحواس (ہوش گم ہونا) ہوتا ہے جو قواعد شرع کے مطابق مرفوع القلم (معاف) ہے۔ جب حالتِ اضطرار میں کلمہ کفر زبان سے نکلنا معاف ہے تو ایسی حالت میں موجب کفر کیسے ہو سکتا ہے اور عقلاً بھی وہ بے چارہ ایسی حالت میں واجب الرحم ہے۔ اس وقت سلبِ ایمان بالکل مستبعد ہے، تو اس کی صورت یہی ہے کہ ایسے ایسے عقیدے کر کے پہلے ہی کافر ہو جاتا ہے مگر تمیز نہیں ہوتی۔ موت سے پہلے ہی ایمان رخصت ہو سکتا ہے، البتہ ظہور سلب اس وقت ہوتا ہے اور آدمی کافر مر جاتا ہے۔

وعظ سننے کی غرض محمود:

حاصل یہ ہے کہ غرض محمود وعظ سننے سے اپنے احوال کی اصلاح اور ان پر واعظ کے اقوال کو تطبیق دینا ہے۔ اگر اصلاح کی کوشش میں مر بھی جائے گا تو صالح ہوگا، یہ تمہید ہوئی۔ اب سنیے کہ اللہ میاں نے شکایت کی ہے بندوں کی غفلت کی کہ ان کا حساب بہت قریب آن لگا۔ اور وہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ اور شکایت محبّ کی ہی ہوا کرتی ہے۔ اس غرض سے کہ وہ اس کی اصلاح کر لے۔ شکایت سے قطع تعلق منظور نہیں ہوا کرتا۔ جب قطع تعلق منظور ہوتا تو شکایت نہیں کیا کرتے۔ دشمن کی شکایت کیا وہ تو دشمن ہی ہے جو کچھ کرے تھوڑا ہے اس کے مقابلہ میں صاف جواب ہوا کرتا ہے۔ تو شکایت کرتے ہیں اور قطع نہیں کرتے، بلکہ ان کو جمع کرتے ہیں۔ **واللہ یدعوا الی دار السلام**. اور یہ کتنی بڑی رحمت ہے کہ بلا اپنی کسی غرض و منفعت کے ہم کو سنوارنا چاہتے ہیں

من نکردم خلق تا سودے کنم　　　بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

(میں نے مخلوق کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ اس سے نفع حاصل کروں، بلکہ اس لئے پیدا کیا کہ ان پر سخاوت و بخشش کروں)

اس شعر پر بعض لوگ یوں خیال کرتے ہیں کہ اللہ میاں کو ہمارے اعمال کی کوئی ضرورت نہیں، پھر کیوں تکلیف دی۔

اللہ تعالیٰ کی اُمت محمدیہ پر عظیم شفقت:

میں کہتا ہوں کہ اگر مریض یوں کہے کہ طبیب کو میری علت کی کیا ضرورت ہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بیمار کبھی اچھا ہوگا اور یہ خیال اس کا اچھا خیال ہے۔ مریض کبھی خیال نہیں کرتا کہ میں طبیب پر بڑا احسان کرتا ہوں اور عابد کو یہ خیال ہوتا ہے۔ تو وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ عبادت اللہ میاں کا کام ہے، پھر یہ عنایت دیکھو کہ اللہ میاں نے پہلی اُمتوں کو ایک ہی مرتبہ ایک کتاب جامع دے دی کہ جس میں تمام امراض لکھے ہوئے تھے اور یہ بندوں کے سپرد کر دیا کہ حسب ضرورت اس میں سے نکال لو۔ اور اس اُمت کو ایک ایک نسخہ کر کے مرحمت فرمایا۔ مرض مرض کے موافق جیسے ایک طبیب کہ ابتدائے علاج سے انتہا تک حسب ضروریات جزئیہ ایک ایک نسخہ مریض کو دیتا ہے۔ یہ زیادہ شفقت ہے اور زیادہ رحمت ہے اور پھر اس سے بڑھ کر یہ رحمت کہ ہماری نگرانی معالجہ کے لئے کیسے شفیق پیغمبر کو مبعوث فرمایا (فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ) آپ صرف خدائے تعالیٰ کی رحمت سے اس قدر مہربان ہیں پھر لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس محبت کی کیا قدر کی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شفقت ورحمت:

بے حد شفیق اور نرم تھے آپ۔ حد ہے اس کی کہ اللہ میاں نے آپ کو جاہد الکفار کا اُمر فرمایا کہ بہت نرمی نہ کیجئے۔ کچھ تو شدت وغلظت چاہئے۔ کبھی برائی تو کسی کی چاہی ہی نہیں۔ اگر کبھی مقتضائے بشریت تمہارے نقصان کی دعا مانگی بھی تو پہلے عہد کر لیا ہے خداوند تعالیٰ سے کہ اس دعا کو موجب رحمت کر دیا کریں، نہ کہ موجب نقصان، آپ کی دعا تو دعا، بددعا بھی دعا ہے اور یہ حضور کی رحمت ہے کہ صرف زبانی اصلاح نہیں فرمائی بلکہ خود مشقت اُٹھائی۔ آپ کو کبھی یہ خیال نہ ہوا کہ عبادت کی کیا ضرورت ہے۔ حالانکہ ماتقدم وما تأخر سب حضور کو عفو کر دیئے تھے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال:

حدیث شریف میں ہے کہ آپ اس قدر قیام فرماتے کہ پاؤں مبارک ورم کر جاتے اور فرماتے: افلا اکون عبدًا شکورًا. (کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ ہوں) حضور کا باوجود مغفور ہونے کے یہ حال تھا، پھر ہمیں کیا ہوا، حالانکہ ہم مغفور قطعی ہیں بھی نہیں۔ حضور کے شکراً عبادت کرنے پر قصہ یاد آیا۔ ایک بزرگ نے ایک پتھر کو دیکھا، رورہا تھا۔ بہت رحم آیا اور بذریعہ کشف معلوم کیا کیوں روتا ہے؟ اس نے کہا کہ جب سے یہ آیت اُتری ہے: وَقُوْدُهَا النَّاسُ

وَالْحِجَارَةُ تب سے برابر رورہا ہوں۔ان بزرگ نے دعا مانگی کہ اللہ میاں اس پتھر کو تو دوزخ سے بچا۔ دعا قبول کرلی گئی۔اس پتھر کا آپ نے اطمینان کردیا۔ پھر ایک مرتبہ جو گزر ہوا، دیکھا کہ اور زیادہ رورہا ہے۔ بڑا تعجب ہوا۔ پوچھا کہ اب بھائی کیوں رورہا ہے؟ اب تو تیری نجات ہوگئی تو جھٹ سے کہا وہ جس عمل سے ایسا بڑا ثمرہ ہوا اس کو اور زیادہ کیوں نہ کروں۔

عبادت میں سرتا پا نفع:

غرض عبادت میں سراسر اپنا نفع ہے۔اور خیال لوگوں کا یوں ہے کہ عبادت ایک اللہ میاں کا کام ہے، بوجھ سا اُتار دیا۔ ہمارے نفس یہ سب حیلہ کرتے ہیں دین کے چھوڑ دینے کے لئے پھر دعوئے ایمان شعر ؎

وجائزة دعوے المحبة فی الھوے ولکن لا یحقے کلام المنافق

(اور خواہشات میں دعویٰ محبت جائز ہے لیکن منافق کا کلام پوشیدہ نہیں)

محبت مؤمن کے لوازم سے ہے:

مؤمن کے لوازم سے ہے محبت۔ایمان کا دعویٰ جب ہی کیا جاسکتا ہے جب محبت ہو والذین اٰمنوا اشد حبا للّٰہ (اور ایمان والے سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں) لا یؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ (الصحیح للبخاری ۱:۱۰) (الحدیث) (تم میں سے کوئی شخص ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک میں اسے سب سے بڑھ کر محبوب نہ ہوجاؤں) دوسری حدیث ہے: لا یؤمن احدکم حتیٰ یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ. (مشکوٰۃ المصابیح: ۱۶۷) یعنی مومن نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ اس کی خواہش میرے حکم کے تابع نہ ہوجاوے جس کے کہ آج کل لوگوں نے بالکل برعکس کر رکھا ہے کہ احکام شرع کو اپنی ہوا کے تابع بنانا چاہتے ہیں۔

اصلاحِ ظاہر موجبِ اصلاحِ باطن ہے:

اور چونکہ محبت کی حقیقت انجذاب قلب ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان میں اللہ و رسول کی طرف انجذاب ہونا چاہئے قلب کو، لیکن ابتداء میں اگر کسی کو انجذاب نہ بھی ہو تو اس کا غم نہ کرے بلکہ ظاہر کے لئے باطن میں ضرور ایک تاثیر ہے۔ بتکلف اتباع کئے جاوے انجذاب خود پیدا ہوجاوے گا۔ عادت اللہ یوں ہی جاری ہے کہ طالب مطلوب ہوجاتا ہے۔ ہمارے ذمہ جو حقوق ہیں ان کا مقتضی تو یہ تھا کہ اگر ادھر سے انجذاب ولطف بھی نہ ہوتا تب بھی ہماری طرف سے طلب ہی جاری ودائم رہتی، اگرچہ ادھر سے انکار ہی ہوتا مگر نہیں ادھر سے انکار نہیں طلب ہے

اور لوگوں کا معاملہ اللہ میاں کے معاملہ کے برعکس ہے کہ وہ بلا رہے ہیں اور یہ اعراض کرتے ہیں اس واسطے شکایت کرتے ہیں نہ قطع کے لئے بلکہ ع **وبیقی الود ما بقی العتاب**. محبت جب ہی تک رہتی ہے جب تک شکوہ شکایت رہے۔ فرماتے ہیں **اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ** (ترجمہ) لوگوں کا حساب بہت قریب آ گیا اور ان کو کچھ خبر نہیں، نہ کچھ مافات کی تلافی کرتے ہیں، نہ آئندہ کے لئے احتیاط ہے۔

ریا و دکھلاوے کی نیت سے ثواب نہیں پہنچتا:

ہر بات میں جو معاملہ ہمارا ان کے ساتھ ہے وہ اس کے برخلاف ہی کرتے ہیں۔ ہمارے امر و نہی پر مطلقاً نہیں چلتے نہ اقوال میں نہ افعال میں۔ نئے نئے اقوال و افعال اپنی طرف سے اختراع کر لئے ہیں اور پھر ان کو ہماری خوشنودی کا موجب سمجھتے ہیں۔ ہزار ہا امثلہ اس کے ہیں جیسے سوئم و چہلم وغیرہ۔ مشہور حدیث ہے **انما الاعمال بالنیات (الصحیح للبخاری ۱:۲)** اب دیکھ لیجئے آپ کہ افعال مروجہ میں نیت کیا ہے فقط ریا اور دکھلانا برادری کو کہ ہم نے فلانے کی موت ایسی کی۔ کہا کرتے ہیں اے میاں روپیہ دو روپیہ کے چنوں کے لئے نک کٹی کراتے ہو معلوم ہوا کہ صرف نک کٹی کا خیال اس کا موجب ہوتا ہے۔ جب اس کام میں صرف نیت ریا کی ہے تو ثواب کیسا اور جب فاعل کو ثواب نہ ہوا تو موہوب لہ کو کیا چیز پہنچے گی اور جو کوئی اس سے منع کرے تو کہتے ہیں کہ واہ صاحب ایصال ثواب سے منع کرتے ہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ منع کرنے والا ایک طریق سے منع کرتا ہے اور دوسرا طریق ایصال ثواب کا بتلاتا ہے جیسے کہ اس وقت حج بمبئی سے منع ہو گیا اور چاٹ گام سے اجازت ہے۔ دوسرا طریق یہ کہ جتنا روپیہ سویم و چہلم میں صرف کرتے ہو محتاج بیواؤں کو خفیہ طور پر دے دو دیکھو کتنا ثواب ہوتا ہے مگر بڑا خیال تو یہ ہے کہ برادری کیا کہے گی۔ چار چار دانہ برادری کو ملنے چاہئیں تا کہ اعلان ہو جاوے چاہے بھلا ایک کا بھی نہ ہو۔ طرح طرح کے دستور باندھ رکھے ہیں۔ مثلاً جمعرات کا دن آیا اب آج تلاش پڑی کہ لاؤ مسجد کے ملا کو فاتحہ دینے کے واسطے، چاروں طرف سے حلوے اور مٹھائی کی بھرمار ہو رہی ہے۔ ہفتہ کے اور چھ دن میں تو بے چارے کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ بچی کچھی روٹی اور بگڑا ہوا سالن اس غریب کے لئے اور آج ساتویں دن تمنائیں کرتے کرتے یہ دن آیا کہ ایک سالن سے دوسرا سالن اسے ملے گا مگر وہ یوں بیکار ہے کہ اک دم سے اتنا آن پڑا کہ سب کھا نہیں سکتا اور ہفتہ بھر تک رکھا بھی نہیں جا سکتا بگڑ جائے گا۔ بے چارہ اس کو سکھاتا ہے اور پھنکی بنا کر نگلتا ہے جو چیز سکھانے کے قابل نہیں جیسے

حلوا اور تر چیز تو اس کو محلہ والوں سے چھپا کر بیچ لیتا ہے۔ خیال تو کیجئے کہ اس کی نیت بگڑی اور آپ کا مال ضائع گیا۔ اگر بجائے اس کے کہ جمعرات ہی کو خیرات کریں اور دونوں میں بھی کوئی نئی چیز اس کے پاس بھیج دیا کرتے تو اس کی نیت نہ بگڑتی اور نہ سکھانے کی نوبت آتی۔

نابالغ ورثہ کے مال میں تبرع حرام ہے:

یہاں دستور ہے کہ مردہ کے کچھ کپڑے اور جانماز وغیرہ موذن کو دی جاتی ہے اور ان کپڑوں کے دینے کا دستور اس طرح تاکید کے ساتھ ہے کہ چاہے گھر میں ان کے سوا اور کچھ اثاثہ نہ ہو اور اس کے بچے ننگے ہی رہ جاویں مگر رسم کے خلاف نہ ہو حالانکہ ترکہ میں وہ کپڑے بھی داخل ہیں اور ترکہ مشترک ہے۔ بعض ورثاء نابالغ ہوتے ہیں ان کے مال میں تبرع حرام ہے۔ بعض غائب ہوتے ہیں، بعض کا دینے کو جی نہیں چاہتا اور ان کی عمدگی دیکھ دیکھ کر لالچ آتا ہے مگر مجبوراً دیئے جاتے ہیں ورنہ برادری والے دیکھ کر کہیں گے کہ دیکھو مردہ کے کپڑے پہن رکھے ہیں اور پھر اگر قیمتی ہیں اور مؤذن کے پاس پہنچے تو یوں ناس ہوا کہ وہ ان کی قدر نہیں جانتا۔ بازار میں لے جا کر جس قیمت کو بکے فروخت کر دیتا ہے۔ صاحبو! اگر تقسیم کر کے جو بالغ حاضرین کے حصہ میں آوے اس کو وہ مالک نابالغوں کا حصہ محفوظ رکھ کر آپ خود بیچ کر قیمت خیرات کرتے یا بچوں کو پہننے دیتے تو کیا جرم تھا۔

تلاوت قرآن شریف پر اُجرت لینا حرام ہے:

بعض جگہ دستور ہوتا ہے کہ میت کی قبر پر چالیس روز تک قرآن شریف پڑھواتے ہیں اور کچھ اُجرت حافظ کو دینی پڑتی ہے اور اتنے دنوں کا کھانا بھی ملتا ہے۔ اس میں سنیئے تلاوت قرآن شریف پر اجرت لینا حرام ہے۔ یہ مسئلہ فقہ میں لکھا ہوا ہے۔ تعلیم میں جو اس کے جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے تو اس ضرورت سے کہ لوگوں کو یوں تو پڑھانے کا شوق رہا نہیں اگر بالعوض تعلیم کو بھی منع کر دیا جائے تو قرآن شریف کے ضائع ہو جانے کا احتمال ہے اور مردہ کی قبر پر نہ پڑھوانے سے یہ احتمال نہیں تو حرمت اصلیہ کی طرف راجع ہو گا جب عوض لے کر قرآن شریف پڑھا گیا تو قاری ہی کو ثواب نہ ہوا پھر اس کے بخشنے کے کیا معنی یہ اجرت آپ کی ضائع ہوگئی اور حافظ صاحب کے قلب پر جو کچھ اثر پڑا وہ الگ ہر وقت منتظر رہتے ہیں کہ کوئی مرے اور جہاں جنازہ دیکھا بس اطمینان ہو گیا کہ اب چالیس روز کا سہارا تو ہوا اور چلہ جوں جوں ختم ہوتا جاتا ہے دوں دوں دعا مانگتے جاتے ہیں مرے موٹا بھرے لوٹا۔

پابندی رسوم کی خرابیاں:

صاحبو! یہ ساری خرابیاں کاہے سے پیدا ہوئیں، صرف پابندی رسم سے اگر آپ حافظ

صاحب کو یوں ہی کچھ دعوت کر کے عمدہ کھانا کھلا دیا کرتے اور کپڑوں میں سے کبھی کپڑا دے دیا کرتے تو کیوں وہ تمہارے مرنے کو تکا کرتے لیکن بجز موقع موت کے اس کی کوئی بات بھی نہیں پوچھتا اور خصوص موذن کو تو نوکروں اور چاکروں سے بھی ذلیل سمجھ رکھا ہے۔ نہ معلوم اس طرف یہ بات ہے یا نہیں ہمارے قصبات میں تو محلّہ کا پانی تک اسی سے بھرواتے ہیں۔ یوں دستور ہے اگر کسی کے مکان سے اصیل یا ماما مسجد کے کنویں پر گھڑا بھرنے کے لئے لائے اور موذن موجود ہو تو بہتر تو یہ ہے کہ وہ گھڑے کو بھر کر مکان تک پہنچا آئیں اور کم از کم اتنا تو واجب ہے کہ اپنے ہاتھ سے بھر کر اس اصیل کو دے دیں۔ بے چارہ کو سینکڑوں گھڑے بھرنے پڑتے ہیں۔ کیا وہ اہل محلّہ کا نوکر ہے اگر اس کو روٹی دیتے ہو تو وہ اذان بھی تو کہتا ہے اور اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ مسجدوں میں طالب علم رہا کرتے ہیں وہ پڑھیں یا تمہارے گھڑے بھریں اور ایسے ہی بہت سے رواج اس قسم کے ڈال رکھے ہیں کہ صدہا خرابیوں کے باعث ہوتے ہیں تو وجہ کیا ہے کہ ان کے مفاسد پر نظر نہیں اور اسی لئے ان کی اصلاح کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اس بات کا خیال نہیں کہ ان پر بھی حساب ہوگا۔ اس کا خیال رکھو اور علماء کے پاس بیٹھو اور ان سے مناسبت پیدا کرو اور اپنے اقوال اور افعال کی ان سے پوچھ پوچھ کر اصلاح کرو پوچھنے میں شرم ہرگز نہ کرو جب ان سے پوچھو گے تو ضرور کوئی شکل نکلے گی۔ ان کے پاس پہنچو گے تو خدا تعالیٰ کے پاس پہنچو گے۔

ہر کہ خواہد ہم نیشنی باخدا   او نشیند در حضور اولیاء

"جو شخص اللہ تعالیٰ کا ہم نشین ہونا چاہے اسے چاہئے کہ اولیاء اللہ کی صحبت میں بیٹھے۔"

اہل اللہ کی صحبت کا اثر:

اہل اللہ کی صحبت اختیار کرنی چاہئے مگر ناقص صحبت سے احتراز کرنا چاہئے۔ خیر ضرورت کے واسطے مضائقہ نہیں اختلاط نہ چاہئے۔ اہل اللہ کی صحبت سے ضرور نفع ہوتا ہے۔ خیال یوں ہوا کرتا ہے کہ صاحب ہم فلانے بزرگ کے پاس بیٹھے تو کیا کمال ہوا، دل میں جوش تک بھی نہ ہوا۔ یہ غلطی ہے، صحبت کا اصلی اثر یہ ہے کہ دنیا کی محبت گھٹ جائے اور حق سبحانہ تعالیٰ کی محبت بڑھ جائے۔ بس پھر کبھی کیفیات نفسانی کا غلبہ بھی اس کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا حال سنا ہوگا کہ شیخ کا کلام سن کر پچھاڑ کھا کر گر پڑے۔ لوگوں کے نزدیک یہی بڑا اثر ہے جہاں یہ پایا جاوے وہی مجلس اچھی سمجھی جاتی ہے۔

کیفیات کیوں نا قابل اعتبار ہیں

عوام کہا کرتے ہیں کہ میاں سماع تو وہ چیز ہے کہ سانپ کو مست کر دیتا ہے میں کہتا ہوں یہی

دلیل ہے کہ یہ کیفیت خاص قابل اعتبار نہیں کیونکہ کیفیت معتبرہ وہ ہے کہ خواص انسانی سے ہو اور جب سانپ اس سے متاثر ہوا معلوم ہوا کہ اس سے ایسی کیفیت ہوتی ہے جو انسان اور دیگر حیوانات میں مشترک ہے۔کمال خاص انسانی تو وہ ہے کہ تمام خلق پر فوقیت لے جائے بلکہ ملائکہ پر بھی، وہ کمال یہی ہے کہ اتباع کامل وتہذیب نفس پیدا ہو۔ ہاں اگر کیفیت نفسانی بھی اتباع کے ساتھ پیدا ہو جائے تو اچھا ہے کیونکہ نفس میں اشتعال (جوش دلانا) پیدا کرتی ہے تو اور معین ہو جاتی ہے۔اتباع پر جیسا کہ انجن میں آگ کہ گاڑیاں بلا آگ ٹھیلنے سے بھی چلتی ہیں مگر آگ سے زیادہ تیز چلتی ہیں اس معنی کو کیا ہے شعر

صنمارہ قلندر سزوار بمن نمائی — کہ وراز دور دیدم رہ و رسم پارسائی

"اے شیخ کامل مجھے آپ نے اگر عشق کا راز دکھا دیا تو بہتر ہے کیونکہ راہ سلوک تو بہت دور دراز کا راستہ ہے۔"

مقصود اصلی قرب باری تعالیٰ ہے:

مقصود اصلی اتباع اور قرب باری تعالیٰ ہے اگر اشتعال نہیں ہے تو پڑا مت ہو شعر

روز ہا گر رفت گور و باک نیست — تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

"ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہئے اگر گئے بلا سے گئے عشق جو اصلی حالت ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا رہنا کافی ہے"

صحبت کے موثر ہونے کے آداب:

اور جو دونوں ہوں تو یہ اولے ہے۔لوگ صحبت کا اثر چاہتے ہیں اور اکثر لوگ آداب صحبت سے واقف بھی نہیں۔صحبت کے جو طریق ہیں وہ اختیار کیجئے دیکھئے اثر ہوتا ہے یا نہیں۔طرح طرح کے بکھیڑے لے کر مشائخ کی خدمت میں جاتے ہیں کوئی مقدمہ کے واسطے دعا کرتا ہے کوئی اولاد کا طالب ہے۔اللہ میاں کا طالب بھی کوئی ہے؟ مشائخ کے پاس سوائے کلام ضروری کے کچھ بات نہ کی جائے اگر وہ خود بھی دنیا کی بات کریں تو سمجھو کہ منتہی کو اس سے ضرر نہیں ہوتا اور تم مبتدی ہو کوئی بات اگر پوچھنے کی ہو تو یوں گمان کر رکھا ہے کہ ہم جا کر بیٹھتے ہیں اس کو پوچھنا نہ چاہئے وہ خود بیان کریں صاحب اول تو یہ امر متعلق کشف کے ہے اور کشف دائمی اور اختیاری نہیں پھر اگر ان کو کشف بھی ہو گیا تو یہ کیا ضرور ہے کہ وہ اس کا جواب دیں جب تم اہل حاجت ہو کہ مستغنی ہو تو اگر وہ مستغنی ہوں تو کیوں مجبور کئے جاویں، پھر یہ کہ ان کی شفقت اور زیادہ ہو جائے گی تمہارے سوال کرنے سے ضرور پوچھو جب وہ بلا تمہارے پوچھے چاہتے ہیں کہ تم کو معلوم ہو جائے اور

سعادت حاصل کرلوتو تمہارے پوچھنے سے اور زیادہ شفقت نہ کریں گے۔

مراقبہ حساب

میں نے اس بیان کو طول اس واسطے دیا کہ علماء کے ساتھ مجالست کرو اور حالت کو درست کرو اور علماء سے بلا حیا و شرم کے پوچھ لیا کرو اور حساب کا مراقبہ کیا کرو، اگر کوئی وقت مقرر کر کے یہ خیال کیا کرو کہ میں اللہ میاں کے سامنے کھڑا ہوں اور میزان بھی موجود ہے اور حساب ہو رہا ہے اور پل صراط سامنے کھڑا کر کے چلنے کا حکم دیا گیا ہے تو دیکھو تو پھر تم سے کیسے گناہ ہوتے ہیں اور خوف دل میں پیدا ہو جائے گا اور شریعت پر چلنا مشکل نہ رہے گا۔ جب شریعت پر چلنے لگے تو پھر پل صراط پر چلنا کوئی بات نہیں۔ محققین کے نزدیک پل صراط صورت ہے شریعت کی تو سالک یعنی شریعت پر چلنے والا پل صراط پر اب چل رہا ہے اور اپنی حالت کو ہر وقت درست رکھو نہ معلوم کس وقت طلبی ہو جائے۔ حالت کے درست ہو جانے کی علامت یہ ہے من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاء ہ (الصحیح للبخاری ۸: ۱۴۳) "جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو محبوب رکھے اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند فرمائیں۔" جو شخص ایسا صاف ہو کہ اللہ میاں کے پاس جانے سے اس کا اندیشہ نہ ہوتا ہو تو اللہ میاں بھی اس سے خود ملنا چاہتے ہیں اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ اعمال درست ہوں۔ حدیث میں ہے احسنوا الظن بربکم (دلائل النبوۃ للبیھقی ۷: ۲۰۴) "اور اپنے رب سے حسن ظن رکھو۔" اور تجربہ سے ثابت ہوا کہ گمان اس کا درست ہوتا ہے جس کے اعمال درست ہوتے ہیں۔ اس بناء پر حدیث کے معنی یہ ہوئے کہ احسنوا العمل عمل کو درست کرو کہ وہ موجب ہے حسن ظن باللہ کا اور یہ معنی تھوڑا ہی ہو سکتے ہیں کہ اعمال بد کئے جاؤ اور خیال اچھا جماتے رہو، یہ تو دھوکہ ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ایسی حالت بنالو کہ جب سوچ و موت سے کراہت نہ ہو اور موت کا وقت معین نہیں تو ہر وقت ہی درستی حالت کی ضرورت ہوئی شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود۔ تو ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔

اس کے بعد لوگوں نے دعا مانگی اور وعظ ختم ہوا

اَشْرَفُ الْمَوَاعِظِ

دوسرا وعظ

شفقتِ خداوندی:

''کیا ہم قرآن شریف اتارنا چھوڑ دیں اس وجہ سے کہ تم اس کو مانتے نہیں ہو۔ تم نسخہ کو چاک کرتے جاؤ ہم لکھ لکھ کر اور دیتے جائیں گے۔'' ذرا اِس کی قدر کرو۔ اس شفقت و رحمت پر بھی احکامِ الٰہی کی قدر نہ کرو گے تو کچھ تعجب نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے روز فرمائیں

یا رب! ان قومی اتخذوا ھٰذا القرآن مھجورًا

(اے اللہ! بے شک میری قوم نے اس قرآن کو بالائے طاق رکھ دیا تھا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ ماثورہ : الحمد للّٰہ نحمدہ و نستعینہ الخ.

اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم.

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (المائدہ:۲)

''نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں تعاون کرو۔''

نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں تعاون کرو

میں اس وقت صرف ایک ضرورت کو عرض کرتا ہوں، کیوں صاحبو! دین کی ضرورت ہے یا نہیں۔ آپ حضرات کو معلوم ہے اور چند بار ثابت کیا گیا ہے کہ دین ضروری ہے۔ کیونکہ ہر کام میں آخر ایک نہ ایک طریق آدمی کو اختیار کرنا پڑے گا اور یہ کوئی عقل مند نہ کرے گا کہ خراب طریق کو اختیار کرے بلکہ یہی احکام اور واقعات بیان ہوتے ہیں۔ اہتمام ہی نہیں کہ دوسرے معنی لے لئے جاویں اور اس میں حکمت یہ ہے کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محتاج رہیں مستغنی نہ ہو جاویں۔

حدیث بھی منجانب اللہ ہے

اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **لا الفین احدکم مکیا علی اریکته الحدیث** (سنن ابی داؤد: ۴۶۰۵) یعنی میں کسی کو نہ دیکھو کہ قرآن کے بھروسہ میری حدیث سے اعراض کرے خدائے تعالیٰ نے مجھ کو جیسے کہ کتاب دی ہے اسی کے مثل دوسری بھی ایک چیز دی ہے اگرچہ سب کچھ ہے قرآن شریف ہی میں لیکن اس کو سمجھتا کوئی نہیں سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، چنانچہ ارشاد ہے: **''لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ''**

حاصل یہ ہے کہ جس وقت ہمارا رسول یعنی فرشتہ پڑھے تو آپ جلدی نہ کیجئے اور صرف سنتے رہئے، پھر بیان اس کا ہمارے ذمہ ہے۔ معلوم ہوا کہ اصل متلو کے سوا مزید برآں ہے بیان منجانب اللہ۔ پس وہ احادیث کے سوا اور کیا ہے۔ ثابت ہوا کہ قرآن شریف ہی کی طرح سے حدیث

شریف بھی منجانب اللہ ہے فرق اتنا ہے کہ وہ متلو ہے اور یہ غیر متلو بس اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن شریف تو ایک محدود مختصر مجموعہ ہے اس میں تاویل کرلی اور احادیث ہیں بہت کثرت سے تو کہاں تک تاویل کریں انہوں نے کہالاؤ اس کو اصل ہی سے اڑادیں۔

احتمال کی دو قسمیں:

اور اگر احتمال عقلی سے شبہ کیا جاوے تو احتمال کی دو قسمیں ہیں۔ اہتمام ناشی عن دلیل اور احتمال غیر ناشی عن دلیل۔ سو احادیث میں احتمال ناشی عن دلیل نہیں ہے۔ قرائن تو یہی کہتے ہیں کہ غلط نہیں کیا تو اریخ سے بھی گئیں۔ خوب یاد رکھو کہ احتمال تاوقتیکہ ناشی عن دلیل نہ ہو معتبر نہیں ہوتا یوں تو اس وقت جانتے ہو کہ دن ہے مگر احتمال ہے کہ رات ہو اور ہمارا مشاہدہ غلط ہو۔ تو حدیث شریف کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور وہ اگر ظاہراً غیر قرآن ہیں لیکن واقع میں اس کی شرح ہے۔

فقہ دراصل قرآن وحدیث ہی ہے:

جس طرح فقہ ظاہراً غیر قرآن وحدیث ہے لیکن درحقیقت وہ قرآن وحدیث ہی ہے۔ دوسری صورت میں مثال اس کی یہ ہے کہ کسی طبیب کے ہاں مختلف نسخوں سے متفرق علاج ہوتے ہیں ان کو کسی نے ترتیب دے کر کتاب الطب کی صورت میں کردیا تو اس شخص نے اس میں دو تصرف کئے۔ ایک تو یہ کہ ان معالجات کو بترتیب امراض کردیا پہلے سر کے امراض کے نسخے لکھے اور پھر حلق کے اور پھر منہ کے اور معدہ اور جگر وغیرہ وغیرہ کے دوسرے یہ کہ ان امراض کے متعلق قواعد کلیہ بھی بیان کردیئے تو اس شخص نے کچھ اپنی طرف سے نہیں اختراع کیا بلکہ یہ کلیات بھی وہ ہیں کہ طبیب کے علاجوں سے مستنبط ہوتے ہیں ان کو اس نے بیان کردیا اسی طرح فقہ ہے حقیقت شناس لوگ اس کی وہی تعظیم کرتے ہیں جو قرآن مجید کی کرتے ہیں جیسے کوئی اپنے معشوق کو دیکھے گرمی کے کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہیں اور جاڑوں کے پہنے ہوئے ہے وہ تو یہی کہے گا: شعر

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش
من از انداز پایت مے شناسم

"تم جس رنگ میں چاہو آؤ میں تمہارے قدموں کے انداز کو پہچانتا ہوں۔"

عبارا تنا شتے وحسنک وحد
وکل الی ذاک الجمال یشیر

''ہماری عبارتیں مختلف ہیں اور تیرا حسن ایک ہے اور جملہ عبارتیں تیرے جمال کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔''

ضرورت دین بہ دلیل عقلی:

قرآن شریف علم دین ہے ایک صورت میں اور حدیث شریف وہی علم دین ہے دوسری صورت میں اور ایسے ہی فقہ وہی علم دین ہے تیسری صورت میں۔ بہرحال علم دین معہ اپنی تفاصیل کے ضروری ٹھہرا۔ اسی مطلب کو دوسری طرح تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ اس کا کون منکر ہوسکتا ہے کہ اللہ میاں احکم الحاکمین ہیں اور یہ امر فطری ہے کہ حکام کے کچھ احکام ہوا کرتے ہیں اور مقتضائے فطری احکام کا یہ ہے کہ ان کے بجالانے والے پر رحم کیا جائے اور سرکشوں پر عتاب کیا جائے تو ہر عقلمند کے ذمہ ضرور ہوا کہ سوچے کہ اللہ میاں کے کیا احکام ہیں جس پر اثر مذکور مترتب ہوا اچھا علم دین کو نہ مانو، پھر تم اور کوئی طریق ان احکام کے پہچاننے کو بتادو اللہ ثم واللہ سوچتے سوچتے قیامت آجائے اور پھر اور قیامت آجائے تب تک بھی تو تمام جہان کے عقلاء اس کام کو انجام نہ پہنچا سکیں گے۔ اتنا زمانہ گزر گیا ایک بات بھی متفق علیہ ثابت ہوئی افلاطون کے نزدیک کچھ ہے اور ارسطو کے نزدیک کچھ غرض کہ عقلیں آپس میں متبائن ہیں ایک عقل پر اعتماد کیا جاوے تو ترجیح بلا مرجح ہے اور سب کو مان لیا جائے تو اجتماع ضدین ہے۔ دونوں شقیں نہیں لی جاسکتیں۔ معلوم ہوا کہ ایک ثالث شق اور ہے کہ وہ حق ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی پر اعتماد نہ کیا جاوے اور صرف عقل کو اس کام کے لئے کافی نہ سمجھا جاوے۔

احکام الٰہی کے ادراک کے لئے محض عقل کافی نہیں:

اور یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ احکام فی نفس الامر ہیں ضرور اور ان پر وہ اثر مترتب ہونے والا ہے اور عقل ان کے ادراک کے لئے کافی نہیں تو عقل کے سوا اور رستے کی ضرورت پڑی اور وہ وحی ہے۔ واللہ! اگر حق سبحانہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو نہ بھیجتے اور حکم یہ کر دیتے دیکھ دنیا میں عقائد صحیح رکھنا اور ہمارے پاس سرخرو ہو کر آنا تو معلوم ہوتا ہے کہ کس مشکل میں پڑتے جو آلہ اس کے ادراک کا تھا وہ ایسا مختلف ہے کہ کبھی کچھ بتلاتا ہے اور کبھی کچھ اس صورت میں کوئی سرخروئی کی امید کرسکتا تھا مگر نہیں ایسا نہیں، کیا ان احکام کو یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ ایک متفق علیہ طریق یعنی وحی سے مفصل بیان کر دیا محض اس نظر سے کہ ان کمزور بندوں کو تکلیف نہ ہو ورنہ کیا غرض تھی اللہ

میاں کو انبیاء علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کو بھیجیں۔ اس تقریر کا مطلب یہ نہیں کہ دین عقل کے مناقض ہے بلکہ عقل وہاں تک پہنچتی نہیں۔

ادراک حقائق کے دو راستے:

ادراک حقائق کے دو راستے ہیں کامل دین اور ناقص عقل۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ناقص کو اصل ٹھہرا کر کامل کو اس کا تابع کرتے ہیں ان بھلے آدمیوں نے اس کا عکس کیوں نہ کیا۔ اس کی مثال ایسی ہوئی کہ مادر زاد اندھے کے سامنے کہا جائے کہ سپید اور سیاہ دو رنگ ہوتے ہیں اس نے چونکہ دیکھے نہیں ہیں سمجھ میں نہیں آتا اور کہتا ہے کہ سب یوں ہی کہو کہ رنگ کوئی چیز نہیں اس خبر کو اگر صحیح اور اپنے ادراک کو ضعیف سمجھ کر آنکھوں کی اصلاح کرتا تو بہتر تھا نہ کہ اس خبر میں انکار یا تاویل شروع کر دے اس طرح مدعیان عقل نے قرآن شریف کے معنی جب اپنی عقل کے خلاف دیکھے تو اس میں تاویل وتحریف کرنے لگے۔ یہ نہیں کہ اپنی فہم کو درست کرتے۔ نظم

برہوا تاویل قرآں مے کنی ... پست و کج شد از تو معنی سنی
چوں ندارد جان تو قندیلہا ... بہر بینش مے کنی تاویلہا
کردۂ تاویل لفظ بکرار ... خویش را تاویل کن نے ذکر را

''خواہش نفسانی کی بناء پر قرآن میں تاویل کرتے جس سے اس کے روشن معنی پست و کج ہو جاتے ہیں تمہارے اندر قرآن سمجھنے کا فہم ہی نہیں اس لیے تاویلات کرتے ہو قرآن سمجھنے کا فہم پیدا کرو اور تاویلات چھوڑ دو''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت:

خوب سمجھ لو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر بڑا احسان کیا کہ راستہ کو صاف کر دیا کہ ہم کو بے چوں چرا آپ کا اتباع ضرور ہے ورنہ ہماری مثل ایسی ہو گی کہ جیسے اندھا اپنے لے چلنے والے سے کہے کہ کیا دلیل ہے کہ آگے میرے خندق ہے۔ دلیل یہ ہے کہ چھوڑ دیں کہ بھئی جا، جب خندق میں گرے گا تب آپ کو فساد طریق معلوم ہو جائے گا۔ راستہ بتانے والے کی بلا سے، مگر یہاں ایسا نہیں ہدایت کرنے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بندوں کو نہیں چھوڑتے چاہے وہ چھوڑتے جائیں۔ ایسی حالت میں آپ کو کیسی کلفت ہوتی ہو گی آپ کی خدمت میں اعمال بھی پیش ہوتے ہیں آپ دیکھتے ہوں گے کہ میرا قول یوں بدلا جاتا ہے کیا کچھ صدمہ آپ کے قلب پر

ہوتا ہوگا۔ فرماتے ہیں لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ آپ اپنی جان کو ہلاک کر ڈالیں گے ان کے پیچھے کیا رحمت ہے بندے گناہ کرتے ہیں اور آپ گھلے جاتے ہیں۔ آپ کا کیا حرج تھا صلی اللہ علیہ وسلم کیوں صاحبو آپ نے نہیں دیکھا ہے کہ طبیب نے کسی مریض کے لئے نسخہ لکھا ہو اور یہ جانتا ہو کہ اگر اس نسخہ کو نہ پئے گا تو مر جائے گا اور اس مریض نے نسخہ چاک کر کے پھینک دیا اب وہ طبیب اس سے پھر کہے گا اور زبردستی کرے گا کہ میری خاطر سے پی لو۔ اس کا کیا حرج ہے مر جاؤ۔

شفقتِ خداوندی:

مگر حق سبحانہ تعالیٰ کی کیا شفقت ہے کہ فرماتے ہیں اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ کیا ہم قرآن شریف اتارنا چھوڑ دیں اس وجہ سے کہ تم اس کو مانتے نہیں ہو۔ تم نسخہ کو چاک کرتے جاؤ ہم لکھ لکھ کر اور دیتے جائیں گے ذرا اس کی قدر کرو۔ اس پر شفقت و رحمت پر بھی احکام الٰہی کی قدر نہ کرو گے تو کچھ تعجب نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے روز فرمائیں يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا اے اللہ بے شک میری قوم نے اس قرآن کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

بقائے عالم کے لئے ضرورت علماء:

چاہئے تو یہ کہ جو کچھ حکم سنیں پوچھیں بھی نہیں کہ اس میں کیا مصلحت ہے مگر پوچھنا کیسا اس میں ترمیم کی جاتی ہے طبیب سے کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ دوا کیوں لکھی تو وجہ یہ ہے کہ طبیب اگر ناراض ہو جائے گا تو جان جاتی رہے گی اور عالم اگر خفا ہو جائے گا تو ایمان جاتا رہے گا اور اس کی ہم کو کچھ پروا نہیں۔ سمجھ لیا آپ نے کہ تاویل کو کیا علاقہ ہے دین کے ساتھ اور دین کی اصلیت کیا ہے اور اسی سے ثابت ہو گیا کہ دین ضروری ہے اور یہ بات بدیہی (واضح) ہے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ ضروری کا ذریعہ بھی ضروری ہوتا ہے اور وہ ذریعہ کوئی بتلائے کہ ان مدرسوں کے سوا کیا ہے تو مدرسے بھی ضروری ہوئے۔ میں نے کلام کو طول اس واسطے دیا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ دین ضروری ہے مگر ان کے معاملہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اپنے لڑکوں کو انگریزی مدرسوں میں بھیجتے ہیں اور جب کوئی کہتا ہے کہ عربی پڑھو تو یہ کہتے ہیں یہ تو یہ چاہتے ہیں کہ بھوکے مر جائیں۔ صاحبو! اگر یہ بات صحیح بھی ہو تو وہ بھوک کہ جس کے بعد ہمیشہ کی غذائیں ہوں اس غذا سے اچھی ہے جس کے بعد ہمیشہ کی بھوک ہوں، حالانکہ ہم علم معاش سے منع نہیں کرتے مگر جب کہ وہ مخل ہو علم دین میں۔ بعضے یوں کہہ دیتے ہیں کہ علماء تو بہت سارے موجود ہیں، بس کافی ہیں۔ میں کہتا ہوں جب یہ ختم ہو جائیں

گے تو کون باقی رہے گا۔ اسی طرح ہم بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے طالب بھی تو بہتیرے موجود ہیں، کونسی ضرورت ہے کہ ہم بھی ایک اور ان افراد میں بڑھیں۔ اس کا جواب یہ دیا جاوے گا کہ دوسرے کے ہونے سے ہم کو تو روزی نہیں ملے گی۔ پیٹ تو ہمارا بھی ہے۔ کیوں صاحبو! حقوق اللہ علماء کے اداء کرنے سے کیا تم پر سے بھی ادا ہو جائیں گے؟ کیا ہر شخص کو جدا جدا ضرورت نہیں؟ بات یہ ہے کہ اس کا نتیجہ تو ابھی معلوم ہو جاتا ہے اگر ان کا نتیجہ ابھی چھپا دیا گیا ہے۔

مگر یاد رہے کہ ایک دن واقع ہو گا ضرور، میں کہتا ہوں کہ اگر دین کے قائم رکھنے کی ضرورت نہیں ہے تو آپ لوگ دنیا کے قائم رہنے کے تو محتاج ہیں، تو یاد رہے کہ دنیا کی بقاء بھی جب ہی تک ہے کہ جب تک اللہ اللہ کہا جاتا ہے اور یہ جب ہی تک ہے کہ جب تک علماء موجود ہیں۔ قیامت ہو جائے گی جس وقت علماء نہ رہیں گے۔ حدیث صحیح میں آ چکا ہے، غرضیکہ دنیا کے قائم رکھنے میں بھی آپ ان کے محتاج ہیں۔ جب آپ علم و علماء کے محتاج ٹھہرے تو احسان نہ جتایئے کہ آپ علماء کی خدمت کرتے ہیں۔ دین کی بقاء تو ان سے ہی ہے، دنیا کی بقا بھی منظور ہو تو ان ہی کے دم سے ہو سکتی ہے۔ آپ کو دنیا میں رہنا ہو تو ان کو باقی رکھئے۔ اپنی غرض کے واسطے بقاء علم دین میں ان کی اعانت کرو اور یہ اور بات ہے کہ اپنی غرض بھی آپ کو محسوس نہ ہو اور یہ جانئے کہ علماء دنیا میں بھی تمہارے محتاج نہیں، کیونکہ کوئی صاحب جائیداد ہیں، کوئی تاجر ہیں اور نہیں تو یہ کام سب سے اچھا کر سکتے ہیں اور ہمارا تو اعتقاد ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (اور کوئی جاندار اور زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو) آپ کے سامنے ہم کو ہاتھ پھیلانے کی کونسی ضرورت ہے اور تم محتاج ہو ان لوگوں کے دین میں بھی اور دنیا میں بھی، تو جو کچھ ان کو دیتے ہو اپنی غرض کو...... ؎

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی   منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

(تیرا بادشاہ پر احسان نہیں کہ تو ان کی خدمت کرتا ہے بلکہ بادشاہ کا تجھ پر احسان ہے کہ اس نے تجھے خدمت کے لئے رکھ لیا ہے)

یہ لوگ باوجود اپنی اس استغنا کے آپ کی خدمت قبول کر لیتے ہیں۔ اس کا احسان آپ پر باقی ہے اور اگر ان کا ہونا تمہارے نزدیک بیکار ہے تو ذرا اس وقت کو خیال کرو جب علماء فنا ہو جائیں تو تمہاری اولاد کا کیا حال ہو گا۔

کس قدر تحصیل علم دین فرض عین ہے:

بعض دیہات میں اب دیکھ لیجئے کہ جنازہ کی نماز کا کوئی پڑھانے والا نہیں ملتا۔ استغفر اللہ جب علم دین

اس درجہ ضروری ہے اس کی تحصیل وحفاظت واجب ہوئی پھر جامعیت ہوئی تو سبحان اللہ اوروہ فرض کفایہ ہے اور اگر اس قدر مہلت نہیں تو اچھا فرض عین ہی ادا کرلو اور ہندی یا عربی یا فارسی جس میں ہو سکے حاصل کرو۔

لوگوں کا گمان ہے کہ راہ نجات کافی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں سارے اخلاق اور عقائد آگئے ہیں بفضلہ تعالیٰ علم دین کی ضرورت ثابت ہوچکی اس سے تو کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر یہ خیال ہوسکتا ہے کہ اس ہیئات مروجہ کی ضرورت نہیں تو بہتر مجھے کوئی اور ہیئات بتا دیجئے اور دکھا دیجئے کہ وہ مفید ہے میں کچھ مانگتا نہیں ہوں ہاں ضرورت ثابت کئے دیتا ہوں۔ اگر ثابت نہ ہوئی ہوتو آپ کے نزدیک تو میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ آپ میرے مقدمات دلیل کی غلطی ظاہر کردیجئے میں اپنے حجرے میں بیٹھ کر نہیں کہتا ہوں۔

فضائل چندہ:

غرض ضرورت ہے دین کی اور مدرسوں کی اسی ہیئات پر باقی رکھنے کی۔ آپ جو کچھ دین اپنی ضرورت اور منفعت کی تحصیل کے واسطے دیں گے ہم پر کچھ احسان نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **فیأخذه بیمینه فیربیه کما یربی احدکم فلوه حتی یکون اعظم من الجبل.** باری تعالیٰ اپنے یمین میں لیتے ہیں جو کچھ دیا جاتا ہے یمین کا لفظ متشابہات میں سے ہے اس کے معنی اور تاویل سے تو اس وقت بحث نہیں مراد قبول ہے اور باری تعالیٰ کے ہاتھ میں کیسے نمونہ ہوگا جب زمین میں ڈالنے سے دانہ پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے اگر ایک کھجور کو بویا جائے اور پھر اس سے جتنے پھل پیدا ہوں ان کو بویا جائے اور ایسے ہی حساب لگایا جائے تو یہ بات معلوم ہوسکتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ احد اعظم الجبال تھا مدینہ میں اس واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مثال دی ورنہ پہاڑ سے اور اس سے کیا نسبت۔ یہی معنی ہیں اس کے جو شب قدر میں ہے کہ **خیرٌ مِّن الف شھر** کلام عرب میں مفرد لفظ اعداد کے اندر الف سے زیادہ کے واسطے موضوع نہ تھا اس واسطے لایا گیا۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ دینے والا اگر ثواب کو دیکھ لے تو یہی کہے:

جمادے چند دادم جاں خریدم بحمد اللہ عجب ارزاں خریدم

''میں نے چند سکوں کے عوض جان خریدی، بفضل اللہ میں نے کس قدر ارزاں خریدی۔''

(وعظ ختم ہوا)

تمت بحمد اللہ